حیدرآباد میں طنزومزاح کی ایک صدی

(2000ء - 1900ء)

مقالہ برائے ڈاکٹر آف فلاسفی

مقالہ نگار

میر حشمت علی

ایم۔اے، ایم فل

نگران

ڈاکٹر حبیب نثار

شعبۂ اردو

اسکول آف ہیومانٹیز

حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد

2010ء

Hyderabad Mein Tanz-o-Mizah Ki Ek Sadi

(A Century of Satire & Humour in Hyderabad)

Thesis

Submitted to the University of Hyderabad
in partial fulfillment of the requirement for the
award of the degree

Doctor of Philosophy

In Urdu

by

Mir Hashmath Ali
M.A., M.Phil

Supervisor

Dr. Habeeb Nisar

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad - 500 046

2010

DEPARTMENT OF URDU
SCHOOL OF HUMANITIES
UNIVERSITY OF HYDERABAD
HYDERABAD 500 046

CERTIFICATE

This is to certify that I, Mir Hashmath Ali, have carried out the research embodies in the present thesis entitled **"HYDERABAD MEIN TANZ-O-MIZAH KI EK SADI "** (A Century of Satire and Humour in Hyderabad) for the full period prescribed under Ph.D. ordinance of the University.

I declare to the best of my knowledge that no part of this thesis was earlier submitted for the award of research degree of any University.

(Signature of the candidate)

Name : **Mir Hashmath Ali**
M.A, M.Phil
Enrolment No..03HUPH05

Dean, School of Humanities

University of Hyderabad

(Signature of the Supervisor)

Dr. Habeeb Nisar

Head Dept, of Urdu

University of Hyderabad

بسمہ تعالیٰ

حرفِ آغاز

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل ہوا۔ تحقیق میں موضوع کا انتخاب سب سے اہم اور مشکل امر ہوتا ہے۔ راقم الحروف نے اساتذہ سے یہ بات سن رکھی تھی کہ ایسا موضوع منتخب کیا جائے جو ریسرچ اسکالر کی ذہنی مناسبت سے ہم آہنگ ہو۔ دوسرے چونکہ یہ کام ایک مقررہ مدت میں تکمیل کرنا ہوتا ہے' اس لئے موضوع کے انتخاب میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا جائے۔

الغرض جب موضوع کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوا تو میں نے کئی مرتبہ ذہن کو مجتمع کر کے غور و فکر کیا۔ کئی موضوع ذہن میں آئے لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ ایسے موقع پر اُستادِ محترم ڈاکٹر حبیب نثار صاحب نے میری رہنمائی کی اور میرے لئے ''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی ایک صدی'' موضوع تجویز کیا۔ چونکہ بیسویں صدی ختم ہو چکی تھی اور ہم ایک نئی صدی میں سانس لے رہے تھے اس لئے مجھے یہ موضوع دلچسپ معلوم ہوا۔ ویسے بھی مجھے طنز و مزاح سے خاصی دلچسپی رہی ہے۔ ایم فل میں منشی سجاد حسین کے ناول پر کام کر چکا تھا' اسی لئے یہ موضوع میری طبیعت کے عین مطابق معلوم ہوا۔ دیگر اساتذہ نے بھی اس تجویز پر اپنی رضا مندی کی مہر لگائی۔

راقم الحروف نے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں طنز و مزاح کی تعریف' معنی و مفہوم' اس کے مختلف برتاؤ اور رویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد ان حالات و اسباب کا سرسری تذکرہ ہے جس کی وجہ سے اردو ادب میں طنز و مزاح کی ابتداء ہوئی۔ اودھ پنچ میں شائع ہونے والی تحریروں ے سماج اور معاشرے پر کیا اثرات مرتب کئے اور مجاہدین آزادی کے کاز کو بڑھانے میں کس طرح ساتھ دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو نما اور ارتقاء کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''حیدرآباد میں اردو طنز و مزاح'' کے ذیلی عنوان کے تحت حیدرآباد میں طنز و مزاح کی روایت کا مختصراً بیان کیا گیا ہے' اور بعد کے ابواب میں ان ہی فنکاروں کے فن کا مفصل تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

سقوطِ حیدرآباد کے سانحہ کے بعد حیدرآبادی معاشرے میں ایک اضطراب اور خوف کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ اس خوفناک ماحول کو شگفتگی میں بدلنے اور لوگوں کو حوصلہ بخشنے میں ''زندہ دلانِ حیدرآباد'' کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ اس باب میں اس کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ ارضِ دکن میں طنز ومزاح کو وقار بخشنے میں رسالہ شگوفہ کی خدمات سے بھی رو گردانی کرنا ادبی کفر سے کم نہیں ہے۔ یہ بھی ایک کارنامہ ہے کہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال اپنی ادارت میں اسے مسلسل 42 برس سے شائع کر رہے ہیں۔ اور یہ صرف ان ہی کی ذات کا خاصہ ہے۔ اس کے بعد حیدرآباد میں طنز ومزاح کے اُن موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر حیدرآباد کے مزاح نگاروں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس باب کے آخر میں ایسے قلم کاروں کا بھی اجمالی جائزہ لیا گیا ہے جنھیں عوامی مقبولیت نہ مل سکی لیکن ان کی تخلیقات نے سماج کے مختلف مسائل کا احاطہ کیا ہے۔

دوسرے باب میں اردو نثر میں طنز ومزاح کے ذیلی عنوان کے تحت حیدرآباد کے معروف مزاحیہ نثر نگاروں کی اہم تخلیقات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں اردو شاعری میں طنز ومزاح کے ذیلی عنوان کے تحت حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے مزاحیہ شاعروں اور ان کے فن پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

طنز ومزاح کے میدان میں بہت کم خواتین نے طبع آزمائی کی ہے۔ اور ان میں بھی چند ہی خواتین نے ادبی دنیا میں اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ چوتھے باب میں حیدرآباد کی ایسی ہی منتخب طنز ومزاحیہ خواتین کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب طوالت اور بحث کے لحاظ سے اس مقالے کا حاصل ہیں۔ ان ابواب میں لیا گیا جائزہ میرے مقالے کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا، بلکہ یہی میرا عین منشا و مقصد بھی ہے۔

آخری باب یعنی باب پنجم ماحصل یا اختتامیہ ہے، جس میں پورے مقالے کا سرسری نچوڑ یا لب لباب پیش کیا گیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے زیرِ نظر مقالے کے دروبست اور اس کے اہم ماخذات اور مبادیات کا خلاصہ سامنے آتا ہے۔

اس طرح زیرِ نظر مقالے میں ایک اور باب بھی شامل ہے جسے ابواب کے زمرے میں تو شامل نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ مقالے کا ایک اہم حصہ ضرور ہے۔ اسے کتابیات کا نام دیا گیا ہے۔ اس باب میں اُن کُتب اور رسائل

واخبارات کی تفصیل درج ہے جن سے راقم الحروف نے اس مقالے کی تیاری میں مدد حاصل کی ہے۔

خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں یہ بندہ سجدہ شکر بجالاتا ہے جس کی بے حساب عنایتیں اور رحمتیں اس گناہ گار پر برستی رہیں۔اوران ہی رحمتوں اور عنایتوں کا نتیجہ ہے کہ یہ مقالہ تکمیل ہوسکا۔

بے ادبی ہوگی اگر میں اپنے نگران، مربی و محسن اُستاد محترم ڈاکٹر حبیب نثار کا شکریہ ادا نہ کروں۔ادب کی سنگلاخ راہوں پر ہر جگہ آپ نے شجر سایہ دار کی طرح ہمیشہ میری رہنمائی و رہبری فرمائی۔دکنی ادب اور تحقیق کے میدان میں آپ ایک اتھاریٹی سمجھے جاتے ہیں۔موضوع کے انتخاب سے لیکر مقالے کی تکمیل تک ان پدرانہ شفقت میری ساتھ رہیں۔اوران کی ہی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ یہ مقالہ تکمیل پاسکا۔

میں اپنے شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے تمام اساتذہ خصوصاً پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر محمد انور الدین اور ڈاکٹر میر محبوب حسین کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ ان یکتائے روزگار علمائے ادب نے ہر طرح میری رہبری فرمائی۔ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال مدیر ''شگوفہ'' کی عنایتوں اور کرم فرمائیوں کے لئے بھی میں ممنون و مشکور ہوں۔میں شعبہ اردو کی سینئر اسسٹنٹ محترمہ بصالت النساء صاحبہ کا مشکور ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ دفتری کارروائیوں میں ہر مشکل مرحلہ پر میرا تعاون کیا۔

بقول مولانا آزاد لائبریریاں اور کُتب خانے علم کے خزانے ہوتے ہیں۔دورانِ تحقیق مجھے ایسے ہی کئی خزانوں یعنی کتب خانوں سے استفادہ کا موقع ملا۔میں خاص طور پر اندرا گاندھی میموریل لائبریری، یونیورسٹی آف حیدرآباد کے عہدیداروں کا بھی مشکور ہوں۔اس کے علاوہ، سنٹرل لائبریری، مولانا آزاد یونیورسٹی، ادارہ ادبیات اردو، شیخ داؤد اکیڈیمی آف ریسرچ اینڈ لائبریری، حیدرآباد، ادارہ ''شگوفہ'' کے ذمہ داروں کا بھی بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ مواد کی فراہمی میں انہوں نے میری ہر طرح سے مدد فرمائی۔

آخر میں میں اپنے ساتھیوں حافظ عبدالمنیر، ایم. محمد غوث، رؤف احمد، شفیق احمد، ڈاکٹر عائشہ صدیقہ، ڈاکٹر شیخ عبدالکریم، ڈاکٹر میر مرتضیٰ علی مجاہد، کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے اپنی بے پناہ محبتوں کے ساتھ میری حوصلہ افزائی کی۔میں محمد اسحاق اور محمد غلام احمد کا بھی سپاس گذار ہوں جنھوں نے کمپیوٹر کتابت اور گرافِک کی تیاری میں میری جزوی طور پر مدد کی۔اللہ ان تمام کو جزائے خیر عطا کرے۔آمین

میں والدین کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ ان کی دعائیں اور شفقتیں ہر لمحہ میرے شامل حال رہیں۔ میں اپنے بھائی بہنوں کا بھی شکر گذار ہوں کہ ان کی نیک تمناؤں کا حاصل آج پیش نظر ہے۔ اپنی نصف بہتر کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے ہر وقت اور ہر قدم پر نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ مجھے ذہنی یکسوئی عطا کی جس کی اشد ضرورت مجھے دوران تحریر مقالہ محسوس ہوئی۔

والسلام

میر حشمت علی......ریسرچ اسکالر

فہرست

صفحہ نمبر

حرفِ آغاز 1 - 4

بابِ اوّل ⮜ اُردو میں طنز و مزاح۔آغاز۔تشکیلی دور اور اِرتقاء 5 - 93

اَودھ پنچ اور اُردو طنز و مزاح

دکنی زبان میں طنز و مزاح کا فروغ

بابِ دوّم ⮜ اُردو نثر میں طنز و مزاح 94 - 265

بابِ سوّم ⮜ اُردو شاعری میں طنز و مزاح 266 - 489

بابِ چہارم ⮜ حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین 490 - 607

بابِ پنجم ⮜ حیدرآباد میں طنز و مزاح کی ایک صدی (اختتامیہ) 608 - 611

کتابیات

طنز و مزاح

ہنسی ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو دنیا کی دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ ہنسنا اور رونا انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ آدمی جب خوش ہوتا ہے تو مُسکراتا ہے' ہنستا ہے اور گُنگناتا ہے۔ اور جب یہی انسان اُداس اور غمگین ہوتا ہے تو رونے لگتا ہے۔ کچھ جانور بعض اوقات روتے ضرور ہیں لیکن یہ تمام جانور ہنسنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ دوسری طرف ان جانوروں کی بے ساختہ حرکتیں انسان کی حس مزاح کو مہمیز کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں برصغیر کے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں۔

''یہ ایک حقیقت ہے کہ ہنسی ہی دنیا کے سارے انسانوں کی بنیادی مادری زبان ہے۔ انسان چاہے اردو بولے یا انگریزی' فرانسیسی بولے یا اطالوی مگر جب وہ ہنستا ہے تو متفقہ طور پر ایک ہی لہجہ اور ایک ہی انداز سے ہنستا ہے۔ البتہ ہنسنے کی مقدار' وجوہات' موضوعات اور ضروریات مختلف ہوسکتی ہیں۔ لیکن وہ ہنستا تو ایک ہی طرح ہے۔ ساری کائنات میں انسان ہی ایک ایسا سماجی جانور ہے جسے قدرت نے ہنسی کی دولت عطا کی ہے۔'' (1)

پدم شری مجتبیٰ حسین نے ہنسی کو ''انسانوں کی بنیادی مادری زبان'' قرار دیا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ نے غالبؔ کو ان کی شگفتہ مزاجی کی باوصف ''حیوان ظریف'' کہا تھا۔ ہنسی' ہنسنا' ہنسانا کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

ہنسنا ہنسانا' جس کا ادبی نام طنز و مزاح یا شوخی و ظرافت ہے' آدمی کا جبلی

عمل ہے۔جس طرح آدمی خوبصورت چیزوں کو دیکھ کر واہ وسبحان اللہ کہنے پر مجبور ہے اسی طرح وہ اپنے دوست کو دور سے دیکھ کر خوشی سے دانت نکالنے اور زندگی کے مضحک پہلوؤں پر ہنسنے پر مجبور ہے۔اس کی یہ مجبوری کہیں بے ادبی و گستاخی گردانی جاتی ہے' کہیں لُطف انگیز ونشاط آور۔ باشعور و باذوق افراد کی یہ کوشش ہوتی ہے اور یہی ہونی چاہیے کہ طنز وظرافت سے دودھاری تلوار یا خواہ مخواہ کسی کی دل آزاری کا کام نہ لیا جائے' بلکہ اسے ایسے ہلکے پھلکے نشتر کی لطیف چُبھن تک محدود رکھا جائے جو مریض کی صحت کا ضامن بھی ہو اور لُطف اندوزی کا کامیاب وسیلہ بھی۔'' (2)

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔جعفر زٹلی' سوؔدا اور غالبؔ کے کلام میں اس کے اولین نقوش نظر آجاتے ہیں۔لیکن نقادوں نے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو ہمیشہ تیسرے درجے کا ادب سمجھا ہے۔شاعری کو وہ پہلے درجے کا ادب قرار دیتے ہیں اور فکشن کو دوسرے درجے میں رکھتے ہیں جبکہ طنز و مزاحیہ ادب کو تیسرے درجے کا ادب قرار دیتے ہیں۔آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد جہاں دوسری اصناف ادب نے ارتقائی منازل طئے کیں وہیں طنزیہ و مزاحیہ ادب نے بھی خاطر خواہ ترقی کی ہے۔انیسویں صدی کی اوائل میں جہاں خوش طبعی اور تفریح کے لئے مزاحیہ ادب تخلیق ہوا وہیں آزادی کے بعد تخلیق ہوئے ادب میں طنز اور اصلاحی پہلو زیادہ واضح نظر آنے لگا۔

اردو ادب میں طنز و مزاح معروف اسلوب ہے۔عموماً اسے صنف تصور کیا جاتا ہے۔اور اسی لئے طنز و مزاح کو مختلف نام دئے جاتے ہیں۔مثلاً مزاح' تضحیک' پیروڈی وغیرہ وغیرہ۔چنانچہ طارق سعید ایسے مختلف اسماء میں طنز و مزاح کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مزاح تضحیک' تمسخر لطیفہ' مسخراپن' سوانگ' دل لگی' مذاق بذلہ سنجی' پیروڈی' آئرنی' طربیہ' فنطاسی اور شکوہ و شکایت یہ سبھی طنز وظرافت کی پیش کش میں کسی نہ کسی طرح معاون ثابت ہوتے ہیں' ساتھ ہی ان میں سے کوئی تنہا طنز وظرافت کے ہم معانی اور ہم صورت نہیں۔ان کی صورتیں طنز وظرافت سے

قریب ہونے کے باوجود بھی کسی نقطہ پر پہنچ کر علٰحدہ ہو جاتی ہے۔“(3)

طارق سعید نے اردو میں طنز و مزاح کے مختلف اسالیب پر بالکل صحیح اظہار خیال کیا ہے۔ جو نام انہوں نے یہاں گنائے ہیں وہ یا تو طنز و مزاح کے مترادفات ہیں یا ان کے معاون اسالیب ہیں۔ اردو ادب میں طنز و مزاح سے متعلق موجود اس عام غلط فہمی کے بارے میں ممتاز مزاح نگار خواجہ عبدالغفور نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ ان اسالیب کے اختلافات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کو ہم معنیٰ استعمال کرنے پر بھی اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”بالعموم ظرافت اور طنز ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں اور ان دونوں میں امتیاز نہیں برتا جاتا حالاں کہ دونوں ہی مختلف ہیں۔ ظرافت کھلا مزاح ہے جس میں کسی پر چوٹ نہیں۔ طنز تیز چُبھتے ہوئے اور چُھپے ہوئے معنیٰ رکھتا ہے۔ لیکن کثیف اور ثقیل نہیں ہوتا اور اس میں ہَجو کی طرح زہر بھرا نہیں ہوتا۔ یہ تنقید سے کچھ زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں قدرے بے اعتدالی ہوتی ہے۔ اسلوب بیان ناقدانہ لیکن اندرونی طور پر ہلکا سا لعن طعن اور گفتگو فقرے بازی کی چُبھن سے بھرپور، ایک حد تک سرزنش اور سزا دینے کا پہلو بھی شریک رہتا ہے لیکن وہ بھی ڈھکا چھپا۔“(4)

خواجہ عبدالغفور نے یہاں طنز و مزاح کے فرق کی وضاحت کرنے کی سعی کی ہے لیکن وہ اپنی بات کو واضح انداز میں وہ بیان نہیں کر سکے۔ مزاح انگریزی لفظ Humour کا مترادف ہے۔ آکسفورڈ کی English Urdu Dictionary (چیف ایڈیٹر: پروفیسر کلیم الدین احمد) میں ”ہیومر“ Humour کی تعریف کچھ اس طرح کی گئی ہے۔

”مزاح، شگفتگی (Wit کی نسبت عالمانہ سے زیادہ ہمدردانہ) ادب، تقریر وغیرہ میں ظرافت کا رنگ۔“(5)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے شائع کردہ ڈکشنری میں مزاح Humour کی تعریف کچھ اس طرح کی گئی ہے۔

''خلط' قلبی یا دماغی کیفیت' موج' لہر' میل' رغبت' رجحان
ظرافت' مذاق' خوش طبعی
ذوق ظرافت' احساس ظرافت
مضحک حالات' مضحک پہلو''(6)

urduenglishdictionary.org ویب سائٹ پر طنز و مزاح کی تعریف کچھ اس طرح بتائی گئی ہے۔

''مزاح' شگفتگی' ادب' تقریر وغیرہ میں ظرافت کا رنگ۔''(7)

ہیومر کے معنیٰ بتاتے ہوئے ایس جے صادق لکھتے ہیں۔

''لفظ Humour یوروپی زبانوں سے لیا گیا ہے۔اس کے معنیٰ
رطوبت یا بھیگے پن یا گیلے پن کے ہیں۔''(8)

ایس جے صادق نے ہیومر کو یوروپی زبانوں سے متعلق بتایا ہے اس کے برخلاف خواجہ عبدالغفور لفظ ہیومر کو لاطینی لفظ بتاتے ہیں۔لاطینی یورپ کی زبانوں سے علحدہ ایک زبان ہے دراصل یوروپی زبانوں کا منبع لاطینی زبان ہی ہے۔خواجہ عبدالغفور ہیومر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ہیومر ایک لاطینی لفظ ہے۔اس کے لغوی معنیٰ رطوبت' رطوبت اور
حرارتِ عزیزی کی ہم آہنگی' انسان کے مزاج کو شگفتگی بخشتی ہے اور کبیدگی کو
دور کرتی ہے۔''(9)

مزاح کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے:

''مزاح زندگی اور ماحول سے اُنس اور مفاہمت کی پیداوار ہے۔''(10)

اس میں کوئی شک نہیں کہ تبسم زیر لب ہی مزاح کا معیار قائم کرتا ہے لیکن اس کی شعریات میں کبھی کبھی وہ حزن و ملال بھی شامل ہوتا ہے جو مزاح نگار کے بُطون سے نکل کر مزاح کے لئے ایسے شگوفوں کو جنم دیتا ہے جن پر اشکوں

کے موتیوں کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔مشتاق احمد یوسفی نے اس کو اپنے خاص انداز میں اس طرح لکھا ہے۔

''عمل مزاح' اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے۔لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ' لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ' باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا' ہیرا بن جاتا ہے۔''(11)

نامی انصاری طنز و مزاح کو ایک اسلوب قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''طنز و مزاح محض ایک اسلوب ہے بلکہ یہ ایک مستقل صنفِ سخن ہے' ٹھیک اسی طرح جیسے اردو زبان' ہندی کی شَیلی نہیں ہے بلکہ ایک مستقل اور قائم بالذات زبان ہے۔اس لئے اب اردو ادب کی کوئی تاریخ طنز و مزاح کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاسکتی۔''(12)

سید عابد حسین ایک اچھے انشائیہ نگار مانے جاتے ہیں انھوں نے بڑے نفیس مزاحیہ مضامین سپرد قلم کئے ہیں۔مزاح کا ایک مترادف اردو میں ظرافت ہے۔ظرافت کی تعریف کرتے ہوئے سید عابد حسین لکھتے ہیں۔

''وہ مذاق جو پستی کی طرف جھکنے کے بجائے بلندی کی طرف ابھرتا ہے۔جس میں نفاست' ندرت' ستھرا پن پایا جاتا ہے۔اسے ظرافت کہتے ہیں۔''(13)

طنز جسے انگریزی زبان میں Satire کہتے ہیں۔اس کی جولان گاہ معاشرے کی برائیوں' کمزوریوں اور حماقتوں کو مضحک بنا کر پیش کرنا ہے۔مگر اس میں تہذیب اور ادبیت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑنے کی ضرورت ہے۔آکسفورڈ ڈکشنری میں طنز Satire کی تعریف کچھ اسطرح کی گئی ہے۔

''(ا) ہجو' طنزیہ' مضحک تحریر جو کسی کی حماقت یا شرارت وغیرہ کو موضوع بنا کر لکھی جائے۔(ب) طنز پر مبنی نظم و نثر کی کوئی تحریر (ت) طنزیہ ادب (ج) کوئی بات جس میں کسی کی مذمت یا تضحیک کا پہلو نکلتا ہو۔''(14)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے شائع کردہ ڈکشنری میں طنز Satire کی تعریف کچھ اسطرح کی گئی ہے۔

(۱) ہجو، ہجویہ نظم، ہجویہ تصنیف یا قصیدہ

(۲) تضحیک، موجب ننگ، باعث عار

(۳) طعن، طنز، تعریض (15)

طنز کی تعریف کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں۔

''طنز کا تلقین حقیقت ہوتا ہے اور حقیقت بلاشبہ ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔اس تلخی کو ایسے الفاظ میں بیان کرنا کہ اس شخص اور سماج کو کم نقصان پہنچے لیکن غیر شعوری طور پر اس کی اصلاح ہوجائے کہ جس پر وار کیا گیا، یہی حقیقی طنز ہے۔'' (16)

غلام احمد فرقت کاکوروی اس کی تشریح کچھ وضاحت کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں۔

''صحیح طنز وہ ہے جس میں تمسخر زیادہ ہو، زہر نا کی کم اور کم سے کم احساس برتری ہو'' (17)

خواجہ عبدالغفور نے طنز کی تعریف کرنے کے بعد طنز کے افعال اس کے کارہائے نمایاں پر اظہار خیال کیا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے طنز نگار کے بارے میں بھی لکھا ہے۔

''طنز تنقید ہے، صدائے احتجاج ہے، دشنام یار ہے، تبصرہ ہے، تازیانہ ہے۔اس کا مقصد اصلاح۔ پگڑی اُچھالنا ہے۔احساس برتری کا مظاہرہ کرنا ہے۔بے ہودہ اشیاء اور اشخاص کا مضحکہ اڑانا ہے۔طنز مبالغہ ہے، مشغلہ ہے، مہتابی ہے، انار ہے، پھلجھڑی ہے۔اپنے آپ پر ہنسنے کا نام ہے، چٹکی لینا ہے، ہمدردانہ نقطۂ نظر سے انسانی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کا فن۔طنز نگار سرجن ہوتا ہے، احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے۔'' (18)

طنز میں سطحیت کے بجائے گہرائی ہوتی ہے۔جس میں طنز نگار مبالغہ آرائی کے ساتھ معاشرے کی اصلاح کا کام لینا چاہتا ہے۔اس سلسلے میں وقار عظیم رقمطراز ہیں۔

''طنز جذبات کے اظہار کا ایسا نام ہے جس میں انسان جذبات کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے سطحی محرکات سے بچتا ہوا کسی ایسی بلندی پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی آواز میں پیمبرانہ شان پیدا ہوتی ہے۔''(19)

طنز کی خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

''طنز کی سب سے بڑی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں نشتریت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔طنز نگار کے ردعمل میں ایک استہزائی کیفیت ہوتی ہے۔وہ دراصل جس چیز یا عیب کا مذاق اُڑاتا ہے اس سے نفرت کرتا ہے اور اسے تبدیل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔''(20)

طنز میں مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا جاتا ہے اور اسے معروف مغربی مفکر آرتھر کوئسلر ضروری بھی قرار دیتا ہے۔وہ کہتا ہے:

''ہمارے اذہان زندگی کی بے زار کن یکسانیت اور بے رنگ تکرار سے اس قدر بے حس ہو چکے ہیں اور ہم زندگی کے ناسوروں کو دیکھ دیکھ کر ان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ جب تک طنز نگار انھیں مبالغہ آمیز انداز میں پیش نہ کرے ہماری نگاہیں ان پر جمنے ہی نہیں پاتیں۔پس طنز نگار کی جیت اسی میں ہے کہ وہ زندگی اور سماج کی ناہمواریوں کو یوں بڑھا چڑھا کر اور ایسے انداز میں پیش کرے کہ ہم ان ناہمواریوں کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ہمیں طنز نگار کی یہ بات بری بھی نہ لگے۔''(21)

طنز نگار چونکہ ادب کا سرجن ہوتا ہے، جراح ہوتا ہے اس لئے وہ کڑوی سے کڑوی دوا مٹھاس کے ہمراہ پلاتا

ہے۔یعنی طنز کا تیر مزاح کی بان سے چلاتا ہے۔طنز چونکہ تلخ ہوتا ہے اسی لئے ہمیشہ طنز کے ہمراہ مزاح بھی شامل ہوتا ہے۔ اور یہ اردو ادب میں اتنے ہم آہنگ ہو گئے ہیں کہ اب میرے کی مثنویوں کے عاشق و معشوق معلوم ہوتے ہیں کہ الگ کرنا ممکن نہیں۔ادب میں ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ ہوتا ہے۔طنز تنقید کا فرض بھی انجام دیتا ہے لیکن تضحیک اس سے الگ ایک اسلوب ہے۔تضحیک میں کبھی واحد متکلم خود کی تضحیک کرتا ہے' کبھی سامنے والے کو زِک پہنچاتا ہے طنز اور تضحیک پر اظہار خیال کرتے ہوئے خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں۔

''کسی کی ذاتیات پر حملہ کرنا اور اس کی عام صفات کو اس طرح گرا کر پیش کرنا کہ وہ دوسروں کی نظر میں ہنسی اور مذاق بن جائے۔ایک سور کو اس سے زیادہ مکروہ شکل میں پیش کرنا جیسا کہ خود خدا نے اس کو بنایا ہے' طنز یا تضحیک ہے۔''(22)

ایک اور مقام پر تضحیک کی تعریف و توضیح کرتے ہوئے خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں۔

'' کچھ لوگ '' آ بیل مجھے مار'' کے مصداق ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں کہ خود شکار ہو جاتے ہیں' اور دوسروں کے لئے پر مذاق کھلونا۔اس میں اپنی بڑائی کو خو' بو ہوتی ہے۔لیکن سننے والے اس کی شخصیت پر ہنس اُٹھتے ہیں۔اوٹ پٹانگ باتیں واہیات اور خلاف عقل بھی ہوتی ہے۔مضحکہ خیز' تمسخرانہ یا مذاق اور ساتھ ساتھ ذلیل کرنے والی باتیں سب کی ہنسی اور جس کی تضحیک ہوتی ہے' اس کی اذیت کا باعث ہوتی ہے۔''(23)

انیسہ سلطانہ لکھتی ہیں کہ دوسروں کی ذاتیات پر حملہ کرنا تضحیک ہے۔اقتباس دیکھئے۔

''دوسروں کی ذاتیات پر حملہ کرنا تضحیک ہے۔کسی کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانا اور اسے نیچ اور ذلیل کرنا تذلیل ہے۔تعریض اور تنقیص بھی تضحیک کی ایک قسم ہے۔اس میں طنز کا نشانہ کوئی خاص قباحت یا عام رجحان ہوتا ہے۔''(24)

طنز ومزاح ایک مشکل فن ہے۔اس فن کے استعمال میں مہارت ضروری ہے۔کیونکہ اس میں سماجی اصلاح کا ایک مقصد ہوتا ہے۔اوراسی سے پست ہوتی سماجی قدروں کو بدلنا ہوتا ہے۔طنز نگار کی بصیرت جتنی گہری ہوتی اس کے فن کا وار بھی اتنا ہی گہرا ہوگا۔اس سلسلے میں مشتاق احمد یوسفی رقمطراز ہیں۔

''سادہ اور پُر کار طنز جاں جوکھوں کا کام ہے۔ بڑے بڑوں کے جی چھوٹ جاتے ہیں اچھے طنز نگار تنے ہوئے رسے پر اِترا اِترا کر کرتب نہیں دکھاتے بلکہ رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر۔''(25)

عموماً طنز ومزاح میں فرق نہیں کیا جاتا۔لیکن طنز ومزاح نگاری کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں کہ دونوں کے الگ الگ مدارج ہیں۔ لکھتے ہیں:

''جہاں مزاح نگار کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ناہمواریوں سے محظوظ ہوتا ہے وہاں طنز نگار ان ناہمواریوں سے نفرت کرتا ہے۔اور انھیں خندہ استہزاء میں اڑا دینے کی طرف ہر دم مائل رہتا ہے۔البتہ طنز کے کئی ایک مدارج ضرور ہیں، چنانچہ کبھی تو یہ محض ایک فرد کو نشانہ ءتمسخر بناتی ہے اور کبھی ان ارتقائی منازل پر پہنچ جاتی ہے جہاں یہ انسان اور سماج کی مستقل حماقتوں اور عالمگیر ناہمواریوں کو طشت از بام کرتی اور انسان کو انسانیت سے قریب تر لانے میں مدد دیتی ہے۔''(26)

سید احتشام حسین کی رائے بھی وزیر آغا سے مختلف نہیں ہے وہ لکھتے ہیں

''بعض لوگ طنز اور مزاح کو اس طرح الجھا دیتے ہیں کہ طنز کی حقیقت مزاح میں چھپ جاتی ہے۔اس کا سبب یہی ہے کہ مزاح کی مختلف شکلوں کے درمیان حد فاصل کھینچنا دشوار ہے۔طنز، مزاح کے سوا کچھ اور بھی ہے، اور یہی '' کچھ اور'' گرفت میں نہیں آتا۔......طنز میں ناگواری کی جو کیفیت ملتی ہے۔شاید اسی کی وجہ سے بہت سے لوگ اسے مزاح سے الگ کرکے دیکھتے

ہیں......اصل حقیقت یہ ہے کہ طنز کا وجود مزاح کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ ہاں مزاح طنز سے بالکل پاک بھی ہوسکتا ہے۔خالص ظرافت میں ارسطو کے خیال کے مطابق بھدا پن اور بدصورتی کا احساس ہوسکتا ہے لیکن اذیت کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔اس طرح ایک بات تو طئے ہوسکتی ہے کہ طنز' مزاح کی ایک قسم ہے جس میں مقصد کے بدل جانے سے بعض ایسی خصوصیتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔۔ظرافت جنس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔طنزاور مزاح میں تفریق نمایاں کرنا آسان نہ ہو لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ ظرافت کا مقصد تفریح ہے اور طنز کا مقصد افراط وتفریط کی اصلاح۔''(27)

ڈاکٹر انوار احمد انصاری لکھتے ہیں۔

''طنز ومزاح دو مختلف چیزیں ہیں۔طنز میں زہرناکی ہوتی ہے۔اس میں نشتریت کا عنصر غالب رہتا ہے جبکہ مزاح ملائمت کا احساس دلاتا ہے اور زخم پر فوراً مرہم لگادیتا ہے۔طنز ومزاح آپس میں مل کر ایک خوشگوار اور معتدل فضاء تیار کرتے ہیں جس سے بالواسطہ اصلاح کا کام بھی لیا جاتا ہے اور سماجی حالات بھی متاثر ہوتے ہیں۔طنز میں مزاح کے عناصر موجود ہوتے ہیں لیکن مزاح میں طنز کا ہونا ضروری نہیں۔بعض ناقدین طنز کو مزاح سے جدا رکھتے ہیں۔ان کے نزدیک طنز طنز ہے اور مزاح مزاح' خالص طنز ہمیں رُلانے پر اُکساتا ہے اور خالص مزاح قہقہہ لگانے کی فضاء تیار کرتا ہے۔''(28)

جب ہم اردو میں طنز ومزاح کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مقصد ادبی طنز ومزاح ہوتا ہے۔پھکڑ پن' چٹکلے بازی ، جنسی چٹخارے' یاوہ گوئی' لطیفہ سازی جس میں ابتذال اور رکاکت ہو' ادبی طنز ومزاح کے زمرے میں نہیں آتے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے طنز ومزاح کو انسانی اظہار کا جوہر بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''طنز ومزاح' انسانی اظہار کی ایسی خصوصیت ہے جس کے لئے نظم ونثر

یا شاعری کی کوئی قید نہیں کیونکہ یہ وہ جوہر ہے جس کے بغیر زندگی کا کوئی مرقع مکمل نہیں ۔اس کی جھلک تمام اچھے ادب میں کسی نہ کسی پیرائے میں ضرور ملتی ہے۔''(29)

اعلیٰ ترین مزاح کے تخلیق کے لئے انفرادیت اور نُدرت خیال ضروری ہے۔اچھا مزاح وہی لکھ سکتا ہے جو خود ہنسنا جانتا ہواور دوسروں کو ہنسانے کے فن سے بخوبی واقف ہو۔اس سلسلے میں ڈاکٹر نسیم الدین فریسؔ لکھتے ہیں۔

''اعلیٰ درجے کے طنز ومزاح کے لئے ذہانت' فطانت' حساسیت' قوت مشاہدہ ذہن رسا اور بذلہ سنجی نہ ہوتو طنز ومزاح کے میدان میں استقامت کے ساتھ جمے رہنا ناممکن ہوتا ہے۔باغ و بہار طبیعت کا مالک ہی ظرافت کے کشت وزعفران کی آبیاری کرسکتا ہے۔یاسیت پسند' اور قنوطیت پسند طبائع کو ظرافت کے گلستان میں بار نہیں۔مردہ دل اور پژمردگی' ظرافت اور شگفتگی کی تخلیق کیا کرے گی۔الٹے وہ زندہ دلوں کی محفل میں افسردگی پھیلائے گی۔''(30)

طنز ومزاح نے ارتقاء کے کئی منازل طئے کئے' کئی نشیب وفراز سے گذری' نئی بستیاں بسائیں' اُداس اور پژمردہ دلوں میں نئی روح پھونکی یہی وجہ ہے کہ ہر طبقہ اور مکتب فکر کے لوگ اس کے دامن میں راحت محسوس کرتے ہیں۔طبقاتی کشمکش کے علاوہ انسانی ذہنی ارتقاء' وسعت فکر' مذہبی واخلاقی اقدار' سیاسی ومعاشرتی آزار نے بھی طنز و مزاح پر اثرات مرتب کئے۔طنز ومزاح کے ارتقاء کے حوالے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

''دراصل انسانی ارتقاء نے صدیوں کے مدو جزر کے بعد کہیں جا کر ایسی فضاء تخلیق کی جس میں انفرادی آزادی کے تصور نے اپنے پاؤں مضبوط کر لیے اور فرد کے قہقہے یا تبسم میں نہ صرف گہرائی بلکہ انفرادیت کی جھلک نظر آنے لگی۔اس مزاح میں بھی پہاڑی ندی کی پرشور راگنی کی بجائے پرسکون دریا کی دھیمی لے سنائی دے رہی ہے۔آج ہمارا مزاح ان مدارج تک جا پہنچا ہے جہاں سے پلٹ کر ہم اپنی سنجیدہ زندگی پر اس بے نیازی

سے نگاہیں دوڑا سکتے ہیں۔ جس طرح کوئی بوڑھا اپنے شباب کی اُن
داستانوں پر نظریں دوڑائے جو اِک وقت اتنی سنجیدہ اور جذباتی تھیں لیکن
آج محض حماقتیں نظر آتی ہیں۔ اور جن پر اب وہ آسانی سے قہقہے لگا سکتا ہے
اس کے علاوہ آج کا مزاح ایک ایسے مقام پر جا پہنچا ہے جہاں اس نے یاس
کے گلے میں بانہیں رکھ سکتی ہے وہیں مزاح بھی یاس کو ہچکیوں میں تبدیل
ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔" (31)

طنز و مزاح کی افادیت کا بیان کرتے ہوئے نامی انصاری لکھتے ہیں۔

"انسانی جذبات میں جس طرح جوش و مسرّت، غم و غصہ، رنج والم، اور
انکار و احتجاج کی اہمیت ہے کہ ان سے انشراحِ قلب کے ساتھ ساتھ ذہن و
دل میں توانائی اور تازگی بھی پیدا ہوتی ہے اور ہم زندگی کی کشاکشوں سے
نجات کے چند لمحے حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ طنز و مزاح
اسی کے ادبی اظہار کا ایک معروف نام ہے۔" (32)

طنز و مزاح نے کئی سنگ میل عبور کئے ہیں، کئی نشیب و فراز دیکھے۔ اردو ادب کے کئی قلمکاروں نے اپنے خونِ جگر سے آبیاری اس فن کی آبیاری کی، اور پنے جوہر پاروں سے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ طنز و مزاح کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل ہوگی۔

حیدرآباد میں اُردو ادب کا فروغ انیسویں صدی کے آخری دہے میں اپنے عروج پر تھا۔شبلی نعمانی نے ''اَل'' کی اپنی تصانیف حیدرآباد میں ہی مکمل کیں۔موازنہ انیس و دبیر دراصل شبلی نعمانی کے ایک لیکچر کی توسیع شدہ تصنیف ہے جونھوں نے حیدرآباد میں دیا تھا۔سید محمد والہ مدراسی' جو نظام کالج میں فارسی کے لیکچرار تھے 1893ء میں کلام غالبؔ کی پہلی شرح ''وثوق صراحت''(1) حیدرآباد میں لکھی' اُس زمانے میں مولانا الطاف حسین حالیؔ حیدرآباد میں تشریف فرما تھے۔مولوی سجاد حسین کسمنڈویؔ نے گلبرگہ میں ''نشتر'' ناول لکھا جو اپنی تکنیک اور مواد کے لئے اردو ناول کی تاریخ میں منفرد مقام ومرتبہ کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتداء میں ''اَودھ پنچ'' حیدرآباد کے تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبول تھا۔''اَودھ پنچ'' نے اُردو طنز ومزاح سے ایک نئی شناخت بنائی تھی۔مرزا فرحت اللہ بیگ' دہلی کے اہل زبان تھے۔اَودھ پنچ کا شباب انہوں نے دیکھا بھی تھا سمجھا بھی تھا۔لیکن خود انہوں نے گلبرگہ یں تخلیق کو اپنایا تو اَودھ پنچ کے اُسلوب سے دامن بچا کر ایک علٰحدہ اور منفرد اسلوب نگارش اپنایا۔جس کی بنیاد پر انہوں نے زبان اور اُسلوب پر رکھی۔سرزمین حیدرآباد پر بیسویں صدی کی ابتداء میں اُردو طنز ومزاح لکھنے والوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ ستمبر 1883ء میں دلکُشا منزل محلّہ چڑی والاں دہلی میں پیدا ہوئے۔دہلی میں ہی تعلیم مکمل کی۔حصول علم کے بعد 1907ء میں حیدرآباد آئے اور صدر مدرس کی حیثیت سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اپنی صلاحیتوں کی بناء پر ترقی کرتے ہوئے سیشن جج کے عہدے تک پہنچے۔ان کی شادی حیدرآباد میں ہوئی۔27 اپریل 1947ء کو ان کا انتقال ہوا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن انھیں شہرت ایک مزاح نگار کے طور پر حاصل ہوئی۔پروفیسر سیدہ جعفر کی زیرنگرانی لکھے گئے مقالہ ''حیدرآباد میں طنز ومزاح کی نشونما'' میں مقالہ نگار انیسہ سلطانہ نے فرحت اللہ بیگ کو پہلا مزاحیہ نثر نگار قرار دیا ہے۔ان کا مزاح زبان اور انداز بیان کا مزاح ہے۔ان کے پاس تاریخی' سماجی اور سیاسی شعور ہے۔وہ خالص مزاح لکھتے ہیں کہیں کہیں طنز بھی ہے لیکن اس کی حیثیت جزوی

ہے۔ڈاکٹر زینت ساجدہ لکھتی ہے۔

''ان کے مزاح کا رنگ اودھ پنچ سے مختلف اور اردو کے لئے
نیا تھا۔''(33)

فرحت اللہ بیگ کا فن اُن عناصر سے ترکیب پایا ہے جو ایک کامیاب طنز و مزاح نگار کے لئے لازم ہیں' تہذیبی اقدار کا رچاؤ' سماجی مطالعہ' ادبی روایات سے ہم آہنگی اور زبان و بیان پر قابو ان کے فن کے عناصر اربعہ ہیں۔وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو بس یہی کہنا تھا۔انداز بڑا ہی شائستہ اور شستہ اس لئے تیر نشانہ پر بیٹھتا ہے۔پہلی نظر میں ہم طنز و مزاح کا احساس کرتے ہیں لیکن غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو مصنف نے بر سر عام عریاں کردیا ہے۔

نذیر احمد کی کہانی......پھول والوں کی سیر' دہلی کا یادگار مشاعرہ یا مضامین فرحت کے کسی بھی حصہ کے کسی بھی مضمون کا مطالعہ کیجئے فرحت اللہ بیگ کا اسلوب شوخی' شگفتگی' خوش مذاقی' شائستگی سے مالا مال نظر آئے گا۔

مرزا عصمت اللہ بیگ دہلی کے معزز اور علمی گھرانے میں 30 مارچ 1896ء کو پیدا ہوئے۔مرزا غالبؔ اور مومن خاں مومنؔ کے خاندان سے رشتہ داری تھی۔''بوستان خیال'' کے مترجم خواجہ امان سے نسبت تھی۔مرزا فرحت اللہ بیگ کے چچازاد بھائی تھے۔کم سنی میں ہی حیدرآباد آ گئے تھے۔دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے وابستہ رہے۔ انہیں محکمہ تعلیمات میں بھی ملازمت کرنے کا موقع ملا۔ملازمت کے سلسلے میں گلبرگہ جانے کا اتفاق ہوا۔سجاد مرزا گلبرگہ میں صدر مہتمم تعلیمات تھے۔انہوں نے عصمت کی خوب حوصلہ افزائی کی۔وہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔طنز و ظرافت کو قومی اصلاح کیلئے استعمال کیا کرتے تھے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ نے آزادی سے قبل حیدرآباد میں مزاح نگاری کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ انہوں نے اپنی سادہ اور پر اثر زبان میں مزاح کے مختلف رنگ بکھیرے جو پڑھنے والے کو عجب تازگی اور مسرت کا احساس دلاتے ہیں۔پیشہ کے اعتبار سے وہ انجینئر تھے اور دوسروں کا مضحکہ اڑانے کے بجائے خود اپنی شخصیت کو طنز کا نشانہ بناتے۔

بیسویں صدی کی ابتداء میں اردو میں طنز ومزاح کو اپنا اور فروغ دینے والوں میں دہلی کے بیگ خاندان نے اہم حصہ ادا کیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اور مرزا عصمت اللہ بیگ نے حیدرآباد کو ہی وطن ثانی بنالیا تھا اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔ ان بزرگوں کے بعد حیدرآباد کی نوجوان نسل نے اردو طنز ومزاح کے فروغ کا فرض اپنے ذمہ لے لیا اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ اس کے ارتقاء کو آگے بڑھایا۔ یہاں ایک اور حسن اتفاق کی جانب اشارہ کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ حیدرآباد میں طنز ومزاح کے ابتدائی نثر نگار کسی نہ کسی طرح گلبرگہ سے متعلق رہے ہیں۔ تمکین کاظمی کا بچپن بھی اپنے والد کے ہمراہ گلبرگہ شریف میں گذرا ہے۔

تمکین کاظمی 27 نومبر 1902ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے، ان کا اصل نام مصباح الدین تھا۔ تمکین کاظمی کے اجداد شمالی افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے تھے۔ تمکین کاظمی کے والد حضرت تجلی کو عربی فارسی اور حدیث وفقہ کا گہرا ادراک تھا۔

انہوں نے اپنے نام کے علاوہ فرضی نام بخاری، آوارہ اور فلک نما وغیرہ استعمال کئے۔ وہ بنیادی طور پر سنجیدہ نثر نگار ہیں۔ لیکن انہوں نے مزاحیہ تحریریں بھی لکھی ہیں۔ ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ''زن مرید'' رسالہ ''نظر'' لکھنؤ جولائی 1927ء میں شائع ہوا۔ ان کے مزاحیہ مجموعہ ''غنچہ وتبسم'' میں 19 مضامین ہیں۔ تمکین کاظمی کی تحریروں میں اصلاحی رجحان ہے۔ ان کی تخلیقات میں طنز ومزاح توازن لئے ہوئے ہیں۔

تمکین کاظمی دکنی ہونے پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی نثر گرچہ سادہ ہے لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس عہد میں تمام مزاح نگاروں کی تخلیقات میں بھی یہی رنگ نظر آتا ہے۔ چُبھتے ہوئے فقرے، معاشرتی اصلاح کا جذبہ، ان کے پیش نظر تھا۔

عبدالمتین صدیقی نام اور شاہد صدیقی قلمی نام تھا۔ 1911ء میں آگرہ کے ایک محلے گھٹیا اعظم خاں میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم روایتی انداز میں ہوئی یعنی عربی اور فارسی سے ان کی تعلیم کا آغاز ہوا ابتدائی تعلیم دینی تعلیم کے لئے انہیں مارلین اسلامیہ ہائی اسکول مارہرہ میں شریک کیا گیا۔ شاہد صدیقی ابھی نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے کہ ان کے بڑے بھائی نے ان کی تعلیم کے سلسلے کو ختم کرنے کی غرض سے انہیں اسکول سے نکال دیا اور گھر کے کام کاج پر توجہ دینے کا حکم دیا حالانکہ شاہد صدیقی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے چونکہ شاہد صدیقی ہر جماعت میں

امتیازی نشانات سے کامیابی حاصل کی تھی۔

شاہد صدیقی نے میٹرک میں کامیابی کے بعد آگرہ سے ہجرت اختیار کی اور غالباً 1932ء میں حیدرآباد آگئے۔انہیں یہاں کی فضاء اس قدر پسند آئی کہ وہ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔

انہوں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ملازمت کیلئے صحافت کا انتخاب کیا اور حیدرآباد سے شائع ہونے والے مختلف رسائل واخبارات سے وابستہ ہوئے انہوں نے ''الاعظم'' قاضی عبدالغفار کے اخبار ''پیام'' احمد عارف کے اخبار ''صبح دکن'' پیسہ ''نگار وطن'' کے علاوہ کئی رسالوں جیسے ''سب رس، ایوان، چراغ، صبا'' وغیرہ میں ملازمت اختیار کی۔اس کے علاوہ ایڈن اینڈ کمپنی اور عذرا پبلسٹی میں سینما کے اشتہار بھی لکھا کرتے تھے۔ملازمت اختیار کی ''صبح دکن'' میں وہ ''سرراہ'' کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔شاہد صدیقی اخبارات کے علاوہ ریڈیو سے بھی جڑے رہے۔وہ ریڈیو پر ترنم کے ساتھ غزلیں سنایا کرتے تھے جس کی بناء پر لوگ دوسرے شعراء کی بہ نسبت شاہد صدیقی کو سننا زیادہ پسند کرتے تھے۔

شاہد صدیقی نے سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ مزاحیہ شاعری بھی کی ہے۔روزنامہ شیشہ و تیشہ کالم سے بھی ان کی حس مزاح کا انداز بخوبی لگایا جاسکتا ہے انہوں نے عوامی مسائل،قومی سیاست اور بین الاقوامی مسائل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔1960 میں شاہد صدیقی کا مجموعہ کلام ''چراغ منزل'' شائع ہوا۔

بھارت چند کھنہ 22 جون 1912ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم سری نگر میں ہوئی۔انٹرمیڈیٹ جموں سے کیا اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا۔1928ء کے آس پاس وہ حیدرآباد آئے جہاں ان کے بڑے بھائی راجہ اقبال چند حکومت آصفیہ میں ڈی آئی جی کے عہدے پر فائز تھے۔راجہ اقبال چند مہاراجہ کشن پرشاد، وزیر اعظم سلطنت آصفیہ کے داماد تھے۔بھارت چند کھنہ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے تاریخ کے مضمون میں ایم اے کیا۔اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلینڈ چلے گئے۔1938ء میں حیدرآباد لوٹے اور سٹی کالج میں درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔

بھارت چند کھنہ کی مزاح نگاری کا آغاز 1944ء میں ہوا۔نیم سنجیدہ اور مزحیہ افسانوں کا ایک مجموعہ ''مسکراتے آنسو'' شائع کیا۔ان کی تخلیقات میں ٹریجڈی اور کامیڈی کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

مضمون ''حسرت'' اس کی غمازی کرتا ہے۔

بھارت چند کھنہ اردو کے ایسے مزاح نگار ہیں جنہوں نے جامعہ عثمانیہ میں تعلیم حاصل کی۔1940ء تک نثر میں مزاح لکھنے والے وہ ادیب تھے جنہوں نے حیدرآباد کو اپنا وطن بنایا تھا یا جن کی تعلیم بیرون حیدرآباد ہوئی تھی۔1918ء میں جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے بعد جس ادیب نے اردو میں مزاحیہ مضامین لکھے ان میں پہلا نام بھارت چند کھنہ کا ملتا ہے۔

سید موسیٰ کلیم یداللہی نام ہے شاعری میں کلیم تخلص استعال کرتے ہیں اور مزاحیہ تخلیقات کیلئے برق آشیانوی قلمی نام اختیار کیا ہوا ہے۔ برق آشیانوی 18 اپریل 1918ء کو سکندرآباد میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم ویسلی ہائی اسکول سکندرآباد میں ہوئی لیکن بعد میں اسلامیہ ہائی اسکول مشیرآباد سے میٹرک کامیاب کیا۔ ذریعہ تعلیم حالانکہ انگریزی تھا لیکن انہوں نے عربی فارسی اور اردو کی تعلیم بھی حاصل کی۔

برق آشیانوی نے طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کردیا تھا۔انہیں شاعری، مضمون نگاری، افسانہ نویسی اور ڈرامہ نویسی سے بھی شغف رہا۔1935ء میں ان کی پہلی تخلیق رسالہ ''حسن کار'' میں شائع ہوئی۔ یہ ایک ڈرامہ تھا جس کا عنوان ''نمبر 313'' تھا۔اس میں طنز و مزاح کا ہلکا سا امتزاج نظر آتا ہے۔انکی تخلیقات عالمگیر، ادب لطیف، ملاپ اور میزان جیسے معروف رسالوں میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ان میں شرح غالب مزاحیہ کی سات قسطیں شامل ہیں۔

خواجہ عبدالغفور 1918ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔سٹی ہائی اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور جامعہ عثمانیہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر داس، ڈاکٹر جعفری، پروفیسر سعید الدین اور پروفیسر سید محمد جیسے اساتذہ سے اکتساب کیا۔مخدومؔ، اکبر وفا قانیؔ، میکش وغیرہ آپ کے ہم عصر تھے جن کی صحبت علمی نے آپ کے ذوق کو مزید نکھارا۔1948ء میں حیدرآباد سیول سرویس کا امتحان پاس کیا۔

خواجہ عبدالغفور کو پسماندہ طبقات کے مسائل کے حل میں بڑی دلچسپی رہی۔ اسی بناء پر انہوں نے Antrhopology پر دس کتابیں لکھ ڈالیں۔اردو میں ان کی کتابیں ''قہقہہ زار''، ''شگوفہ زار''، ''گل و گلزار''، ''لالہ زار''، اور ''سمن زار'' شائع ہو چکی ہیں۔قہقہہ زار کا ہندی اور مراٹھی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

یوسف ناظم کا پورا نام سید محمد یوسف ہے۔اور ناظم تخلص۔ادبی دنیا میں یوسف ناظم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔والد کا نام محمد ایوب تھا جو جالنہ کے ایک معروف وکیل تھے۔یوسف ناظم 7نومبر 1921 (سرکاری ریکارڈ میں 1918ء درج ہے) کو جالنہ،دکن (موجودہ مہاراشٹر یا مرہٹواڑہ) میں پیدا ہوئے۔یوسف ناظم نے جالنہ ہائی اسکول سے میٹرک کامیاب کیا۔اور 1940 میں اورنگ آباد کالج سے انٹر میڈیٹ کی تکمیل کے بعد 1942ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے بی اے اور 1944ء میں جامعہ عثمانیہ سے ہی اردو میں ایم اے کی سند حاصل کی۔1944ء میں ہی ریاست حیدرآباد کے محکمہ لیبر میں مترجم کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ریاستوں کی تقسیم جدید کے بعد ریاست مہاراشٹر میں لیبر آفیسر کی حیثیت سے منتقل ہوئے۔ڈپٹی لیبر کمشنر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں،اور دسمبر 1976ء میں بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر آف لیبر،وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

یوسف ناظم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اسکول میں ہی شاعری سے کیا۔1944ء سے نثر لکھنی شروع کی اور طنز و مزاح نگاری کو اپنا میدان بنایا۔یوسف ناظم کی اب تک بائیس 22 تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔منظوم تراجم، تالیفات اور بچوں کے لئے پانچ کتابیں اس کے علاوہ ہیں۔انہوں نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ''کیف و کم'' 1962 میں ادارہ ادبیات اردو کے تحت شائع کیا۔یوسف ناظم نے اپنے مزاح کی بنیاد انسانی رویوں پر رکھی ہے ان ہی رویوں میں وہ کوئی مضحک پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں تو مزاح معرض وجود میں آتا ہے۔یوسف ناظم ایک زندہ دل خوش طبع اور شگفتہ مزاج فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کے تخلیقی استعمال پر بھی کامل قدرت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انکی طنزیہ تحریریں فنی اعتبار سے اعلیٰ معیار کی حامل ہوتی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے بعد جب حیدرآباد میں تعلیم عام ہوئی تو صنف نازک نے بھی مزاح کو اپنایا۔حیدرآباد میں نثر لکھنے والوں میں پہلا نام آصف جہاں بیگم کا ملتا ہے

آصف جہاں بیگم بلگرامی 1924ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔والدین نے آنسہ آصف جہاں بیگم نام رکھا۔ادبی دنیا میں آصف جہاں بیگم کے نام سے معروف ہوئیں۔آصف جہاں بیگم ممتاز مزاح نگار فرحت اللہ بیگ کی بھانجی ہیں۔ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''گل خنداں'' 1941 میں شائع ہوا۔

عاتق شاہ 7 نومبر 1931ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔عاتق شاہ نے ادبی زندگی کا آغاز 1945ء سے

کیا۔روزنامہ ''میزان'' حیدرآباد میں ان کی پہلی کہانی ''گرگٹ'' شائع ہوئی۔اپنے ایک مجموعہ ''انڈین کاجو'' میں وہ خود اپنے بارے میں اعلان کرتے ہیں۔

''میں بنیادی طور پر طنز نگار ہوں'' (34)

عاتق شاہ کے مضامین کے مطالعہ کے دوران قاری صرف زیرلب مسکرا کر رہ جاتا ہے اوراس مسکراہٹ میں بھی کرب ناک سنجیدگی شامل ہوتی ہے جو سماج کے مسائل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔عاتق شاہ کمرکس کر طنز کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔اور بھرپور وار کرنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔

سید رحیم الدین توفیق 16 اکتوبر 1932ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔رحیم الدین توفیق نے سنجیدہ ادب کے علاوہ مزاح میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔وقتاً فوقتاً ان کے مضامین ماہنامہ ''شگوفہ'' اور دیگر رسائل واخبارات میں شائع ہوئے۔رحیم الدین توفیق مشہور مزاح نگار ڈاکٹر حبیب ضیاء کے شوہر ہیں۔ایسا مزاح نگار جوڑا ادب میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے ''کہیں دیکھا ہے'' ان کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو 1999ء میں شائع ہوا۔

نام مسیح الدین قلمی نام مسیح انجم ہے۔ان کی پیدائش ضلع میدک کے سدی پیٹ تعلقہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ویلکٹور میں 6 اکتوبر 1933ء کو ہوئی۔ابتدائی تعلیم گاؤں کی چاوڑی میں ہوئی۔قلم و تختی سے شناسائی کے بعد مسیح انجم کو سدی پیٹھ ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا۔جہاں سے انہوں نے میٹرک کامیاب کیا اور روزگار کی تلاش میں حیدرآباد چلے آئے اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے۔

1966ء میں حیدرآباد میں شائع ہونے والے روزنامے ''ملاپ'' میں افسانہ شائع کرتے ہوئے اپنے ادبی سفر کی شروعات کی۔ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ''چھٹتی نہیں منہ سے'' روزنامہ ''رہنمائے دکن'' میں شائع ہوا۔اُس وقت رہنمائے دکن کے ادبی ایڈیشن کے مدیر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال تھے۔مسیح انجم اپنی مزاح نگاری میں ایک سنبھلی ہوئی اور سلجھی ہوئی کیفیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ انہوں نے سماج اور ملک کی سیاست کو طنز کا نشانہ بنانے سے گریز کیا ہے اوراپنی ذات کو نشانہ بناتے ہوئے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے مزاح میں رکاکت اور عامیانہ پن کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ان کا مزاح شائستہ اور مہذب ہوتا ہے۔

نریندر لوتھر 1933ء میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلق سرزمین پنجاب سے ہے۔حیدرآباد ان کا وطن ثانی ہے لیکن آج گونا گوں خصوصیات اور وجوہات کی بنا ان کا شمار حیدرآباد کے چنندہ مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء یکم نومبر 1935ء میں حیدرآباد کے ایک معزز علمی خانوادہ میں پیدا ہوئیں۔آپ کے والد مرزا ضیا الدین بیگ کا سلسلہ نسب حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی سے ملتا ہے جو بیدر کی سرزمین میں آسودہ خاک ہیں اور جن کا مزار آج بھی مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

حبیب ضیاء کی ابتدائی تعلیم نامپلی گرلز ہائی اسکول حیدرآباد سے ہوئی۔انٹرمیڈیٹ 1954ء اور بی اے یونیورسٹی کالج فار ویمن عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے 1957ء میں اور ایم اے (اردو) 1959 میں آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے کیا۔1966ء میں شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی سے ''کشن پرشاد شاد کی علمی و ادبی خدمات'' کے موضوع پر پروفیسر حفیظ قتیل کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔ ہندی آتما 1976ء اور وشارد 1977ء میں کامیاب کیا۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے 1967ء سے 1984ء تک اُردو اورینٹل کالج، حیدرآباد میں بحیثیت لکچرر خدمات انجام دیں۔1984ء میں ان کا تقرر بحیثیت ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی میں ہوا۔انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کالج فار ویمن کوٹھی حیدرآباد میں بھی خدمات انجام دیں۔ بعد میں وہ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئیں اور صدر شعبہ بھی بنیں، اور وہیں سے وظیفہ حسن پر سبکدوش ہوئیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء کی اب تک سات تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔''اُنیس بیس''، ''گویم مشکل'' اور ''جو مژگاں اٹھائیے'' طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء کی تخلیقات کی خصوصیت زبان اور بے ساختگی ہے وہ لفظ ڈھونڈ کر جملے نہیں بناتے بلکہ ان کے پاس الفاظ کا ایک ایسا خزانہ ہے کہ وہ لفظ کو جملوں میں نگینے کی طرح جڑ دیتی ہیں۔اپنے فطری لگاؤ کے باعث ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اس ذمہ دارانہ اور مشکل صنف ادب کو نبھایا ہے۔اسی لئے ان کا طنز و مزاح بڑا لطیف اور سبک ہے۔ جسے پڑھ کر ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آ جاتا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے 15 جولائی 1936 کو ضلع گلبرگہ کے تعلقہ چنچولی میں آنکھیں کھولیں۔مجتبیٰ حسین کے دادا محمد حسین ریاست حیدرآباد کی تحصیل عثمان آباد میں بحیثیت اہلکار برسرکار تھے۔محمد حسین کے دو بیٹے تھے۔احمد حسین اور محمد اسحٰق۔احمد حسین بچپن ہی سے ذہین واقع ہوئے تھے۔ملازمت کے وجہ سے ان کا زیادہ عرصہ گلبرگہ میں گذرا۔انھیں دس اولادیں ہوئیں' نولڑکے اور ایک لڑکی۔ان میں محبوب حسین جگرؔ' ابراہیم جلیسؔ اور مجتبیٰ حسین نے اردو ادب وصحافت میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

مجتبیٰ حسین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی بعد ازاں سیدھے چوتھی جماعت میں گلبرگہ کے مدرسہ تحتانیہ آصف گنج میں داخل کردیئے گئے۔1953 میں انھوں نے گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا۔اور گریجویشن کی تکمیل کے لئے حیدرآباد کا رخ کیا۔1956 میں عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی۔31 جولائی 1962 کو جب روزنامہ سیاست کے مشہور کالم نگار شاہد صدیقی کا انتقال ہوا تو محبوب حسین جگر کے مشورے پر روزنامہ ''سیاست'' سے جڑ گئے اور ''کوہ پیا'' کے فرضی نام سے کالم نگاری کرنے لگے۔مجتبیٰ حسین نے اپنے اصلی نام سے پہلا مزاحیہ مضمون ''ہم طرفدار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں!'' 1964 میں لکھا۔یہ مضمون ماہنامہ ''صبا'' میں شائع ہوا۔حکومت ہند نے جب اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لئے گجرال کمیٹی تشکیل دی تو انہیں اس کمیٹی کے شعبہ تحقیق میں کام کرنے کے لئے مدعو کیا گیا۔

''تکلف برطرف'' مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو فروری 1968 میں شائع ہوا۔اس میں 13 تیرہ مضامین اور ایک رپوتاژ شامل ہے۔مجتبیٰ حسین کی تربیت میں ان کے والد کا اہم رول رہا۔انھوں نے ان کی تعلیم پر خاص توجہ دی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ ان کے بڑے بھائی محبوب حسین جگرؔ نے ان کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا۔سرزمین گلبرگہ میں اٹھنے والا یہ وہ تخلیق کار ہے جس نے اپنے مزاحیہ مضامین' خاکوں کے ذریعہ عالمی شہرت حاصل کی ہے۔غالباً اسی بناء پر گلبرگہ یونیورسٹی کے ارباب مجاز نے انھیں اعزازی ڈاکٹریٹ سے سرفراز کیا ہے۔

ڈاکٹر لئیق صلاح 1938ء میں صلاح بن شمشیر یار جنگ کے گھر پیدا ہوئیں۔ان کے اجداد کا تعلق یمن کے ایک معروف عربی خاندان ''القعیطی'' سے تھا۔انہوں نے گریجویشن عثمانیہ یونیورسٹی اور ایم اے' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ڈاکٹر لئیق صلاح نے ''میر شمس الدین فیض حیات اور کارنامے'' کے موضوع پر ایم فل اور ''ارسطو

جاہ کی علمی وادبی خدمات'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے مقالے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی نگرانی میں تحریر کئے۔لئیق صلاح کی ادبی زندگی کا آغاز مزاح نگاری سے ہوا ہے۔ان کے اکثر مزاحیہ مضامین زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان رسالہ ''شگوفہ'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بعدازاں میں یہ مضامین ''سنی سنائی'' کے نام سے 1981ء میں شائع ہوئے۔تمکنت، وقار اور شائستگی لئیق صلاح کی شخصیت کا حصہ ہے اور یہی خوبیاں ان کی تحریریں میں اُمڈ آئی ہیں ان کا مزاح بہت ہی شائستہ بلکہ صرف مسکرانے کے لائق ہوتا ہے۔

فاطمہ تاج 29 اکتوبر 1948ء کو حیدرآباد کے محلّہ تالاب کٹہ میر جملہ میں پیدا ہوئیں۔کم عمری میں ہی شاعری کرنے لگیں تھیں۔نثر میں طبع آزمائی کرتی ہیں۔مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے ''دلاسا'' اور ''من مانی'' منظر عام پر آچکے ہیں۔فاطمہ تاج کی تخلیقات میں گہرائی کے ساتھ ساتھ زبان کی چاشنی بھی نظر آتی ہے۔

پرویز یداللہ مہدی 21 جون 1943ء کو فرقہ مہدیہ کے ایک سادات گھرانے میں پیدا ہوئے میٹرک تک تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ان کا پیدائشی نام سید یداللہ مہدی حسینی ہے۔ادبی دنیا میں پرویز یداللہ مہدی کے نام سے معروف ہوئے۔پرویز نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔لیکن مختلف راہوں سے ہوتے ہوئے مزاحیہ نثر نگاری کی طرف آ پہنچے۔ان کے اندر کا شاعر ان کے مضامین میں بھی نظر آجاتا ہے۔''چھیڑ چھاڑ'' ان کی پہلی تصنیف ہے جو 1974 میں شائع ہوئی۔

15 فروری 1952ء کو بیگم بازار محلّہ، حیدرآباد دکن میں سید منجو قمر ممتاز ڈرامہ نویس وادیب کے گھر سید ممتاز مہدی کا جنم ہوا۔گھر کی فضاء ادبی تھی ممتاز مہدی کو بچپن ہی سے ادبی ماحول میسر رہا۔گورنمنٹ سٹی کالج سے 1975ء میں انہوں نے بی کام میں کامیابی حاصل کی۔1976 میں شعبہ اردو، حیدرآباد ایوننگ کالج بشیر باغ میں داخلہ لیا اور 1978 میں امتیازی نشانات کے ساتھ ایم اے کامیاب کیا۔ممتاز مہدی کی تحریریں دلچسپ شگفتہ اور بذلہ سنجی لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ان میں مزاح کی صلاحیت قدرتی ہے۔موضوعات بے حد ہلکے پھلکے اور انسانی افعال پر مبنی ہوتے ہیں جیسے رونا، بیٹھنا، کھڑا ہونا یا بھاگنا وغیرہ۔یہ ایک لفظی موضوعات ہیں جن کو پھیلانا اور اس پر مزاح لکھنا بے حد مشکل کام ہے۔لیکن ممتاز مہدی اس کام میں بڑے ماہر ہیں۔ممتاز مہدی ہمارے ان مزاح نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے خاموشی کے ساتھ طنز ومزاح کی خدمت کی ہے اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہتے ہیں۔شائد یہی وجہ ہے کہ

میدان ظرافت میں وہ کبھی کبھی اکیلے کھڑے نظر آتے ہیں۔

سید عباس متقی، 17 جنوری 1953ء کو حیدرآباد کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا شوق تھا چنانچہ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے پہلے اردو میں ایم اے کیا بعد ازاں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

ڈاکٹر سید عباس متقی کی اب تک 9 تصنیفات منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان میں سے ''دکھتی رگیں''، ''چھٹی انگلی''، ''میری بلا سے''، ''ڈرتا ہوں آئینہ سے'' اور ''لگے ہاتھوں'' مزاحیہ تصانیف ہیں۔ ڈاکٹر سید عباس متقی روزمرہ پیش آنے والے واقعات و حادثات کو مضحک انداز میں پیش کرتے ہیں اور ایسے چست جملے اور لفظیات کا استعمال کرتے ہیں کہ قاری خود بخود مسکرانے لگتا ہے اور دھیرے دھیرے یہ مسکراہٹ قہقہے کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

عابد معز کا پیدائشی نام سید خواجہ معز الدین ہے۔ ادبی دنیا میں عابد معز کے نام سے معروف ہیں۔ وہ 25 اپریل 1955ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد 1979ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج حیدرآباد سے ایم بی بی ایس 1985ء میں تغذیہ اور استحصالی امراض میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ چند برس حیدرآباد میں سیول اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1982ء میں سعودی عرب روانہ ہوئے جہاں وہ منسٹر آف ہیلتھ میں خدمات انجام دے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

عابد معز کے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ 1982ء میں ماہنامہ ''شگوفہ'' سے شروع ہوا۔ ان کے مضامین ہندو پاک کے رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد کے علاوہ ماہنامہ ''آج کل''، نئی دہلی، ''کتاب نما'' نئی دہلی، ''رابطہ''، ''افکار'' لاہور، ''چہارسو'' دہلی میں باقاعدگی سے چھپتے رہتے ہیں۔ ملک و بیرون ملک کے مختلف ادبی اجتماعات میں مضامین سنا چکے ہیں۔ زندہ دلان حیدرآباد سے وابستہ ہیں۔ جنوری 1992ء سے ماہنامہ ''شگوفہ'' کے اوورسیز ایڈیٹر کی حیثیت سے ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔

عابد معز کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''واہ حیدرآباد'' کے نام سے جنوری 1994 میں شائع ہوا۔ عابد معز کے مضامین کا دوسرا مجموعہ 1995ء میں ''سگ گزیدہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ عابد معز اپنی ظرافت نگاری کے ذریعہ قاری کو جھنجھوڑنے پر نہیں بلکہ چٹکیاں لینے پر یقین رکھتے ہیں۔ معمولی واقعات کو وہ منتخب کرتے ہیں اور اس کے مضحک

پہلوؤں کو بڑی عمدگی سے مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر دہوں میں پیدا ہونے والے تین اہم مزاح نگاروں میں سید عبدالکریم نوؔر، مرزا فرحت اللہ بیگ، اور عظمت اللہ خاں شامل ہیں۔ان میں نور شاعر اور باقی دو مزاح نگار نثر سے تعلق رکھتے ہیں۔

عبدالکریم نوؔر حیدرآباد میں پیدا ہوئے ان کا سنہ پیدائش 1292ھ ہے۔جو عیسوی تقویم کے مطابق 1871ء کے قریب قرار پاتا ہے۔نور کی تخلیقات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کل جو سماجی مسائل ہمارے معاشرے کا ایک جز بنے ہوئے تھے وہ ہنوز آج بھی موجود ہیں۔

دکنی شعراء کے تذکرے میں رحیم صائب میاںؔ کے ذکر سے صرف نظر کرکے آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔رحیم صائب میاںؔ کا کوئی تحریری کلام دستیاب نہیں ہوسکا جس کی بنیاد پر ان کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کیا جاسکے لیکن انہیں جدید دکنی شاعری کی خشتِ اول ضرور کہا جاسکتا ہے۔

عبدالرحیم نام اور رحیم صائب میاںؔ تخلص تھا والد کا نام محمد حفیظ الدین تھا۔وہ نہایت ذہین اور حاضر دماغ انسان تھے ان کی طبیعت میں بلا کی شگفتگی وشوخی پائی جاتی تھی۔ابتداء میں عام اردو میں سنجیدہ ومزاحیہ کلام موزوں کیا کرتے تھے طبیعت میں شوخی وشگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔سنجیدہ شاعری کے پڑاؤ پر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے اور یکا یک عوام الناس کی زبان یعنی دکنی میں شعر کہنا شروع کیا دوست احباب کے سلیس اردو کی بہ نسبت دہقانی اور دکنی صوتی شاعری کو زیادہ پسند کیا تو پھر وہ اسی زبان میں شعر کہنے لگے۔انہوں نے کسی سے کسب واستفادہ نہیں کیا۔رحیم صائب میاں فی البدیہہ شاعری کیا کرتے تھے۔اسی لئے بھی ان کا کلام محفوظ نہ رہ سکا اور جو کلام تحریری حالت میں تھا وہ پولیس ایکشن کے بعد کے حالات سے دلبرداشتہ ہوکر خود اپنے ہاتھوں کنویں میں پھینک دیا۔

سید غلام علی نام، تخلص، صائب اور علی صائبؔ اور قلمی نام علی صائب میاںؔ تھا۔ادب کی دنیا میں اسی نام سے معروف ہوئے۔سید غلام علی 1906ء میں سید خواجہ محی الدین اور سیدن بی صاحبہ کے گھر حیدرآباد کے محلّہ ترپ بازار میں پیدا ہوئے۔آپ کے اجداد آصف جاہ اول کے عہد میں حیدرآباد آئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔خاندانی نسبت سے آپ نجیب الطرفین تھے۔آپ کا سلسلہ نسب حضرت شیخ غوث اعظم دستگیرؒ سے ملتا ہے۔

سید غلام علی (علی صائب میاں) کی ابتدائی تعلیم و تربیت اشرف المدارس واقع ٹرپ بازار میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مکمل ہونے کے بعد چادر گھاٹ ہائی اسکول میں داخل کر دیے گئے۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول سے میٹرک میں کامیابی کے بعد انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی۔ علی صائب میاں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں زمانہ طالب علمی سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ طنزیہ و مزاحیہ کلام پر مشتمل ایک مجموعہ ''گھوکرو کے کانٹے'' 1968ء میں شائع ہوا۔ علی صائب میاں کے کلام میں زندگی کی حقیقتیں، تفکر کا عنصر، ادبی شگفتگی جیسے عناصر موجود ہیں۔

مرزا شکور بیگ حیدرآباد کے محلّہ فتح دروازہ میں 15 ستمبر 1907ء کو مرزا غفور بیگ اور فیاضی بیگم کے گھر پیدا ہوئے۔ شکور بیگ کے آباواجداد مغل تھے، زمانے قدیم میں دلی سے حیدرآباد آئے اور یہیں بس گئے۔ مرزا شکور بیگ بچپن سے ہی کھیل کود کے شوقین اور شریر واقع ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم دھرماونت اسکول حیدرآباد میں ہوئی۔ ساتویں کا امتحان شاہ گنج مڈل اسکول اور میٹرک سٹی ہائی اسکول حیدرآباد سے کامیاب کیا۔ 1930 میں گریجویشن کی تکمیل کی اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ایف اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ہی 1935ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی اور وکالت کرنے ورنگل چلے گئے۔

مرزا شکور بیگ کے دو مزاحیہ مجموعے ''ترانے'' اور ''سدا بہار'' شائع ہو چکے ہیں۔ مرزا شکور بیگ نے زمانہ طالب علمی میں ہی شاعری کا آغاز کیا۔ ہاسٹل میں قیام کے دوران انہیں شاعری کا چسکہ لگا شرارت ان کی مزاج کا خاصہ تھا اسی شریر طبیعت نے ظریفانہ شاعری کی طرف راغب کیا۔ ہاسٹل کے واقعات کو مزاحیہ انداز میں نظم کرنے لگے۔

نذیر احمد نام، تخلص دہقانی اور قلمی نام نذیر دہقانی تھا۔ وہ 1908ء میں نلگنڈہ کے ایک ضلع جنگاؤں میں شیخ احمد صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بھونگیر مڈل اسکول میں ہوئی۔ رحیم صائب میاں نے انیسویں صدی کے اوائل میں دیہاتی زبان کو اپنا کر اسی میں شاعری کرنے کی بنا ڈالی تھی۔ ان کے تتبع میں دیہاتی اور دہقانی زبان میں شاعری کرنا ایک جراءت مندانہ اقدام تھا۔ نذیر دہقانی نے رحیم صائب میاں کو سننے کے بعد ہی شعر کہنا شروع کیا۔ چنانچہ ایک انٹرویو میں انھوں نے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ رحیم صائب میاں سے متاثر ہو کر دہقانی زبان میں شاعری شروع کی تھی۔ ***

*** حیدرآباد میں طنز و مزاح لکھنے والے ہر دو تخلیق کار نثر میں فرحت اللہ بیگ اور نظم میں نذیر دہقانی، حسن اتفاق کہ 1908ء میں پیدا ہوئے اور دونوں ہی نے بڑی صالح بنیادوں پر زبان کو وسیلہ بنا کر مزاح تخلیق کیا ہے۔ (میر حشمت علی)

نذیر دہقانی ایک عوامی شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی پیدائش گاؤں میں ہوئی۔ان کی ابتدائی تعلیم بھی گاؤں میں ہی ہوئی اور انھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گاؤں ہی میں گذارا تھا۔شاید اسی لیے انھوں نے ایک ایسی زبان کو اپنے جذبات کا وسیلہء اظہار بنایا جو دیہاتوں' قصبوں' میلوں اور ٹھیلوں میں بولی جاتی ہے۔عوامی زبان ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

سلیمان خطیبؔ 1919ء کو سابق ریاست حیدرآباد کے ضلع گلبرگہ کے ایک گاؤں معین آباد (چڑگوپہ) میں پیدا ہوئے۔ چھ ماہ کی عمر میں ہی ماں باپ کے سایہ سے محروم ہوگئے۔ کچھ عرصہ تک ان کے چچا نے ان کی پرورش کی پھر وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ خطیبؔ کو بچپن سے ہی شاعری سے شغف رہا۔ خطیبؔ کو ڈھولک کے گیت بہت پسند ہیں چار پانچ سال تک انہوں نے اسے جمع کیا ان کے مجموعے میں بھی کئی ڈھولک کے گیت شامل ہیں۔ان کی شاعری میں مزاح سے زیادہ طنز کا عنصر غالب رہتا ہے۔ خطیبؔ نے دکنی زبان کو وسیلہ اظہار بنایا اور بقول رشید شکیب سلیمان خطیبؔ کو حیدرآباد کے چار میناروں میں سے ایک مینار مانا جاتا ہے۔ان کا مجموعہ ''کیوڑے کا بن'' پہلی بار ڈسمبر 1975ء میں گلبرگہ میں منعقدہ ''جشنِ سلیمان خطیب'' کے موقع پر شائع ہوا۔حالانکہ اس سے قبل بھی ایک مختصر مجموعہ ''دھنک'' نام سے بھی شائع ہوا تھا۔اس مجموعہ میں کلام کو مختلف عنوانات کے ذریعہ درج کیا گیا ہے جیسے گھر گھر کی بات (عوامی مسائل) محبت کی چھاؤں (رومانی شاعری)، پھر ڈھولک اڑی (لوک گیت اور ڈھولک کے گیت)، پھولاں مرجھا گئے (شخصی مرثیے) وغیرہ۔

دکنی شاعری کی اہم خصوصیت یہ رہی ہے کہ اپنی زمین سے اس کا رشتہ برقرار رہتا ہے۔ دکن کے شعراء مواد کی تلاش میں علائم و تلمیحات کی تلاش میں ایران و توران کی طرف نہیں دیکھتے۔ خطیبؔ نے اسی خصوصیت کو برقرار رکھا ہے۔ انہوں نے یہاں کی سرزمین یہاں کے موسم بہار و خزاں، یہاں کی تاریخ اور اساطیری و دیو مالائی روایتوں سے مواد، علائم و تلمیحات اور اپنی شاعری کا مواد اکٹھا کیا ہے اور اس مواد کو فنکارانہ انداز میں اس طرح سے پیش کیا ہے کہ اس میں ایک جانب نشتریت ہے تو دوسری جانب مزاح بھی موجود ہے۔

اعجاز حسین کھٹاؔ 22 مارچ 1922ء کو شاد نگر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد کے ضلع

نظام آباد میں ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی ملازمت محکمہ مال اور محکمہ رسد میں انجام دی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ادبی ذوق رکھنے والے اس نوجوان کو دیہی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اعجاز حسین کھٹا نے دکنی اور دہقانی زبان کو اپنے شاعری کا وسیلہ بنایا اور دکنی شاعری کے اُفق پر وہ نذیر دہقانی، سلیمان خطیب اور سرور ڈنڈا کی طرح روشن ستارے کی مانند جگمگار ہے ہیں۔ اعجاز حسین کھٹا کم گو شاعر تھے ان کا شعری ذخیرہ بہت کم ہے لیکن انہوں نے اپنے کلام میں معاشرہ کی بھرپور عکاسی کی ہے اور جو بھی ان کا شعری سرمایہ ہے وہ ان کی شہرت دوام کیلئے کافی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد دکن کے حالات کچھ اچھے نہیں رہے۔ سیاسی اتھل پتھل کے بیچ اعجاز حسین کھٹآ نے پاکستان ہجرت کی۔ وطن مالوف سے ہجرت کر جانے کے بعد ان کا دل اپنے وطن کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہا۔ ان کو سقوط حیدرآباد کا غم اور والئی دکن آصف سابع کی مجبوریاں یاد آتی تھیں اور وہ قطب شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قطب شاہ دلا سادے عثمان کو
زخم کھائے گھبرائے سو، جان کو
وہ پوچھے ہے کیسا ہے میرا دکن
وہ میرا وطن

غلام سرور خاں نام اور تخلص ڈنڈآ تھا۔ ادبی دنیا میں سرور ڈنڈآ کے نام سے معروف ہوئے۔ غلام سرور خاں (سرور ڈنڈآ) 1925 کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم چادرگھاٹ ہائی اسکول اور انوار العلوم ہائی اسکول میں ہوئی۔ کالج آف فائن آرٹس سے کمرشیل آرٹس میں ڈپلوما کیا۔ شاعری اور مصوری دونوں کا تعلق فنون لطیفہ سے ہے۔ ایک عرصہ تک پینٹنگ ان کا ذریعہ معاش رہا۔ سرور ڈنڈآ کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہیکہ انہوں نے عوام کو پہلی بار لوک گیتوں کے مختلف سانچوں ''بورّا'' سے روشناس کروایا۔ سرور ڈنڈا کے یہاں اپنے پیش روشعراء کی طرح متنوع موضوعات ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے موضوعات میں بین الاقوامی سیاست پر بھی طنز کیا ہے۔ اور حملہ آور چین کو بھی للکارا ہے۔ اشارے کنایہ میں انہوں نے کانگریس حکومت پر بھی طنز کے تیر چلائے ہیں۔ ان کے بعض اشعار سیاست دانوں کی مفاد پرستی اور موقع پرستی کی قلعی کھولتے ہیں۔

غوث خواہ مخواہ 17 اپریل 1930 کو حیدرآباد کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام

غوث محی الدین احمد ہے اور تخلص خواہ مخواہ۔ادبی دنیا میں غوث خواہ مخواہ کے قلمی نام سے معروف ہیں۔ان کے تین شعری مجموعے ''بہ فرضِ محال'' 1992 ''حرفِ مکرر 1998'' اور'' کاغذ کے تیشے'' 2004 منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کی مزاحیہ اور طنزیہ شاعری کی ابتدا1954 سے ہوئی۔خواہ مخواہ نے شاعری میں کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ان کا کہنا ہے کہ ظرافت دو دھاری تلوار ہے۔اور اِس فن کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کرنا پڑتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ سنجیدہ شعر کہنا آسان ہے لیکن مزاحیہ شعر کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

محمد حمایت اللہ کا تعلق حیدرآباد دکن کے ایک باعزت فوجی گھرانے سے ہے۔محمد حمایت اللہ نے محمد غلام مرتضیٰ اور افضل النساء بیگم کے گھر 25 ڈسمبر 1932ء کو سکنڈ لانسر فوجی ایریا' حیدرآباد میں آنکھ کھولی۔حمایت اللہ کی ابتدائی تعلیم سینٹ پیٹرک ہائی اسکول سکندرآباد میں ہوئی۔انھوں نے سینٹ پیٹرک اسکول کے بعد آل سینٹس گرامر اسکول عابڈس میں داخلہ لیا۔سینئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اپنے تعلیمی سفر کو خیر باد کہہ دیا۔حمایت اللہ سچے' مخلص' ہمدرد اور محبت کرنے والے زندہ دل انسان کا نام ہے۔ان کی نس نس میں بزلہ سنجی' لطافت اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔بحیثیت انسان اور بحیثیت شاعر حمایت اللہ کے پاس فطری پن نظر آتا ہے۔حمایت اللہ بچپن سے ہی ظریف اور مزاحیہ طبیعت کے مالک رہے ہیں۔حمایت اللہ نے اپنی شاعری کی ابتداء اس دور میں کی جب حیدرآباد میں مسلمان پولیس ایکشن کے بعد سہم سے گئے تھے۔پولیس ایکشن کے دوران پیش آنے والے واقعات نے ان کے دلوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ایسے نازک دور میں PDF پیوپلز ڈیموکریٹک فرنٹ قائم ہوا۔حمایت اللہ اور سرورڈنڈا اس پارٹی کی کلچرل ونگ میں شامل ہوگئے۔کلچرل ونگ کی جانب سے بھوئی گوڑہ (آغاپورہ) میں ایک عوامی پروگرام (بھاگواتم) منعقد کیا جاتا تھا۔جس میں شعروشاعری ہوتی تھی۔اور خاکے پیش کیے جاتے تھے اور سماجی اور سیاسی حالات پر نظمیں پیش کی جاتی تھیں۔حمایت اللہ نے بھاگواتم پروگرام ہی کے ذریعہ اپنی شاعری کی ابتدا کی۔ان کی پہلی نظم 'زولسانی' تھی۔

تندانا تانا تانا واہ واہ رے تلنگانہ
منشی پوچھے منشی ایدی ایم رارے ماٹا

حمایت اللہ کو ان کی دکنی شاعری نے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔حمایت اللہ نے سنجیدہ شاعری نہیں کی'

ہمیشہ اپنے خیالات اور موضوعات کو مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انسان دوستی تو ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔

مرزا مصطفیٰ علی بیگ 11 اکٹوبر 1936ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے 1958ء میں بی ایس سی کرنے کے بعد سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوگئے۔ ابتداء ہی سے طبیعت کا میلان طنز و مزاح کی طرف رہا۔ زندہ دلان حیدرآباد اور فائن آرٹس اکیڈیمی سے وابستگی نے اس ذوق میں کمال پیدا کیا۔ انہوں نے شاعری میں اپنا ایک منفرد اسلوب اختیار کیا۔ ان کی شاعری جس کو ''اینگلو اردو شاعری'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ''آئی ایم سوری'' منظر عام پر آچکا ہے۔ ایک اور مجموعہ ''آئی ڈونٹ نو'' زیر اشاعت ہے۔

نام معین الدین خاں، گلی تخلص تھا۔ چونکہ سکونت نلگنڈہ کی تھی۔ اسی مناسبت سے گلی نلگنڈوی کے نام سے موسوم ہوئے۔ ان کے دادا عبدالرحیم خاں محکمہ پولیس میں کانسٹبل کے عہدہ پر فائز تھے۔ عبدالرحیم خاں کے بڑے بیٹے منور خاں، تعلیم سے فراغت کے بعد محکمہ بلدیہ میں UDC کے عہدے پر مامور ہوئے۔ منور خاں کی شادی غوثیہ بیگم سے ہوئی۔ جن سے تین اولادیں ہوئیں۔ (1) خواجہ معین الدین خاں (گلی نلگنڈوی) (2) زہرہ بانو (3) عبدالباری خاں۔

گلی نلگنڈوی نے جب دہقانی کا کلام سنا تو خود بھی دہقانی زبان میں شعر موزوں کرنا شروع کردیا۔ جب انہوں نے سرور ڈنڈا کا کلام سنا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے آپ کو ڈنڈا کا تابع بنالیا اور اپنا تخلص امر سے تبدیل کرتے ہوئے ڈنڈا کی مناسبت سے گلی رکھ لیا۔

طالب خوندمیری کا اصلی نام سید محمود ہے۔ تخلص طالب اور قلمی نام طالب خوندمیری ہے۔ طالب خوندمیری 14 فروری 1940ء کو کندیگل میں پیدا ہوئے۔ وہ زندہ دلان حیدرآباد، حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے شاعری کی ابتداء سنجیدہ شاعری سے کی لیکن دھیرے دھیرے وہ مزاحیہ شاعری کی طرف راغب ہوتے چلے گئے۔ ان کی شاعری عام آدمی کے مسائل اور عصری حسیت سے تعبیر ہے۔ ان کی شاعری مقصدیت لئے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ مزاح سے اصلاح معاشرہ کا کام لینا چاہتے ہیں۔ معاشرے میں پائی جانے والی بے اعتدالیوں، ناہمواریوں کو دور کرنے کیلئے وہ اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری سے کام لیتے ہیں۔ ''سخن

کے پردے میں'' شعری مجموعہ شائع ہوکر مقبول ہوا ہے۔طالب خوندمیری نے غالب کو موضوع بنا کر بڑی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ان کی نظموں کا اختتام بڑا ہی معنیٰ خیز اور فلسفیانہ ہوتا ہے جو ان کی انفرادیت ہے۔

محمد فریدالدین نام اور انجم تخلص اور قلمی نام فریدالدین انجم اختیار کیا اور اسی نام سے معروف ہوئے۔محمد فرید الدین 10 اکتوبر 1940ء کو محمد شریف الدین اور زیب النساء کے گھر عادل آباد میں پیدا ہوئے۔فرید انجم کا شمار دکنی طنز ومزاح کے مقبول عام شعرا میں ہوتا ہے۔فرید انجم نے سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری کے علاوہ ڈرامے اور مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کی بذلہ سنجی اور حسن مزاح نے انہیں مزاحیہ شاعری کی طرف متوجہ کیا۔

سید محمد علی خوندمیری بیجوؔد کے والد کا نام سید عبدالکریم ہے۔وہ 16 جون 1949 کو حیدرآباد کے قدیم محلّہ چنچلگوڑہ میں پیدا ہوئے۔وہ فائن آرٹس اکیڈیمی سے عرصہ داز سے وابستہ ہیں اور ڈراموں میں حصہ لیتے ہیں۔سید محمد علی خوندمیری بیجوؔد کے علاوہ ان کے دو اور بھائی طالب خوندمیری اور اشرف خوندمیری نے اردو ادب میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

رؤف رحیمؔ 10 جون 1954 کو دبستان صفی کے مشہور شاعر شمس الدین تاباںؔ کے گھر پیدا ہوئے۔شاعری کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا۔ان کا کلام سنجیدہ' مزاحیہ اور نعتیہ شاعری پر محیط ہے۔

حیدرآباد' بقول مجتبیٰ حسین طنز ومزاحیہ ادب کا اہم مرکز بن گیا ہے۔گذشتہ صدی میں (2000 - 1900) میں اردو میں لکھنے جانے والے طنز ومزاح کے ارتقاء جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ سرزمین حیدرآباد پر نثر ونظم میں تقریباً ایک ساتھ مزاحیہ ادب تخلیق ہونے لگا۔جب ہم مجموعی اعتبار سے اس ذخیرہ پر نظر ڈالتے ہیں تو تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ یہاں نثر میں لکھنے والے ادیب زیادہ ہیں۔یہ خوش آئند بات بھی ہے کہ معاشرہ کی اصلاح کے لئے نثر کا انتخاب تخلیق کاروں نے کیا ہے۔یہ اس مناسبت سے بھی قابل تحسین ہے کہ شاعری کی عام روایت کے خلاف نثر میں زیادہ اور پائیدار خدمات انجام دی گئیں۔

نثر میں لکھے جانے والے مزاحیہ ادب کا جائزہ لیتے ہوئے خواتین کی خدمات کو ایک علٰحدہ باب میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔طنز ومزاح لکھنے والی بیشتر خواتین نے نثر کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا ہے۔خواتین شعرا میں صرف چند نام ملتے ہیں جنھوں نے مزاح کو اپنایا ہے' ان تمام کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد میں مزاح لکھنے والی خواتین میں پہلا نام جہاں بانوں نقوی کا ملتا ہے۔ جہاں بانو نقوی کی پیدائش حیدرآباد کے ایک معزز تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔ افسانوں کا مجموعہ ''رفتارخیال'' شائع ہوا جس میں سترہ افسانے شامل ہیں۔ خطوط نگاری میں بھی انہوں نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ رفتارخیال کے علاوہ ان کی تصانیف میں ''بربط ناہید''، ''محمد حسین آزاد'' اور ''فتراک'' قابل ذکر ہیں۔ ''فتراک'' میں مزاحیہ مضامین اور انشائیے شامل ہے۔ ان کے مطالعہ سے ان کی زبان کی شستگی، روانی اور دلکشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ طرز تحریر دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ کی پیدائش رائچور کے ایک سادات گھرانے میں ہوئی۔ ایم اے کی طالب علمی کے دور میں کہانیوں کا مجموعہ ''جل ترنگ'' منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ مزاح نگاری کے میدان میں بھی شہرت رکھتی ہیں۔ طنز و مزاح سے بھرپور ان کے مضامین اخبار سیاست میں شائع ہوئے اور کئی مضامین آل انڈیا ریڈیو سے نشر بھی کیئے گئے۔

جیلانی بانو مہذب اور علم دوست گھرانے میں 1935ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ جیلانی بانو نے 1954ء سے مختصر کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ اب تک ان کی بارہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ جن میں دو ناول، کہانیوں کے سات مجموعے، دو ناولٹ اور ملیالم زبان میں لکھی گئی کہانیوں کا ہندی ترجمہ شامل ہے۔ انھوں نے کچھ دنوں تک روزنامہ سیاست کا مزاحیہ کالم ''شیشہ و تیشہ'' بھی تحریر کیا۔ ان کے کئی انشائیے اور مزاحیہ مضامین ماہنامہ ''شگوفہ'' اور روزنامہ ''سیاست'' میں شائع ہوئے۔

رفیعہ منظور الامین حیدرآباد کے ایک معزز اور علمی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز 1970 کے آس پاس شروع ہوتا ہے۔ ان کی پہلی کہانی ''بختاور'' رسالہ ''شمع'' میں شائع ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے قومی سطح پر ان کی شناخت قائم ہوئی۔ اس کے بعد ان کی تخلیقات مختلف اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہے۔ اب تک ان کی کہانیوں کے دو مجموعے ''دستک سی در دل پر'' اور ''آہنگ'' شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ تین ناول ''سارے جہاں کا درد''، ''عالم پناہ''، ''یہ راستے'' شائع ہوچکے ہیں۔ انھوں نے مزاحیہ مضامین اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے ناولوں کے بعض کرداروں میں بھی مزاح کا عنصر پایا جاتا ہے۔

حیدرآباد کی مزاح نگار خواتین میں فاطمہ عالم علی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ فاطمہ عالم علی مراد آباد میں قاضی

محمد عبدالغفار اورافضال بیگم (بیگماں) کے گھر 16 نومبر 1923ء کو پیدا ہوئیں۔ان کے مزاحیہ مضامین، انشائیوں اور خاکوں پرمشتمل مجموعہ ''یادش بخیر'' منصۂ شہود پر آچکا ہے۔

رشید موسوی 9 جون 1935 کو حیدرآباد کے معزز خاندان میں پیدا ہوئیں۔رشید موسوی نے نامپلی گرلز ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔''کاغذی ہے پیرہن'' طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں 18 مضامین اوردوخاکے ہیں۔یہ کتاب 1986 میں زندہ دلان حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوئی۔طنز ومزاح سے اپنے لگاؤ کے بارے میں وہ خود رقمطراز ہیں۔

> ''ادبی حلقوں میں مجھے ایک استاد اور محقق کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔لیکن طنزیہ ومزاحیہ ادب سے مجھے خاص دلچسپی رہی ہے۔شفیق الرحمٰن، شوکت تھانوی، پطرس بخاری، مرزا فرحت اللہ بیگ، مشتاق احمد یوسفی، رشید قریشی، بھارت چند کھنہ، اور مجتبیٰ حسین کو میں نے بہت پڑھا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ 1968ء میں میرا رجحان طنز ومزاح کی طرف ہوگیا تھا۔''(35)

رشید موسوی اپنے اساتذہ میں جہاں بانو نقوی اورڈاکٹر زینت ساجدہ سے بے حد متاثر ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ان اساتذہ کے اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے۔انھوں نے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون ''طنز کیا چیز ہے مزاح کیا ہے'' کے عنوان سے لکھا۔جسے انھوں نے زندہ دلان حیدرآباد کی 1968 میں منعقدہ سالانہ کانفرنس میں پیش کیا تھا۔

ڈاکٹر لئیق صلاح کا پورا نام لئیق خدیجہ ہے اور قلمی نام لئیق صلاح۔ڈاکٹر لئیق صلاح، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر سیدہ جعفر پروفیسر ثمینہ شوکت سے متاثر رہیں۔ان کی اب تک پانچ تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ان میں سنی سنائی مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں 14 مضامین ہیں۔ان مضامین میں طنز ومزاح کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔لئیق صلاح نے بعض مضامین میں دکنی زبان میں مکالمے لکھے ہیں۔

عابدہ محبوب 1937ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔عابدہ محبوب کے ادبی سفر کا آغاز 1955ء میں لطیفہ نگاری سے شروع ہوا۔عابدہ محبوب کی دو تصانیف ''درد کے پیوند'' 1985ء اور دھجیاں 1988ء میں شائع ہو چکی

ہیں۔ ''دھجیاں'' طنز یہ و مزاحیہ کہانیوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ان کا ماننا ہے کہ اگر کسی مزاح نگار کی تحریر قاری کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دے تو اس تحریر کو بار بار پڑھنا چاہیے۔

نسیمہ تراب الحسن کا تعلق اتر پردیش کے ایک زمیندار خاندان سے ہے۔ابتدائی تعلیم گوشہ محل گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں ہوئی اور وہیں سے انھوں نے میٹرک پاس کیا۔زمانہ طالب علمی سے ہی لکھنے کا شوق رکھتی تھیں۔لیکن وہ خود کہتی ہیں کہ ڈاکٹر زینت ساجدہ کی ہمت افزائی سے قلم چلانے کی جرات پیدا ہوئی۔ان کے مضامین سیدھے سادے اور شگفتہ مزاح لئے ہوئے ہوتے ہیں۔

حیدرآباد کی مزاح نگار خواتین میں شمیم علیم ایک اہم نام ہے۔ان کی کتاب ''عکسِ کائنات'' میں موجودہ دور کے سلگتے ہوئے مسائل پر کئی مضامین ہیں جن میں ان کا طنز یہ اور مزاحیہ اسلوب واضح نظر آتا ہے۔شمیم علیم کی تحریروں میں زیرِلب تبسم نظر آتا ہے۔مزاح کی ایک زیریں لہر ان کی تحریر میں جاری وساری رہتی ہے۔

حیدرآباد کی مزاح نگار خواتین میں فاطمہ تاج ایک اہم نام ہے۔مدیر شگوفہ سید مصطفیٰ کمال' ڈاکٹر حبیب ضیا' ڈاکٹر زینت ساجدہ' محبوب حسین جگر کی حوصلہ افزائی سے نثر کی طرف توجہ کی اور خاص طور پر مدیر شگوفہ اور ڈاکٹر حبیب ضیا کی وجہ سے طنز و مزاح کی طرف مائل ہوئیں۔

حیدرآباد میں شعر کی پیرائیہ میں طبع آزمائی کرنے والی چند طنز و مزاح نگار خواتین بھی ملتی ہیں۔حالانکہ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن ان شعراء نے حتیٰ المقدور اپنی تخلیقات سے فن کا حق ادا کیا ہے۔ان میں بشیرؔ' عزیزہ محبوب اور اطہری فضاء کے نام ملتے ہیں۔

بشیر النساء جعفری 25 جولائی 1931 کو حیدرآباد میں سید علی موسوی اور بتول النساء کے گھر پیدا ہوئیں۔کمسنی سے ہی مزاحیہ شاعری سے شغف رہا۔اس کے علاوہ انھوں نے مزاحیہ مضامین میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔بشیرؔ تخلص اختیار کرتی ہیں۔

عزیزہ محبوب 1935 کو حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔انکے والد شیخ محبوب قادری شاعری میں مفتوںؔ تخلص اختیار کرر کھا تھا۔طالب علمی کے دور سے ہی مضامین لکھتی ہیں۔مضامین کے علاوہ شاعری بھی

کرتی ہیں۔

نام سروری بیگم ہے اور ادبی دنیا میں اطہری فضاء کے نام سے مقبول ہیں۔اطہری فضاء سنجیدہ شاعری کے ساتھ طنزیہ ومزاحیہ غزلیں بھی لکھ لیتی ہیں۔فیشن کے نام مٹتی ہوئی مشرقی اقدار پر بھی اطہری فضا کا قلم خوب چلتا ہے۔

حیدرآباد میں طنز ومزاح لکھنے والوں نے ابتداء تو اس غرض سے کی کہ ''کچھ ہنسنے ہنسانے'' کا سامان ہو جائے۔لیکن 1947ء کے بعد حیدرآباد کے حالات جب تبدیل ہوئے تو ان طنز ومزاح لکھنے والوں نے انتہائی عزم وحوصلہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ہم وطنوں کی دلجوئی' ہمت افزائی اور حالات سے ڈٹ کر مقابلہ پیدا کرنے کی غرض سے مزاحیہ ادب سے کام لیا۔حیدرآباد کے مزاحیہ فنکاروں کا یہ ایسا کارنامہ ہے کہ جس کی داد نہ دینا کفران ادبی ہوگا۔اردو کے معروف مزاح نگار پدم شری مجتبیٰ حسین صاحب نے شعبہ اردو حیدرآباد یونیورسٹی میں ڈاکٹر حبیب نثار سے محمد حمایت اللہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''حمایت بھائی وہ فنکار ہیں جنھوں نے 1950ء کے قریب حیدرآبادیوں کو ہنسنا سکھایا ورنہ ہم لوگ تو ہنسنا بھول گئے تھے۔'' (29 اپریل 2009ء) نالگو برادران کی تنظیم وتشکیل خاص اسی مقصد سے کی گئی تھی کہ حیدرآبادی عوام کے حوصلوں کو بلند کیا جائے انہیں پھر ایک بار سماجی دھارے میں شامل کرلیا جائے۔

خاندان آصفیہ کے ساتویں حکمراں نواب میر عثمان علی خان کا دور اس لحاظ سے ذرین کہا جاسکتا ہے کہ ان ہی کے دور میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔اسی زمانے میں ہندوستان کے تمثیلی اسٹیج پر فلمی صنعت کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا اور ڈرامہ کا چاند غروب ہونے کو تھا۔ایسے میں جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل چند طلباء نے جن میں قابل ذکر نام اکبر وفا قانی کا ہے انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک ادارہ بزم تمثیل کی بنیاد ڈالی۔جس کا مقصد حیدرآباد میں ڈرامہ کو فروغ دینا تھا۔اس بزم میں کئے گئے ڈراموں میں مالن' پھولن' کشمکش وغیرہ بے حد پسند کئے گئے اور مقبول عام وخاص ہوئے۔اس بزم کے ڈرامہ نگاروں میں اکبر وفا قانی، عزیز احمد، مرزا ظفر الحسن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ان ڈراموں میں حصہ لینے والے اداکار زیادہ تر جامعہ عثمانیہ کے گریجویٹس ہوا کرتے تھے۔ان میں خصوصاً مرزا شکور بیگ، ظفر مرزا، عبدالرب، شرافت اللہ، فضل الرحمٰن (کمرشیل آرٹسٹ)، شہریار کاؤس جی،

محمود مرزا رضوی، علی صائب میاں، اعجاز حسین کھٹا اور نذیر دہقانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ کچھ عرصہ مقبول ہونے کے بعد یہ بزم آہستہ آہستہ ماند پڑتی گئی۔(36)

عین اسی زمانے میں جب کے بزم تمثیل اپنے عروج پر تھی حیدرآباد کے چند بے باک نوجوانوں نے ایک اور بزم کی بنیاد رکھی۔اس بزم کو تشکیل دینے والے جملہ چار افراد تھے۔چنانچہ اسی مناسبت سے اس بزم کا نام ''نالگو برادران'' رکھا گیا۔

نالگو تلگو لفظ ہے جس کے معنی ہیں چار اور برادران فارسی لفظ ہے جس کے معنی بھائی کے ہیں۔تلگو اور فارسی الفاظ کا یہ مرکب جب بزم کا نام قرار پایا تو اس نے اپنے پروگراموں کے ذریعہ حیدرآباد کی تہذیبی دنیا میں اسم با مسمیٰ کی حیثیت اختیار کر لی اس بزم نے یہ ندرت بھی پیدا کی کہ عوامی اسٹیج کے بجائے گھریلو محفلوں کو لالہ زار بنائے رکھا۔

کہتے ہیں کہ ''نالگو برادران'' کی تشکیل میں اہم رول جناب سید معزالدین ملتانی صاحب نے ادا کیا تھا چنانچہ جناب جہاندار افسر صاحب نے ایک انٹرویو میں یہ انکشاف کیا کہ اس بزم زندہ دلان کو ''نالگو برادران'' کا نام عطا کرنے کا اعزاز بھی جناب معزالدین ملتانی ہی کے سر جاتا ہے۔''نالگو برادران'' میں شامل ارکان کے اسمائے گرامی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

معزالدین ملتانی کے فرزند جناب سید مظفرالدین سعید نے ان چار بھائیوں کے نام حسب ذیل بتائے۔

> عبدالرحمٰن بڑے بھائی، شمس الدین نواب منجھلے بھائی، معزالدین ملتانی سنجھلے بھائی اور جعفر حسین خان چھوٹے بھائی صاحب موصوف نے یہ اہم اطلاع دی کہ نالگو برادران میں زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہی ہے۔چنانچہ انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ شمس الدین صاحب کے انتقال کے بعد قیوم صاحب اور جعفر حسین خاں کے انتقال کے بعد امجد صدیقی امجد نے ان کی جگہ لے لی تھی۔(37)

جناب مظفرالدین سعید صاحب کی اطلاع کے تناظر میں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ''نالگو برادران'' میں

وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی ہے۔

حیدرآباد کے معروف صحافی جہاندار افسر کے مطابق اس بزم میں محمد عثمان عبدالرحمٰن، معز الدین ملتانی اور بھگوان راؤ آنکھ شامل تھے۔(38)

حیدرآباد کے مشہور مصور سعادت علی خان کے مطابق اس بزم میں شامل چار ارکان حسب ذیل ہیں۔

> ''عبدالرحمٰن''، ''معز الدین ملتانی''، ''محمد عثمان'' اور ''فرید الدین گردہ''۔(39)

سعادت علی خان نے اپنے مضمون میں بھگوان راؤ آنکھ کا بھی ذکر کیا ہے لیکن انہیں وہ ''نالگو برادران'' میں شامل نہیں کرتے بلکہ ''نالگو برادران'' کی جانب سے پیش کئے گئے خاکوں میں اداکاری کرنے والے فنکار قرار دیا ہے۔

نالگو برادران کا تعارف کراتے ہوئے بشیر النساء بیگم لکھتی ہیں:

> ''پولیس ایکشن سے پہلے جب معز الدین ملتانی پروپگنڈہ ڈپارٹمنٹ سے منسلک تھے تو ایک انجمن ''نالگو برادران'' کے نام سے بنائی گئی تھی اس کے ارکان عبدالرحمٰن بڑے بھائی، جعفر حسین خان منجھلے بھائی، معز الدین ملتانی سنجھلے بھائی اور قیوم صاحب چھوٹے بھائی تھے''۔(40)

بشیر النساء بیگم نے نالگو برادران کے وہی نام درج کئے ہیں جن کی نشاندہی جناب سید مظفر الدین سعید نے کی ہے۔

ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے اپنے ایک مضمون میں ''نالگو برادران'' کی بزم بننے کے اسباب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان برادران کے ناموں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

> قریبی ماضی میں حیدرآباد کے عوام مختلف سماجی تبدیلیوں اور انقلابات کے نتیجے میں قنوطیت اور مایوسی کا شکار ہو چکے تھے...... مایوسی اور گھٹن سے

> بھرے اس زمانے میں اس سرزمین کی خاک سے چار فنکار اٹھے جنہوں نے اپنی ظرافت اور زندہ دلی کے ذریعہ شکست خوردی، رنج و ملال، خوف خطر اور پژمردگی کے اندھیروں میں طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں قہقہوں کی آتشبازی چھوڑی یہ چار فنکار تھے۔عبدالرحمٰن، سید اعجاز حسین کھٹاؔ علی صائب میاںؔ اور فرید الدین گردؔہ مزاح نگاروں کی یہ ٹولی عام طور پر نالگو برادران کے نام سے مشہور تھی''۔(41)

پروفیسر اشرف رفیع اپنے ایک مضمون میں زندہ دلان حیدرآباد اور شگوفہ کے قیام اور اس سے پہلے بنی بزم ''نالگو برادران'' کا ذکر کچھ اس طرح کرتی ہیں۔

> ''دکن کے چند جیالوں اور نوجوانوں نے سماج کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارے دینے کیلئے ''زندہ دلان حیدرآباد'' اور ''شگوفہ'' کی بنیاد ڈالی۔ سسکتی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی شاہی حکومت کے زمانے میں نالگو برادران (1۔عبدالرحمٰن صاحب، 2۔جعفر حسین صاحب، 3۔سید معز الدین ملتانی صاحب، 4۔قیوم صاحب) نے سماجی پشتہ بندی کا اہم کام انجام دیا تھا لیکن آج زندہ دلوں نے اپنی تمام تر بے نوائی اور بے سروسامانی کے ساتھ خزاں رسیدہ چمن میں شگوفے کھلا دیئے''۔(42)

ان تمام اسناد کی یہ روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتداء اس بزم میں معز الدین ملتانی، عبدالرحمٰن، محمد عثمان اور بھگوان راؤ آنکھ شامل تھے اور بعد میں رفتہ رفتہ کسی ایک فنکار کے بچھڑنے پر دوسرے فنکار نے اس جگہ کو پر کیا۔اس طرح ''نالگو برادران'' میں حسب ذیل اصحاب شامل تھے۔عبدالرحمٰن، محمد عثمان، سید معز الدین ملتانی، بھگوان راؤ آنکھؔ، فریدہ الدین گردؔہ، سید اعجاز حسین کھٹاؔ علی صائب میاںؔ، شمس الدین، جعفر حسین خان، قیوم صاحب، نذیر دہقانیؔ اور بالا پرشاد گوڑ۔

نالگو برادران میں ایک عبدالرحمٰن تھے جو بڑے بھائی کا کردار ادا کرتے تھے اور عام طور پر بڑے بھائی کے نام

ہی سے معروف تھے۔ان کا خاص آئٹم انگریزی اور عربی میں گفتگو اور تقریر تھا۔اس میں وہ انگریزوں اور عربوں کی نقالی کرتے تھے۔وہ اس روانی اور فراٹے کے ساتھ انگریزی کے الفاظ کی آوازیں نکالتے تھے کہ انگریزوں کو بھی پسینہ آجائے۔اسی طرح وہ حلق سے اس روانی اور تجوید کے ساتھ آوازیں نکالنے میں ماہر تھے کہ عرب بھی حیران ہوجائے۔ان کے اسٹائیل اور لہجے سے قطعی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ بے معنی آوازیں نکال رہے ہیں۔لوگوں میں ان کا یہ آئیٹم بہت مقبول تھا اور وہ بھی پوری طمانیت اور اعتماد کے ساتھ انگریز بہادر اور عرب برادر کو شرمندہ گفتار کیا کرتے۔

نالگو برادران ٹیم میں شامل افراد ہرفن مولا تھے یہ افراد تعلیم یافتہ اور انتہائی ذہین تھے۔زندہ دلی اور بزلہ سنجی ان کے رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ان لوگوں کی شریر طبیعت کا ایک چھوٹا سا واقعہ بشیر النساء نے درج کیا ہے۔

> ''ایک دفعہ عبدالرحمٰن بڑے بھائی فجر کی نماز کے بعد چار مینار پولیس اسٹیشن کے پاس سے گذر رہے تھے اس دور میں یہ قانون رائج تھا کہ ہر سائیکل سوار رات کے وقت قندیل لگا کر سفر کرے گا۔عبدالرحمٰن صاحب کو اسٹیشن کے قریب شرارت سوجھی اور پولیس والوں کو متوجہ کرنے کیلئے پکارنا شروع کیا پولیس والے او پولیس والے بھائی،ان کی آوازوں کو سن کر ایک پولیس کانسٹیبل باہر آیا اور پوچھا کہ کیا ہے تو عبدالرحمٰن نے انتہائی معصومیت کے ساتھ اس سے پوچھا کہ میری سائیکل پر قندیل نہیں ہے میں ٹہروں کہ جاؤں چونکہ پولیس والے نالگو برادران سے بخوبی واقف تھے جس کی وجہ سے ان کی اس شرارت کے خوب چرچے ہوئے۔(43)

نالگو برادران کے دوسرے رکن سید اعجاز حسین کھٹا تھے۔کھٹا محکمہ مال میں ملازم تھے اور دکن ریڈیو میں بھی جز وقتی خدمات انجام دیا کرتے تھے۔یہاں وہ بچوں کے ماموں جان کہلائے جاتے تھے۔دکن ریڈیو' سیان' کا پروگرام استاد کی باتیں نہایت مقبول ہوا۔جس میں وہ زمانے کی ترقی سے بیزار قدامت پسند استاد کا کردار' مرزا ظفر الحسن پڑھے لکھے شخص اور غلام علی (علی صائب میاں) بھوئی کا کردار ادا کرتے تھے۔

نالگو برادران کے تیسرے رکن فریدالدین گرؔدہ تھے۔ان کا نام فریدالدین تھا لیکن تخلص اس قدر مشہور ہوا کہ اصل نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ کھٹے کی طرح ان کا تخلص ہی مسکراہٹ کی کلیاں کھلا دیتا تھا۔شاعری میں اپنے تخلص سے خوب استفادہ کرتے تھے۔''نالگو برادران'' کے مشہور مزاحیہ خاکے چھوٹے نواب کی کامیابی میں فرید الدین گرؔدہ کی برجستہ اداکاری اور مکالموں کی ظریفانہ ادائیگی کا بڑا دخل تھا۔اُس دور کی ادبی محفلوں کی وہ جان ہوا کرتے تھے۔لیکن افسوس کہ اس بے مثال ظرافت نگار کو لوگوں نے آج بالکل فراموش کردیا۔

''نالگو برادران'' نامی اس بزم کے چوتھے اور اہم رکن تھے علی صائب میاں۔ان کا پورا نام سید غلام علی تھا۔زمانہ طالب علمی سے ہی اداکاری کا شوق تھا۔ڈراموں اپنی اداکاری کے جوہر دکھایا کرتے تھے۔اُس زمانے میں 'بھوئی' کا کردار بے حد مقبول ہوا جسے علی صائب میاں نے ادا کیا تھا۔علی صائب میاں فطرتاً یہ بڑے شوخ اور ظریف واقع ہوئے تھے۔چنانچہ جامعہ عثمانیہ کے دور ہی میں انہوں نے غالب اور مومن جیسے استاد شعراء کے کلام کی پیروڈیاں لکھی تھیں۔اس وقت تک انہیں دکنی میں لکھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ بعد میں انہوں نے نذیر دہقانی سے متاثر ہوکر اسی رنگ میں شعر کہنا شروع کیا۔علی صائب کی شاعری میں دکن کے باشندوں کی غربت وافلاس اور ان کے دکھ درد کا بھرپور احساس ملتا ہے۔

1948ء کے بعد حیدرآباد کے چند تعلیم یافتہ نوجوانوں نے حیدرآباد کی غمزدہ وافسردہ عوام کو حوصلہ بخشنے اور زندگی سے آنکھ ملانے کا پھر سبق پڑھانے کی غرض سے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔ نالگو برادران میں معزالدین ملتانی' سید اعجاز حسین کھٹاؔ' علی صائبؔ میاں' اور نذیر دہقانؔی جیسے دکنی طنز ومزاح کے شعرا موجود تھے۔ان شعراء نے اپنے درد دل کا بیان ہم عصر واقعات کے پس منظر میں' تخیل کی آنچ میں تپا کر پیش کرنے کی روایت باقی و برقرار رکھا۔اعجاز حسین کھٹا' 1948ء میں پاکستان چلے گئے۔لیکن دوسرے شعراء نے اپنے فن کو حیدرآباد کی سرزمین پر ہی جاری وساری رکھا۔وقت گذرتا گیا' موسی ندی سے پانی بہتا رہا۔دیکھتے ہی دیکھتے دکنی طنز ومزاح کے افق پر سلیمان خطیبؔ' سرور ڈنڈاؔ' حمایتؔ اللہ' غوث خواہ مخواؔہ جیسے شعراء ابھرے۔اور ان ہی شعراء نے حیدرآباد کی طنز ومزاح کی روایت کو پروان چڑھانے کا فرض بھی نبھایا۔اور پھر وہ وقت بھی آیا جب حیدرآباد میں

ہندوستان کی پہلی طنز ومزاحیہ کانفرنس منعقد ہوئی۔جس کے نتیجے میں زندہ دلان حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا۔ طنز ومزاح کانفرنس اور زندہ دلان حیدرآباد کی سرگرمیوں میں مصطفیٰ کمال برابر اپنا رول ادا کررہے تھے۔کانفرنس کے سلسلے میں جو دوسوونیر شائع ہوئے ان میں مصطفیٰ کمال کا خونِ جگر بھی شامل تھا۔زندہ دلان حیدرآباد کے قیام کے بعد اپنے چند دوستوں کی رہنمائی میں طنز ومزاح کا ترجمان رسالہ''شگوفہ'' کے نام سے سرزمین حیدرآباد سے (1968ء) شائع کیا۔جو آج 2010ء میں اپنے 42 سال مکمل کرتے ہوئے اردو رسالوں کی مسلسل اشاعت کی تاریخ میں ریکارڈ قائم کرنے کا اعزاز حاصل کر چکا ہے۔''شگوفہ'' نے اپنی مسلسل اشاعت کے ذریعہ حیدرآباد ہی نہیں ساری اردو دنیا کے طنز ومزاح کو محفوظ کرنے کا انتہائی اہم فرض نبھایا ہے اور اس فرض کی ادائیگی اس کے مدیر و مالک ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال وفاداری وبشرط استواری کے ساتھ پوری کررہے ہیں۔

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کا نام ادبی حلقوں کے لیے جانا پہچانا ہے۔آپ کی شخصیت کے کئی رخ ہیں۔اردو تحریک سے کوئی 50 برس سے وابستہ ہیں اردو صحافت سے بھی آپ کا تعلق خاصہ پرانا ہے۔اور درس وتدریس سے بھی طویل عرصہ تک منسلک رہے ہیں۔آپ گذشتہ 42 برس سے اردو کا ایک ایسا رسالہ شائع کررہے ہیں جو صرف طنز ومزاح کے لیے مخصوص ہے۔ماہنامہ''شگوفہ'' نے طنز ومزاح کے حوالے سے جو کام کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔آپ کی پیدائش 12 جولائی 1939 کو حیدرآباد میں ہوئی البتہ اسکول کے سرٹیفیکیٹ میں آپ کی تاریخ پیدائش 26 فروری 1939ء درج ہے۔غالباً میٹرک کے امتحان کے لیے درکات عمر کم ہونے کی وجہ سے ساڑھے چار ماہ بڑھا کر عمر لکھوائی گئی۔آپ کے والد کا نام سید احمد علی اور والدہ کا نام خیر النساء بیگم تھا۔والد چونکہ محکمہ جنگلات میں ملازم تھے اور ان کا اکثر تبادلہ ہوتا رہتا تھا اسی لئے بار بار اسکول تبدیل کرنے کی وجہ سے مصطفیٰ کمال کی ابتدائی تعلیم متاثر ہوئی۔ان کی ابتدائی تعلیم آندھرا پردیش کے اضلاع نرمل اور کھمم میں ہوئی۔1955 میں آپ نے چادر گھاٹ ہائی اسکول حیدرآباد سے اردو میڈیم میں میٹرک کامیاب کیا۔ 1958ء میں سٹی کالج حیدرآباد سے انٹرمیڈیٹ اور 1961ء میں سائنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد ایک سال سے زائد عرصے تک محکمۂ جنگلات کے تحت عادل آباد میں ملازمت کی لیکن یہ ملازمت انہیں پسند نہیں آئی اور واپس حیدرآباد آ گئے۔

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے 1965 میں جامعہ عثمانیہ سے اردو میں ایم۔اے کامیاب کیا اور یونیورسٹی میں

اول آئے۔1964ء میں آپ کی ادارت میں ''مجلّہ عثمانیہ'' کا ''دکنی ادب نمبر'' شائع ہوا۔اس خصوصی اشاعت کو دکنیات کے موضوع پر آج بھی حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔ایم۔اے کرنے کے بعد پروفیسر مسعود حسین خان کی نگرانی میں ''حیدرآباد میں اردو کا ارتقاء۔تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے'' کے زیرعنوان پی ایچ ڈی میں جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔اس مقالہ کے لیے آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز کے کاغذات کی کوئی ڈیڑھ سال تک چھان بین کرتے رہے۔کافی مواد بھی اکٹھا کرلیا۔اسی دوران 1965ء میں کالج آف لینگوئجس کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا اور دسمبر 1969ء تک اس ایوننگ کالج میں رضا کارانہ تدریسی خدمات انجام دیں۔1965ء سے 1976ء تک روزنامہ ''رہنمائے دکن'' کے صفحہء ''شعروادب'' کی ادارت کا کام انجام دیا۔اسی زمانے 1966ء سے 1969ء کے اختتام تک ممتاز کالج میں پارٹ ٹائم لکچرر رہے۔انجمن تحفظ اردو کے ترجمان ماہنامہ ''قومی زبان'' کی مجلس ادارت کے بھی رکن تھے۔یہ مصروفیات پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل میں مانع رہیں۔لیکن یو جی سی کی ایک اسکیم کے تحت انھوں نے یہ مقالہ 1964ء میں مکمل کیا اور 1990ء میں یہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔

جس زمانے میں لکھنؤ سے اودھ پنچ جاری ہوا تھا۔ہندوستان عجیب وغریب حالات سے گذر رہا تھا۔سلطنت مغلیہ زوال پذیر تھی اور انگریزی تسلط اور جبر وتشدد نے ہندوستانی قوم کو دوراہے پر لاکر کھڑا کردیا تھا۔ایک طرف انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا تو دوسری طرف سیاست کے معاملات اور مسائل کا براہ راست اثر اردو والوں پر پڑھ رہا تھا۔ایسے ہی ہنگامی حالات' تہذیبی وسیاسی کشمکش کا دور اکثر وبیشتر طنز و مزاح کے لیے بڑا سازگار ہوا کرتا ہے۔

کچھ ایسے ہی حالات میں حیدرآباد سے 1968ء میں رسالہ ''شگوفہ'' جاری ہوا تھا۔بلکہ یہ حالات اَودھ پنچ سے بھی کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ثابت ہوئے۔وہاں معاملہ غیروں سے تھا یہاں سابقہ ہم وطنوں سے۔یہاں بھی تہذیبی ٹکراؤ' لسانی عصبیت' معاشی بدحالی' سیاسی کشمکش اردو والوں کی پست ہمتی' تعلیمی پسماندگی اور احساس کمتری نے ''شگوفہ'' کے لکھنے والوں کو موضوعات کے نو بہ نو امکانات اور وسعتوں سے روشناس کروایا۔

طنز و مزاح کے فروغ میں ''شگوفہ'' کے حصہ یا اس کے مقام کو سمجھنے کے لیے اس کی ادبی خدمات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ہندوستان کے سماجی اور سیاسی پس منظر میں اس کے کاز کی وضاحت بھی مناسب ہے۔

''شگوفہ'' کا پہلا شمارہ نومبر 1968ء میں منظر عام پر آیا۔اس میں شائع ہونے والی معیاری تخلیقات کے سبب ادب نواز شائقین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ابتداء میں یہ رسالہ دیڑھ ماہی ہوا کرتا تھا۔شگوفہ کا پہلا شمارہ دیڑھ ماہی ہونے کی وجہ سے شمارے پر نومبر ڈسمبر 1968ء درج کیا گیا ہے۔اس کے مدیر سید مصطفیٰ کمال نے اسے اپنے سرمایے سے جاری کیا۔ان کی خواہش پر اسے زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان کی حیثیت دی گئی۔پہلے شمارے کے ٹائٹل پر دیڑھ ماہی ''شگوفہ'' زندہ دلان حیدآباد اور قیمت ایک صد پیسے درج ہے۔سب ٹائٹل پر 'زندہ دلان حیدرآباد کا طنزیہ ومزاحیہ دیڑھ ماہی ''شگوفہ'' لکھا ہے۔ایڈیٹر کے لیے سید مصطفی کمال کا نام ہے۔احسن علی مرزا' مجتبیٰ حسین اور محمد حمایت اللہ مجلس ادارت میں شامل ہے۔مجلس مشاورت میں کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' بھارت چند کھنہ اور زینت ساجدہ ہیں۔بعد میں مجلس ادارت اور مجلس مشاورت میں کئی بار تبدیلیاں کی گئیں۔

شگوفہ کا عام شمارہ ہر ماہ کے تیسر ہفتے میں شائع ہوتا ہے۔زندہ دلان حیدآباد کی سالانہ تقاریب کے موقع پر سوونیر شائع کیا جاتا ہے۔اور سال کے آغاز پر سالنامہ شائع کیا جاتا ہے۔

پہلے شمارے میں لکھنے والوں کے نام یہ ہیں۔ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید' بھارت چند کھنہ' ڈاکٹر رشید موسوی' مجتبیٰ حسین' برق آشیانوی' نعیم زبیری' عوض سعید' مشتاق قمر' عبدالحلیم شرر' رضا نقوی واہی' سگار لکھنوی' گلی نلگنڈوی' فیض الرحمٰن فیض' ایم اے اڑ پیکر' ماچس لکھنوی' سلیمان خطیب' مجید مقبول' سرپٹ حیدرآبادی' محمد صبغت اللہ بمباٹ' اور حفیظ خان سپاٹ۔مدیر شگوفہ کا اداریہ رسالے کے آخر میں صفحہ 63 تا 64 پر ہے۔شمارے کے جملہ صفحات 64 ہیں۔گڑ بڑ گھٹالہ (تصحیح) کے عنوان سے ایک پرچی چسپاں کی گئی ہے۔جس میں فہرست کی چند غلطیاں درست کی گئی ہیں۔

گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ ''شگوفہ'' کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔چاہنے والوں کے اصرار پر اور تکنیکی وجوہات کی بنا پر جون 1973ء میں ''شگوفہ'' کو ماہنامہ میں تبدیل کر دیا گیا۔تب سے لے کر آج تک اس کی اشاعت بدستو جاری ہے۔ہر ماہ پابندی سے اس رسالے کا شائع ہونا ایک بڑی کامیابی ہے۔

''شگوفہ'' کا یہ طویل سفر مشکلات سے پر اور کس قدر آزمائشی تھا اس بات کا اندازہ ''شگوفہ'' کے اداریوں سے بخوبی ہوتا ہے۔ستمبر 1984 میں حیدرآباد میں فرقہ وارانہ فسادات نے لوگوں کی پرسکون زندگی کو جس طرح درہم برہم کیا تھا۔اس کا آنکھوں دیکھا حال ''شگوفہ'' کے ستمبر 84ء کے اداریے میں موجود ہے اور ساتھ ہی اس

بات کا علم ہوتا ہے کہ اس پر آشوب دور میں بھی ''شگوفہ'' کی اجرائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لکھتے ہیں:

''اردو رسالوں کی زبوں حالی اور غیر یقینی زندگی کے پیش نظر ہم ''شگوفہ'' کے اداریہ کے لیے یہ مستقل عنوان پھر ملیں گے اختیار کیا تھا۔لیکن حیدرآباد کے حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کرلیا ہے کہ ہر شریف آدمی بوقت وداع یہی مصرعہ دہراتا ہے۔ مئی' جون' جولائی' اگست اور پھر ستمبر کوئی مہینہ ایسا نہیں گذرا جس میں فسادات اور کرفیو سے چھٹکارا ملا ہو۔ جس مجردگاہ پر ہم پچھلے 25 سال سے نصف شب گذرنے کے بعد بلاخوف وخطر محفلیں سجائے ہنستے کھیلتے کاموں میں مشغول رہا کرتے تھے۔آج وہی عمارت جارحانہ فرقہ پرستی کی چشم دید گواہ اور ویرانی اداسی کا پیکر بنی ہوئی ہے۔اور تادم تحریر رات کا کرفیو برقرار ہے۔ایسے حالات میں ستمبر کا شمارہ اسی مہینے میں شائع ہونا ناممکن امر تھا۔''(44)

''شگوفہ'' جس دور میں جاری ہوا اس وقت ملک میں خالص طنز و مزاح کا کوئی پرچہ نہیں تھا۔ بعد میں پٹنہ سے ''چٹنی'' علی گڑھ سے ''ہپی پنچ'' مالیگاؤں سے ''چورن'' حیدرآباد سے ''ظریف'' اور لکھنؤ سے ''سرپنچ'' وغیرہ جاری ہوئے۔ لیکن یہ رسائل چند اشاعتوں کے بعد بند ہو گئے لیکن شگوفہ آج بھی مستقل شائع ہو رہا ہے۔

''شگوفہ'' کے اجراء کے وقت ادیب وشاعر طنز و مزاح لکھنے کی طرف مائل نہیں تھے۔ بعض ادیب اور نقاد اپنی تنگ ذہنی کے سبب طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب خیال کرتے تھے۔ شگوفہ نے ادب میں درجہ بندی کی اس لعنت کے خلاف آواز اٹھائی اور طنز و مزح کے چہرے پر پھکڑ پن اور مسخرگی کے جو داغ لگے تھے ان کو دھونے کی کوشش کی۔ شگوفہ کے لکھنے والوں میں ہندو پاک کے نامور طنز و مزاح نگار شامل ہیں۔ شگوفہ اور مدیر شگوفہ نے متعدد لکھنے والوں کو روشناس کروایا۔ اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ مسیح انجم اور ممتاز مہدی اس کی ایک چھوٹی سی نظیر ہیں۔ ممتاز نقاد نامی انصاری اس تعلق سے لکھتے ہیں۔

''شگوفہ کے مدیر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کو اس موضوع سے خاص دلچسپی ہے

اور انھوں نے اپنے رسالے کے ذریعے بہت سے نئے لکھنے والوں کو روشناس کرایا ہے۔یوں بھی طنز ومزاح اور حیدرآباد لازم وملزوم ہیں۔مثلاً بھارت چند کھنہ،نریندر لوتھر،مجتبیٰ حسین،یوسف ناظم،ابراہیم جلیس،خواجہ عبدالغفور،شاہد صدیقی،مسیح انجم وغیرہ حیدرآباد ہی کے آوردہ و پروردہ ہیں۔ان ادیبوں نے نہ صرف طنز ومزاح کے معیار اور وقار کو قائم رکھا ہے بلکہ اس میں نئی جہتیں بھی تلاش کی ہیں۔''(45)

شگوفہ کے لکھنے والوں میں تو بعض نے اپنی تحریروں کے ذریعہ طنز ومزاح کے ادبی سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ کیا۔جنوری86ء کے اداریہ میں نئے لکھنے والوں کو محنت شاقہ کی ترغیب دلائی گئی کیونکہ شگوفہ کی یہ کوشش رہی ہے کہ معیار برقرار رہے۔مدیر شگوفہ نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی ء کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً ان کی سرزنش بھی کی۔

''ہماری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ نئے لکھنے والوں کو شگوفہ کے صفحات پر زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ نئے لکھنے والے توجہ،محنت،خلوص اور لگن کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے۔مطالعے کی کمی شہرت کی خواہش اور معمولی سی شہرت حاصل ہونے پر خود کو صف اول کا تخلیق کار سمجھ لینے کا رجحان فن میں ٹھیراؤ پیدا کرتا ہے۔خاص طور سے مزاحیہ شاعری میں جمود سا پیدا ہوگیا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ مزاحیہ شعراء موضوعات میں تنوع اور فن میں پختگی پیدا کریں اور اس تاثر کو ختم کریں کہ مزاحیہ شاعری روبہ زوال ہے۔''(46)

''شگوفہ'' نے طنز ومزاح کی صحافت کو ایک نئی بلندی سے آشنا کیا اودھ پنچ کے بعد شگوفہ کو ہی یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس طویل عرصہ تک زندگی کا ثبوت دیتے ہوئے طنز ومزاح کی روایت کو عام کیا۔شگوفہ اب ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ڈاکٹر محمد طیب انصاری شگوفہ کی 37ویں سالگرہ کے موقع پر شائع اپنے

ایک مضمون میں لکھتے ہے۔

''موجودہ حالات میں کسی اردو رسالے کا بپابندی وقت مسلسل 37 برسوں سے شائع ہونا ایک غیر معمولی بات ہے۔ ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد اپنی اشاعت کے 36 برس پورے کر چکا ہے۔ یہ بات اس وجہ سے اہمیت رکھتی ہے کہ یہ فرد واحد کا کارنامہ ہے اور اس کارنامہ کو مصطفیٰ کمال نے انجام دیا ہے۔ اب تو شگوفہ زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان سے تحریک بن چکا ہے۔ یہ اس لیے بھی ایسا ہوسکا کہ مصطفیٰ کمال صاحب نے اپنی پوری صلاحیتوں کو اپنے قلب و ذہن کو اور تجربہ کو شگوفہ کے لیے وقف کر دیا ہے۔ تب ہی تو ایسا ممکن ہوسکا۔''(47)

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں خالص طنز و مزاح کا' شگوفہ کے سوا کوئی دوسرا رسالہ نہیں ہے۔ اَودھ پنچ کے بعد شگوفہ ہی وہ رسالہ ہے جس نے طنز و مزاح کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ شگوفہ کی ایک خصوصیت اس کا خاص مزاح اور اس کا معیار ہے۔ پروفیسر گیان چند جین رسالے کے تعلق سے اپنے تاثرات کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''اُردو میں دو ہی مزاحیہ رسالے سرخ رو ہوئے ہیں۔ میری حیات مستعار سے پہلے اودھ پنچ اور میرے دور میں شگوفہ۔ کوئی دوسرا ہشاش بشاش اردو رسالہ ہند و پاک' چین و ماچین' لندن و امریکہ میں ہو تو میرے سامنے لائیے۔''(48)

انور سدید شگوفہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''اگر یہ کہا جائے کہ 'اودھ پنچ' کے بعد 'شگوفہ' ایک ایسا مزاحیہ جریدہ ہے جو نئے لکھنے والوں کے لیے نردبان کا کام ہی نہیں دیتا بلکہ ان کے فن کو پروان بھی چڑھاتا ہے اور انہیں طنز و مزاح کی بالائی منزلوں تک بھی پہنچا دیتا

ہے تو یہ بالکل سچ ہوگا۔''(49)

شگوفہ کی انفرادیت اور شناخت اس کا خاص مزاح ہے۔نومبر ڈسمبر 1968ء میں اس اولین اشاعت سے لے کر اب تک شگوفہ کے کم و بیش 500 شمارے شائع ہو چکے ہیں ۔جملہ صفحات کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ ہے۔28 خاص نمبر اور 32 سالنامے اور 62 شخصی گوشے شائع ہو چکے ہیں۔شگوفہ کے صفحات پر طنز و مزاح کی مختلف صورتیں موجود ہیں۔نثر نگاری اور شاعری میں کئی اصناف کے ذریعہ قدیم اور عصری موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔نیز طنز و مزاح کی بنیاد پر اصلاح معاشرہ اور حصول مسرت پر توجہ دی گئی ہے۔شگوفہ کا نثری حصہ اس کے شعری حصے سے معیاری ہے۔نثری اصناف' شعری اصناف سے زیادہ ہیں۔نثر میں سب سے زیادہ توجہ انشائیوں پر ہے اس کے بعد مضامین' تنقیدیں' شخصیات' تبصرے' خاکے' ڈرامے' افسانے' سفرنامے' سوانح' رپوتاژ' رپورٹ' یادرفتگان' ڈائجسٹ' ترجمے' خطبات صدارت' لطیفے' مراسلے اور اداریے قابل لحاض تعداد میں ملتے ہیں۔

شاعری کی اصناف نسبتاً کم ہیں۔اس کا بڑا حصہ نظموں اور غزلوں کی صورتوں میں موجود ہے۔ان کے بعد قطعات اور پیروڈیوں کی تعداد قابل لحاظ ہے۔ہزلیات اور رباعیات بہت کم ہیں۔گیت' کہہ مکرنیاں' مثنوی' سہرا اور ہائیکو وغیرہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

انتخاب کلام کے تحت مختلف معروف شعرا کا کلام شائع کیا گیا۔ان میں غالب' اقبال' سرور ڈانڈا' سلیمان خطیب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔مزاحیہ ادیب و شعرا پر خصوصی نمبر شائع کیے گئے جیسے حیوان ظریف غالب نمبر' سلیمان خطیب نمبر' تخلص بھوپالی نمبر' مجتبیٰ حسین نمبر' یوسف ناظم نمبر' کنھیا لال کپور نمبر' عابد معز نمبر اور پرویز یداللہ مہدی نمبر وغیرہ۔

یہ ایک ایسا رسالہ ہے جس نے طنز و مزاح کی بھرپور ترجمانی کی ہے سرورق سے ہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ اپنی نوعیت کا منفرد پرچہ ہے۔جب فہرست پر نظر پڑتی ہیں تو از ابتدا تا انتہا مزاح سراپا مجسم نظر آتا ہے۔مثلاً مختلف موضوعات کی سرخیاں دیکھئے۔مال مفت (انشائیے) دخل در نامعقولات (افسانے' فیچر' ڈرامے) ایسی کی تیسی (تنقید) حق تو یہ ہے (ترجمہ) چورن (منظومات) اڑیں گے پرزے (خاکے) مال مسروقہ (ڈائجسٹ) بال کی کھال (تبصرہ) دے کے خط (مراسلے) اور فہرست کے لئے ان کی اصطلاح ہے' اس تھیلی کے چٹے بٹے' قاضی جی

دبلے (رپوتاژ) شگوفے (لطیفے) جلوہ روبرو (انٹرویو) نہیں آتی تو یاد ان کی (یادرفتگان) آدھا تیتر آدھا بٹیر (ملی جلی اصناف) مشمولات میں بصری مزاح کے نمونے کارٹون ہیں۔

کارٹون سماجی اور سیاسی مسائل کو اجاگر کرنے میں کافی معاون ثابت ہوتے ہے۔شگوفہ نے کارٹون کے ذریعہ بھی مقامی اور عالمی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔اس کے بیشتر کارٹون کافی فکر انگیز ہوتے ہیں۔ پروفیسر اشرف رفیع شگوفہ میں شائع ہونے والے کارٹونوں پر کچھ اس طرح اظہار خیال کرتی ہیں۔

''سیاست کا میدان کارٹون کے لیے بڑا زرخیز ہوتا ہے۔سیاسی شخصیتوں اور مسائل کے سارے نقوش ایک کارٹون میں اجاگر ہو جاتے ہیں۔جن میں طنز و مزاح کا عنصر بھی غالب رہتا ہے۔کارٹون کی اس فنی خوبی اور منچلی صفت کو شگوفہ نے مستقلاً اپنے صفحات کی زینت بنایا۔'' (50)

طنز و مزاح کے میدان میں صنف نازک نے بہت کم طبع آزمائی کی ہے۔ڈاکٹر زینت ساجدہ' فاطمہ تاج' حلیمہ فردوس' ڈاکٹر حبیب ضیاء پروفیسر لئیق صلاح' رشید موسوی چند ایسے نام ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ان کی ان منفرد فنکارانہ صلاحیتوں کو عوام کے روبرو پیش کرنے کا سہرا بھی شگوفہ کے سر بندھتا ہے۔ پروفیسر اشرف رفیع اس ضمن میں لکھتی ہیں۔

''شگوفہ نے کئی نئے لکھنے والوں کو روشناس کیا۔خواتین جو بظاہر سنجیدہ نظر آتی ہیں۔انہیں بھی ہنسنے ہنسانے پر مائل کیا۔ چنانچہ پروفیسر حبیب ضیاء' پروفیسر لئیق صلاح' ڈاکٹر رشید موسوی اور حلیمہ فردوس نے طنز و مزاح کے لئے قلم اٹھایا تو خواتین کے انفرادی مسائل گھریلو الجھنوں اور محفلوں کی سخن ہائے گفتنی کو بھی مزاح کے خوبصورت پیرائے میں گفتنی و شنیدنی بنا کر پیش کر دیا۔کبھی طنز کی تلخی اور کبھی مزاح کی ہلکی سی چاشنی ان کے حسن بیان کو دوبالا کر دیتی ہے۔ یہ حسن' یہ لطافت اور یہ نزاکت کسی پنچ کے یہاں کہاں۔'' (51)

شگوفہ نے اردو صحافت میں دکنی شاعری کو بھی بنظر توقیر دیکھا۔فلموں نے دکنی کو بازاری اور سوقیانہ زبان

بنا کر رکھ دیا تھا۔شگوفہ نے ادبی دکنی کی بازیافت کی اور بعض لکھنے والوں کو دکنی میں شاعری کرنے کی طرف مائل کیا۔

شگوفہ کی معین پالیسی، مستقل مقصد اور مسلک اصلاح معاشرہ اور طنز و مزاح کا فروغ ہے۔طنز و ظرافت کا لہجہ معیاری ہے۔شگوفہ نے ہمیشہ اپنے معیار کو بلند رکھا۔مدیر شگوفہ نے اپنے اداریوں میں کئی بار اس کا برملا اظہار بھی کیا ہے اور نئے لکھنے والوں کو سوقیانہ پن اور پھکڑ پن سے بچنے کی تلقین بھی کی ہے۔پروفیسر محمد عبدالرزاق فاروقی شگوفہ کے مضامین اور مشمولات کے معیار پر کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔

> ''سستے قسم کے مزاح سے قوم کا مزاج اعلیٰ وارفع اقدار سے دور ہو جاتا ہے۔اس میں مزاح کا قصور نہیں اس میں معیار کا معاملہ ہے۔قوم کا ذہن فقرے بازی، خود آرائی اور شخصیت پیمائی میں الجھ کر زندگی کی وسیع شاہ راہ پر چلنے سے محروم رہ جاتا ہے۔...... مصطفیٰ کمال نے شگوفہ کے سہارے معیاری ظرافت کے لئے جو سعی کی ہے اس کو اب ان کی 37 سالہ جہد مسلسل کہہ سکتے ہیں۔''(52)

شگوفہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مدیر شگوفہ نے کبھی اسے اپنی شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ان کا کوئی مضمون اس میں شائع نہیں ہوتا۔وہ اپنی بات بطور مدیر اداریے میں کہہ جاتے ہیں اور وہ بھی پوری سنجیدگی سے۔وہ خود مزاح نہیں لکھتے لیکن مزاح نگاروں سے لکھوانے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔انھوں نے معیاری مزاح لکھنے والوں کی ایک جماعت تیاری کردی ہے۔پروفیسر نثار احمد فاروقی تعریف و توسیف میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔وہ بھی اس بات کا اقرار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''شگوفہ پچھلے مہینے بھی ملا تھا اور اس بار بھی آیا ہے۔دل کی کلی کھل گئی۔مجھے خبر نہیں تھی کہ یہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔میں سمجھتا تھا کہ حسب ضرورت شائع ہوتا ہوگا۔بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ طنز و مزاح میں کوئی دوسرا رسالہ پورے برصغیر میں اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔آپ نے لکھنے والوں کی ایک جماعت پیدا کردی ہے۔مضامین سب نہایت دلچسپ ہیں۔

ابتذال اور سوقیانہ پن سے کوسوں دور اور دامن ادب کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا کوئی معمولی بات نہیں۔ مبارکباد۔''(53)

شگوفہ گذشتہ 42 سالوں سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اس کے اوراق پر 1947ء کے بعد پیش آنے والے کثیر الجہات نشیب و فراز بھی نظر آتے ہیں۔ پچھلی نصف صدی کی فکری تبدیلیوں' سیاسی گٹھ جوڑ' لسانی اور مذہبی عصبیت' بدلتے ہوئے تہذیبی اقدار کی تاریخ لکھنا ہو تو شگوفہ کے فائل ایک تہذیبی مورخ اور سیاسی مفکر کو بین السطور بلکہ زیر لب کئی داستانیں سنا دیں گے۔ شگوفہ نے ادیبوں اور شاعروں کو اس وقت مزاح لکھنے کی طرف مائل کیا۔ جب لوگ اسے دوسرے درجہ کا ادب قرار دینے لگے تھے۔ لیکن شگوفہ کا مسلک اور مقصد تو کچھ اور ہی ہے۔ مدیر شگوفہ نے اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کی اور مزاح کو ایک وقار بخشنے میں اہم رول ادا کیا۔ کلیم چغتائی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''شگوفہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے مزاح اور صاحبان مزاح دنوں کو وقار اور اعتبار عطا کیا ہے۔ یہ کام چٹکی بجاتے نہیں ہو گیا۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے شگوفہ کے مدیران نے سخت محنت کی ہے۔ درحقیقت مزاح کا پودا' اپنی نمو کے لیے خون جگر مانگتا ہے اور مدیران شگوفہ نے یہ مطالبہ پورا کرنے میں کبھی بخل یا پس پیش کا مظاہرہ نہیں کیا۔''(54)

ہندوستانی حالات کے پس منظر میں شگوفہ کے مقام کا تعین بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد رونما ہونے والے فسادات' تشدد' جرائم' بیروزگاری' جہیز' افلاس' بیماری اور دیگر بے شمار مسائل ہیں جن سے عام آدمی نبرد آزما ہے۔ ایسے ماحول میں طنز و مزاح کا سہارا نعمت کا درجہ رکھتا ہے۔ منظور وقار ایک مراسلے میں لکھتے ہیں۔

''آج کے انتشار کے دور میں لوگوں کے چہروں پر حقیقی مسرت اور سکون کی ایک ہلکی سی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ آج اقلیم انسانی' تفکرات کے صحرا میں بھٹک رہی ہے۔ حجاب در حجاب مشکلات اور پریشانیاں ہیں۔ ایسے انتشار اور گھٹن کے دور میں اگر کوئی چند لمحوں کے لیے بھی ہنسی اور مزاح کا سامان مہیا کرے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ اور یہ کام آپ شگوفہ کے ذریعہ

> بڑی کامیابی سے انجام دے رہے ہیں۔شگوفہ تو یقیناً مایوس اور پریشان لوگوں کا مسیحا اور ذہنی الجھنوں کے شکار لوگوں لیے مجرب نسخہ ہے۔‘‘(55)

شگوفہ کی معین پالیسی، مستقل مسلک اور مقصد اصلاح معاشرہ اور طنز ومزاح کا فروغ ہے۔اُردو ادب میں طنز ومزاح کا آغاز اَودھ پنچ سے ہوتا ہے اور شگوفہ اس کا تسلسل ہے۔عزیز ابرار اپنے مقالے میں اَودھ پنچ اور شگوفہ کا موازانہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ’’اردو ادب میں طنز ومزاح کا باقاعدہ آغاز اَودھ پنچ سے ہوتا ہے اور شگوفہ اس آغاز کا تسلسل ہے۔اس طرح اودھ پنچ امام اور شگوفہ مقتدی کی حیثیت رکھتے ہیں۔......اودھ پنچ کے زمانے میں اردو سرکاری زبان تھی شگوفہ کے دور میں یہ حقیقت نہیں ہے۔اس طرح کم سازگار ماحول کے باوجود شگوفہ نے اپنا سفر کامیابی سے جاری رکھا ہوا ہے۔‘‘(56)

طنز ومزاح کے فروغ میں شگوفہ کی ادبی خدمات بہرحال قابل قدر ہیں۔آزادی کے بعد اردو طنز ومزاح کے کسی بھی جائزے کے لئے شگوفہ کا ذکر ضروری ہے۔

حیدرآباد کے مزاحیہ ادیب وشعراء نے انسانی زندگی اور اس کائنات کے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے اپنے عہد کی سیاسی حسیت، معاشرت، تہذیبی اُتھل پُتھل، طبقاتی کشمکش، معاشی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ آفاتِ سماوی کو بھی اپنے فن کا موضوع بنایا۔اسی کے ساتھ ان ادیب وشعراء نے جس سرزمین پر سانس لی وہاں کے قدرتی مناظر، تاریخی شواہد (دریا، جھیل، پہاڑ، عمارتیں وغیرہ) پر بھی طبع آزمائی کی۔ذیل میں حیدرآباد کے مزاحیہ ادیب وشعراء کے موضوعات اور عنوانات درج کئے جاتے ہیں۔(یہاں صرف ان ہی تخلیقات کے عنوان اور موضوع درج کئے جارہے ہیں جن کا ذکر وتذکرہ مقالے میں کیا گیا ہے۔ان کے علاوہ بھی مزید موضوعات ان فنکاروں کی تخلیقات میں ملتے ہیں)

نثر

''پھول والوں کی سیر'' ''مخلوط تہذیب'' ''طالب علم'' ''حصول علم'' ''ڈاکٹری کا علم'' ''صاحب بہادر'' ''ایڈیٹر کا کمرہ'' ''جوہر'' ''حکیم جی کا مطب'' ''کاک ٹیل'' ''انوار تبسم'' ''لال بجھکڑ'' ''گدھے کی عقل مندی'' ''راجہ بیربل'' ''قاضی جی کارگذاری'' ''ملاجی کا مکتب'' ''زن مرید'' ''بے پر کی'' ''گھبراہٹ'' ''حسرت'' ''ہمارے بزرگوار'' ''ہمارا پیشہ'' ''ہماری دھوبن'' ''میرا مالی'' ''درزی'' ''ہمارا کلرک'' ''سانچ کو آنچ نہیں'' ''میری پہلی شرارت'' ''چاپلوسی'' ''قرض خواہ'' ''بیوی کی خوش آمد'' ''تغلق کے دور میں'' ''ٹیلی فون'' ''گرانی'' ''بیروزگاری'' ''سیکنڈ ہینڈ موٹرسیکل'' ''ناس'' ''رسم اجراء'' ''گھر کا جغرافیہ'' ''قصہ پہلی چھتری کا'' ''قصہ دوسری چھتری کا'' ''اعضائے رئیسہ اور سر'' ''گواہ'' ''انتساب'' ''التجا مکرر'' ''جنسی تعلیم'' ''عیاں مگر'' ''سائیڈ سے چلئے'' ''کرایہ کا مکان'' ''ریڈی میڈ عید'' ''حاتم طائی'' ''مشترکہ مکان'' ''ہم نے بھی کبڈی کھیلی'' ''نقلستان'' ''حجام کی دوکان'' ''بیمہ'' ''مزاج پرسی'' ''ملاوٹ'' ''ٹیلی فون'' ''بندکواڑ'' ''ریڈیو سے عشق'' ''ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں'' ''ادیبوں کے پریم پتر'' ''غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی'' ''قصہ پہلے گریجویٹ کا'' ''مجھے میرے دھوبی سے بچاؤ'' ''یہ رکشہ والے'' ''سند باد جہازی کا سفرنامہ'' ''دوڑا دئے گھوڑے ہم نے'' ''ناز اُٹھانے کو رہ گئے ہم ڈاکٹروں کے'' ''ہوٹل شبانہ'' ''انتخاب نعرے'' ''مجھ سے ملئے'' ''میں اور میرا مزاح'' ''ہائے وہ مجرد زندگی'' ''آٹو رکشہ'' ''چمچہ'' ''گوشت کی دکان'' ''ناک'' ''چھیڑ چھاڑ'' ''چوڑی کے غلام'' ''چھیڑ غالب سے چلی جائے اسد'' ''امریکہ پلٹ'' ''ایک ویزے کا سوال ہے بابا'' ''امریکہ کا چکر'' ''بیروزگاری'' ''کرکٹ نامہ'' ''گدھا گوشت'' ''جنت امکانی'' ''اردو کے شیر انگریزی کے شیر تک'' ''مارکٹنگ گائیڈ'' ''بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا'' ''میں تلسی تیرے فلیٹ کی'' ''چلتا پھرتا لٹریچر'' ''مرزا غالب اور ازار بند'' ''شادی کا سوٹ'' ''مردہ بدست زندہ'' (غربت) ''دکھتی رگیں'' ''سنی سنائی'' ''خلاء'' ''کہیں دیکھا'' ''بڑے موذی کو مارا'' ''رونا'' ''بیٹھنا'' ''کھڑا ہونا'' ''بھاگنا'' ''لکھنا'' ''برناڈ شاہ'' ''آدھی تنقید آدھی تاریخ'' ''سائیکل'' ''مردم شماری سے مردم آزاری تک'' ''سارے جہاں میں دھوم ہمارے کچن کی ہے'' ''مرزا'' ''گدھ جو عنقاء ہوئے'' ''ڈرتا ہوں آئینہ سے'' ''سو میں سے بارہ'' ''لگے ہاتھوں'' ''واہ حیدرآباد'' ''سگ گزیدہ'' ''مرا شہر لوگاں سو معمور کر'' ''ہماری سڑکیں'' ''ہمارے بھی ڈاکٹراں کیسے کیسے''۔

شاعری

”غافل“ (غفلت) ”استقلال“ ”تلاطم“ (طوفان) ”موسم گرما“ ”مسدس قوم“ ”شہیدانِ وفا“ ”گمشدہ لکڑی“ ”چیونٹی اور انسان“ ”ایل مدراس“ ”گاؤں کا سہرا“ ”لمباڑن“ ”موٹ کا گیت“ (موٹ کا پانی) ”دیہاتن“ ”روتی صورت“ ”کب تلک“ ”تھوتماری کی“ ”غپ چپ“ ”خالہ اماں“ ”بدگمان بیوی کے خیالات“ (بدگمانی) ”اللہ دولت بہوت دے“ (مناجات) ”قائداعظم“ ”نکّو“ ”تمے کیا جی ٹٹولتے سو“ (تلاش و جستجو) ”قلی قطب شاہ“ ”سلطان العلوم“ ”بہادر یار جنگ“ ”گناہ“ ”سائیں کی صدا“ (فقیر) ”سوال“ ”مرد قلندر“ ”برکت قادری“ ”میرا وطن“ ”دکن“ ”جنتا کی عرضی“ ”بورا کتھا“ ”ڈنڈا کتھا“ ”سائنس“ ”بتکماں“ ”اِدے نادیشم“ ”مہاجن“ ”شاہ پور واڑی“ ”ہماری پڑوسن“ ”ایک کلرک کی بیوہ“ ”ساس بہو“ ”چھورا چھوری“ (لڑکا لڑکی) ”پہلی تاریخ“ (ملازم پیشہ) ”سانپ“ ”یاد“ ”ہراج کا پلنگ“ (جہیز) ”چمچے“ (خوشامد) ”دکن کی عورت کا انتظار“ (ہجر) ”ہمالہ کی چاندی“ ”دل کی تبدیلی“ (آپریشن) ”کنبی“ (کسان) ”چینی گڑیا“ ”سن ری گوری“ ”رستے“ ”جھاڑوتارہ“ (منحوسیت) ”آخری جمعگی“ ”پشکولہ“ ”لوک دوانہ“ ”ندی“ ”گجرات کے فسادیوں سے“ ”تعلیم“ ”جہیز“ ”بیروزگاری“ ”جاہل طالب کی فریاد“ ”دعوت کے مناظر“ ”انسان دوستی“ ”نانی ماں“ ”امن کمیٹی“ ”اردو“ ”تلنگانہ“ ”دکھنی شوہر لکھنوی بیوی“ (تہذیبی تصادم) ”شاخِ گل“ ”جہیز“ ”فیشن“ ”الیکشن“ ”چھوت چھات“ ”گناہ دروغ برگردن“ (جھوٹ) ”غائب دماغ دوست“ (نادان دوست) ”شاپنگ“ ”میرا کمرہ بے تکی جلترنگ“ ”مکان بنا ڈالا“ ”کباڑ خانے سے میوزیم تک“ ”میری مرغیاں“ ”بی جمالو“ ”گنڈی پیٹ کا پانی“ ”اگر اللہ میاں عورت ہوتے“ ”اُجاڑ صورت“ ”امتحان کا بخار“ ”ہماری دھوبن“ ”آپ کا ڈرائنگ روم“ ”سوئیاں پوت والی“ ”یومِ خواتین“ ”خواتین اور نمائش“ ”دشمن بنانے کا فن“ ”عید کا دن“ ”جھوٹ کی تائید میں“ ”کچھ چائے کے بارے میں“ ”نام بڑا اور......“ ”گنڈی پیٹ کا پانی“ ”بیکاری کے مشغلے“ ”شادیوں کا موسم“ ”لئیق صلاح......“ ”سن تو سہی“ (رکشہ) ”حجام کا آئینہ“ ”اگر میں“ ”آج کا اخبار“ ”بلی چلی حج کو“ ”شاعر اور ساغر“ ”حق مغفرت کرے“ ”خاں صاحب“ ”ہرفن مولا“ ”خدا بخشے“ ”بچہ باہر گیا“ ”لاڈ بازار“ ”جلسے“ ”گویم مشکل“ ”پانی“ ”ہمارے بھی ہیں امتحان“ ”بدیسی مال“ ”بنام“ ”میرا پہلا مزاحیہ مضمون پڑھنا“ ”ہلمٹ“ ”سولہ برس کا سن“ ”ہزاروں خواہشیں ایسی“ ”حیدرآباد کی سڑکیں“ ”آٹو والے“ ”فن چمچہ گری“ ”بے بی“ ”خوش رہنا بھی ایک فن ہے“ ”دلاسا“ ”من مانی“ ”مر گئے ہم جیتے جی“ ”چپکے سے“ ”انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے“۔

نثر کی بہ نسبت شعراء کے یہاں دکنی زبان کا لب و لہجہ دکنی تہذیب اور دکن کی سرزمین سے متعلق موضوعات زیادہ نظر آتے ہیں۔اس کے برخلاف نثر میں وہ تمام موضوعات ملتے ہیں جو اردو شاعری کا طرّہ امتیاز سمجھے جاتے ہیں۔دکن کی خواتین نے بھی مزاح میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے یہاں جو موضوعات ملتے ہیں وہ اس لئے منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ ان میں نسوانی دنیا کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔جیسے ''میری مرغیاں'' ''لڑکا باہر گیا'' ''شاپنگ'' ''میرا کمرہ'' وغیرہ ان مضامین کا اسلوب بھی اپنے خالق کے Feminism کی چغلی کھاتا ہے۔

اب چند ایسے قلم کاروں کا اجمالی تذکرہ کیا جائے گا جنھیں عوامی مقبولیت نہ مل سکی لیکن ان کی تخلیقات نے سماج کے مختلف مسائل کا احاطہ کیا ہے۔

1857ء کے بعد سارے ہندوستان میں غیر یقینی صورتحال پیدا ہوگئی تھی۔ایسے میں اے۔او۔ہیوم (Allan Octavian Hume) نے 1885ء میں انگریزی حکومت کے مفاد کی غرض سے انڈین نیشنل کانگریس قائم کی۔جس میں چند ہندوستانی بھی شامل تھے۔ان ہی ہندوستانیوں میں ایک منشی محمد سجاد حسین بھی تھے۔کانگریس نے بہت جلد عوام میں اعتماد پیدا کیا اور ہندوستان میں پہلی مرتبہ سیاسی بے چینی عام ہوئی۔انگریزوں کے دیش نکالے کا جو نعرہ سراج الدولہ نے بنگال سے، ٹیپو سلطان نے میسور سے بلند کیا تھا، اب ہندوستانی فضاؤں میں گشت کرنے لگا۔اور دیکھتے ہی دیکھتے شمالی ہند میں کانگریس نے باقاعدہ تحریکوں سے انگریزی حکومت کے خلاف مورچہ کھول دیا تھا۔سیاسی جلسے، جلوس اور احتجاجی مظاہرے ہوتے اور گرفتاریاں ہوتیں ساتھ ہی انگریزی مظالم میں اضافہ ہوتا رہا۔آزادی کے لئے سماج کے ہر طبقے کے لوگ تحریک آزادی کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ایک طبقہ انگریزی تعلیم اور طرز معاشرت کے وکالت کررہا تھا تو دوسرا طبقہ اس کا شدید مخالف تھا۔پہلے طبقہ کی نمائندگی سرسید احمد خاں کررہے تھے۔انھوں نے اپنے انشائیوں کے دل نشین اسلوب سے اردو داں حلقے میں ہلچل سی مچادی تھی۔سرسید انگریزوں سے نالاں منشی سجاد حسین نے 1877ء میں اپنے رفقاء*** کے ساتھ اپنا اخبار ''اودھ پنچ'' جاری کیا۔

منشی سجادہ حسین کٹر کانگریسی تھے۔اُس وقت پورے ملک پر انگریزی تسلط تھا ایسے میں انگریزوں سے ٹکر لینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔منشی سجاد حسین اور ان کے رفقاء نے اپنی تحریروں سے سرسید اور انگریزوں کے تضحیک اور ان

***منشی سجاد حسین کے علاوہ اکبرالہ آبادی، سید محمد آزاد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، سید عبدالغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر اور احمد علی شوق کسمنڈوی وغیرہ شامل تھے، جنھوں نے اپنی تخلیقات میں اپنے عصر کے معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی مسائل پیش کئے۔

کے خیالات پر طنز کرنا شروع کیا۔ اور اس طرح اردو ادب میں طنز و مزاح کا آغاز ہوا۔ جس وقت پورے ملک میں سیاسی اُتھل پتھل تھی اس وقت جنوبی ہند میں اضطراب آمیز سکون تھا۔ دکن میں نظام کی حکومت تھی جہاں امن و آشتی کا دور دورہ تھا اور علم و فضل کے دریا بہہ رہا تھا۔

بیسویں صدی سے قبل ہی حیدرآباد میں اردو طنز و مزاح کا آغاز ہو چکا تھا۔ شمالی ہند کے اخبارات اور ''اَودھ پنچ'' میں شائع ہونے والی تخلیقات سے متاثر ہو کر حیدرآباد کے مزاح نگاروں نے بھی عصری مسائل کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ حیدرآباد علم و ادب کا مرکز بن رہا تھا۔ یہاں چونکہ سیاسی استحکام تھا اس لئے طنز و مزاح کا فروغ ممکن نہ تھا۔ نظام سادس میر محبوب علی خاں ایک علم پرور اور علم دوست حکمراں تھے۔ ان کے عہد میں علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت کا کام عروج پر تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد طیب انصاری لکھتے ہیں۔

> ''ناصر الدولہ کے عہد آفرین دور سے اردو نثر میں تاریخی مذہبی اور علمی کتابیں شائع ہوئیں۔ لیکن میر محبوب علی خاں کے زمانے میں ادبی موضوعات کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ سفرنامہ، ناول، افسانہ، ڈرامہ، تحقیق، تاریخ ادب، تنقید، انشائیہ، ادبی سوانح یا خاکہ نگاری، طنز و مزاح، مکتوبات، تمہیدات و تقریضات، لسانیات، لغت، اقبالیات اور صحافت سے متعلق کارنامے منظر عام پر آئے۔'' (57)

حیدرآباد میں طنز و ظرافت کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے درمیانی وقفے پر محیط ہے۔ بعض دانشوروں نے اس کا قطعی نقطۂ آغاز متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر کی زیر نگرانی لکھے گئے مقالے ''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو و نما'' میں مقالہ نگار انیسہ سلطانہ نے سید عبدالکریم نور کو حیدرآباد کے سب سے پہلے مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور مرزا فرحت اللہ بیگ کو پہلا مزاحیہ نثر نگار قرار دیا ہے۔

اس دور کے مزاح نگاروں میں ایک نام عظمت اللہ خاں کا بھی ملتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ اور عظمت اللہ خاں میں بعض امور مشترک ہیں۔ دونوں انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں پیدا ہوائے۔ دونوں ہم عصر مزاح نگار تھے۔ نیز دونوں کا مقام پیدائش دہلی اور مقام ملازمت حیدرآباد ہے۔ عظمت اللہ خاں 1887ء میں پیدا ہوئے۔ وہ

بنیادی طور پر مزاح نگار نہیں ہیں۔لیکن ''مضامین عظمت'' میں شامل دس مضامین مزاحیہ اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ان کے علاوہ دو ڈراموں میں بھی مزاح کے نقوش واضح نظر آتے ہیں۔طنزیہ مضمون ''کشش صنف سخن کیا ہے'' ان کے فن کی بہتر نمائندگی کرتا ہے۔مضمون ''گڑیا خانہ'' میں مزاح فلسفیانہ رنگ میں ہے۔''اٹوائی کھٹوائی'' میں سنجیدگی بھی شامل ہوگئی ہے۔تحریریں لطف مزاح سے مزین ہیں۔اسلوب کی تشکیل میں بعض جگہ انگریزی سے بھی مدد لی گئی ہے۔

ہندوستان کی آزادی سے پہلے جن مزاح نگاروں نے اردو میں فکاہی ادب کو مزید مستحکم کیا ان میں مولوی زین العابدین کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔مولوی زین العابدین کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ان کے والد کا نام قاضی بدرالدین تھا۔کم عمری ہی سے مضامین لکھنے لگے تھے۔1917ء میں انھوں نے ایک انگریز کمشنر کی فرمائش پر ایک ڈرامہ ''فکر کرو'' لکھا جس کے دو اہم کردار سرپٹ اور چوپٹ ہیں۔وہ کرداروں کی مدد سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔انتہائی لطیف پیرائے میں تحریر کردہ یہ ڈرامہ ادبی لطافتوں اور خاکہ نگاری کی تمام تر خوبیوں سے مملو ہے جگہ جگہ مزاح کی چاشنی موضوع کی سنجیدگی کے باوجود ایک خاص قسم کی شگفتگی کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔

محمد شفیع الدین ناکارہ کی عوامی شہرت کا درجہ آوارہ کے بعد ہے۔ابتدائی تحریریں سنجیدہ ہیں۔ان کے بعد مزاحیہ تحریریں ملتی ہیں۔مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''صدائی'' 1935 میں شائع ہوا اس میں جملہ گیارہ مضامین ہیں۔اس مجموعے میں شامل مضامین میں ''صدائی'' اور ''بیوی آخر بیوی ہے'' قابل ذکر ہیں۔ناکارہ کا سماجی شعور پختہ ہے۔وہ طنز و مزاح کے استعمال سے واقف ہیں۔خواجہ عبدالغفور ناکارہ کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''حیدرآباد کے ادب پرور ماحول میں اپنی ظرافت بھری تحریروں سے چمکے اور ناکارہ نام کے باوجود کامیاب ثابت ہوئے۔رہبر دکن کے مزاحیہ کالم بھی لکھتے تھے۔اکبرالہ آبادی کے پیرو۔مزاحیہ افسانے' ڈرامے' خاکے اور مضامین دلچسپ پیرائے میں لکھتے ہیں۔'' (58)

اسحٰق ایوبی 11 مئی 1916 کو مالیگاؤں' مہاراشٹر کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔مالیگاؤں سے ہی میٹرک کرنے کے بعد بہاؤالدین کالج جونا گڑھ سے بی اے کیا اور واڈیا کالج پونا سے ایم' اے کی تکمیل کی۔

1946ء سے 1954ء تک مہاراشٹر کے محکمہ نشر و اشاعت میں شعبہ اردو کے انچارج رہے بعد میں پریس انفارمیشن بیورو میں شعبہ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے کام کیا۔اس کے بعد حیدرآباد منتقل ہوئے اور انفارمیشن کمشنر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔1974ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

اسحاق ایوبی مزاحیہ نظم و نثر سے لکھتے ہیں۔نثر پر زیادہ نظر ہے۔ان کا پہلا مضمون ''ہاکر'' ماہنامہ ''صبا'' ڈسمبر 1963 میں شائع ہوا۔''قرض کا فلسفہ''''معاشیات اور آرٹ'' شعراء شاعری اور مشاعرہ ''بچپن، جوانی اور بڑھاپا'' اور ''آم شہد کا جام''''فلمی صنعت''''ادیبوں کی اقسام''''پتنگ بازی''''راتوں کی باتیں''''پیشے اور اہل پیشے''''انٹرویو'' وغیرہ ان کے نمائندہ مضامین ہیں۔اسحاق ایوبی زبان و بیان اور فن پر خاص توجہ دیتے ہیں۔انہیں سماجی اصلاح سے دلچسپی ہے۔ان کی خوش طبعی میں شائستگی شامل ہوگئی ہے۔

نثر نگاروں میں رشید قریشی اچھی جگہ کے مستحق ہیں۔ان کی پیدائش 17 جون 1920 کو حیدرآباد میں ہوئی۔رشید قریشی کے مضامین، انشائیوں اور افسانوں کا مجموعہ ''من کی دنیا'' 1938 میں شائع ہوا۔اس مجموعہ میں شامل ''تانگے والا'' ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ہے۔مزاح شریف ان کی ایک اور اہم تصنیف ہے جس میں ایک ڈرامہ ایک انشائیہ اور تیرہ مضامین ہیں۔بیوی کی سہیلیاں' کبریٰ بیگم' بردکھاوا' آنا دولہوں کا دیر سے' کیا کیا نہ کیا شادی کے لئے اور دوسری بیوی کا پہلا شوہر وغیرہ ان کے مزاح پارے ہیں۔عنوانات سے موضوعات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔مزاح کا معیار شائستہ ہے۔ان کا ایک اور مجموعہ ''مزاح لطیف'' ہے جس میں انھوں نے ہنسنے ہنسانے سے زیادہ مطلب رکھا ہے۔

عہد آصفیہ کے آخری عہد میں طنز و مزاح کی طرف جن قلم کاروں نے توجہ دی ان میں ایک نام چندا حسینی کا بھی ہے۔ان کی کتاب ''نمک دان'' مزاحیہ پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ان کے ہم عصر مزاح نگاروں میں تمکین کاظمی قابل ذکر ہیں۔

حیدرآباد کے مختلف رسالوں میں طنز نگاروں نے اپنی تخلیقات سے طنز و مزاح کو فروغ دیا۔ابراہیم جلیس' مخدوم' عبدالرزاق لاری' وہاب حیدر' حیدرآباد سے ابھرے تو پریم دھون' کیفی اور قاضی عبدالغفار جیسے ترقی پسند شاعر بیرون جنوبی ہند سے وارد ہوئے۔جنہوں نے حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کو اپنے طنز کے تیروں کا نشانہ بنایا۔اور

اس کی ہر طرح سے مذمت کی۔ ان نمایاں طنز نگاروں میں نورالحسن، ظفرالحسن، زینت ساجدہ، عاتق شاہ اور ابراہیم جلیس کے نام قابل ذکر ہیں۔

آزادی سے کچھ عرصہ پہلے ہندوستان اور حیدرآباد میں سیاسی تحریکیں عروج پر تھیں۔ عوام ایک نئی طرز حکومت کے خواہشمند تھے۔ معاشرتی تہذیبی تعلیمی ادبی اور صحافتی اقدار میں تبدیلیاں ہورہی تھیں۔ اس دور کے اہم مزاح نگاروں میں ابراہیم جلیس کا ذکر اہم ہے۔

ابراہیم جلیس کی ولادت 22 ستمبر 1923 کو گلبرگہ میں ہوئی۔ انہوں نے سنجیدہ اور مزاحیہ نثر نگاری میں اپنے جوہر دکھائے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''زرد چہرے'' 1942 میں شائع ہوا۔ ''دو ملک ایک کہانی''، ''چالیس کروڑ بھکاری''، ''چور بازار'' اور ''شیروانی اندر پریشانی''، ''شگفتہ شگفتہ''، ''بھوکا ہے بنگال''، جنگل میں منگل'' اور ''ہنسے تو پھنسے'' وغیرہ ان کی اہم تخلیقات ہیں۔ جلیس کا پسندیدہ موضوع سیاست ہے۔ ان کے مضامین میں طنز کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔

آزادی سے قبل جن مزاح نگاروں نے طنز و مزاح کے میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ان میں شاکر کا نام بھی شامل ہے۔ شاکر کے بارے میں زیادہ تفصیل ہمیں آج دستیاب نہیں، صرف اُن کا قلمی نام ہی محفوظ رہ گیا۔ شاکر نے اپنی ظرافت نگاری کا آغاز کب کیا اس بات پر محققین کی نظر شاید اب تک نہ پڑسکی۔ شاکر کی ایک کتاب ''چلم گزٹ'' کے نام سے فبروری 1946ء میں عبدالحق اکیڈیمی اشاعت منزل، کوچہ عبدالحق حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ شاکر کے فن ظرافت میں بے ساختگی اور شگفتگی عیاں ہے۔ ان کے طنز میں تلخی نہیں بلکہ ایک طرح کی شیفتگی پائی جاتی ہے۔ آزادی سے پہلے دکن میں مزاح نگاروں کے قافلے کے شاکر بھی ایک راہرو ہیں۔

رشیدالدین نے 1956ء سے مزاحیہ مضامین لکھنے کی۔ ''خواہ مخواہ'' ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ دوستوں کی خصوصیات، نوکروں کی ستم ظریفیاں اور پروفیسروں کی حماقتیں، میں اور میرا مزاح، وغیرہ ان کے شاہکار مضامین ہیں۔

احسن علی مرزا بنیادی طور پر صحافی ہے۔ سیاست ان کا مرغوب موضوع ہے۔ ان کے مضامین طنزیہ ادب کا حصہ ہے۔ طنزیہ مضامین کا مجموعہ ''زہر خند'' 1967 میں شائع ہوا۔ کانا دجال اور چوکھا ان کے طنزیہ تخلیقات کی

مثالیں ہیں۔اُس دور میں زینت ساجدہ اور جیلانی بانو نے انشائیوں پر زیادہ توجہ دی ہے۔

مزاحیہ ڈرامہ نگاروں میں اظہر افسر کی حیثیت نمائندہ ہے۔اظہر افسر نے 1927ء کو حسینی علم حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے میں آنکھ کھولی۔ان کی اصل نام مرزا اظہر جان بیگ جانِ جاناں ہے۔1945 سے 1948 تک روز نامہ ''میزان'' میں بچوں کا صفحہ مرتب کرتے رہے۔دو سال ماہنامہ ''سب رس'' کے بچوں کے صفحہ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ان کے مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ ''بھول ہی بھول'' کے نام سے شائع ہوا۔تنگ شیروانی' رشتہ' وغیرہ ان کے معروف ڈرامے ہیں۔تحریروں میں مزاح کی زیادتی کے علاوہ جزوی طنز بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

عوض سعید کا شمار حیدرآباد کے مقبول قلم کاروں میں ہوتا ہے۔بنیادی طور پر افسانہ نویسی ان کا میدان ہے لیکن انھوں نے کئی خاکے بھی لکھے ہیں جن میں مزاح کے نقوش واضح طور پر محسوس کئے جاسکتے ہے۔عوض سعید 6 ڈسمبر 1933ء کو حیدرآباد کے علاقے ملے پلی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم انوار العلوم ہائی اسکول میں ہوئی۔ 1948ء میں سٹی کالج سے انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی۔بی اے کے دوران ہی انھیں ملازمت ملی جس کی وجہ سے وہ گریجویشن کی تکمیل نہ کرسکے۔ان کے پانچ افسانوی مجموعے اور ایک خاکوں پر مشتمل تصنیف ''خاکے'' (جون 2006ء) شائع ہوچکی ہے۔مخدوم' جیلانی بانو اور حبیب حیدرآبادی پر لکھے خاکے دل کو چھوتے ہیں۔عوض سعید کے خاکوں کی اہم صفت ان کا خلوص ہے جسے وہ ہر شخص میں تلاش کرتے ہیں۔وہ اپنے انداز دل آویز افسانہ نگار ہی نہیں' مرقع نگار کی حیثیت سے بھی ان کا قد اونچا ہے۔

تقسیم وطن کی وجہ سے برپا ہونے والے فسادات سے لوگوں کے ہونٹوں سے ہنسی چھن گئی تھی۔ادھر دکن میں پولیس ایکشن ایک ایسا سانحہ تھا جسے آج بھی یاد کرکے اُس نسل کے لوگ کانپ اٹھتے ہیں۔تلخیوں کے اس دور میں ظرافت نگار ہی نہیں افسانہ نگار کالم نویس شاعر سب ہی طنز نگاری پر اتر آئے تھے۔بقول ایس جے صادق۔

> ''تاریخ کے بدلتے ہوئے دھارے کے باعث ہندوستان ہی کیا سارے عالم میں طنز دبے پاؤں جدید تخلیقی ادب کے ایوانوں میں داخل ہونے لگا۔اس کی چاپ کو کسی نے محسوس کیا اور کسی نے نہیں۔مگر یہ ردعمل عالمگیر تھا۔خصوصاً ہندوستان کے حالات طنز کے لئے بڑے ہی سازگار

تھے۔ یہ طنز کبھی تو سخت تلخیوں کی صورت میں اور کبھی تو زہرناکیوں، تلخ اندیشوں، قنوطیت پسندی کے رجحان لے کر ظاہر ہوتا اور کبھی مزاح کی ہلکی سی چاشنی لئے ہوتا۔'' (59)

حیدرآباد میں مزاحیہ ہفتہ وار اخبار ''دکن پنچ'' 28 فروری 1887ء کو جاری ہوا۔ اس کے مدیر پنڈت کشن راؤ تھے۔ پانچ سال بعد یعنی 1892ء میں ''دکن پنچ'' کا نام بدل کر ''مشیر دکن'' رکھا گیا۔ شاعر وقار خلیل اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

''دکن پنچ کو ''مشیر دکن'' کا نام دے کر روزنامہ کر دیا گیا۔'' (60)

پنڈت کشن راؤ اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی زبان سے واقف تھے۔ ان کی ادارت میں ''مشیر دکن'' نے ترقی کے کئی منازل طئے کئے۔ انھیں اُس وقت اچھے قلم کاروں کی خدمات حاصل تھیں۔ انیسہ سلطانہ لکھتی ہیں۔

''مشیر دکن کے ایڈیٹر کشن راؤ ایک قابل آدمی تھے۔ اردو کے ساتھ فارسی اور انگریزی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ انہوں نے حیدرآباد کے چند اہل قلم کا تعاون حاصل کر کے رسالے کو خاصی ترقی دی۔ اس کے اہم مضمون نگاروں میں عبدالقادر، امیر عزاء مرتضیٰ، حکیم شمس اللہ قادری اور عزیز بیگ وغیرہ تھے۔ مشیر دکن'' کی پالیسی میں اودھ پنچ کی طرح حکومت پر سختی سے طنزیہ نکتہ چینی کرنا شامل نہیں تھا۔'' (61)

مشیر دکن'' کے اداریے مزاحیہ پیرائے میں لکھے جاتے تھے اور ایسے عنوانات پر تحریر کئے جاتے کہ پڑھتے ہی بے ساختہ ہونٹوں پر تبسم کھل اُٹھتا۔ چند عنوانات یہ ہیں۔ ''آزادی و بے پردگی کی الجھن''، ''پولیٹیکل گھن گھور گھٹا''، ''شفاخانہ افضل گنج''، ''سررشتہ تعلیمات''، ''انجینئرنگ اسکول کی افسوسناک حالت'' اور ''اعلیٰ عہدیداروں کا الاؤنس''، ''تخفیف کا اکاؤنٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے''، ''مسلمان اور نیشنل کانگریس''، رعایا ہند کی وفا شعاری'' وغیرہ وغیرہ۔

مشیر دکن کے ایڈیٹر کشن راؤ 1932ء میں انتقال کر گئے جس کے چند عرصہ بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ مشیر دکن

کو وہ شہرت نہ ملی جو اودھ پنچ کے حصہ میں آئی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مشیر دکن'' نے اپنے دور کے لحاظ سے حیدرآباد میں طنز مزاح کے فروغ میں اہم حصہ ادا کیا اور بوجھل ذہنوں کو تسکین پہنچانے کا سامان فراہم کیا۔

حیدرآباد میں 1942 میں ایک رسالہ ''جیت'' جاری ہوا۔ اس کے مدیر مرزا عصمت اللہ بیگ تھے جو خود بھی ایک اچھے مزاح نگار تھے۔ اس رسالے نے عرصہ تک طنز و مزاح کی آبیاری کی۔ دراصل یہ رسالہ فوجیوں کی دل بستگی کے لئے شائع ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس میں اعلیٰ پایے کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین شائع ہوا کرتے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اور اکبرالہ آبادی جیسے اعلیٰ پایے کے ظرافت نگاروں کی تخلیقات اس رسالے میں شائع ہوا کرتیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد انورالدین لکھتے ہیں۔

> ''اس رسالہ میں ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین اور غزلیں و نظمیں، لطیفے اور دلچسپ قصے کہانیاں اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار مضامین درج ہوتے تھے۔'' (62)

حیدرآبادی صحافت میں طنز و ظرافت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ سماجی، سیاسی حالات کی پیش کش میں کالم نگاری نے اہم رول ادا کیا۔ حیدرآباد کے اخبارات ''پیام''''میزان''''رہبر دکن'' اور ''وقت'' وغیرہ میں مزاحیہ کالم لکھے جانے لگے۔ حیدرآباد کے کالم نگاروں میں قاضی عبدالغفار اور شاہد صدیقی اہم نام ہیں۔ جنھوں نے نئے میلانات کے باوجود حیدرآبادی مذاق کو ملحوظ رکھا۔ بقول ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال آزادی سے قبل حیدرآباد کے روزناموں کا اپنا ایک مخصوص معیار تھا ان اخبارات کے طنزیہ و مزاحیہ کالم اسی مزاج کے غماز تھے۔ (63)

قاضی عبدالغفار سنجیدہ تخلیقی ادب میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ انہوں نے صحافت سے بھی سروکار رکھا۔ وہ اپنے کالموں کے ذریعہ مزاحیہ ادب میں انفرادیت قائم کرتے ہیں۔ اخبار ''پیام'' میں ان کا کالم 'سرراہ' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے عہد کے مسائل موثر انداز میں پیش کرتے رہے۔ ان کے فقروں میں طنز زیادہ اور مزاح کم ہے۔

1950ء میں حیدرآباد کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں۔

''آزادی کے بعد'حیدرآباد کے پس منظر میں خوشگوار اور ناخوشگوار طرح طرح کی واقعات تھے۔دوسری جنگ عظیم کی باقیات'تقسیم ہند' ملک کی آزادی'سقوط حیدرآباداور پھر معاشی ابتری' کساد بازاری'ٹوٹتے بکھرتے اور بچھڑتے خاندان'تہذیبی قدروں کا زوال'فرقہ وارانہ فسادات'لسانی نقشے میں تبدیلی'اردو کا دیس نکالا'یہ اور ایسی کئی باتیں!''(64)

جامعہ عثمانیہ کہ قیام کے بعد کا دور کافی اہم ہے۔جامعہ عثمانیہ میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز 17 اگست 1919 سے ہوا۔جامعہ کی اردو کو ایک اہم دین اس کے تخلیق کار ہیں۔آزادی سے پہلے حیدآباد میں شاہی حکومت تھی۔اس عہد کے مزاحیہ ادب میں اقتدار اور سیاست پر طنز کی نشاندہی مشکل ہے۔سماجی موضوعات طنز بھی کم ہے۔اس کی وجہ شاید حیدرآباد کی روایتی تہذیب ہو۔مزاح زیادہ فروغ پاتا رہا۔لیکن بیسویں صدی کے ابتدا میں حیدرآبادی مزاح نگاروں نے شمالی ہندوستان میں رونما ہونے والی سیاسی' سماجی' ثقافتی' علمی اور ادبی تبدیلیوں کے اثرات قبول کئے۔چنانچہ بیشتر مزاح نگاروں نے طنز اور مزاح دونوں میں دلچسپی لی۔ان ہی میں ایک نام ہے جلال الدین اشکؔ۔

جامعہ عثمانیہ کے اولین فارغین میں جلال الدین اشکؔ منفرد مزاح نگار ہیں۔اشکؔ نے 1925ء میں بی اے کی تکمیل کی۔1927ء میں ایل ایل بی کیا۔انہوں نے نظم اور نثر میں تخلیقات پیش کیں۔ان کے تین مجموعے ہیں ان میں ''شیطان کا انتقام''نثری مجموعہ''سلک گوہرین''منظوم ڈرامے اور''گرگٹوں کا شہر''شعری مجموعہ شامل ہے۔''شیطان کا انتقام میں اشکؔ نے شاعری'افسانہ نگاری'اور صحافت پر شدید طنز کیا ہے۔ان کی تخلیقات میں شعور کی پختگی اور طنز ومزاح میں گہرائی نظر آتی ہے۔ڈاکٹر زینت ساجدہ اشکؔ کے تعلق سے لکھتی ہیں۔

''شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی ان کی تصنیف''شیطان کا انتقام''اور سلک گوہرین'' شائع ہوچکی ہیں۔شیطان کا انتقام ایک طنزیہ ہے جو افسانوی انداز میں لکھا گیا ہے اس طنزیہ تحریر میں پروفیسر عبدالقیوم نے لکھا ہے کہ تمہاری تہذیب شیطان کا انتقام ہے جو انسانوں کے بچوں کے ساتھ لیا جارہا ہے۔''(65)

اشکؔ سرسری انداز میں اپنی بات کہتے ہیں جس کی بناء پر ان کی تحریر ادبی لطافت‘ طنز کی افادیت اور گہرائی ومعنویت سے عاری نظر آتی ہے۔اسی طرح ’’بے پر کی......‘‘ کے خالق آوارہ بلگرامی ہیں۔ان کی تحریروں میں چبھتا ہوا طنز اور ہلکا پھلکا مزاح پایا جاتا ہے۔

اسی عہد کے ایک اور مزاح نگار مسلم ضیائی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔اسی لئے ان کے ہاں روسی طنزیہ ومزاحیہ ادب کا عکس نظر آتا ہے۔انھوں نے روسی ادب کے اثرات کو اردو طنز ومزاح میں استعمال کیا۔انھوں نے روس کے معروف طنز ومزاح نگاروں کی تخلیقات کا اردو ترجمہ کر کے ’’روسی ظرافت‘‘ کے عنوان سے 1944ء میں اردو محل حیدرآباد سے شائع کیا۔اس کتاب کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

> ’’دنیا کی دوسری زبانوں کے مانند اردو میں بھی روسی ادب کا ایک معتدبہ حصہ منتقل ہو چکا ہے۔لیکن اب تک روسی ظرافت کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی۔میں نے اس مجموعہ میں روس کے نمائندہ ظریفانہ داب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔‘‘(66)

’’روسی ظرافت‘‘ میں شامل مضامین میں طنز کی کاٹ گہری ہے۔سلیس اردو میں ترجمہ نگاری کا عمدہ نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔کرداروں اور مقامات کے نام اگر تبدیل کر دیے جائیں تو یہ ہمارے آس پاس کی دنیا لگے گی۔اس مجموعہ میں دس مضامین شامل ہیں‘ جس میں روڑا‘ دیوانے کی ڈائری‘اسکول ماسٹر‘ پیسہ اور کسان عمدہ مضامین ہیں۔

پروفیسر منظور الامین 1926ء کو ریاست حیدرآباد کے صوبہ برار کے شہر امراوتی میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم محمڈن ہائی اسکول‘ امراوتی میں ہوئی اور وہیں سے انہوں نے 1942ء میں میٹریکولیشن کا امتحان کامیاب کیا۔اس کے بعد کنگ ایڈورڈ کالج سے بی‘ اے اور مورس کالج‘ ناگپور سے ایم‘ اے اور یونیورسٹی آف لاء سے ایل ایل بی کی تکمیل کی۔ان کی تین تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔’’بدلتے رنگ‘‘(شعری مجموعہ)’’جلیں آتش کدے‘‘(شعری مجموعہ)اور نظامی گنجوی کی مثنوی کا منظوم ترجمہ ’’حدیث دِل‘‘ کے نام سے کیا۔وہ روزنامہ ’’ہمارا عوام‘‘ اور روزنامہ ’’منصف‘‘ سے بھی وابستہ رہے۔انہوں نے انشائیہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔وہ مشکل سے مشکل موضوع کو نہایت سادہ اور آسان انداز میں پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ان

کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''منظورالامین کی تحریروں میں جو مزاح ہے وہ دبا دبا سا ہے۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مضامین کی حدیں انشائیے سے جاملتی ہیں۔''(67)

محمد عبدالنعیم 30 ستمبر 1942 کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ بی کام کے بعد ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور سیکریٹریٹ میں ملازمت اختیار کی۔ ابتداء میں افسانے لکھے' چونکہ طبیعت میں بذلہ سنجی تھی چنانچہ جلد ہی طنز و مزاح کی طرف مائل ہوگئے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''گھر کا نہ گھاٹ کا'' 1977ء میں منظر عام آیا۔ان کی تحریروں میں روانی، شگفتگی، برجستگی کا عنصر نمایاں ہے۔ بیشتر مضامین میں اپنے آپ کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

محمد عبدالرؤف نام اور قلمی نام رؤف خیر ہے۔ رؤف خیر 5 ڈسمبر 1948 کو حیدرآباد کے قدیم محلّہ کاروان ساہو میں پیدا ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنے کا چسکہ لگا۔ان کا پہلا مضمون ''منہ'' روز نامہ رہنمائے دکن میں بچوں کے صفحہ کی زینت بنا۔1962-63 میں شعر گوئی کی طرف توجہ کی۔ ان کی پہلی غزل ماہنامہ ''شمع'' اگست 1966ء میں شائع ہوئی۔ مزاحیہ شعری تخلیقات کے علاوہ مزاحیہ مضامین اور انشائیے رسالہ ''شگوفہ کی زینت بنتے رہتے ہیں۔''محلّہ کانل'' اور ''ابوکلب'' اچھے مزاحیہ مضامین ہیں۔

یکم جون 1951ء کو ضلع نظام آباد ریاست آندھراپردیش کے ایک متوسط گھرانے میں محمد عبدالحنان کا جنم ہوا۔ بی ایس سی کرنے کے بعد لائبریری سائنس کا ڈپلوما حاصل کیا۔ نیو گورنمنٹ اینڈ سائنس کالج خیرت آباد میں بحیثیت اسسٹنٹ لائبریرین کارگذار رہے۔ پندرہ مزاحیہ مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ ''گستاخی معاف'' شائع ہو چکا ہے۔ان کی تحریروں میں مزاح کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ برجستگی اور روانی ان کے مضامین کی انفرادیت ہے۔ شکر کی تلاش' گستاخی معاف' اور غائب ہونا پٹرول کا' الیکشن اور ہم' کاتب حضرات اچھے مضامین ہیں۔ بعض مضامین میں زبان اتنی اچھی نہیں ہے۔ الفاظ کی تکرار بھی سماعت پر گراں گذرتی ہے۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھئے۔

''جنھوں نے نشان میٹ میٹ کر اور دوڑ دوڑ کر پانچ سات مرتبہ حق رائے دہی کا استعمال کر کے ہماری حوصلہ افزائی کی۔''(68)

جملوں کی طوالت اور لفظوں کی تکرار سے قطع نظر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں پختگی ضرور آئے گی۔

محمد علی رفعت حیدرآباد کے ایک علمی گھرانے میں 24 مارچ 1954 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد رحمت علی پولٹیکل سائنس کے استاد کی حیثیت جانے جاتے ہیں۔ محمد علی رفعت کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ 1987ء میں وہ IAS کے لئے منتخب ہوئے۔ وہ ایک طویل عرصہ سے زندہ دلان حیدرآباد سے وابستہ ہیں۔ ان کے کئی مزاحیہ مضامین اور غزلیں ماہنامہ ''شگوفہ'' میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اِن دنوں انگریزی کے معروف طنز و مزاح نگار مارک ٹوئین کی تخلیقات کا ترجمہ سلسلہ وار ''شگوفہ'' میں شائع کر رہے ہیں۔

ارشد علی خاں کا شمار حیدراآباد کے اچھے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ ''چراغ پا'' اور ''کام و دہن'' کے عنوان سے ان کی دو مزاحیہ کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''شوشے'' 1979ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں بارہ مضامین شامل ہیں۔

ارشد پطرس بخاری سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ پطرس کی طرح ان کے مزاح میں شستگی اور وقار معلوم ہوتا ہے۔ ابتذال اور پھکڑ پن سے ان کی تحریریں کوسوں دور ہیں۔ ان کے پاس موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ مرزا اور کُتّا، فن عروض، ابہام اور ہم، فال نامہ، مونگ، ضرورت ہے، اچھے مضامین ہیں۔ ''فن اور عروض'' اور ''ابہام اور ہم'' ایسے موضوعات ہیں جس میں قاری کی فن عروض اور شاعری سے واقفیت ضروری ہے ورنہ اس مضمون کے پڑھنے کا لطف جاتا رہتا ہے۔ بعض مضامین میں وہ طنز و مزاح میں توازن برقرار نہیں رکھتے۔ بعض مضامین کا آغاز وہ بہت اچھا کرتے ہیں لیکن اختتام کو پہنچتے پہنچتے ان کی گرفت قلم اور مزاح دونوں پر کمزور پڑ جاتی ہے۔

سید طالب حسین زیدی حیدرآباد کے ایسے مزاح نگار ہیں جو زبان و بیان کے لحاظ سے بہت ہی بلند مقام پر فائز ہیں۔ وہ اردو ادب کے معروف مزاح نگار کرنل محمد خاں سے بے حد متاثر ہیں شاید اسی لئے انہوں نے اپنے مجموعے کا نام بھی کرنل محمد خاں کی کتاب ''بجنگ آمد'' کی طرز پر ''بزور آمد'' رکھا ہے۔ 2001ء میں شائع ہوئی ان کی اس تصنیف میں 16 مضامین شامل ہیں۔ بوفیٹ تیار ہے، دلی کو ہم نے بھی دیکھا، اچھے مضامین ہیں۔ طالب حسین زیدی اپنے اسلوب سے ایک منفرد ماحول پیدا کرتے ہیں۔ وہ زبان و بیان پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ

سلیس اردو میں لکھتے ہیں لیکن کہیں کہیں دکنی الفاظ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو تحریر میں لطف پیدا کرتے ہیں۔

زندہ دلوں کے اس شہر کے سلطان سبحانی بھی باسی ہیں۔ مصری گنج علاقے میں ان کی رہائش ہے۔ سلطان سبحانی کی تخلیقات روزنامہ ''منصف'' ماہنامہ ''شگوفہ'' کے علاوہ ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ پڑوسی ان کا ایک اچھا مضمون ہے جس میں پڑوسیوں کی بیجا کرم فرمائیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ وہ عام سلیس اردو میں لکھتے ہیں لیکن دکنی الفاظ اور روزمرہ بھی لاشعوری طور پر ان کی تحریروں میں درآتے ہیں۔

میر فاروق علی بھی حیدرآبادی مزاح نگاروں کے قافلے کے راہروں ہیں۔ وہ شگوفہ کی انتظامیہ میں بھی شامل رہے۔ محکمہ آبکاری میں ملازمت کرتے ہیں اور ادب میں ظرافت کے گل بوٹے کھلاتے ہیں۔ ان کی مزاحیہ تخلیقات پر مشتمل تصنیف 1994ء میں منظر عام پر آئی۔ ''EAMCET عقل مند بیٹے اور ہوشیار باپ کا امتحان'' اس مجموعہ میں شامل ایک عمدہ مضمون ہے۔ وہ راست طور پر کسی ہدف طنز نہیں بناتے بلکہ باتوں باتوں میں طنز کی کڑوی گولی مزاح کی شیرنی کے ساتھ کھلا دیتے ہیں۔ مضحک واقعات کو طنزیہ انداز میں پیش کرنے میں انھیں خوب مزہ آتا ہے۔

عہد حاضر کے مزاح نگاروں میں حمید عادل کا نام بھی شامل ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین پر مشتمل اب تک تین کتابیں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ حمید عادل کی پہلی تصنیف ''بے تیغ'' دوسری تصنیف ''ہنستے ہنستے'' اور تیسری تصنیف ''رنگے ہاتھوں'' ہے۔ ان مجموعوں میں شامل بیشتر مضامین روزنامہ ''منصف'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ بیوی یا سپریم کورٹ'' ان کا معروف انشائیہ ہے۔ وہ زیادہ تر اپنے عصر اور آس پاس کے مسائل پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ طنز ومزاح میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابھی ان کا فن اتنا پختہ نہیں ہے۔

حیدرآباد کے مزاح نگاروں نے نئی بستیاں بھی بسائیں۔ خاص طور پر سعودی عرب' امریکہ' آسٹریلیا' کنیڈا میں اردو کی ترویج واشاعت میں اپنی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ یہاں چند ایسی قلم کاروں کا مختصراً جائزہ لیا جاتا ہے جو سعودی عرب میں مقیم ہیں اور طنز ومزاح کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔

علیم خاں فلکی حیدرآباد کے محلے فلک نما میں پیدا ہوئے۔ محلّہ کی مناسبت سے فلکی کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ سنجیدہ تخلیقات کے علاوہ مزاحیہ مضامین بھی لکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں روزنامہ ''منصف'' ''سیاست'' اور ماہنامہ ''شگوفہ'' اور ''اردو میگزین'' میں شائع ہوتی ہیں۔ فی الحال روزگار کے سلسلے

میں جدہ، سعودی عرب میں مقیم ہیں اور اردو کی ترویج و اشاعت میں بھی سرگرم ہیں۔ ''قحط الرجال''، ''قطع کلام کے اسپیڈ بریکر'' اور ''انسان بھونکتے ہیں'' ان کے اچھے مضامین میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

جدہ میں مقیم حیدرآبادی مزاح نگاروں میں نعیم جاوید بھی شامل ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے مزاحیہ مضامین انشائیے اور خاکے لکھتے ہیں۔ تحریروں میں طنز و مزاح شگفتگی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ ''نئی نویلی گرہستی'' ان کا عمدہ مضمون ہے۔ ان کی تحریریں سماجی شعور کی حامل، علامتی اور غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ ایک عرصہ سے جدہ سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ سلیم مقصود کے قلمی نام سے لکھتے ہیں۔ گریجویشن اور ایم اے کی تعلیم عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ مزاحیہ مضامین اور انشائیے روزنامہ ''منصف'' اور ماہنامہ ''شگوفہ'' میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ''احتجاج'' ان کا اچھا مضمون ہے۔

سید نصرت کا تعلق حیدرآباد دکن کے ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاسوں میں مضامین سنا چکے ہیں۔ ان کی تخلیقات ماہنامہ ''شگوفہ'' میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے مزاح میں حد درجہ شوخی اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ ''یوں ہی گر روتا رہا'' رونے کے موضوع پر ایک دلچسپ مضمون ہے۔ اسی قبیل کا ایک مضمون ممتاز مہدی نے بھی ''رونا'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ سید نصرت اپنے مضامین کے موضوعات خلیج میں رہنے والے ہندوستانیوں کے مسائل میں تلاش کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو دلچسپ پیرائے میں بیان کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔

خواجہ مسیح الدین یکم جنوری 1955ء کو سدی پیٹ ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ ابونبیل خواجہ مسیح الدین کے قلمی نام سے ادبی دنیا میں معروف ہیں۔ گورنمنٹ کالج سدی پیٹ سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ افسانوں کے علاوہ مزاحیہ مضامین اور انشائیے لکھتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''سائبان'' 2002ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ''خواتین کی جنت'' ایک شگفتہ مضمون ہے۔ عام معاشرتی مسائل کو موضوع سخن بناتے ہیں۔ ان کے مضامین میں غیر مقیم ہندوستانیوں کے مسائل اور ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔

چوپٹؔ کریم نگری پیدائشی طور پر حیدرآبادی ہیں۔ وہ رود موسیٰ سے آٹھ سال قبل حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں کریم نگر منتقل ہوگئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد پیشہ تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ عربی، فارسی، انگریزی اور تلگو زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ اردو کے ساتھ فارسی میں بھی شعر کہے۔ مزاحیہ شاعری میں چوپٹؔ تخلص کرتے ہیں۔ دکنی زبان اور اس کی لفظیات انکے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ طنز و مزاح میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پلارئیں ایڑیاں گھس گھس کو موے
کلاٹیاں ماررئیں پے ٹاں میں چوے
لگیے ٹکساں کی جونک ہاتاں کو چوپٹؔ
گرانی چھید رہی بن بن کو سُوّے

جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں میں مخدومؔ محی الدین کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مخدوم محی الدین، ضلع میدک کے گاؤں ''اندول'' میں 4 فبروری 1908ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میدک میں ہی حاصل کی اور بی اے اور 1936ء میں ایم اے کی سند عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ فن شاعری کے علاوہ انھیں ڈرامہ نگار اور اداکاری سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے اقامت خانوں میں شکور بیگ کی نظم ''دال'' اور مخدومؔ کی نظم ''پیلا دوشالہ'' کافی مشہور ہوئی تھی۔ جس کا آخری شعر ہے:

اور گرم کن پہلوئے من بازیبائی۔ گریم زِ جدائی
آن زور بیا دار کہ من زیر تو بالا۔ وہ پیلا دوشالہ

اس نظم کی تعلق سے مرزا شکور بیگ رقمطراز ہیں:

''یہ نظم جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ شائد اسی نظم نے مخدومؔ سے شعر کہلوانا شروع کیا۔ جیسے جیسے دن گذرتے گئے مخدومؔ کی شاعری نے رنگ بدلا۔ شاعری رومانٹک تھی مگر اس کا رنگ گلابی ہو رہا تھا۔'' (69)

یہ نظم فرمانروائے دکن میر عثمان علی خاں کے سامنے قوالی کی شکل میں پیش کی گئی۔اس محفل کے بارے میں مرزا ظفرالحسن لکھتے ہیں۔مخدوم کی نظم پیلا دوشالہ قوالی کے روپ میں پیش کی جانے والی تھی۔مخدوم اسٹیج پر آیا اوراس نے اپنی نظم کی وجہ تسمیہ بیان کی۔......ابتدائی اشعار پر اعلیٰ حضرت کافی محظوظ ہوئے مگر جب آخری اور فارسی شعر گایا گیا تو سرکار کی داد و تحسین کا کوئی حساب نہ تھا۔

اور گرم کنِ پہلوئے من باز بیائی۔گریم زِ جدائی

آن زور بیادار کہ من زیر تو بالا۔وہ پیلا دوشالہ

بیسویں صدی کے اوائل میں پیدا ہونے والے مزاح نگاروں میں برق آشیانوی (پیدائش 18 اپریل 1908ء) بھی شامل ہیں۔انھوں نے نظم اور نثر دونوں میں اپنے فن پارے پیش کئے۔''مکرر ارشاد''ان کا شعری مجموعہ ہے۔ان کی شاعری میں مقصدیت بنیادی عنصر ہے۔اہم انسانی مسائل ان کے موضوعات ہیں۔تخلیقات میں بغیر انجن کی ریل گاڑی' حادثہ' رہیے اب ایسی جگہ' مریض عشق' مریض قلب' شکر کی فریاد' دم دار ستارہ' دھوبی کی درخواست' اقتدار کے نام' اور نیا سال مبارک وغیرہ ہیں۔انہوں نے طنز و مزاح میں توازن برقرار رکھنے کی کامیاب سعی کی ہے۔نثر میں ان کی پہلی تخلیق ''حسن کار'' ہے جو 1935ء میں شائع ہوئی۔

ناچیزؔ حیدرآبادی کا اصل نام اختر حسن ہے۔ناچیز حیدرآبادی ایک کہنہ مشق اور بے باک قلم کار ہیں۔انہوں نے قومی اور بین الاقوامی مسائل پر اچھی نظمیں کہیں ہیں۔ناچیز حیدرآبادی نے اپنی نظم ''سی آئی اے'' میں امریکی خفیہ ایجنسی اور اس کے آلہ ءکاروں کی ریشہ دوانیوں اور طرز زندگی کا ذکر کیا ہے۔اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہو:

پوچھئے ہم سے کہ ہیں کون جو سی آئی اے کے — ہم رہ و ہم قدم و ہم نفس و ہم دم ہیں

ان میں لیڈر بھی' ایڈیٹر بھی' دانشور بھی — لاکھ وہ کہتے رہیں' ہم تو نہیں' تاہم

ان کو آتا ہے مزا تفرقہ اندازی میں — سچ تو یہ ہے کہ یہ ابلیس صفت آدم ہیں

ناخدا ہے ان کا ڈالر تو خدا بھی ڈالر — موجب خواری و رسوائی دو عالم میں

اور اس بات کی تو سب کو خبر ہے ناچیزؔ — کس کے بل بوتے پر یہ ٹھاٹ ہیں یہ دم خم ہیں

1948ء کے بعد ایک نیا حیدرآباد ابھر کر سامنے آیا صحت مند انقلاب اور قدروں کی شکست و ریخت اہم حقیقتیں بن گئیں۔ادب نے ردعمل کے طور پر نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی۔طنز ومزاح کے لئے فطرتاً زیادہ امکانات پیدا ہوئے۔چونکہ اہل اردو بے اطمینانی کا شکار تھے۔طنز ومزاح پر کسی حد تک جمود کی کیفیت طاری رہی۔اس کے باوجود اس دور کے مزاحیہ ادب کا سرمایہ قابل اعتناء ہے۔اس دور کے اہم مزاح نگاروں میں سرور ڈنڈاؔ' سلیمان خطیبؔ' حمایت اللہ' اور اسمٰعیل ظریفؔ شامل ہیں۔ریختہ نے امیر خسرو کی خانقاہ سے دکن کے دربار تک ایک طویل سفر طئے کیا ہے۔اس بیچ دکنی شعرا نے اردو ادب کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔بعد ازاں عرصہ دراز تک دکنی شاعری کو غیر معیاری زبان سمجھا جانے لگا۔دہلی اور لکھنؤ کی زبان کو معیاری زبان کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ایسے ماحول میں نذیر دہقانی نے دکنی شاعری کا احیاء کیا۔وہ دکنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''ان کے عہد میں اس زبان میں شعر کہنا ایک جسارت تھی بدذوقی تھی گنوار پن تھا۔''(70) نذیر دہقانی' اعجاز حسین کھٹا' اور علی صائب میاں نے دکنی شاعری کو فروغ دیا۔آزادی کے بعد سرور ڈنڈا' سلیمان خطیب' اور محمد حمایت اللہ نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔

موضوعات کی رنگا رنگی مناظر کی عکاسی جدید حسیت اور اسلوبیاتی خدوخال کے لحاظ سے جدید دکنی شاعری اہمیت کی حامل ہے۔جدید دکنی شعراء نے عصر حاضر کے سماجی' سیاسی' معاشی و معاشرتی زندگی کی بے اعتدالیوں و کوتاہیوں کو طنزیہ و مزاحیہ انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ڈاکٹر سیدہ جعفر جدید دکنی مزاحیہ شاعری کی اہمیت بتاتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> ''حیدرآباد میں جدید دکنی کے مزاحیہ شاعروں نے اپنے مخصوص انداز میں سماجی زندگی کی کوتاہیوں کو بے نقاب کیا ہے۔نذیر دہقانی' سلیمان خطیب' حمایت اللہ' اور علی صائب کی شعری تخلیقات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔''(71)

غیر حیدرآبادیوں کے لئے دکنی شاعری میں طنز ومزاح دلچسپ نہیں ہے۔اس کی بڑی وجہ دکنی زبان اور اس کی لفظیات سے ان کی ناواقفیت ہے مقامی کلچر اور مقامی موضوعات دوسرا سبب ہے۔دکنی زبان کو کم تر ماننے کا

احساس ایک اور وجہ ہوسکتی ہے۔ان عوامل نے دکنی شاعری کی آفاقیت پر اثر ڈالا۔عام شاعری میں طنز ومزاح کے لئے زیادہ امکانات ہیں۔اس قسم کی مزاحیہ شاعری میں مسافر نلگنڈوی اور اسمٰعیل ظریف وغیرہ شامل ہیں۔

مسافرؔ نلگنڈہ کے متوطن تھے اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ابتداء ہی سے طبیعت مزاحیہ شاعری سے رغبت رہی۔مسافر نلگنڈوی اپنی نظم ''وغیرہ وغیرہ'' کے لئے معروف ہیں۔انہوں نے سماجی اور سیاسی مسائل اور موضوعات پر توجہ دی۔ان کی شاعری کا ایک اہم عنصر طنز ہے۔ان کی تخلیقات حیدرآباد کے مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے۔دو شعر ملاحظہ ہو جس میں رشوت خوری اور سیاست دانوں پر گہرا طنز ہے۔

قوم اپنی ہے مالیہ اپنا جیب بھرلوں تو کیا برائی ہے
وہ تو چرتا ہے قوم کی کھیتی اور لیڈر کی کیا کمائی ہے

اسمٰعیل ظریفؔ ناندیڑ کے ایک متمول تاجر گھرانے میں پیدا ہوئے۔زمانہ طالب علمی سے ہی مزاحیہ شعر وسخن کی طرف طبیعت مائل رہی۔تعلیمی سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد تجارت سے وابستہ ہوئے۔بعد میں حیدرآباد میں سکونت اختیار کی۔اسمٰعیل ظریفؔ مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ان کا کلام مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔انہوں نے غزلیات' اور قطعات زیادہ لکھے ہیں' نظموں کی تعداد کم ہے۔اجلاس بلدیہ' چارمینار' ان کی معروف تخلیقات ہیں۔اسمٰعیل ظریف کی نظر بھی اصلاحِ سماج پر ہے۔

حیدرآباد میں طنز ومزاح کا اہم ترین دور 1961 ء سے شروع ہوتا ہے۔حیدرآبادی نوجوانوں کی تنظیم ''فائن آرٹس اکیڈیمی'' موسیقی اور ڈرامے تک محدود تھی۔آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے زندہ دلان پنجاب کے نام سے استفادہ کرتے ہوئے جنوری 1961 ء میں ایک مزاحیہ مشاعرہ بعنوان ''زندہ دلان حیدرآباد'' اسٹیج کیا۔جو 9 جنوری 1961 ء کو نشر بھی ہوا۔اس میں علی صائب میاں' سلیمان خطیب' محمد حمایت اللہ' سرور ڈنڈا' شکور بیگ' بوگس حیدرآبادی' مصطفٰی علی بیگ وغیرہ نے شرکت کی۔1962 ء میں فائن آرٹس اکیڈیمی کا ادبی شعبہ زندہ دلان حیدرآباد قائم کیا گیا۔نریندر لوتھر کی صدارت میں اس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔اس کے بعد ادبی اجلاسوں اور مشاعروں کا سلسلہ چل پڑا۔1966 ء میں طنز ومزاح نگاروں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔اس کی صدارت کرشن چندر نے کی۔1968 ء سے زندہ دلان حیدرآباد نے اپنی مطبوعات کا سلسلہ شروع کیا۔ابتداء میں علی صائب میاں

کا مجموعہ ''گھوکرو کے کانٹے'' اور رضا نقوی واہی کا مجموعہ ''نشتر ومرہم'' شائع کئے گئے۔ نومبر 1968 میں دیڑھ ماہی شگوفہ جاری ہوا۔ زندہ دلان حیدرآباد کے قیام کی وجہ سے طنز ومزاح کو وسیع پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ طنز ومزاح ملک و بیرون ملک تحریک بن کر پھیلنے لگا۔ اس عہد کے مزاح نگاروں میں سرپٹ حیدرآبادی' گلیم میدکی' صبغت اللہ بمباٹ' محمد علی منگلی' قادر حیدرآبادی' گڑبڑ حیدرآبادی' فیض الرحمٰن فیض' حفیظ خاں مذاق' عظمت بھلاواں' بھارت چندکھنہ' رشیدالدین' یوسف ناظم' مجتبیٰ حسین' خواجہ عبدالغفور' اسحاق ایوبی' مسیح انجم' احسن علی مرزا' عاقل علی خاں' زینت ساجدہ' اور جیلانی بانو وغیرہ شامل ہیں۔

مشاعرے کے شاعروں میں سرپٹ حیدرآبادی کا نام مشہور ہے۔ انھوں نے 1961 سے مزاحیہ شاعری کا آغاز کیا۔ 143 مزاحیہ غزلوں پر مشتمل ان کا مجموعہ ''دھرگھسیٹ'' 1979 میں شائع ہوا۔ ان کی غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ''ویلدی ساس'' اچھی نظم ہے۔ ان کے کلام میں ابتذال اور پھکڑ پن کے عناصر بھی پائے جاتے ہے۔

گلیم میدکی نے 1962 میں اپنی شاعری کی ابتداء کی۔ ''آندھرا کے دادا تلنگانہ کی وارننگ'' ان کی مشہور انقلابی نظم ہے۔ اس کی وجہ سے انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ وہ خالص طنز کے قائل ہیں۔ 1962 سے اپنی شاعری کا آغاز کرنے والے ایک شاعر صبغت اللہ بمباٹ ہیں۔ آج کے طالب علم' علم کا شوقین اور شادی ان کی چند بہترین نظموں میں شامل ہیں۔

سید اسداللہ حسینی چکر سنجیدہ شاعری میں اسدؔ اور مزاحیہ شاعری میں چکر تخلص کرتے ہیں۔ ان کے والد کا نام سید کلیم اللہ حسینی ہے۔ 26 فبروری 1925ء کو حیدرآباد کے قدیم محلّہ چنچل گوڑہ میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے بی اے کامیاب کرنے کے بعد محکمہ زراعت میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ امریکہ منتقل ہوگئے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''چٹکیاں'' 2003ء میں اور ''دھجیاں'' 2006 میں شائع ہوئے۔ ان کی شاعری میں بیجا فیشن پرستی اور مغربی معاشرے کی اندھی تقلید اور معاشری برائیوں پر گہرا طنز پایا جاتا ہے۔

ہر چیز انوکھی ہے تہذیب امریکن میں
بے شرمی' بے حیائی' داخل 'ٹریڈیشن' میں

انھوں نے اپنی شاعری میں محاوروں اور ضرب الامثال کا بھی نہایت خوبی سے استعمال کیا ہے۔

ہم گئے تھے بخشوانے کو نماز
الٹے روزے بھی گلے میں پڑ گئے
تھی نہ گنجائش جو کچھ تکرار کی
شرم سے چکر زمیں میں گڑ گئے

ایک اور قطعہ ملاحظہ ہو جس چکر نے معاشرے میں راہ پاتی ہوئی برائیوں کی طرف انگشت نمائی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سُلگ کر آگ بنتا ہے شرر آہستہ آہستہ
ذرا سا تخم ہوتا ہے شجر آہستہ آہستہ
یہ سب تو ٹھیک ہے چکر مگر یہ کیسا چکر ہے
کہ انسان بن رہا ہے جانور آہستہ آہستہ

چکر کے کلام میں گہرائی کا فقدان ہے۔ وہ عمومی مسائل پر مزاحیہ انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کا کلام صرف وقتی طور پر تفریح فراہم کرتا ہے لیکن دیرپا اثر نہیں چھوڑتا۔

اسی عہد میں ایک اور شاعر نے شاعری کا آغاز کیا وہ ہیں محمد علی منگلی ۔ محمد علی منگلی 30 مئی 1930 کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ سنٹرل پریس حیدرآباد میں کمپوزیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اسٹیج اداکاری سے بھی شغف رہا۔ ایک ڈرامے میں انہوں نے منگلی کا کردار ادا کیا تھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ دوست احباب میں منگلی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ فائن آرٹس اکیڈیمی سے بھی وابستہ رہے۔ شاعری میں غزلیات، نظمیں اور قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو

تمہارا خوب میک اپ تھا میں اندازہ نہ کر پایا
بہت حیران تھا، یہ بلّور کا پُتلا کدھر آیا
گھنی زلفوں کو جھٹکا یوں ادائے کافرانہ سے
بہت شرما گئیں، جب دور پُر چُٹلا نظر آیا

گڑبڑ حیدرآبادی زمانہ طالب علمی سے ہی شاعری کرنے لگے تھے۔سنجیدہ شاعری بھی کرتے ہیں‘ سنجیدہ شاعری میں ناظم مرزائی تخلص کرتے ہیں۔گڑبڑ 1930ء میں حیدرآباد کے محلّہ آغا پورہ میں پیدا ہوئے۔ابتداء میں صبر آغائی‘ اجلال لکھنوی اور امجؔد حیدرآبادی سے اصلاح لیتے رہے بعد میں منشی نظیر احمد ایماؔن کے سامنے زانوے ادب تہہ کیا۔انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کی نظمیں ’’ہے ضرورت وزیر اعظم کی‘‘ ’’کرسی‘‘’’مشاطہ‘‘اور’’اپوزیشن لیڈر‘‘ کافی مشہور ہوئے۔ان کی نظم’’شاعری کی دُکان‘‘ کاایک بند ملاحظہ ہو:

قطعہ چاہتے ہو تو سگریٹ پلاؤ
رباعی جو چاہو گلوری منگاؤ
ہو گر نظم درکار قلمی کھلاؤ
غزل کی ہے خواہش تو کافی پلاؤ
لگائی ہے میں نے دکان شاعری کی

انہوں نے غزلیں اور قطعات بھی کہے ہیں۔گڑبڑ حیدرآبادی کی شاعری میں سماجی اور سیاسی طنز ہے۔ان کا انتقال جنوری 1981ء کو ہوا۔ناظم مرزائی گڑبڑؔ حیدرآبادی کے سانحہ ارتحال پر علی صائب میاں نے یہ اشعار کہے تھے۔

ڈنڈے بجاکے جس طرح ڈنڈاؔ چلا گیا
گڑبڑ مچاکے حضرت گڑبڑؔ چلے گئے

دنیا کے رنج وغم کو وہ ہنس ہنس کے سہہ گئے
’’کل من علیھا فان‘‘ کا وہ درس دے گئے

ناظم تھے وہ یارباش اکیلے نہ جاسکے
مرزا کو بھی ساتھ میں اپنے وہ لے گئے

اشرف خوندمیری 16اکتوبر1935 کو محلّہ چنچل گوڑہ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام سید عبدالکریم تھا۔ان کی ابتدائی تعلیم وسطانیہ اسکول زمستان پور میں ہوئی۔میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی اسکول سکندرآباد سے پاس کیا۔میٹرک کے بعد بہادر خان کالج آف انجینئر نگ سے 1957 میں اپر سب آرڈینٹ کا امتحان کامیاب کیا۔

انہوں نے اپنی شاعری کی ابتداء طالب علمی کے زمانے سے کر دی تھی۔اشرف خوندمیری نے دکنی زبان میں شاعری کی ہے ایک دکنی شاعر کی حیثیت سے مقبول ہوئے انہوں نے بہت کم لکھا ہے۔''جھمک جھکا''''اٹھا چماں'' ان کی چند مشہور نظموں میں شامل ہیں۔

اشرف خوندمیری کا شعری سرمایہ زیادہ نہیں ہے لیکن جتنا کلام بھی منظر عام پر آچکا ہے وہ انہیں مزاحیہ شاعری میں ایک منفرد مقام عطا کرنے کے لئے کافی ہے۔ان کی شاعری میں سماج کے تمام مسائل ملتے ہیں۔مثلاً ایک شعر جہیز کے مسئلہ سے متعلق ہے ملاحظہ ہو:

دولہے والے کچھ بھی منگتیں نہیں کرنا فریاد کتے
دولہن والے جہیز میں ان کو دینا حیدرآباد کتے

عزیز ابرار لکھتے ہیں۔

> ''اشرف خوندمیری خالص دکنی لب ولہجہ کے شاعر ہیں۔ان کی نظم 'ہلوّ کی سلوّ کی دُوئی دم بتی بُتہ'' ان کے مخصوص لہجہ کی اچھی مثال ہے۔......ان کی نظموں میں دکنی عناصر کی مبالغہ آویزی محسوس ہوتی ہے۔''(72)

اشرف خوندمیری کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے عصر کے مسائل کو دکنی زبان میں پیش کرنے میں کامیاب رہے۔

صبغت اللہ بمباٹ 9 نومبر 1939ء کو بھونگیر میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم بھونگیر ہی میں حاصل کی۔میٹرک کا امتحان چنچل گوڑہ ہائی اسکول سے کامیاب کیا۔بی اے کی تکمیل اردو آرٹس ایوننگ کالج سے کی۔کالج میں دو سال بزم اردو کے صدر رہے۔بعد میں فزیکل انسٹرکٹر کی ٹریننگ حاصل کی اور مدرسہ آصفیہ میں بطور فزیکل انسٹرکٹر برسر خدمت رہے۔مختلف ڈراموں اور ٹی وی سیریلوں میں اداکاری بھی کی۔مزاحیہ شاعری کے علاوہ مزاحیہ مضامین بھی قلم بند کئے۔کلام میں دکنی کے علاوہ انگریزی الفاظ کا استعمال عمدگی سے کرتے ہیں۔غزل کے چند شعر ملاحظہ ہو:

ہارٹ میں جمپ لگاتے تو بہت اچھا تھا

پھوٹی قسمت کو جگاتے تو بہت اچھا تھا
نام لکھ مرا کیوں لِسٹ میں کاما دے رئیں
تم فُل اسٹاپ لگاتے تو بہت اچھا تھا

قادر حیدرآبادی نے مزاحیہ نثر اور مزاحیہ شاعری دونوں میں طبع آزمائی کی۔ان کا ادبی سرمایہ زیادہ نہیں ہے۔دنیا کے چھوٹے لوگ ان کی اچھی تخلیق ہے۔

فیض الرحمٰن نام اور فیض تخلص ہے۔ادبی دنیا میں فیض الرحمٰن فیض کے نام سے جانے جاتے ہیں۔میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔تعلیم سے فراغت کے بعد محکمہ تعمیرات میں بطور نقشہ نویس ملازمت اختیار کی۔انھوں نے نظم اور غزل کے علاوہ قطعات بھی کہے ہیں۔ان کے کلام میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔مزاح کی چاشنی کے ساتھ طنز کی زیریں لہر کہیں کہیں محسوس کی جاسکتی ہے۔وہ اپنے کلام میں انگریزی الفاظ بڑی چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں۔غزل کے دوشعر ملاحظہ ہو:

فیس سے ہینڈ ہٹاتے تو بہت اچھا تھا　　عشق کا بینڈ بجاتے تو بہت اچھا تھا
لوز ٹاکنگ پر اتر آئے ڈیر کے فادر　　ٹنگ پہ لاک لگاتے تو بہت اچھا تھا

مغرب کی اندھی تقلید اور فیشن کے نام پر مٹتی اخلاقی اقدار کو اپنے طنز کا نشانہ کچھ اس طرح بناتے ہیں۔

ابھر آیا ہے اب کپڑوں میں بھی احساسِ آزادی
تماشہ ہے کہ جامہ جسم سے آزاد ہوتا ہے
مذکر اور مونث کا سمجھنا ایک معمّہ ہے
کوئی شمشاد ہوتی ہے کوئی شمشاد ہوتا ہے

ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے عزیز ابرار لکھتے ہیں۔

''فیض الرحمٰن فیض نے اصلاحی میلان پایا ہے۔وہ خالصتاً مزاح نگار ہیں۔کہیں کہیں طنز بھی تحریر کا جزو بن جاتا ہے۔''اندھیر نگری چوپٹ راجہ'' سے شناخت بنائی ہے۔''(73)

اس عہد کے ایک اور مزاحیہ شاعر حفیظ خاں مذاق ہیں۔ٹائیڈی گرل' ماڈرن محبوبہ'اور فیشن کی گڑیاں وغیرہ حفیظ خاں مذاق کی تخلیقات ہیں۔

عظمت بھلاواں کی شاعری میں فکر کی وسعت نہیں ہے۔ان کے ذہن پر عورت سوار ہے۔فحش گوئی' ابتذال' عامیانہ پن اور غیر معیاری زبان ان کے کلام میں درآئے ہیں۔خدا کے حضور میں اردو کی فریاد' اچھی نظم ہے۔اس کا لب ولہجہ بھی شائستہ ہے۔بھلاویں کے داغ ان کا مجموعہ کلام ہے۔

احمد شریف نام اور پاگل تخلص ہے۔ادبی دنیا میں پاگل عادل آبادی کے نام سے معروف ہیں۔ پاگل 1943ء نظام آباد کے محلّہ حطائی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ٹیچر ٹریننگ کی تکمیل کے بعد 1962ء میں عادل آباد کے پرائمری اسکول پنجہ شاہ سے بحثیت مدرس خدمات کا آغاز کیا۔اور عادل آباد کو ہی اپنا وطن بنالیا۔ابتداء میں وہ محمد رفیع کی غزلوں اور گیتوں کو دوستوں کی محفلوں میں پیش کر کے داد وتحسین حاصل کرتے تھے۔1970ء میں مزاحیہ شاعری کا آغاز کیا۔ان کے تعلق سے معروف مزاح نگار یوسف ناظم کا خیال ہے کہ ان کے پاس ہر قسم کا مال ہے' مشاعروں کا بھی' محفلوں کا بھی' اور خانگی صحبتوں کا بھی اور کچھ ان لوگوں کے لئے جو صرف ہنسنا نہیں چاہتے سوچنا بھی چاہتے ہیں۔(74)

پاگل عادل آبادی اپنے منفرد انداز میں ہر وہ بات کہہ جاتے ہیں جسے سننا عام حالات میں گوارا نہیں ہوتا۔''الّم غلّم''''چوں چوں کا مربّہ''''گڑ بڑ گھٹالہ''''کھٹے انگور''''اوٹ پٹانگ''اور''کھسر پُھسر'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ان کی شاعری میں عصری حسیت کا بیان ملتا ہے۔وہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کا عمیق مشاہدہ کرکے اس پر اپنے منفرد انداز میں اظہار خیال کرتے تھے۔خوردنی اشیاء میں ملاوٹ ایک عام بات ہوگئی ہے' اور یہ لعنت دواؤں میں ملاوٹ تک پہنچ گئی ہے۔یہ شعر ملاحظہ ہو:

یہ سیل بند بوتل ہے لیبل بھی اصلی ملاوٹ ہے گھی میں مگر ففٹی ففٹی

موجودہ دور میں بعض مفاد پرست سیاسی قائدین عوام میں فرقہ وارانہ منافرت پیدا کر کے ملک کے اتحاد کو پارہ پارہ کردینا چاہتے ہیں۔ایسے قائدین کو بے نقاب کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

کرسی کا یہ بھوکا ہے پیاسا ہے یہ ووٹوں کا　　　خود غرض ہے ایجنٹ ہے چوروں کا
ظاہر میں یہ مہاتما ہے باطن میں یہ پاپی ہے　　　ابلیس کا یہ مجھ کو چیلا نظر آتا ہے

انھوں نے ملک و بیرون ملک کئی مشاعروں میں اپنے فن کا جادو بکھیرا۔ انھوں نے غزل، نظم اور کئی قطعات کے علاوہ پیروڈیاں بھی کہی ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہو:

معتمد نے گھر خریدا صدر نے دھنمڑی
ہوگیا چندہ غبن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

انصاف کے ڈگر پہ چچو دکھاؤ چل کے
یہ دیس ہے تمہارا کھا جاؤ اس کو تل کے

ان کے کلام میں مزاح کے شگفتگی کے ساتھ طنز کی نشتریت واضح نظر آتی ہے۔ پاگل عادل آبادی کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے شفیع اللہ خاں لکھتے ہیں۔

> ''پاگل عادل آبادی نے طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں جو نقوش چھوڑے ہیں، وہ حالات حاضرہ کے مماثل ہیں۔ ان کی شاعری میں مزاح کا عنصر کم اور طنز زیادہ ہوتا تھا۔'' (75)

پاگل عادل آبادی فالج کے حملے اور طویل علالت کے بعد 3 اگست 2007ء کو انتقال کر گئے۔ انھیں عادل آباد میں ہی سپرد خاک کیا گیا۔

مضطر مجاز ارض دکن کے ایک معروف شاعر ہیں۔ حالانکہ وہ سنجیدہ شاعری کرتے ہیں لیکن انہوں نے مزاح سے معمور چند تخلیقات بھی موزوں کی ہیں ''حکیم لقمان کی نصیحت'' ان کی ایک اچھی مزاحیہ تخلیق ہے۔ چند کہہ مکرنیاں بھی کہیں ہیں جو ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہوئیں۔ (کہہ مکری، کہہ مکرنیاں برج بھاشا کی ایسی صنف سخن ہے، جس میں دو سہیلیوں کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے۔ ابتدائی تین مصرعوں سے بظاہر محبوب کے ذکر کا پتہ چلتا ہے لیکن بعد کے مصرع میں اور ہی بات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ مکر جانے کے سبب اسے ''کہہ مکری'' یا ''کہہ مکرنیاں'' کہا جاتا ہے۔) مضطر

مجاز نے چند ہی کہہ مکرنیاں کہی ہیں لیکن ان کی یہ کہہ مکرنیاں دلچسپ ہیں ان میں لطیف مزاح محسوس کیا جاسکتا ہے۔ایک کہہ مکری ملاحظہ ہو:

تن میں ایک آگ لگادے
آنکھیں، گال، بدن دہکادے
ڈھیلے کردے انجر پنجر
نا سکھی فیور　　(Fever یعنی بخار)(76)

اقبال شاؔنہ کا پورا نام اقبال احمد قریشی ہے، شانہ تخلص کرتے ہیں۔ان کا تعلق نظام آباد آندھرا پردیش سے ہے۔انھوں نے غزل، نظم، اور قطعات کے علاوہ پیروڈی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کا شعری مجموعہ ''شانہ بشانہ'' اکتوبر 1996ء میں شائع ہوچکا ہے۔ان کے اس مجموعہ کلام میں نظموں او رقطعات کے علاوہ غزلیں شامل ہیں۔''کمپیوٹر''،''گھنٹی''،''پنکھا''،''انٹرنیشنل غزل''،''سو گئے ٹھیک''،''تمھیں کیا معلوم''،''انشا اللہ''،''بستر مرگ پر ڈاکٹر''، وغیرہ اچھی تخلیقات ہیں۔(76)

ڈاکٹر معین امر بمبؔو مزاحیہ شاعری میں خاص مقام کے حامل ہیں۔ان کی پیدائش 21جنوری،1952ء کو ہوئی۔کمسنی میں ہی سایہ پدری سے محروم ہوگئے۔والدہ نے دوسرا نکاح کرلیا۔دادی نے ان کی پرورش کی۔ان کی ابتدائی تعلیم کھوکڑ واڑی اسکول میں ہوئی میٹرک بھی اسی اسکول سے کامیاب کیا۔میٹرک کے بعد انھیں سیکریٹریٹ میں ملازمت مل گئی۔تعلیم حاصل کرنے کا شوق باقی تھا اسی لئے حیدرآباد ایوننگ کالج سے ایم اے، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی سے ایم فل اور جامعہ عثمانیہ سے، پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔

معین امر بمبؔو نے خورشید احمد کاظمی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔شاعری کی ابتداء کالج کے زمانے سے ہوئی۔ان کے استاد کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے ان کی شاعری میں تنوع پیدا ہوا۔ان کی شاعری، حمد باری تعالیٰ، نعت شریف، رباعی، قطعات، غزلوں اور نظموں پر محیط ہے۔انہوں نے ہزلیات میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ہزلیات کے چند شعر ملاحظہ ہو:

اب تو سونچوں بیوہ کو ہی کر کے لاؤں گا دیکھ لیو
عقدِ ثانی میں سفید رقعے چھپواؤں گا دیکھ لیو
میں شاعر دبلا پتلا موٹی تازی بیوی وہ
لونا کا لائسنس رکھ کو بس چلاؤں گا دیکھ لیو

ان کا تخلیقی سفر اب بھی جاری ہے۔

فرید احمد نام، تخلص سحرؔ اور ادبی دنیا میں فرید سحرؔ کے نام سے معروف ہیں۔ فرید سحرؔ 2 مئی 1952ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ 1973ء میں انہوں نے ممتاز کالج سے بی ایس سی کامیاب کیا اور پھر بی ایڈ کی تکمیل کی۔ وہ پیشہ تدریس سے وابستہ رہے۔ ان کی مزاحیہ شاعری کا آغاز 1977ء سے ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے ظریفانہ کلام سے معاشرے کی ناہمواریوں اور کمزوریوں کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ ان کی غزلیں روزنامہ ''منصف'' روزنامہ ''سیاست'' اور ماہنامہ ''شگوفہ'' میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ غزل کے چند شعر دیکھئے۔

میں بھی ایک شاعر بنوں گا یہ کبھی سوچا نہ تھا　　داد کا بھوکا رہوں گا یہ کبھی سوچا نہ تھا
دھاک بستی پر جما کر مطمئن تھا میں مگر　　گھر میں بیوی سے پٹوں گا یہ کبھی سوچا نہ تھا
لوٹنے محفل کو میں بھی کیا بتاؤں اے سحرؔ　　شعر چوری کے پڑھوں گا یہ کبھی سوچا نہ تھا

بیشتر شعراء نے اپنے کلام میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ مال و دولت اکثر جھگڑوں اور دیگر خرابیوں کا باعث بنتے ہیں۔ جہاں دولت اور جائیداد ہوتی ہے وہاں حقیقی بھائی بہنوں میں بھی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں مال و دولت نہیں وہاں جھگڑے بھی نہیں رہتے۔ اسی مضمون کو انہوں نے اس شعر میں اس طرح باندھا ہے۔

وراثت میں ڈیڈی نے کچھ بھی نہ چھوڑا
میرا بھائی بہنوں سے جھگڑا نہیں ہے

فرید سحر زندہ دلان حیدرآباد کے ایک فعال رکن کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔ اور ان کا تخلیقی سفر اب بھی جاری ہے۔

سید عبدالمجید نام اور بیدارؔ ان کا تخلص ہے۔ 16 مئی 1952ء سابقہ ضلع حیدرآباد اور موجودہ ضلع رنگاریڈی

کے تعلقہ پرگی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید عبدالعزیز ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد کے مختلف مدرسوں میں ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم‘ اے امتیازی نشانات کے ساتھ کامیاب کیا۔ 1977ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم فل اور 1982ء میں ’’دکنی تذکرے‘‘ کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ابتداء میں انہوں نے اورنگ آباد میں واقع مولانا آزاد کالج میں اردو لیکچرر کی حیثیت خدمات انجام دیں اور اب عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کارگذار ہیں۔ ان کی اب تک متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ زمانہ ء طالب علمی سے ہی مزاحیہ شاعری کرنے لگے تھے۔ جب وہ ساتویں جماعت میں زیر تعلیم تھے تو انہوں نے ایک فلمی گیت کی پیروڈی لکھی اس کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

چرانے کو تیتر بٹیر ڈھونڈتے ہیں
جو دے دے منافع وہ شر ڈھونڈتے ہیں

ہیں معشوق ہمارے ریاضی میں ماہر
کہ دائرے بنا کر ہوئے گھر سے باہر

مرے عشق میں نصف قطرے ڈھونڈتے ہیں
جو دے دے منافع وہ شر ڈھونڈتے ہیں

مجید بیدار نہ صرف ایک اچھے نثر نگار ہیں بلکہ وہ ایک اچھے مزاحیہ شاعر بھی ہیں۔ ان کی غزل کے دو شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ جس میں انہوں نے بڑے دلکش انداز میں صنعت تلمیح کا استعمال کیا ہے۔

پلکوں پہ نئے خواب سجانے نہیں آتے
جو بیت گئے پھر سے زمانے نہیں آتے

یہ دور عجب دور ہے اس دور میں یارو
کعبہ کو ابابیل بچانے نہیں آتے

مجید بیدار نے قیام اورنگ آباد کے دوران جگمگ اورنگ آبادی کے نام سے طنزیہ و مزاحیہ شاعری بھی کی جو

اورنگ آباد ٹائمز میں شائع ہوتی رہی۔ چند شعر دیکھئے۔

کیا جب بھی پولیس نے جگمگؔ کا پیچھا
کلام اس نے داغا سٹکتے سٹکتے

ماں باپ کو جو گھر میں بلایا تو کہہ اُٹھیں
کیا کیا بلائیں گھر میں اٹھا لا رہے ہیں آپ

لے کے رشوت پھنسے تو کیا غم ہے
دے کے رشوت مچا رہے ہیں دھوم

مجید بیدارؔ کی سنجیدہ نظمیں، غزلیں، طنزیہ ومزاحیہ شاعری مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کئی تحقیقی وتنقیدی مضامین مختلف اخبارات وجرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

محمد منور علی مختصرؔ، محمد عبدالغفور کے گھر 5 جون 1952 کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اردو شریف میں ہوئی۔ 1968ء میں ایچ ایس سی کا امتحان کامیاب کیا اور اردو آرٹس ایوننگ کالج سے 1974ء میں بی اے کی تکمیل کی۔ 1971ء میں اچاریہ اے جی رنگا ایگریکلچرل یونیورسٹی میں ملازم ہوئے۔ زمانہء طالب علمی سے ہی ڈراموں میں حصہ لیتے رہے۔ میٹرک کے بعد انھیں مزاحیہ شاعری کا چسکہ لگا۔ 1976ء سے زندہ دلان حیدرآباد سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے ملک وبیرون ملک مشاعروں میں اپنا کلام سنا کر داد وتحسین حاصل کی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن پر انہوں نے اپنا کلام پیش کیا۔

منور علی نے شاید اپنے مختصر قد وقامت کی وجہ سے مختصر تخلص اختیار کیا ہے۔ اپنے ایک شعر میں وہ اپنے قد اور خدا کی دین کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

ہوں مختصر مگر مری عادت بری نہیں
شرمندگی کسی سے بھی مل کر ہوئی نہیں

جو بھی ملا ہے وہ مرے قد سے بڑا ملا
اللہ کا فضل ہے مری گردن جھکی نہیں

اپنی شادی اور بیوی کے تعلق سے کہتے ہیں:

شادی کا نام سنتے ہی پڑ جاتے تھے سفید
لیکن گھڑی وہ ٹل نہ سکی جس کی تھی اُمید

پوچھا جوان کی سہیلی نے کیسے ہیں تیرے وہ
شرما کے سر جھکا کے کہا مختصر مفید

انہوں نے اردو شاعری کی مختلف اصناف جیسے غزل، نظم، اور قطعات میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کا کلام ماہنامہ ''شگوفہ'' کے علاوہ حیدرآباد کے موقر روز ناموں اور ادبی رسائل میں شائع ہوتا ہے۔ان کا شعری سفر اب بھی جاری ہے۔

محمد صدیق ادبی دنیا میں ان پڑھ بھونگیری کے نام سے معروف ہیں۔26 اکتوبر 1956ء کو بھونگیر ضلع نلگنڈہ میں پیدا ہوئے۔کلام میں جہاں ظرافت ہے وہیں پھر طنز کے تیر و نشتر بھی ملتے ہیں۔عہد حاضر کے سیاسی قائدین پر طنز ملاحظہ ہو۔

کھوٹا سکہ بھی چل گیا نا جی
پوٹّا لیڈر نکل گیا نا جی

خود ساختہ اکابران مذہب کے تعلق سے ان کا تیکھا وار ملاحظہ ہو

کار میں پھر رہے ہیں مولانا
یہ چندے کی مہربانی ہے

ملک میں بڑھی مہنگائی اور گرانی کے تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

دیس میں ہر طرف گرانی ہے
اس ندی میں بڑی روانی ہے

ٹپیکل جگتیالی کا نام محمد وحید الدین حیدر اور ان کا تخلص ٹپیکل ہے' اور ان کی سکونت جگتیال ہے۔ اپنی سکونت کی نسبت سے وہ ٹپیکل جگتیالی کہلائے جاتے ہیں۔ ان کے والد کا نام ولی الدین حیدر ہے۔ ٹپیکل 9 فبروری 1965ء کو حیدر کھیڑا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے لا کالج پونا سے ایل ایل بی کی تکمیل کی۔ 1990ء سے انہیں شاعری کا چسکہ لگا۔ لیکن 1995ء میں وہ مزاحیہ شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ انہوں نے ملک کے مختلف علاقوں میں منعقدہ مشاعروں میں کلام سنا کر داد وتحسین حاصل کی۔

انھوں نے موجودہ معاشرے کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور ان برائیوں پر مزاحیہ انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو جن میں انہوں نے سماج میں راہ پارہی اخلاقی برائی کی طرف اشارہ کیا ہے اس طرح انہوں نے کڑوی دوا کو شوگر کوٹیڈ کر دیا ہے۔

بیوی ان کی تو خاندانی ہے
صرف معشوق نوکرانی ہے
نام تو شیر خان ہے ان کا
شکل و صورت مگر زنانی ہے
کتنا میک اپ کروگی تم بیگم
یہ تو عادت بہت پرانی ہے

کچھ دنوں پہلے گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی امریکہ کا دورہ کرنا چاہتے تھے لیکن گجرات فسادات میں ان کے مبینہ رول کو دیکھتے ہوئے امریکہ نے انھیں ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ اس موضوع پر وہ کہتے ہیں۔

کام کیسا کیا ذرا دیکھو امریکہ نے
ڈھول گجرات کے نیتا کو بجانے نہ دیا
یہ بھی کیا بات ہوئی خوب ٹپیکل یارو
ایک نمرود نے مردود کو آنے نہ دیا

ان کا ایک اور مزاحیہ قطعہ ملاحظہ ہو

یہ کوئی کہہ دے ذرا خودغرض زمانے سے
کہ باز آئے مرا ظرف آزمانے سے
ہے جن کو دعویٰ بہت پارسائی کا اپنی
نکلتے دیکھا انہیں بھی شراب خانے سے

وہ سماجی مسائل، سیاسی حالات اور معاشرتی ناہمواریوں پر بڑا تیکھا طنز کرتے ہیں۔

حیدرآباد کے مزاحیہ شعراء کے قافلے میں وحید پاشاہ قادری بھی شامل ہیں۔ وحید پاشاہ قادری 1964 میں معروف مزاحیہ شاعر بے ہوش محبوب نگری کے گھر پیدا ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ 1996ء میں آئی ایک ہندی فلم ''راجہ ہندوستانی'' کے نغمے ''پردیسی پردیسی جانا نہیں'' کی پیروڈی سے مزاحیہ شاعری کی ابتداء ہوئی۔(77) وہ زیادہ تر غزل، قطعات اور پیروڈی کہتے ہیں۔ وہ مشاعروں کے کامیاب شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا کلام مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہو:

روٹھ کر جب وہ میکے کو جانے لگے
ہم بھی گھی کے چراغاں جلانے لگے

مونچھ چٹ ہوگئی اور زلفیں بڑیں
ہم کو صورت سے وہ تو زنانے لگے

دیکھو والد کا چہلم بھی گذرا نہیں
بیٹے دیوار گھر میں اُٹھانے لگے

اے وحیؔد ان کی دیوانگی دیکھئے
خود کو کھجلی ہے ہم کو کھجانے لگے

وہ اپنے عصر کے مسائل کو مزاحیہ پیرائے میں بہت ہی شگفتگی سے بیان کرتے ہیں۔ گرتی ہوئی اخلاقی اور سماجی اقدار پر وہ کھل کر طنز کرتے ہیں۔

حسن عسکری حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔خلیج میں مقیم معروف عثمانین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔انھوں نے شاعری اور نثر کی مختلف اصناف طبع آزمائی کی ہے۔ان کے افسانے اور ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔1979ء سنجیدہ شاعری کی ابتداء ہوئی۔بعد میں دوستوں کی فرمائش پر مزاحیہ شاعری کی طرف مائل ہوئے۔سلیس اردو کے علاوہ دکنی میں بھی شعر کہتے ہیں۔غزل کے دو شعر ملاحظہ ہو۔

کچھ نہ کچھ میں کر دکھانا سونچ روں ان کے ابّا کو ستانا سونچ روں
ڈال کر کھجلی کا پوڈر چائے میں ان کے ابّا کو پلانا سونچ روں

ان کی شاعری میں سطحیت نظر آتی ہے اور کلام میں طنز کی گہرائی کا فقدان ہے۔وہ صرف ہنسنے ہنسانے کے قائل نظر آتے ہیں۔

محمود حیدر آبادی کا تعلق ایک علمی اور سادات گھرانے سے ہے۔دکنی کے معروف شاعر علی صائب میاں ان کے پھوپی زاد بھائی ہیں۔ان کا کلام مختلف علمی وادبی رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔انہوں نے اپنے عصر کے مسائل کو اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے۔کلام میں مزاح کی شگفتگی کے ساتھ طنز کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

رشوت ایک دستِ غیب ہے دیکھو
کیا بھیانک یہ عیب ہے دیکھو
کر رہے ہیں وصول نذرانہ
کیا مہذب فریب ہے دیکھو

فیشن کے نام پر مغرب کی اندھی تقلید' اردو والوں کی اردو کے فروغ سے عدم توجہی' گرتی ہوئی اخلاقی اقدار' رشوت خوری اور ادبی خیانت پر کھل کر طنز کرتے ہیں۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ حیدر آباد کے قلم کار فکاہی ادب کی ترویج واشاعت میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔آئندہ باب میں حیدر آباد دکن کے نمائندہ مزاح نگاروں کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا جائے گا۔

---000---

حوالہ جات

(1) مجتبیٰ حسین　''طنز کیا ہے مزاح کیا ہے''مطبوعہ ماہنامہ''کتاب نما''　ص72 جون 2008ء

(2) ڈاکٹر فرمان فتح پوری　''اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے''　ص14 سنہ 2004ء

(3) طارق سعید　''اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب''　ص85 سنہ 1996ء

(4) خواجہ عبدالغفور　''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ''　ص79 سنہ 1983ء

(5) The Oxford English Urdu Dictionary　ص771 سنہ 2004ء

(6) Urdu English Dictionary, NCPUL　ص357 سنہ 1995

(7) urduenglishdictionary.org

(8) ایس جے صادق　''کنہیا لعل کپور حیات اور کارنامے''　ص54 سنہ 1975ء

(9) خواجہ عبدالغفور　''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ''　ص28 سنہ 1983ء

(10) ڈاکٹر وزیر آغا　''اردو ادب میں طنز و مزاح''　ص41 سنہ 1981ء

(11) مشتاق احمد یوسفی　''پہلا پتھر'مشمولہ چراغ تلے''　ص12

(12) نامی انصاری　''آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح''　ص7 سنہ 2003ء

(13) عابد حسین　بحوالہ''اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب''از طارق سعید　ص75

(14) The Oxford English Urdu Dictionary　ص1507 سنہ 2004ء

(15) Urdu English Dictionary, NCPUL　ص357 سنہ 1995

(16) رشید احمد صدیقی　بحوالہ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' از خواجہ عبدالغفور　ص85

(17) غلام احمد فرقت کاکوروی''اردو ادب میں طنز و مزاح''　ص18 سنہ 1957

(18) خواجہ عبدالغفور　''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ''　ص79

(19) وقار عظیم　مطبوعہ''ساقی'طنز و ظرافت نمبر''　ص14 اپریل 1946ء

(20) ڈاکٹر وزیر آغا　مطبوعہ ماہنامہ''نقوش'طنز و ظرافت نمبر''　ص51 جنوری فروری 1959ء

(21) آرتھر کوسلر　''ان سائیٹ اینڈ آؤٹ لُک''　ص95

(22) خواجہ عبدالغفور　''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ''　ص113

(23) خواجہ عبدالغفور　''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ''　ص149

(24) انیسہ سلطانہ　　''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو نما''　　ص 16 سنہ 1987ء

(25) مشتاق احمد یوسفی　　دیباچہ ''چراغ تلے''　　ص 14

(26) ڈاکٹر وزیر آغا　　''ایک مزاح نگار''　　مطبوعہ ماہنامہ ''ادب لطیف'' (سالنامہ) 1961ء ص 12

(27) سید احتشام حسین　　''ادب میں طنز کی جگہ''　　مضمون مشمولہ ''تنقید اور عملی تنقید'' سنہ 2005ء ص 31-30

(28) ڈاکٹر انوار احمد انصاری ''پنجاب کا طنزیہ و مزاحیہ نثری ادب'' مطبوعہ ''پرواز ادب' طنز و مزاح نمبر'' (حصہ دوم)
ص 23 سنہ مارچ اپریل 2005ء

(29) پروفیسر گوپی چند نارنگ مقدمہ ''الف تحاشہ'' از نریندر لوتھر　　ص 10

(30) ڈاکٹر نسیم الدین فریس　مطبوعہ ''شگوفہ' یوسف ناظم نمبر''　　ص 69

(31) ڈاکٹر وزیر آغا　　''اردو طنز و مزاح کا ارتقاء آزادی کے بعد''　ص 79

(32) نامی انصاری　　''آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح''　ص 8 سنہ 2003ء

(33) ڈاکٹر زینت ساجدہ　''مضمون مشمولہ: ''حیدرآباد کے مزاح نگار'' مرتب ڈاکٹر طیب انصاری　ص 116

(34) عاتق شاہ ''باتیں''　مضمون مشمولہ: ''انڈین کا جو''　　ص 10

(35) رشید موسوی　　''کاغذی ہے پیراہن　　ص 3 سنہ 1986ء

(36) محمد سعادت علی خاں ''حیدرآباد میں اردو ڈرامے کی روایت'' مطبوعہ ''شگوفہ ڈرامہ نمبر''　ص 245

(37) سید مظفر الدین سعید سے شخصی انٹرویو، بمقام معظم جاہی مارکٹ، بتاریخ 15 اپریل 2004ء

(38) جہاندار افسر سے شخصی انٹرویو، بمقام مغل پورہ کمان، بتاریخ اپریل 20، 2002ء

(49) سعادت علی خاں　　مطبوعہ ''شگوفہ ڈرامہ نمبر''　　ص 346

(40) بشیر النساء بیگم ''معز الدین ملتانی، شخصیت اور فن'' صفحہ 250 مقالہ برائے ایم فل، غیر مطبوعہ شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد مارچ 1990ء

(41) ڈاکٹر نسیم فریس ''طنز و مزاح کے نالگو برادرس'' مطبوعہ ''قومی زبان'' اکتوبر 2006ء ص 66

(42) پروفیسر اشرف رفیع ''ترکی بہ ترکی... پرویز یداللہ مہدی'' مطبوعہ ''شگوفہ' پرویز یداللہ مہدی نمبر'' صفحہ 128

(43) بشیر النساء ''معز الدین ملتانی، شخصیت اور فن'' ص 66

(44) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ''پھر ملیں گے گر خدا لایا'' (اداریہ) مطبوعہ ''شگوفہ'' ستمبر 1984 ص 60

(45) نامی انصاری　　''آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح''　ص 51

(46) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ''پھر ملیں گے گر خدا لایا'' (اداریہ) مطبوعہ ''شگوفہ جنوری 1986ء　ص 56

(47) ڈاکٹر محمد طیب انصاری ''شگوفہ۔ ترجمانی سے تحریک تک'' مطبوعہ ''شگوفہ 37 ویں سالگرہ نمبر جولائی 2007'' ص 127

(48) پروفیسر گیان چند جین ''تاثرات'' ایضاً ص197

(49) انور سدید مطبوعہ ''شگوفہ'' ستمبر 1988ء ص149

(50) پروفیسر اشرف رفیع ''شگوفہ کا 37 سالہ سفر'' مطبوعہ ''شگوفہ 37 ویں سالگرہ نمبر'' جولائی 2005 ص112

(51) پروفیسر اشرف رفیع ایضاً ایضاً ص111

(52) پروفیسر عبدالرزاق فاروقی ''شگوفہ کی 37 ویں سالگرہ کے موقع پر'' ایضاً ص133

(53) پروفیسر نثار احمد فاروقی ''دے کے خط'' ایضاً ص114

(54) کلیم چغتائی ''دے کے خط'' مطبوعہ'' ایضاً ص112

(55) منظور وقار ''مراسلہ ''مطبوعہ ''شگوفہ'' ستمبر 1981ء ص 56

(56) عزیز ابرار ''شگوفہ کی ادبی خدمات'' مقالہ برائے ایم فل مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو
سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد 1989ء ص220

(57) ڈاکٹر محمد طیب انصاری ''عہد آصفیہ اور اردو نثر کا ارتقاء'' 1999ء ص183

(58) خواجہ عبدالغفور ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' 1983ء ص249

(59) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد'' ص191

(60) وقار خلیل ''مشیر دکن'' مطبوعہ روز نامہ ''سیاست'' مورخہ 5 جنوری 1975ء

(61) انیسہ سلطانہ ''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو نما'' 1986ء ص68

(62) ڈاکٹر محمد انور الدین ''حیدرآباد دکن کے علمی و ادبی رسائل'' مکتبہ شاداب' حیدرآباد 1997 ص287

(63) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ''آندھرا پردیش میں اردو طنز و مزاح کے بائیس سال'' مضمون مشمولہ ''مبصر'' ص5
ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری

(64) ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ''حیدرآباد میں طنز و مزاح آزادی کے بعد'' مطبوعہ ماہنامہ ''شگوفہ'' جنوری 1988ء ص89

(65) ڈاکٹر زینت ساجدہ ''حیدرآباد کے ادیب'' 1958ء ص55

(66) مسلم ضیائی ''پیش لفظ'' ''روسی ظرافت'' 1944ء ص9

(67) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال شخصی انٹرویو مشمولہ ''ڈاکیومنٹری'' ''زندگی کا سفیر' منظور الامین'' تیار کردہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

(68) ایم اے حنان ''الیکشن اور ہم'' مشمولہ ''گستاخی معاف'' ص72

(69) مرزا شکور بیگ ''پیلے دوشالے سے سرخ سویرے تک'' مطبوعہ ''شگوفہ'' ستمبر 2000ء ص45

(70) نذیر دہقانی ''میں اور میری شاعری کے ثمرات'' مطبوعہ ''شگوفہ'' جون 1973ء ص42

(71) سیدہ جعفر ''نظم میں طنز و مزاح کے نئے رجحانات'' مشمولہ ''طنز و مزاح تاریخ و تنقید'' 1986ء ص144

(72) عزیز ابرار ''شگوفہ کی ادبی خدمات'' مقالہ برائے ایم فل' از عزیز ابرار غیر مطبوعہ' مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو' سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد' 1989ء ص44

(73) سید بشیر احمد ''مزاح نگاران حیدرآباد'' ص79

(74) شفیع اللہ خاں ''پاگل عادل آبادی: طنز و مزاح کے مقبول شاعر'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ 6 اگست 2007ء

(75) مضطر مجاز ''کہہ مکرنی'' مطبوعہ ''شگوفہ'' ستمبر 1982ء ص20

(76) اقبال شانہ ''غزل'' مطبوعہ ''شگوفہ خلیج نمبر'' جون 2004ء ص137

(77) وحید پاشاہ قادری ''شخصی انٹرویو'' مورخہ 24-02-2010

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ ستمبر 1883 میں دلکُشا منزل محلّہ چڑی والاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں ہی تعلیم مکمل کی۔ حصول علم کے بعد اگست 1907 میں حیدرآباد آئے اور صدر مدرس کی حیثیت سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اپنی صلاحیتوں کی بناء پر ترقی کرتے ہوئے سیشن جج کے عہدے تک پہنچے۔ ان کی شادی حیدرآباد میں ہوئی۔ 27 اپریل 1947 کو حیدرآباد میں ان کا انتقال ہوا۔ مسجد ٹھگی جیل سے متصل قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن انھیں شہرت ایک مزاح نگار کے طور پر حاصل ہوئی۔ پروفیسر سیدہ جعفر کی زیر نگرانی لکھے گئے مقالہ ''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو نما'' میں مقالہ نگار انیسہ سلطانہ نے فرحت اللہ بیگ کو پہلا مزاحیہ نثر نگار قرار دیا ہے۔ ان کا مزاح زبان اور انداز بیان کا مزاح ہے۔ انھیں دہلی کی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اسلوب کی دلآویزی' فقروں کی لطافت اور الفاظ کی مخصوص ترتیب ان کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔ ان کی تحریروں میں مخصوص قسم کی بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ارادتاً یا شعوری طور پر مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کی تحریر میں مزاح آپ ہی آپ پیدا ہو رہا ہے۔

ان کے مضامین کے سات مجموعے شائع ہوئے ہیں۔'نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' ان کا تحریر کردہ مشہور خاکہ ہے۔ ان کے مضامین کے مجموعے ''مضامین فرحت'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تصانیف ''پھول والوں کی سیر' اور'' دلی کی یادگار مشاعرہ'' ان کے غیر فانی شہکار ہیں۔ مزاحیہ مضامین میں دلی کا یادگار مشاعرہ' عظمت اللہ' حکیم آغا خاں عیش' خواجہ بدرالدین عیش'' ایک وصیت کی تکمیل'' (وحیدالدین سلیم کا خاکہ) اور ایک نواب صاحب کی ڈائری وغیرہ کافی مقبول ہیں۔ نذیر احمد اور وحیدالدین سلیم کے خاکے فرحت اللہ بیگ کی ذہانت' بذلہ سنجی اور خوش مذاقی پر دال ہیں۔ ان کے پاس تاریخی' سماجی اور سیاسی شعور بہت پختہ ہے۔ وہ خالص مزاح لکھتے ہیں کہیں کہیں طنز بھی ہے لیکن اس کی حیثیت جزوی ہے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ لکھتی ہے۔

''ان کے مزاح کا رنگ اودھ پنچ سے مختلف اور اردو کے لئے نیا تھا۔ ان

کے ہاں لب و لہجے کی متانت اور مذاق کی شائستگی کے ساتھ ایک طرح کی خوش مذاقی پائی جاتی ہے جس سے ذہنی بشاشت اور انبساط پیدا ہوتا ہے۔‘‘(1)

فرحت اللہ بیگ کی تحریریں قہقہہ بر دوش نہیں بلکہ ان کا قلم طنز کی راہوں کو سنجیدگی اور متانت کی روشنی میں طئے کرتا ہے۔ان کی سنجیدگی میں مسکراہٹ اوران کی مسکراہٹ میں معنویت کے خزانے پوشیدہ تھے ان کی تحریروں سے ان کے مشاہدے کی وسعت اور گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔وہ اپنی تحریر میں شستہ اور شائستہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اوران کی ظرافت میں بھی ایک مقصد ہوتا ہے۔چنانچہ مرزا صاحب خود اپنی مضمون نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

’’مضامین لکھنے میں میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایک تو وہ پرانے واقعات تحریر میں آجائیں جو بزرگوں کی زبانی مجھے تک پہنچے ہیں۔تاکہ کچھ دن بعد نیست و نابود نہ ہوجائیں۔دوسرے یہ کہ ان اہل قلم کے واقعات قلم بند ہوجائیں جنھوں نے زبان اردو کی اصلاح میں اپنی عمریں صرف کردیں۔تیسرے اردو زبان میں خوش مذاقی کے ذریعہ اصلاح معاشرت کا پرچار کیا جائے‘‘(2)

ماقبل آزادی حیدرآباد میں مزاح نگاری کے میدان میں چند ہی لوگوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔مرزا فرحت اللہ بیگ مزاحیہ نثر نگاروں کی پہلی صف سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ اپنے مخصوص اسلوب سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔نامی انصاری ان کے فن اوران کی خاکہ نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ۔

آزادی کے قبل مزاح لکھنے والوں میں فرحت اللہ بیگ کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔نذیر احمد اور وحیدالدین سلیم پر ان کا مزاحیہ خاکہ اپنا جواب آپ ہے۔ان خاکوں کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس سے قبل اردو ادب میں اس قسم کی خاکہ نگاری کی کوئی روایت نہ تھی۔البتہ مرزا غالبؔ نے اپنے ایک خط میں میرن صاحب کا جو نقشہ کھینچا ہے اسے مزاحیہ خاکہ نگاری کا نقش اول کہا جاسکتا ہے۔وہ اپنی تحریر میں زبان اور اسلوب سے مزاح پیدا کرنے میں ماہر ہیں۔‘‘(3)

مرزا فرحت اللہ بیگ کی کامیابی کا راز ان کی بے مثل ذہانت کے علاوہ اردو زبان، خاص طور پر دہلی کی ٹکسالی زبان پر ان کی قدرت میں پوشیدہ ہے۔ وہ اردو کے ایک ایک لفظ کے رمز شناس ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ کہاں، کس لفظ سے کونسا نکتہ پیدا کیا جاسکتا۔ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' سے ایک اقتباس دیکھئے۔

> ''محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا تحریر ہو یا تقریر وہ محاوروں کی ٹھونسم ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے۔ خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کونسی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا۔ ایسے ایسے محاورے ان کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے اور نہ سنے۔ ان عبارتوں کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے مگر چلتے چلتے راستے میں عربی زبان کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے بلکہ پہاڑ رکھ دیتے تھے۔'' (4)

مولوی عبدالحق اس مرقع کے بارے میں کہتے ہیں کہ نہ صرف اردو بلکہ کسی دیگر زبان میں بھی اس طرح کے پُر بہار خاکے نہیں لکھے گئے ہیں۔ خاکوں کے علاوہ ''پھول والوں کی سیر'' اور ''دہلی کی آخری شمع'' بھی ان کی یادگار تخلیقات ہیں جن میں بیان کی شوخی اور شگفتگی نمایاں ہے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ان کے اسلوب اور فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''فرحت اللہ بیگ جدید دور کے قابل تکریم مزاح نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انھیں دلی کی ٹھیٹ اور بامحاورہ زبان پر خاصہ عبور حاصل ہے۔ ان کے ہاں رنگ رس زبان کا لطف اور تلذذ ملتا ہے۔ زبان و بیان کے لطف اور چاشنی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ خواہ کیسے ہی موضوع پر قلم کیوں نہ اٹھائیں ظرافت پیدا کئے بغیر نہیں رہتے۔......نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، فرحت اللہ بیگ کے فن کا شہکار اور زندہ جاوید مرقع ہے۔ اس کی

سب سے بڑی خوبی فرحت اللہ بیگ کا ظریفانہ اسلوب ہے وہ واقعات سے مزاح پیدا نہیں کرتے۔انکی ظرافت انکی دلکش زبان اور خوبصورت محاوروں میں ملتی ہے۔''(5)

مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو اپنے مزاح کے لئے معروف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز طنز نگار بھی ہیں۔ان کے ہاں کیفیت وکمیت کے لحاظ سے مزاح کو اہمیت حاصل ہے۔ادب میں مزاح کئی طرح سے پیدا کیا جاتا ہے۔واقعاتی مزاح' واقعات کی خاص ترتیب یا ان کو مسخ کر کے' پطرس کے مضامین اس کی بہترین مثال ہے۔فرحت اللہ بیگ ایک ایسے فنکار ہیں جو اپنے مزاحیہ اسلوب کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔یوسف حسین خاں نے مرزا فرحت اللہ بیگ کو دہلی کی خالص بے میل اور پاکیزہ زبان کا نمائندہ قرار دیا ہے۔ان کے طنز میں مشرقیت اورانسانیت کی ہم آہنگی ملتی ہے۔(6)

''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی''ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو اپنی سنجیدگی متانت اور عالمانہ وقار کے لئے ایک زمانہ میں شہرت رکھتی تھی۔ڈپٹی نذیر احمد کو مزاح سے کوئی خاص تعلق تو نہیں تھا لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ کا مرقع پڑھنے کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کی مزاح سے بھرپور شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔یہ نذیر احمد کا کمال نہیں فرحت اللہ بیگ کے اسلوب کا کمال ہے۔اس میں فرحت اللہ بیگ اپنے شگفتہ اسلوب سے کردار نگاری کرتے ہیں کہ قاری مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔فرحت اللہ بیگ شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں بلکہ اپنے اسلوب سے تحریر میں جان ڈال دیتے ہیں۔عزیز احمد لکھتے ہیں۔

''اس مضمون میں مرزا صاحب کی تحریر اور کردار نگاری کی شوخی دراصل محبت کی شوخی ہے اور یہ اسلوب کی بے تکلفی کی وجہ سے ادب بن گئی ہے۔زبردستی کی ظرافت نہیں بنی۔اس مضمون ہئیت اور تکنیک ادب اور حیات دونوں کے اعتبار سے انوکھی اور غیر معمولی ہے۔کہانی کا جتنا حصہ نذیر احمد کی زبانی ہے اس میں ظرافت کی نوعیت مختلف ہے کیونکہ وہ نذیر احمد کی ظرافت ہے'اس ظرافت اور اپنی شوخی میں فرق قائم رکھنا فرحت اللہ بیگ

کے مزاحیہ اسلوب کا بڑا کمال ہے۔‘‘(7)

مرزا فرحت اللہ بیگ نے مولوی نذیر احمد کی خامیوں کی پردہ پوشی نہیں کی ہے بلکہ ایک دیانت دار مرقع نگار کی طرح ان کی خامیوں کو ہمارے سامنے پیش کر کے ان کی شخصیت کے حقیقی خدوخال مع اپنی حرکات وسکنات کے ساتھ لا کھڑا کر دیا ہے۔ ایسے موقع پر وہ اپنے مزاحیہ اسلوب سے کام کر جاتے ہیں۔ ان کی خامیوں کو اپنے اسلوب کے غلاف میں یوں لپیٹتے ہیں کہ قاری خامیوں سے زیادہ اس غلاف کے بیل بوٹوں کی صناعی میں محو ہو جاتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے۔

> ’’کوڑی کوڑی کا حساب دیکھتے۔ اعتراضوں کی بوچھاڑ سے پریشان کرتے اور کہتے جاتے’’بھئی حساب جو جو بخشش سو سو‘ فقرے کے پہلے جزو سے تو بیچاروں کو روز واسطہ پڑتا لیکن دوسرے جزو کا دیکھنا کسی کو نصیب نہ ہوا۔‘‘(8)

فرحت اللہ بیگ اپنے مزاح کے اعتبار سے اس گروہ میں شمار ہوتے ہیں جو مشرقیت کا دلدادہ ہے۔ وہ مشرقی اقدار سے پیار کرتے ہیں اور مشرقی تہذیب کے عاشق ہیں۔ لیکن ان کی ذہنیت کچھ شدید بھی نہیں۔ وہ بڑے کھلے دل و دماغ کے مالک ہیں۔ وہ مغرب کی اچھی چیزوں کو پسند بھی کرتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں انھوں نے مغرب کی کورانہ تقلید دیکھی جس کی وجہ سے مشرقی اقدار پر کاری ضرب لگتی ہے وہ برداشت نہیں کرتے۔ سب سے پہلے ایک ہندوستانی کا حاصل سنیئے جن کو انگریزیت کا نیا نیا شوق چرایا تھا۔

> ’’میں سمجھ گیا کہ ان ہمارے ہندوستانی بھائی کو انگریزیت کا نیا شوق چرایا ہے گھر سے بیوی نے لوٹا ساتھ کر دیا ہوگا یہاں سوٹ پہن کر لوٹا ساتھ رکھتے شرم آتی ہے۔ اسی لئے اس کی ملکیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔ گھڑی گھڑی ان کا ہاتھ مونچھوں پر جاتا اور خالی آتا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ مونچھیں پہلی دفعہ منڈائی گئی ہیں۔ رہ رہ کر ٹائی درست کرتے‘ کوٹ اور واسکوٹ کی سلوٹیں نکالتے یہ اس بات کی دلیل تھی کہ سوٹ پہننے کی عادت نہیں

ہے۔ہاتھ میں موٹی سی انگریزی آداب مجلس کی کتاب تھی اس سے سمجھ لیجئے
کہ عالم ہو کر یہ کہیں عمل کرنے جارہیں ہیں۔بکسوں کی زیادتی بتارہی ہے کہ
سفر کے عادی نہیں اس لئے بے ضرورت سامان سمیٹ لائے ہیں۔''(9)

ایک مزاح نگار کے لئے مشاہدہ کی وسعت اور بصیرت کی گہرائی اولین شرط ہے۔فرحت اللہ بیگ کا مشاہدہ کافی وسیع ہے۔ان کی نگاہ معاشرے کے تقریباً ہر پہلو پر ہوتی ہے۔ان کے پاس ادبی' سماجی' سیاسی' قانونی' سوانحی ہر موضوع مل جائے گا۔فرحت اللہ بیگ کے پاس طنز ومزاح مقصد نہیں وسیلہ ہے۔دراصل وہ معاشرے پر طنز کرتے ہیں اس کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔وہ طنز کی ایسی چٹکیاں لیتے ہیں کہ جس کی چٹکیاں لے رہے ہیں وہ بھی مسکرادیتا ہے۔اور جیسے ہی مسکراہٹ ختم ہوئی وہ اپنے محاسبے پر مجبور ہوجاتا ہے۔یہاں دیکھئے اخبارات کے مدیران کا خاکہ کس سلیقے اور شائستگی سے اڑاتے ہیں۔

''ان کی ظاہری حالت پر نہ جانا یہ بڑے آدمی ہیں۔سوتے میں بھی
مضمون لکھ لیا کرتے ہیں۔کیوں نہ ہو بڑی تقدیر والے آدمی ہیں۔چار دفعہ
جان بوجھ کر جیل جاچکے ہیں اور سرکاری روٹیاں کھاچکے ہیں۔سچ ہے جس کو
خدا رکھے اس کو کون چکھے۔''(10)

''ایڈیٹر کا کمرہ'' اور ''بیرا'' فرحت اللہ بیگ کے گہرے مشاہدے کی دلیل ہیں۔فرحت اللہ بیگ کے جن مضامین میں طنز کے عناصر زیادہ ملتے ہیں وہ ایسے ہیں جن میں وہ کسی اخلاقی مسئلہ کو پیش کرتے ہیں ظاہر ہے تاآنکہ وہ اپنی ذمہ داری کا کماحقہٗ احساس نہ کریں قاری کو اپنا موید نہیں بناسکتے۔ہمارے خوشحال گھرانوں کی اولاد جس بے راہ روی کی شکار ہے۔دیکھئے کس طرح سے وہ اس کو بے نقاب کرتے ہیں۔

''لا کلاس کا صداقت نامہ بھی مل گیا۔اب کیا تھا والدین امتحانِ
وکالت کی تیاری کے لے سر ہوگئے۔مگر میں بھی ایک ذاتِ شریف ہوں
ایک بڑھیا اور بڈھے کو دھوکہ دینا کیا بڑی بات ہے۔میں نے تقاضہ کیا
کہ علحدہ کمرہ مل جائے۔محنت کروں۔بال بچوں کی گڑبڑ میں مجھ سے

کچھ نہیں ہوسکتا۔ چند روز اسی حیلے سے ٹال دیئے لیکن تا بکے! بڑی بی نے اپنے سونے کا کمرہ خالی کر دیا اب میں دوسری چال چلا۔ دروازوں میں شیشے تھے ان پر کاغذ چپکا دیا۔ لیمپ روشن کر کے آرام سے سات بجے سو جاتا اور صبح نو بجے اٹھتا۔ اگر کسی نے آواز دی اور آنکھ کھل گئی تو ڈانٹ دیا کہ خواہ مخواہ میری پڑھائی میں خلل ڈالا جاتا ہے۔ اگر آنکھ نہ کھلی اور صبح کو سونے کا الزام لگایا گیا تو کہہ دیا کہ میں پڑھتے وقت کبھی جواب نہ دوں گا۔ آئندہ کوئی مجھے دق نہ کرے۔'' (11)

فرحت اللہ بیگ کا فن ان عناصر سے ترکیب پایا ہے جو ایک کامیاب طنز ومزاح نگار کے لئے لازم ہیں' تہذیبی اقدار کا رچاؤ' سماجی مطالعہ' ادبی روایات سے ہم آہنگی اور زبان و بیان پر قابو ان کے فن کے عناصر اربعہ ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو بس یہی کہنا تھا۔ انداز بڑا ہی شائستہ اور شستہ اس لئے تیر نشانہ پر بیٹھتا ہے۔ پہلی نظر میں ہم طنز ومزاح کا احساس کرتے ہیں لیکن غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو مصنف نے برسر عام عریاں کر دیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے وہ کس طرح ڈاکٹروں کی ''سرجری'' کرتے ہیں۔

''ڈاکٹری کی جماعت میں شریک ہوگئے۔ بڑی نوابی سے وہاں پانچ برس گذارے امتحان میں بیٹھے پاس ہوئے اور سند مل گئی کہ آج سے اس شخص کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے زہر دے کر مار ڈالے جس پر چاہے چھری چلا دے' جس کو چاہے عدم آباد پہنچا دے کسی قانون کی رو سے اس کے مقابلہ میں ضرر شدید زہر خورانی یا قتل کا مقدمہ قائم نہ ہو سکے گا۔'' (12)

مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے بیشتر مضامین میں سماجی برائیوں اور ناہمواریوں کو نہایت لطیف انداز میں بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کے مضامین قاری کو مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ دعوت فکر بھی دیتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو ظریفانہ رنگ میں پرکھتے ہیں اور اسے دلچسپ اور لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری کو دل میں ایک خوشی اور مسرت محسوس ہوتی ہے۔ ''میری بیوی'' کے عنوان سے ان کے ایک مضمون کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اجی بی اماں! کیا ہماری شادی ٹھہر گئی'۔والدہ صاحبہ نے مسکرا کر کہا۔'کیا اب بھی کچھ شک ہے۔ یہ چڑا چڑا کر باتیں کرنے سے فائدہ؟ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کیوں نہیں کہتے'۔میں نے کہا 'یہ بتایئے کہ ہماری دلہن کچھ پڑھی لکھی بھی ہیں'۔جواب ملا 'ہاں' ہم نے کہا 'کچھ سلیقہ مند بھی ہیں' کہا 'ہاں' پھر پوچھا کہ شکل وصورت کیسی ہے بی اماں بولیں 'ہاں آدمی کا بچہ ہے' یہ جواب کچھ عجیب گول مول تھا۔ہم آدمی تھے اگر آدمی کے بچے یا آدمی کی بچی سے شادی نہ ہوتی تو کیا کسی جانور کے بچے یا بچی سے ہوتی ہم نے ذرا بگڑ کر کہا کہ ''دیکھئے اماں جان! صاف صاف بتایئے۔آپ کو معلوم ہے کہ مجھے صورت سے نفرت ہے۔مگر بیوی صاحبہ کی صورت ذرا خراب ہوئی تو مجھ سے نبھنی مشکل ہے۔یہ سن کر والدہ صاحبہ تو بگڑ ہی گئیں کہنے لگیں کہ ''اوہو اب آپ بھی اس قابل ہو گئے ہیں کہ میں بہو لیکر آؤں اور آپ پسند نہ کریں۔چل رے لڑکے چل مجھے تیری یہ باتیں پسند نہیں۔اب میں شادی کر رہی ہوں یا تو کر رہا ہے۔تیرے لئے جنت سے کوئی حور آنے سے تو رہی۔شریف لوگ صورت شکل تھوڑی دیکھتے ہیں۔ہڈی دیکھتے ہیں۔اب تو نے مجھ سے ایسی باتیں کیں تو اچھا نہ ہوگا۔'' لیجئے ساری محنت اکارت گئی۔جب ماں ہی کو ہمارا خیال نہیں تو اور کسی کو کیا ہوگا۔خیر جی کچھ ہرج نہیں۔اماں ہماری بیوی کی مالک ہیں۔تو ہم اپنے مالک ہیں۔اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ ہے۔کسی نہ کسی طرح گذر ہی جائے گی' خدا تنگ نیست پائے مرلنگ نیست۔''(13)

فرحت اللہ بیگ کی ظرافت ایک مقصدی ظرافت ہے۔ان کی مزاحیہ تحریروں میں ان اقدار کی جھلک صاف نظر آتی ہے جن سے ان کو محبت ہے۔مرزا فرحت اللہ بیگ کا ایک مضمون ''آزاد نگارستان اور دادا جان'' بہت دلچسپ ہے اس خاکہ نما مضمون میں ان کے تخیل کی پرواز اپنی پوری بلندی پر نظر آتی ہے۔واضح رہے کہ یہ مضمون

انھوں نے آزادی سے کئی سال قبل لکھا تھا اور یہ محض تخیلی داستان ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''اسی وقت وکیل صاحب فرما رہے تھے۔میرے عزیز بھائیوں تم کو اپنے کاموں سے اتنی فرصت کہاں کہ ملک کی پارلیمان میں شرکت کرسکو۔تم میں اتنی تعلیم کہاں ہے کہ خود اپنی بہبودی کے لئے کوئی رائے ظاہر کرسکو۔تم میں اتنی سکت کہاں ہے کہ دارالسلطنت میں رہ کر وہاں کے اخراجات برداشت کرسکو۔میں تمہارا خادم ہوں۔مجھ پر تمہارے حقوق ہیں۔تمہارا فائدہ ہر وقت میرے پیش نظر ہے۔میں تم کو خوشحال دیکھنا چاہتا ہوں۔میں تمہاری بھلائی کے لئے اپنی جان دینے کو تیار ہوں۔میں پارلیمان میں تمہاری نیابت کروں گا۔میں ثابت کردونگا کہ تم نے مجھ پر جو بھروسہ کیا تھا وہ کچھ بیجا نہ تھا۔میں تمہارے مقابلہ میں اپنے فائدہ کو ہیچ سمجھوں گا' میں ظالموں کے پنجے سے تمہیں نجات دلاؤں گا۔سچ کی مدد کروں گا اور حقدار کو حق پہنچاؤں گا۔''(14)

اس مضمون میں غیر مقامی اور خود ساختہ رہنماؤں پر بڑا ہی لطیف طنز کیا گیا ہے۔جو معصوم عوام کو مستقبل کو سبز باغ دکھا کر بے وقوف بناتے ہیں اور اپنی جیبیں گرم کرتے ہیں۔حالانکہ یہ مضمون نما خاکہ آزادی سے بہت پہلے تحریر کیا گیا ہے لیکن آج بھی اس کی معنویت برقرار ہے۔اور جو واقعات اور حالات بتائے گئے ہیں بالکل اسی طرح کی صورتحال ہمارے آس پاس نظر آتی ہے۔

زبان و بیان پر فرحت اللہ بیگ کی گرفت ان کے مزاح کی کامیابی کی ضمانت ہے۔کسی بھی ادیب کے اسلوب میں جان اسی طرح پیدا کی جاسکتی کہ موضوع کی فکرانگیزی کے ساتھ وہ زبان و بیان پر کتنی قدرت رکھتا ہے۔الفاظ' محاوروں' روزمرہ' تشبیہات' تلمیحات' اصطلاحات اور ضرب الامثال کا استعمال وہ کتنی مہارت کے ساتھ کرتا ہے۔فرحت اللہ بیگ کو ڈپٹی نذیر احمد کی شاگردی کا شرف حاصل تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اردو سیکھی تھی۔وہ دلی کی ٹکسالی زبان استعمال کرتے ہیں۔ان جیسا اہل زبان اردو

ادیبوں میں کم اور طنز نگاروں میں تو دو ایک ہی ملیں گے۔نذیر احمد کی کہانی......پھول والوں کی سیر' دہلی کا یادگار مشاعرہ یا مضامین فرحت کے کسی بھی حصہ کے کسی بھی مضمون کا مطالعہ کیجئے فرحت اللہ بیگ کا اسلوب شوخی' شگفتگی' خوش مذاقی' شائستگی سے مالا مال نظر آئے گا۔نامی انصاری اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''ظرافت سے ان کا سروکار کافی گہرا تھا لیکن وہ خوش طبعی اور بذلہ سنجی تک محدود تھا۔ان کے یہاں طنز بہت کم ہے لیکن زندگی کی ناہمواریوں کو اُجاگر کرنے میں وہ کوئی رعایت نہیں کرتے۔''(15)

فرحت اللہ بیگ کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خورشید الاسلام رقمطراز ہیں۔

''فرحت اللہ بیگ ماضی کو حال میں تبدیل کرسکتے ہیں حال میں مستقبل کا جلوہ دیکھنا ان کے بس کی بات نہیں۔وہ مشرقیت کے دلدادہ ہیں۔وہ اشخاص سے ہمدردی رکھتے ہیں' لیکن ہمدردی......ہمدردی میں شگفتہ تنقید کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ان کی زبان ظرافت کی جان ہے' فرحت اللہ محاوروں سے وہی کام لیتے ہیں جو رشید احمد صدیقی قول محال Parodox سے لیتے ہیں۔ان کی مرقع نگاری اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔''نذیر احمد کی کہانی' ''پھول والوں کی سیر' اور ''آخری وصیت'' ان کے کارنامے ہیں۔''(16)

ایک اور وصف جو فرحت اللہ بیگ کے فن کو بلند مقام عطا کرتا ہے۔وہ ان کا ظریفانہ لہجہ ہے۔لب ولہجہ کا مزاح اسلوب کے مزاح سے بھی زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے۔اس کے لئے فن کار کو بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔فرحت اللہ بیگ کے مضامین کا لب ولہجہ اپنی مثال آپ ہیں۔ان کے موضوعات میں تنوع اور ان کے طنز و مزاح میں خوش گوار عناصر پائے جاتے ہیں۔اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں وہ اپنی آواز سے پہچانے جاتے ہیں۔وہ اپنے موضوعات سے زیادہ اپنے اسلوب اور لب ولہجہ کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔

---000---

حوالہ جات

(1) ڈاکٹر زینت ساجدہ　مشمولہ: ''حیدرآباد کے ادیب''　ص116

(2) فرحت اللہ بیگ　بحوالہ ''اردو ادب میں طنز ومزاح'' از غلام احمد فرقت کاکوروی　1957ء ص144

(3) نامی انصاری　''آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز ومزاح''　ص29

(4) مرزا فرحت اللہ بیگ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی''　ص 24 سنہ 2004ء

(5) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ''اردو نثر کے چند طنز ومزاح نگار'' مضمون مشمولہ: تنقید اور احتساب ص64 ستمبر 1993

(6) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ''یادوں کی دنیا'' ص 114-113 سنہ 1967ء

(7) عزیز احمد　مضمون مشمولہ: ''یادگار فرحت'' ص101

(8) فرحت اللہ بیگ　''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی''　ص23

(9) فرحت اللہ بیگ　''صاحب بہادر''　مضمون مشمولہ: ''مضامین فرحت''　ص55

(10) فرحت اللہ بیگ　''ایڈیٹر صاحب کا کمرہ'' مضمون مشمولہ: ''مضامین فرحت''　ص105

(11) فرحت اللہ بیگ　''عشق کی گولیاں''　مضمون مشمولہ: ''مضامین فرحت''　ص67

(12) فرحت اللہ بیگ　''عشق کی گولیاں''　مضمون مشمولہ: ''مضامین فرحت''　ص77

(13) مرزا فرحت اللہ بیگ ''میری بیوی''　مشمولہ ''اردو ادب میں طنز ومزاح''　145

(14) مرزا فرحت اللہ بیگ ''آزاد نگارستان اور دادا جان''　مشمولہ ''بیسویں صدی میں طنز ومزاح'' ص30 سنہ 2002ء

(15) نامی انصاری　''بیسویں صدی میں طنز ومزاح'' ص25

(16) ڈاکٹر خورشید الاسلام　''اردو میں طنز وظرافت''　مضمون مشمولہ ''سوونیئر' زندہ دلان حیدرآباد 1967ء
(دوسرا کل ہند مزاحیہ مشاعرہ)

مرزا عصمت اللہ بیگ

مرزا عصمت اللہ بیگ دہلی کے معزز اور علمی گھرانے میں 30 مارچ 1896ء کو پیدا ہوئے۔ مرزا غالبؔ اور میر مومن خاں مومنؔ کے خاندان سے رشتہ داری تھی۔ بوستان خیال کے مترجم خواجہ امان سے نسبت تھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے چچا زاد بھائی تھے۔ کم سنی میں ہی حیدرآباد آ گئے تھے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے وابستہ رہے۔ انہیں محکمہ تعلیمات میں بھی ملازمت کرنے کا موقع ملا۔ ملازمت کے سلسلے میں گلبرگہ جانے کا اتفاق ہوا۔ سجاد مرزا گلبرگہ میں صدر مہتمم تعلیمات تھے۔ انہوں نے عصمت کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ وہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ طنز و ظرافت کو قومی اصلاح کیلئے استعمال کیا کرتے تھے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ نے آزادی سے قبل حیدرآباد میں مزاح نگاری کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ انہوں نے اپنی سادہ اور پر اثر زبان میں مزاح کے مختلف رنگ بکھیرے جو پڑھنے والے کو عجب تازگی اور مسرت کا احساس دلاتے ہیں۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ انجینئر تھے اور دوسروں کا مضحکہ اڑانے کے بجائے خود اپنی شخصیت کو طنز کا نشانہ بناتے۔ اکثر کہا کرتے کہ جو عمارتیں اور پل ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں وہ خاکسار کے ہی بنائے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ ان کی شخصیت کی تصویر کشی کچھ اس طرح سے کرتی ہیں:

> ''عصمت اللہ بیگ بڑے خوش باش، خوش فکر اور خوش گفتار آدمی تھے اور یہی رنگ ان کی نظم و نثر میں جھلکتا ہے۔ وہ دلّی کے اس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس کو غالبؔ، مومنؔ سے نسبت تھی اور جس نے خواجہ امان مترجم بوستان خیال کو جنم دیا تھا۔ فرحت اللہ بیگ ان کے چچا زاد بھائی تھے جن کی ظرافت نے اردو میں ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ انہیں نجوم، رمل اور مصوری سے گہرا لگاؤ تھا۔ نجوم پر تو ''آسمان کے بھید'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ انہیں ترجمہ نگاری کا بھی اچھا ملکہ تھا۔

ان کے مزاحیہ مضامین میں جو ہر اور حکیم جی کا مطب بہت مشہور ہوئے''۔(1)

بذلہ سنجی اور شگفتگی عصمت اللہ بیگ کی شخصیت کا ایک اہم حصہ تھی۔عصمت شوخ طرار قسم کی طبیعت کے مالک تھے۔دوستوں کی محفل کی جان ہوا کرتے تھے فرحت اللہ بیگ اور حکیم معشوق علی خاں جوہرؔ کی صحبت نے ان کے فن کو مزید جلا بخشی۔اپنے عم زاد فرحت اللہ بیگ کی زندگی کے پہلوؤں کو اپنے ایک مضمون''فرحت کی زندگی کے چند پہلو''میں کچھ اس طرح اجاگر کرتے ہیں۔

''مرحوم ہمیشہ کہتے تھے کہ میں خالی کے مہینے میں پیدا ہوا تھا۔مگر نہ تو کبھی اللہ نے ہمیں یہ توفیق دی کہ ان کی پیدائش کا سن پوچھتے اور نہ کبھی انہوں نے بتایا۔خدا مولوی غلام یزدانی کو خوش رکھے،انہیں سنہ اور تاریخیں بتانے میں کمال حاصل ہے اور کیوں نہ ہو بچپن سے وہ اسی فن میں بڑے ہوئے،مرے مردے قبر سے اکھڑتے ہیں اور پرانے سے پرانے باوا آدم کے مقبروں اور گنبدوں کا سنہ تعمیر بتا دیتے ہیں۔پھر بھلا مرحوم کا سنہ پیدائش بتا دینا ان کیلئے کیا مشکل تھا۔بچپن کے ساتھی ہیں۔میں نے پوچھا تو انہوں نے فوراً اپنی لال کتاب اٹھائی اور چوتھی لا کر بتا دیا کہ مرحوم 1884ء کے اوائل میں پیدا ہوئے تھے۔لیجئے اس حساب سے ان کی عمر کوئی 64 سال کی ہوتی ہے''۔(2)

عصمت اللہ بیگ کی تحریریں ایک عجب تازگی اور مسرت کا احساس دلاتی ہیں وہ گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے ان کی تخلیقات میں فرحت اللہ بیگ کی طرح شخصیت نگاری کے تمام لوازم موجود ہیں۔مرزا فرحت اللہ بیگ کے مشہور خاکہ''نذیر احمد کی کہانی''کے تعلق سے وہ ایک واقعہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس میں بھی ان کی شگفتگی دیکھنے لائق ہے۔

''ہاں میں نذیر احمد کی کہانی کے متعلق ایک بات کہنی تو بھول ہی گیا بھائی فرحت کہتے تھے کہ ایک بار میں اپنے دوست سے ملنے گیا۔کیا دیکھتا

ہوں کہ ایک ملا صاحب سر پر لکو عمامہ باندھے بغیر جبا ڈالے، ایک لڑکے کو پڑھا رہے ہیں۔ وہ بزرگ بعض بعض شعروں کے تو ایسے الٹے سیدھے اور غلط سلط معنی پڑھا رہے تھے کہ مولانا حالیؔ کہیں سن پاتے تو اپنا سر پیٹ لیتے، یا صائب کی طرح سے کہہ اٹھتے کہ ''شعر مرا مدرسہ کہ برد'' چنانچہ لڑکے نے یہ مصرع پڑھا کہ ''سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپاتے'' مولوی صاحب! یہ سانڈے کے کیا معنی ہیں؟ ملا صاحب سانڈے کی طرح سر ہلا کر فرمایا کہ سانڈے سانڈ کی جمع ہے، جیسے بھینس سے بھینسے مرغ سے مرغے اور سانڈ سے سانڈے۔ پھر فرمانے لگے کہ یہ مصرع اس طرح بھی لکھ سکتے ہیں کہ ''تھے سانڈ بلوں میں منہ چھپائے ہوئے'' مگر مولانا حالیؔ پرانے زمانے کے شاعر ہیں اس لئے انہوں نے یہاں بھی پرانی جمع کو برقرار رکھا''۔(3)

عصمت للہ بیگ کم عمری سے ہی لکھنے لگے تھے۔فرحت اللہ بیگ اپنی شاعری اور مزاح نگاری کی وجہ سے مقبول تھے تو چچا مرحوم بھی شاعر تھے۔ان کے دوست حکیم معشوق علی خاں جوہرؔ کی صحبت نے ان کے علمی ذوق کو اور ابھارا۔

عصمت اللہ بیگ کو مصوری اور نقشہ نویسی سے بھی لگاؤ تھا یوں تو عصمت اللہ بیگ نظم ونثر دونوں میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں یہاں صرف مضامین کا ذکر کیا گیا ہے۔جن میں ''مضامین عصمت'' جس کا دیباچہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے'' کاک ٹیل'' جس کا دیباچہ ڈاکٹر غلام یزدانی نے تحریر کیا ہے اسی طرح حکیم معشوق علی خاں جوہر لال بجھکڑ، گدھے کی عقلمندی، مچھلی خاں، راجہ بیربل جیسی مزاحیہ کتابیں بچوں کیلئے لکھی ہیں۔''انوار تبسم'' اور'' کاک ٹیل'' مزاحیہ کتابیں ہیں۔اس طرح انہوں نے انوار ظرافت کے نام سے حکایات رومی وسعدی اور جامی کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ان ترجموں میں عصمت نے اپنی شوخ طبیعت اور ظرافت کا استعمال بہت ہی فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ان ترجموں کے متعلق انیسہ سلطانہ لکھتی ہیں

''ان کتابوں کا ترجمہ آسان نہ تھا، دوسرے یہ کہ عصمت نے ان میں ادبیت اور ظرافت پیدا کر کے اس کو فارسی کی طرح دلچسپ بنا دیا''۔(4)

عصمت کے زیادہ تر مزاحیہ مضامین اخبار ''رعیت'' میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان میں ''حکیم جی کا مطب'' ایک شاہکار مضمون ہے۔ جس میں عصمت حکیم صاحب کے شب و روز کو اپنے انداز میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''سیدھے ہاتھ میں مرنل کا قلم، یہ ان کے باپ دادا سے چلی آرہی ہے۔ اس سے نسخہ بھی لکھتے اور کان میں سے میل بھی نکالتے۔ اس کی نوک ٹوٹی ہوتی لیکن اس سے خط شکستہ اچھا لکھا جاتا ...... حکیم جی مریضوں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ نسخہ لکھتے دوائیں پلاتے، ناامیدی ہو جاتی ہے تو یٰسین پڑھتے ہیں اور جب مر جاتا ہے کاندھا دے کر قبرستان تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ مریض بھی ان پر جان دیتے ہیں''۔ (5)

اس طرح ''قاضی جی کی کارگذاری'' جو سب رس 1939ء میں شائع ہوا اور ''ملا جی کا مکتب'' نومبر 1938ء میں شائع ہوا۔ ان مضامین میں عصمت نے منظر کشی بہت فنکاری سے کی ہے۔ ''ملا جی کا مکتب'' سے ایک اقباس ملاحظہ ہو:

> ''ہم مکتب کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک بڑا دالان ہے اور زمین پر بوریئے کا فرش ہے جو شائد باوا آدم سے بھی پیش تر کا ہوگا۔ چھت سفال پوش تھی اور وہ بالکل قدیم رسدگاہوں کے نمونے پر بنائی گئی تھی۔ یعنی اس میں ہزار ہا سوراخ تھے جن کے ذریعہ علم مناظر اور علم فلکیات کی تعلیم دی جاسکتی تھی۔ چنانچہ صبح کے وقت نور کی اشاعت، نور کی ترکیب یعنی نور کی چھت کے سوراخوں سے گذر کر اس کی شعاعوں کو پہاڑ یا مختلف رنگوں میں تقسیم کرنے کے تجربے ہوسکتے تھے اور رات کے وقت نظام شمسی کے سیاروں کی گردش، منطقہ البروج، دم دار ستارے اور شہاب ثاقب وغیرہ کا معائنہ نہایت تفصیل سے کیا جاسکتا ہے''۔ (6)

مزاح نگاری مرزا عصمت اللہ بیگ کی فطرت میں داخل تھی۔ ان کی تصانیف میں انوار تبسم، کاک ٹیل اور

دادالال بجھکڑ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پرو وائس چانسلر فضل الرحمٰنؒ ''یادعصمت'' کے عنوان سے عصمت کی بعداز مرگ شائع ہونے والی کتاب ''متاح ظرافت'' میں لکھتے ہیں:

''جن لوگوں نے عصمت کی نظمیں سنی ہیں یا ان کے مضامین پڑھے ہیں وہ اس امر کی گواہی دیں گے کہ مزاحیہ نگاری عصمت کی فطرت میں داخل تھی وہ چاہتے بھی تو اس کوچہ سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔پچھلے تیس سال سے ان کی متعدد نظمیں اور مضامین پڑھنے اور سننے میں آئے ہیں۔جو سب سے زیادہ پاکیزہ مذاق کے نمونے ہیں۔ریڈیو پر وہ کئی برس تک سننے والوں کو تفریح طبع کا سامان مہیا کر چکے ہیں۔اداکاری میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔خانگی صحبتوں اور کئی برس پہلے اسٹیج پر وہ ایکٹنگ کے جوہر دکھا چکے ہیں۔یہ سب کچھ مزاحیہ مضمون لکھنے والے اور بھی ہیں۔نظم میں ظرافت کی چاشنی دوسروں نے بھی دی ہے۔اردو کامیڈی میں کئی ڈرامہ نویس ان سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔لیکن میری دانست میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے تمام عمر صبح سے شام تک اپنے ساتھیوں کو ہنسایا ہو۔ڈاکٹر جانسن کی طرح اگر انہیں کوئی بوزویل ملتا تو ان لطیفوں سے کئی جلدیں تصنیف ہو سکتی تھیں''۔(7)

ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں۔

ویسے نثر نگار مشہور ہیں۔حکیم جی کا مطب ان کا شاہکار ہے۔انوار تبسم اور کاک ٹیل بے حد مقبول ہیں' بلا کی آمد اور فطری ظرافت سے بھرپور' ضلع جگت' رعایت لفظی اور تصنعات کے تکلفات انکے کلام میں موجود ہے۔جو ان کی روانی اور قدرتی مزاحیہ رنگ میں کچھ چھپ جاتی ہیں۔''(8)

بذلہ سنجی اور شگفتگی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور عصمت نے اسے اپنے فن پاروں میں پوری طرح عیاں بھی کر دیا ہے۔وہ مرقع نگاری اور منظر نگاری کو نہایت باریک بینی سے مزحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔عصمت

نے اپنے دوست حکیم معشوق علی خان جوہرؔ پر بھی ایک مضمون لکھا ہے جو، جوہر مرحوم کی مختصر سوانح کی حیثیت رکھتا ہے۔ عصمت نے اس مضمون میں مزاح کے پھول بکھیر دیئے ہیں۔ یہ مضمون حیدرآباد سے شائع ہونے والے ایک ادبی رسالے ''ہم جولی'' میں شائع ہوا۔ عصمت کے اسلوب میں سادگی اور بے ساختگی ہے۔ وہ فطری طور پر مزاح نگار ہیں انہوں نے ہر موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے انہیں الفاظ کے استعمال پر بھی عبور حاصل ہے۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) ڈاکٹر زینت ساجدہ　مضمون ''حیدرآباد کے ادیب''　مطبوعہ آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈیمی 1958ء صفحہ 16

(2) مرزا عصمت اللہ بیگ ''فرحت کی زندگی کے چند پہلو''　مضمون مشمولہ: متاع ظرافت، صفحہ 181-180 مطبوعہ عصمت میموریل اکیڈیمی، حیدرآباد، مرتبہ وقار خلیل 1985ء

(3) مرزا عصمت اللہ بیگ ''فرحت کی زندگی کے چند پہلو''　مضمون مشمولہ: متاع ظرافت، صفحہ 194-193

(4) انیسہ سلطانہ ''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو نما'' صفحہ 37

(5) مرزا عصمت اللہ بیگ　مضمون ''حکیم جی کا مطب'' مطبوعہ روزنامہ ''رعیت'' حیدرآباد

(6) مرزا عصمت اللہ بیگ　مضمون ''ملا جی کا مکتب'' مطبوعہ روزنامہ ''رعیت'' حیدرآباد نومبر 1938

(7) پروفیسر فضل الرحمٰن　مضمون ''یادِ عصمت، متاع ظرافت''　صفحہ 15　مطبوعہ عصمت میموریل پبلی کیشنز کمیٹی 1985ء

(8) خواجہ عبدالغفور　طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ　ص 230-229　سنہ 1983ء

تمکین کاظمی

تمکین کاظمی 27 نومبر 1902ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے، ان کا اصل نام سید مصباح الدین تھا۔ تمکین کاظمی کے اجداد شمالی افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے تھے۔ تمکین کاظمی کے والد حضرت تجلی کو عربی فارسی اور حدیث وفقہ کا گہرا ادراک تھا۔ انہیں شاعری سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ تمکین کاظمی کی ابتدائی تعلیم رواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔ بعد میں دھرماونت ہائی اسکول' مدرسہ اعزہ، مدرسہ مفید الانام اور دارالعلوم بلدہ میں عربی فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کی۔

انہوں نے اپنے نام کے علاوہ فرضی نام بخاری، آوارہ (1) اور فلک نما وغیرہ استعمال کئے۔ وہ بنیادی طور پر سنجیدہ نثر نگار ہیں۔ لیکن انہوں نے مزاحیہ تحریریں بھی لکھی ہیں۔ ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ''زن مرید'' رسالہ ''نظر'' لکھنؤ جولائی 1927ء میں شائع ہوا۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''غنچہ و تبسم'' 1930 میں شائع ہوا جس میں 19 مضامین ہیں۔ تمکین کاظمی کی تحریروں میں اصلاحی رجحان ہے۔ ان کی تخلیقات میں طنز و مزاح توازن لئے ہوئے ہیں۔

---

(1) تمکین کاظمی اپنی کتاب ''غنچہ و تبسم'' کے صفحہ 5 پر لکھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر مضامین ان کے نام سے شائع ہوئے اور بعض فرضی ناموں بخاری، آوارہ اور فلک نما وغیرہ کے ساتھ چھپتے ہیں۔ نیز صفحہ 6 پر اپنی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے مضامین میں دکنی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کئی دانشوروں نے آوارہ کا شمار حیدرآباد کے اولین مزاح نگاروں میں کیا ہے۔ تمکین کاظمی کے بیان کے مطابق وہ خود آوارہ بھی ہیں۔ شائد اس لئے انیسہ سلطانہ نے اپنی تحقیقی تصنیف کے دوسرے باب ''حیدرآباد میں طنز و مزاح 1950ء سے پہلے'' میں آوارہ کو شامل نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر طیب انصاری نے اپنے مضمون ''حیدرآباد کے مزاح نگار'' کے صفحہ 511 پر بتایا ہیکہ ''بے پر کی'' اڑانے والا ''آوارہ'' بلگرامی ہے۔ معاشرتی ماحول کی عکاسی لکھنوی زبان میں کرتا ہے۔ لکھنؤی زبان، روزمرہ کے محاورے اس کی تحریر کی جان ہیں۔

اس دور کے مزاح نگاروں میں عصمت اللہ بیگ، فرحت اللہ بیگ اور شفیع الدین ناکارہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، پرویز یداللہ مہدی، رشید الدین اور مضطر مجاز کے مطابق آوارہ کا پورا نام آل عبا قادری آوارہ تھا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔ ان کی مزاحیہ کتاب کا نام ''بے پر کی'' ہے۔ اور وہ تمکین کاظمی کے فرضی نام آوارہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ خواجہ عبدالغفور نے اپنی کتاب ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' کے صفحہ 238 پر سید آل عبا آوارہ مارہروی اور آوارہ حیدرآبادی کا دو مختلف مزاح نگاروں کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ خواجہ عبدالغفور کے مطابق سید آل عبا آوارہ مارہردی کی تصانیف میں ''بے پر کی''، ''اپنی من میں''، ''اسرار ہند'' اور ''سفاک دلہن'' شامل ہیں۔ جبکہ آوارہ حیدرآباد کی ادبی زندگی کا آغاز جامعہ عثمانیہ سے ہوتا ہے۔

ابتداء میں وہ سنجیدہ نثر لکھتے رہے ان کے سیاسی، تاریخی، اقتصادی اور کئی ادبی مضامین اخبارات میں شائع ہوئے۔ انہیں ترجمے سے بھی شغف رہا۔ انہوں نے متعدد ڈراموں کے تراجم بھی کئے۔ آسکر وائیلڈ کا ڈرامہ The Importance of Learning Honest کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ معاشقہ نپولین اور گئٹے کا شاہ کار ''ورتیر'' کا ترجمہ فارسی سے اردو زبان میں کیا۔ خود تمکین کاظمی اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

''فکاہیات اور مزاحیات میرے موضوع سے بہت دور تھے۔ کیونکہ میں نثری، تاریخی اور علمی مضامین پر زیادہ وقت صرف کیا کرتا تھا۔ ابتداء میں میں نے تفریحی طور پر اس قسم کے مضامین لکھنا شروع کیا۔ چنانچہ ''زن مرید'' اس سلسلے کی پہلی قسط ہے جس کی اشاعت رسالہ ''نظر'' لکھنؤ جولائی 1927ء میں ہوئی۔ مگر چند ہی مضامین لکھ کر میں نے اسے ختم کر دیا۔ چنانچہ 1929ء میں سوائے ایک ''گھبراہٹ'' کے اور کوئی مضمون نہیں لکھا۔ مگر 1930ء اور اوائل 1931ء میں زیادہ مصروف رہنا پڑا اور مدیران رسائل نے مارے تقاضوں کے ناک میں دم کر دیا۔ ہر ایک رسالہ کے لئے علمی و ادبی یا تحقیقی مضمون کہاں سے لاتا۔ بعضوں کیلئے کچھ وقت نکال لیا اور بعضوں کو ان ہی بدحواسیوں پر ٹرخا دیا۔ یہ ہے شان نزول، ان مضامین کی جو کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ ان میں سے اکثر مضامین میرے نام سے شائع اور بعض فرضی ناموں کے ساتھ چھپتے تھے''۔(2)

غنچۂ تبسم کے اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہیکہ ان کا اصل میدان طنز ومزاح نہیں ہے۔ انہوں نے صرف مختلف رسالوں کے مدیران کی فرمائش پوری کرنے کی غرض سے یہ مضامین لکھے۔ تمکین کاظمی اپنی زبان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ان کی نثر نہایت سادہ اور رواں ہے۔ دکنی زبان سے بہت کے الفاظ تمکین کاظمی کی نثر میں بے تکلفانہ انداز میں در آئے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھئے:

''میری مادری زبان اردو ہے اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

مگر میں اس قدر مجبور ہونا پسند نہیں کرتا کہ ''اماں حوا'' کی بجائے ''ماما حوا''، ''گنڈیوں'' کے عوض ''گھنڈیاں''، ''چھاتے'' کی بجائے ''سینہ''، ''گرد داڑھی'' کے بدلے ''گردے کی داڑھی''، پچکے ہوئے گالوں'' کو پچنے ہوئے گال'' کہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ برادران ہند گرد داڑھی پڑھ کر گردے کی داڑھی کا تصور کرنے میں تامل کریں گے اور چھاتے سے سینہ مراد نہ لیں۔مگر میں نے جان بوجھ کر ان الفاظ کا استعمال کیا ہے تا کہ وہ دکنی الفاظ جو آہستہ آہستہ غائب ہو رہے ہیں کم از کم میرے مضامین میں محفوظ رہ جائیں اور برادران ہند بھی ان دکنی الفاظ سے واقف ہو جائیں''۔ (3)

اس سلسلے میں غلام احمد فرقت کاکوروی لکھتے ہیں۔

''دوسرے سنجیدہ لکھنے والوں کی طرح تمکین کاظمی نے بھی بہت سے ظریفانہ مضامین لکھے ہیں مگر چونکہ ظرافت ان کا مخصوص میدان نہیں ہے اور ظرافت سے زیادہ ان میں سنجیدگی ہے اس لئے ان کے مزاح پر علمیت زیادہ غالب ہے۔ان کے یہاں بھی طنز سے زیادہ ظرافت اور شوخی ہے۔''(4)

تمکین کاظمی دکنی ہونے پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ان کی نثر گرچہ سادہ ہے لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس عہد میں تمام مزاح نگاروں کی تخلیقات میں بھی یہی رنگ نظر آتا ہے۔چھبتے ہوئے فقرے، معاشرتی اصلاح کا جذبہ، ان کے پیش نظر تھا۔ تمکین کاظمی نے اپنی عصری حسیت کو اپنے فن میں سمونے کی پوری کوشش کی ان کے پاس مقامی رنگ پایا جاتا ہے ان کی تحریروں میں شگفتگی اور روانی نظر آتی ہے۔انیسہ سلطانہ اس بارے میں رقمطراز ہیں:

''تمکین کاظمی کے ہاں مقامی رنگ غالب ہے۔افضل گنج، سدی عنبر بازار، بیگم پیٹ، واڑی وغیرہ جیسے ناموں سے حیدرآباد کے باہر کا قاری باخبر نہیں ہوتا اسی لئے اسے دلچسپی بھی نہیں ہوسکتی ہے''۔(5)

انیسہ سلطانہ کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اردو ادب میں متعدد نثر نگاروں اور شعراء کے پاس

مقامی رنگ پایا جاتا ہے۔لیکن یہ بات ان کی مقبولیت میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی اور نہ ہی قاری کی دلچسپی ان کے مقامی رنگ کی بنا پران کی نگارشات سے کم ہوتی ہے جہاں تک مزاحیہ نثر نگاروں کا تعلق ہے مشتاق احمد یوسفی کے پاس جتنا مقامی رنگ پایا جاتا ہے شائد ہی کسی مزاح نگار کے ہاں پایا جاتا ہوگا۔تو کیا اس وجہ سے یوسفی کو پڑھتے وقت قاری کی دلچسپی کم ہوجاتی ہے۔مزاح بات سے بات پیدا کرنے اور حالات اور واقعات سے شہہ پاتا ہے۔مقامی رنگ کی موجودگی یا عدم موجودگی سے نہیں۔تمکین کاظمی جیسی ہمہ جہت شخصیت اوران کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں۔

''شاعر، نقاد، ادیب اور مزاح نگار، تحریر میں دکنی الفاظ اور حیدرآبادی ماحول کو دلچسپ انداز میں پیش کرتے رہے اور کافی مقبول ہوئے۔''(6)

تمکین کاظمی کے فن میں خاکہ نگاری کے عناصر اس قدر کثرت سے ملتے ہیں کہ کبھی کبھی رشید احمد صدیقی کے خاکوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''دبلے پتلے تیر کی طرح سیدھے آدمی، متوسط قد، گٹھا ہوا سر، خشخاشی داڑھی جس کے بال آدھے سے زیادہ سفید، بل کھاتی ہوئی مونچھیں، سرمہ آلود آنکھیں، سیاہ شملہ، باریک کپڑے کی ملگجی شیروانی، ہرک کا چست پائے جامہ، دلی کا سادہ جوتا، ہاتھ میں پتلی سی بنوٹ کی لکڑی، سیدھے ہاتھ کی انگلی میں آخری چہارشنبہ کا چھلہ، الٹے ہاتھ میں فیروزے کی انگوٹھی اور مضراب، کندھے پر رومال، جیب میں پان کا بٹوا اور ایک تھیلی میں شطرنج کے مہرے اور کاغذ''۔(7)

تمکین کاظمی کی تخلیقات میں مرقع نگاری کے بھی عمدہ نمونے نظر آتے ہیں۔ایسا لگتا ہے جیسے کہ یہ کردار ہمارے اردگرد کی کوئی جانی پہچانی شخصیت ہو۔

تمکین کاظمی نے امتیاز علی تاج اور ملا رموزی کی طرز پر کردار خلق کرنے کی کوشش کی۔جیسے میر صاحب، مرزا صاحب، خان صاحب، مولوی جی، منشی جی وغیرہ۔ان مجموعے ''غنچۂ تبسم'' سے انہیں کافی شہرت حاصل ہوئی۔ان کا

شعور بہت ہی گہرا اور پختہ تھا۔ ان کے ہاں طنز و مزاح ہم آہنگ ہو کر تحریر کو زندگی بخشتے ہیں۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(2) تمکین کاظمی ''غنچہء و تبسم'' صفحہ 65 سنہ 1930ء

(3) تمکین کاظمی ''غنچہء و تبسم'' صفحہ 65

(4) غلام احمد فرقت کاکوروی ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' 1957ء ص 242

(5) انیسہ سلطانہ ''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو نما'' صفحہ 35-34 ، پبلیشرز ''شگوفہ'' حیدرآباد، مطبوعہ 1986ء

(6) خواجہ عبدالغفور ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' ص 239 سنہ 1983ء

(7) تمکین کاظمی ''غنچہ و تبسم'' صفحہ 70

شاہد صدیقی

عبدالمتین صدیقی نام اور شاہد صدیقی قلمی نام تھا۔ 1911ء میں آگرہ کے ایک محلے گھٹیا اعظم خاں میں پیدا ہوئے۔ شاہد صدیقی کے والد بشارت اللہ خان کاکور شریف کے رہنے والے تھے۔ تلاش معاش میں وہ اکبرآباد پہنچے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

بشارت اللہ خاں کی شادی سندیلہ کی متوطن خاتون رابعہ بیگم سے ہوئی۔ انہیں گیارہ اولادیں ہوئیں۔ پانچ لڑکیاں اور چھ لڑکے۔ شاہد صدیقی سب سے چھوٹے تھے۔ شاہد صدیقی بچپن سے ہی شریر اور حاضر جواب واقع ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم روایتی انداز میں ہوئی یعنی عربی اور فارسی سے ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ چھ سال کی عمر میں ان کے والد نے ایک حافظ صاحب کو مقرر کیا جن سے انہوں نے کلام پاک پڑھا۔ ابتدائی تعلیم، دینی تعلیم کے لئے انہیں مارلین اسلامیہ ہائی اسکول مارہرہ میں شریک کیا گیا۔ جب شاہد صدیقی سات برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور دو سال بعد ان کی والدہ بھی مالک حقیقی سے جا ملیں۔ اس کے بعد شاہد صدیقی اپنے بڑے بھائی کے زیر پرورش رہے۔ ان کے والد متمول تھے اور انہوں نے کئی جائیدادیں چھوڑی تھیں لیکن والدین کی رحلت کے بعد ان کے بڑے بھائی تمام جائیداد پر قابض ہوگئے اور چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہیں رہا۔ چنانچہ شاہد صدیقی کے دوسرے بھائی ماہر القادری اور تیسرے بھائی محشر القادری نے اپنے بڑے بھائی کے ناروا سلوک سے دلبرداشتہ ہوکر گھر چھوڑ دیا اور تلاش معاش میں نکل پڑے۔ شاہد صدیقی چونکہ سب سے چھوٹے تھے اس لئے وہ اپنے بڑے بھائی کے ظلم وستم کا نشانہ ایک عرصہ تک بنے رہے۔ بڑے بھائی نے اتنا حق ادا ضرور کیا کہ اپنی بہنوں کی شادیوں کا انتظام بخیر وخوبی کیا۔

شاہد صدیقی ابھی نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے کہ ان کے بڑے بھائی نے ان کی تعلیم کے سلسلے کو ختم کرنے کی غرض سے انہیں اسکول سے نکال دیا اور گھر کے کام کاج پر توجہ دینے کا حکم دیا، حالانکہ شاہد صدیقی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے چونکہ شاہد صدیقی ہر جماعت میں امتیازی نشانات سے کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن بڑے بھائی

نے ایک نہ سنی علاوہ ازیں ان کی بھابھی بھی بڑی سخت مزاج تھیں وہ بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک روانہیں رکھتی تھیں۔ رفتہ رفتہ شاہد صدیقی پر عرصہ حیات تنگ ہوتا چلا گیا اب انہیں گھر کا سارا کام ہی نہیں کرنا پڑتا تھا بلکہ انہیں کھانا بھی خود پکا کر کھانا پڑتا تھا۔ جب ان کی بڑی بہن کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے شاہد صدیقی کو اپنے یہاں لکھنؤ بلالیا۔ شاہد صدیقی کو جب کچھ سکون میسر آیا تو وہ پھر سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے ایک خانگی انگریزی اسکول میں داخلہ حاصل کیا۔ لیکن ابھی کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ ان کے بھائی لکھنؤ پہنچے اور شاہد صدیقی کی خواہش کے خلاف انہیں اپنے ساتھ آگرہ لے آئے اور ایک جوتا بنانے کے کارخانے میں ملازم رکھوادیا۔ شاہد صدیقی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے بڑے بھائی کے رویہ نے ان میں بغاوت اور ضد کا جذبہ پیدا کردیا تھا چنانچہ انہوں نے جوتے کے کارخانے میں کام کرنے سے انکار کردیا۔ اس بار ان کے بڑے بھائی نے پھر سے شاہد صدیقی کی مرضی کے خلاف انہیں ریلوے میں ملازم رکھوادیا۔ جیسا کہ لکھا جاچکا ہے کہ شاہد صدیقی تعلیم کے میدان میں اپنی فتوحات حاصل کرنا چاہتے تھے اسی لئے ملازمت ان کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ جب شاہد صدیقی نے شعور کی منزل میں قدم رکھا تو ان میں بغاوت کا جذبہ پروان چڑھ چکا تھا آخر کار سولہ سال کی عمر میں انہوں نے بڑے بھائی کے ظلم سے تنگ آکر گھر کو خیرآباد کہہ دیا اور اپنے ایک دوست کے پاس مقیم ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد یہاں کے مقامی اسکول میں داخلہ لیا، انتھک محنت کی پڑھائی میں دن رات ایک کردیئے نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے میٹرک کا امتحان اعلیٰ نمبرات سے کامیاب کیا۔ ان کے منجھلے بھائی محشر القادری نے حیدرآباد میں سکونت اختیار کی تھی جہاں وہ ملازمت کررہے تھے۔

شاہد صدیقی نے میٹرک میں کامیابی کے بعد آگرہ سے ہجرت اختیار کی اور غالباً 1934ء میں حیدرآباد آگئے۔ انہیں یہاں کی فضاء اس قدر پسند آئی کہ وہ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ماہر القادری حیدرآباد میں ان کی آمد اور ادبی اجلاسوں شرکت کی روداد سناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''1934ء کا واقعہ ہے چند شعراء اپنا کلام سنا چکے تو شاہد صدیقی اکبرآبادی کا نام اس تعارف کے ساتھ پکارا گیا کہ ابھی حال ہی میں اکبرآباد' آگرہ سے تشریف لائے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر بہت سے بہت بیس سال کی ہوگی۔ ململی شیروانی پہنے تھے' جس کے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ چہرہ

مہرہ وجیہہ تھا نہ حسین! وہ اسٹیج پر آئے تو سننے والوں نے ان کی آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا' مگر جب انہوں نے رباعی پڑھی' تو لوگ چونک پڑے۔ انھوں نے سامعین کے اصرار پر متعدد رباعیاں اور غزلیں سنائیں! حیدرآباد دکن میں یہ ان کا پہلا تعارف تھا۔ اس کے بعد وہ مشاعروں' دعوتوں اور ادبی نشستوں میں شریک ہونے لگے۔''(1)

حیدرآباد میں انہیں سکون اور راحت نصیب ہوئی تو انہوں نے علم کے حصول کو اولین ترجیح دی چنانچہ وہ اپنا زیادہ تر وقت آصفیہ لائبریری میں گذارا کرتے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ بھائی پر بوجھ بننا ٹھیک نہیں، زندگی گذارنے کیلئے کچھ نہ کچھ کام کرنا ہوگا۔ انہوں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ملازمت کیلئے صحافت کا انتخاب کیا اور حیدرآباد سے شائع ہونے والے مختلف رسائل واخبارات سے وابستہ ہوئے انہوں نے ہفتہ وار اخبار ''الاعظم'' قاضی عبدالغفار کے اخبار ''پیام'' احمد عارف کے اخبار ''صبح دکن'' پیسہ ''نگاروطن'' کے علاوہ کئی رسالوں جیسے ''سب رس، ایوان، چراغ، صبا'' وغیرہ میں ملازمت اختیار کی۔ اس کے علاوہ ایڈن اینڈ کمپنی اور عذرا پبلسٹی میں سینما کے اشتہار بھی لکھا کرتے تھے۔ ''صبح دکن'' میں وہ ''سرراہ'' کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ شاہد صدیقی اخبارات کے علاوہ ریڈیو سے بھی جڑے رہے۔ وہ ریڈیو پر ترنم کے ساتھ غزلیں سنایا کرتے تھے جس کی بناء پر لوگ دوسرے شعراء کی بہ نسبت شاہد صدیقی کو سننا زیادہ پسند کرتے تھے۔ بقول اقبال

غربت میں آ کے چمکے گمنام تھے وطن میں

1957ء میں شاہد صدیقی نے سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں اور 1963ء میں روزنامہ ''سیاست'' سے وابستہ ہوگئے۔ اس اخبار میں وہ ''شیشہ و تیشہ'' کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔

شاہد صدیقی کی شادی 1947ء میں نظام آباد کے ایک مذہبی خاندان کی لڑکی طاہرہ بیگم سے ہوئی۔ شاہد صدیقی کو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود انہوں نے کبھی اس کا افسوس نہیں کیا۔ بلکہ خدا کی مرضی پر راضی بہ رضا رہے۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت ہی خوشگوار تھی۔ وہ اپنی بیوی کا اچھی طرح خیال رکھتے تھے حالانکہ ان کی بیوی

کو اولاد سے محرومی کا دکھ تھا لیکن شاہد انہیں ہمیشہ تسلی دیا کرتے۔

شاہد صدیقی نے سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ مزاحیہ شاعری بھی کی ہے۔ روزنامہ ''سیاست'' میں لکھے گئے شیشہ و تیشہ کالم سے بھی ان کی حسِ مزاح کا انداز بخوبی لگایا جاسکتا ہے انہوں نے عوامی مسائل، قومی سیاست اور بین الاقوامی مسائل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ 1960 میں شاہد صدیقی کا مجموعہ کلام ''چراغ منزل'' شائع ہوا۔ جگر مراد آبادی ان کی شخصیت کا محاسبہ یوں کرتے ہیں۔

> ''میں ان کی دوستی اور خلوص کو ایک متاع گراں سمجھتا ہوں۔ وہ ایک اچھے دوست ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ بلا کے ذہین، انتہائی ذکی، نہایت حاضر جواب، بذلہ سنج اور لطیف مزاج کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت شریف النفس، مخلص، خوددار، وضعدار اور حق پسند انسان ہیں۔ تصنع اور ریاکاری کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔'' (2)

شاہد صدیقی صحافی اور سنجیدہ شاعر کے علاوہ ایک اچھے مزاحیہ فنکار بھی تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مزاح کے کامیاب تجربے کئے۔ ان کی طبیعت میں بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ ہر بات میں مزاح کا پہلو ڈھونڈتے تھے۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان اور پاکستان کے اخبارات میں جتنے بھی ظریفانہ کالم شائع ہوتے ہیں وہ سب کے سب نثر میں ہوتے ہیں لیکن یہ شاہد ہی کا حصہ تھا کہ وہ ہر اتوار کو نہایت پابندی سے ایک طویل مزاحیہ نظم لکھتے تھے''۔ (3)

شاہد صدیقی نے اپنی مزاحیہ نظموں میں سماجی سیاسی اور معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ ''برتھ کنٹرول'' کے عنوان سے لکھی ایک نظم میں انہوں نے ملک کی بڑھتی آبادی کا ذکر کیا ہے۔ پہلے وہ ملک میں بسنے والے ہر طرح کے آدمی کا ذکر کرتے ہیں۔ جس طرح نظیر اکبر آبادی نے ''آدمی نامہ'' ہر طرح کے آدمی کا تعارف کرایا ہے اسی طرح شاہد صدیقی لکھتے ہیں:

اس میں پہلے ہی سے آباد ہیں لوگ

جن میں لیڈر بھی ہیں نقال بھی ہیں
گانے والے بھی ہیں قوال بھی ہیں
جیب کترے بھی ہیں اور تاجر بھی ہیں
اور پھر شاعر و صورت گرو افسانہ نویس
جتنے انسان میرے ملک میں ہیں
وہی کافی سے زیادہ ہیں قدیم (4)

شاہد صدیقی ملک کے معاشی حالات کو کنٹرول کرنے کیلئے ''برتھ کنٹرول'' کو ضروری قرار دیتے ہیں ایک شخص کی حالت کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں جس کے دس بچے ہیں۔

صحن میں کھیلتے پھرتے ہیں میرے دس بچے
اور سب چیخ رہے ہیں کہ ہمیں روٹی دو

ان کا کیا ہوگا بھلا میرے بعد
کسی کے گھر جائے سیلاب میرے بعد

یہ نظمیں روزنامہ سیاست میں شائع ہوئی تھیں۔ایک اور نظم ''15 اگست'' کے عنوان سے ملتی ہے جس میں انہوں نے غالب کے ایک مصرعہ کا استعمال کرتے ہوئے ہمارے ملک کے نوجوانوں کی مغرب پرستی پر طنز کیا ہے۔یہ نظم اکبرالہ آبادی کی یاد دلاتی ہے۔انہوں نے اپنی قوم کو مغربی تہذیب کی اندھی تقلید سے بچانے کیلئے طنز و مزاح کا استعمال کیا تھا:

لڑکیاں ملک کی آزاد ہوئیں ہیں اتنی
بھاگ جاتی ہیں کسی عاشق جاں باز کے ساتھ
اور ماں باپ یہ کہتے ہیں کہ اب کیا ہوگا
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو (5)

شاہد صدیقی کہتے ہیں ملک میں آزادی کے نام پر بے راہ روی چور بازاری رشوت خوری کا بازار گرم ہے۔ اس پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو''

شاہد صدیقی مزاح نگار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ایک کامیاب صحافی کیلئے ضروری ہے کہ وہ قاری کے مزاج کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔بعض وقت تو قاری کو متاثر کرنے کیلئے اپنے طریقہ کار میں مناسب لچک بھی پیدا کرنی پڑتی ہے۔شاہد صدیقی نے اپنی مزاحیہ نظموں میں کہیں پیروڈی کے طرز کو اپنایا ہے تو کہیں اپنے مخصوص انداز کے ذریعہ سے مزاح کو پراثر بنانے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا مزاح نگار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مزاح نگار کو فطرت کی طرف سے نہ صرف ایک بلند ذوق مزاح ہی ودیعت ہوتا ہے بلکہ ایک ایسی نظر بھی ملتی ہے جو زندگی کے موہوم ترین مضحک پہلو تک رسائی پاتی ہے''۔(6)

شاہد صدیقی نے اپنے طنز مزاح کے اسلوب میں اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھا کہ ان کی بات کو سماج کا ایک بڑا طبقہ سمجھ سکے۔شاہد صدیقی کی مزاحیہ شاعری کے بارے میں طیب انصاری کہتے ہیں:

''شاہد صدیقی نے مختلف شعراء کے مصرعوں کو آزادانہ استعمال کرتے ہوئے شاعری میں ڈرامائی انداز مکالمہ اور طنز ومزاح کے بھرپور اور ایسی خصوصیات جو ان کے کالموں کو ادب کا گراں قدر اور ناقابل فراموش سرمایہ بناتی ہیں حالانکہ مسائل وقتی ہوتے ہیں لیکن شاہد صدیقی کی شعری صلاحیت نے ان کو ادب پارہ بنادیا ہے''۔(7)

شاہد صدیقی نے اپنی نظم ''نمائش اور مشاعرہ'' میں موجودہ دور کے شعراء پر طنز کیا ہیکہ وہ چند اشعار لکھ کر شاعروں کی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔

''شعراء آتے ہیں اور ڈٹ جاتے ہیں
کچھ نئے شعر بھی فرماتے ہیں
گونج اٹھتی ہے ترنم کی صدا
سننے والوں کو تکلم کی صدا
داد دیتے ہیں اس انداز سے سننے والے
جیسے غصے میں کوئی حاکم وقت
ڈانٹتا رہتا ہو ماتحتوں کو
اور شاعر ہیں کہ تسلیم بجالاتا ہے
شعر کو دہراتا ہے'' (8)

شاہد صدیقی نے اپنی ایک اور نظم میں نیوکلیر توانائی کو فروغ دینے والے ممالک پر طنز کیا ہے۔ ''حسن اور دھماکہ'' کے عنوان سے لکھی یہ نظم آج کے دور میں بھی بامعنی نظر آتی ہے۔ شاعر نے اس سے ہونے والی تباہ کاریوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک طرف امن کی بات چلی ہے
دوسری سمت بم پھٹ کے سر پر گرا
آگ، شعلہ، حرارت، چمک، روشنی
جو پرندے فضا میں تھے سب جل گئے

شاہد صدیقی نے پیروڈی میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔ پیروڈی اردو میں مغرب کی دین ہے۔ پیروڈی شائد اس لئے بھی مقبول ہے کہ اس کا مقصد صرف تفریح نہیں بلکہ اصلاح بھی ہوتا ہے شاہد صدیقی نے ''آم اور غالب'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جو غالب کی نظم کی طرز پر ہے۔

رکھ کے ایک آم کف دست پر غالب نے کہا

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

نہ ملے مبادہ انگور تو کچھ فکر نہیں
آم تقدیر سے مل جائیں تو پھر کیا کہئے

یہی اپنا بھی عقیدہ ہے بقول غالبؔ
سخت بدبخت ہے جو معتقد آم نہیں

شکیل بدایونی کی غزل پر بھی شاہد صدیقی نے پیروڈی لکھی ہے۔شکیل بدایونی کا شعر ہے۔

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا　　　　جانے کیوں آج تیرے نام پہ رونا آیا

شاہد صدیقی لکھتے ہیں:

میں نے بچپن میں سنایا جو الف ب کا سبق　　　　''میم'' سے پہلے مجھے ''لام'' پہ رونا آیا
فارغ البال تھے طفل میں ہنستے تھے بہت　　　　جب بڑے ہوگئے حجام پہ رونا آیا (9)

شاہد نے میرؔ، ذوقؔ، میر حسنؔ، ناصر کاظمیؔ اور باقی صدیقی کی زمین میں بھی اشعار لکھے ہیں انہوں نے نہ صرف معروف شعراء بلکہ فلمی نغموں کے انداز پر بھی پیروڈیاں لکھی ہیں۔ جیسے ایک فلمی نغمہ تھا:

تا تھیا کرتے آنا

شاہد صدیقی لکھتے ہیں:

چھپ چھپ کے گلی سے آنا　　　　آ کے دل میرا چرانا
چوری کا مال بچانا　　　　منہ بگاڑ کر کے چڑانا
تا تھیا کرتے آنا (10)

شاہد صدیقی کی ظرافت اپنے اطراف کی زندگی اور اس میں موجودہ زندہ تہذیبی عناصر سے مواد اخذ کرتی

ہے۔مزاح نگار نہ صرف اصلاح کا کام انجام دیتا ہے بلکہ تفریح کا سامان بھی مہیا کرتا ہے۔شاہد صدیقی کے کلام میں بھی یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ان کا مشاہدہ کافی قوی ہے اور ہر موضوع کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

شاہد صدیقی چونکہ ابتداء ہی سے صحافت سے وابستہ رہے اس لئے وہ ایک کامیاب صحافی ثابت ہوئے۔ہر اخبار میں وہ مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔لیکن نامساعد حالات نے ان کی مزاحیہ تحریروں کو باقی نہ رکھا۔صرف سیاست اخبار کے مزاحیہ کالم کتابی شکل میں موجود ہیں۔جسے ان کے انتقال کے بعد مجتبیٰ حسین نے مرتب کیا ہے۔شاہد صدیقی نے کالم نگاری کے فروغ میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے مخدوم محی الدین لکھتے ہیں:

> شاہد صدیقی کا کمال تو ان کی شاعری ہے مگر نثر میں خاص طور پر طنز نگاری میں اس نے جو تخلیقات چھوڑی ہیں وہ اردو صحافت کا گراں قدر ورثہ ہیں''۔ (11)

کالم نگاری میں طنز ومزاح کا مقصد محض ہنسی دل لگی نہیں ہوتا بلکہ کالم نگار ہنسی ہنسی میں ایسی نشتر زنی کر جاتا ہے کہ مدتوں اس کے زخم مندمل نہیں ہو پاتے۔اس کی واہ واہ کے پیچھے ایک آہ چھپی ہوتی ہے۔شاہد صدیقی نے اپنے کالموں کے ذریعہ چاہے وہ صبح دکن کا کالم ''تجلیات'' ہو یا ''پیام'' کا کالم ''سرراہ'' یا پھر روزنامہ سیاست کا کالم ''شیشہ و تیشہ'' انہوں نے اپنے فن سے قاری کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے اپنے کالموں میں ادبی، سماجی، سیاسی معاشی اور معاشرتی موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔

آزادی کے بعد لوگ ہر شعبہ میں اصول وضوابط اور اخلاق سے بے پرواہ ہوتے جارہے ہیں۔جیسے ''فری اسٹائل'' کی اصطلاح کو صرف Wrestling یا کشتی تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ فری اسٹائیل زندگی کے ہر شعبہ میں رائج ہوا ہے اور ادب پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔شاہد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں جب سے زندگی نے قدم رنجہ فرمایا ہے لوگ جوق در جوق فری اسٹائیل ہوتے جارہے ہیں اور آج صورتحال یہ ہے کہ ادب اور شاعری سے لیکر مصوری موسیقی تک کوئی فن ایسا نہیں ہے جس میں فری

اسٹائیل کے بہترین نمونے نہ ملتے ہیں''۔(12)

زندگی تجربات سے بنتی اور بکھرتی ہے۔اسی طرح شاعری بھی تجربات سے سنورتی ہے آج کل ہماری شاعری میں نئے تجربات کا ایک نیا سیلاب امنڈ آیا ہے جدید شاعری کا ایک نمونہ شاہد صدیقی اس طرح پیش کرتے ہیں:

زندگی کس کے لئے
آدمی کس کے لئے
سرخوشی کس کے لئے
بھاگ جارہے ہم نشین

شاعری میں جدید تجربے کی ایک مثال اس طرح پیش کرتے ہیں

'' آسمان پر چھارہی تھیں بدلیاں کل رات کو
مضطرب تھی کہکشاں کل رات کو
امتحان کل رات کو
کل رات کو
رات
کو'' (13)

کسی بھی ملک کا ادب اس کی تہذیبی تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہوتا ہے اور طنز ومزاح بھی ایک دائمی قدر کا حامل ہوتا ہے۔شاہد صدیقی نے طنز ومزاح کے پردے میں ادب کی دنیا میں ہونے والی بے راہ روی کو پیش کیا۔کڑپہ میں منعقدہ ایک مشاعرے میں شعرا نے اپنا کلام قوالی کی طرز پر سنایا تھا۔جس پر طنز کرتے ہوئے شاہد صدیقی لکھتے ہیں:

''ہم ان شعراء کو ستائش ومبارک کا مستحق سمجھتے ہیں جنھوں نے شعر خوانی کے سلسلے میں لکیر کا فقیر بنے رہنے کے بجائے جدت وندرت کی طرف قدم بڑھایا اور قوالی کے طور پر کلام سنا کر یہ ثابت کردکھایا کہ شعراء، بھی کافی

ذہین و فطین ہوتے ہیں''۔ (14)

شاہد صدیقی مشاعروں کے انعقاد کے خلاف نہیں تھے بلکہ وہ چاہتے تھے ان میں ابتذال نہ ہو اور نہ ذوق سلیم پر گراں گذرے وہ ان شاعروں کے خلاف تھے جو کلام کو قوالی کی طرز پر سنا کر مشاعرہ لوٹنا چاہتے تھے۔

شاہد صدیقی نے اپنی تحریروں سے ان صحافیوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا جو زبان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ایک اخبار کی خبر تھی'' کلکتہ میں ملکہ انگلستان کا پر جوش استقبال'' اور تفصیلات میں بتایا گیا کہ 8 افراد بے ہوش اور 15 زخمی ہو گئے۔شاہد صدیقی کہتے ہیں کہ پر جوش کے لغوی معنی ہیں'' جوش سے بھرا ہوا'' اور یہ تعریف انسان سے لیکر شعر تک صادق آتی ہے۔لیکن پر جوش کا لفظ بے ہوش میں استعمال کرنا درست نہیں۔

شاہد صدیقی اشیا میں ہونے والی ملاوٹ کے خلاف بھی آواز بلند کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ صنعتکار مونگ پھلی کو بنولے کے تیل میں ملاتے ہیں تو گھی ہاتھ آتا ہے۔اور جب ایک قسم کا پوڈر'' بیریان'' چھڑک دیا جاتا تھا تو وہ دودھ بن جاتا ہے۔اور لکڑی کے سفوف کے آٹے کی شکل دی جاتی ہے۔

شاہد صدیقی کے پاس اعتدال پسندی ہے ان کا مشاہدہ کافی گہرا ہے۔ایک عام آدمی کی بہ نسبت ایک فنکار کی نظر کافی تیز ہوتی ہے۔شاہد صدیقی کی نظر ایک ایسی فلم پر پڑی جس میں مجاز کے ایک شعر کو کچھ اس طرح پیش کیا گیا تھا۔

تیرے ماتھے پہ اس اڑتے ہوئے آنچل کا کیا کہنا
تو اس آنچل سے ایک گھونگھٹ بنالیتی تو اچھا تھا

جبکہ مجاز کا اصل شعر یہ ہے

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

''دوسروں کے اشعار سرقہ کر کے پیسے کمانا کوئی مردانہ کام نہیں''۔(15)

شاہد صدیقی نے سماج کے ہر شعبے کو اپنے مزاح کا موضوع بنایا۔ وہ اپنے مزاح کے ذریعہ سماج میں در آئی خامیوں اور خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں ہر تقریب کے دوران مشاعروں کا انعقاد ہونے لگا تھا۔ ایک خبر آئی تھی کہ علی گڑھ میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا چوتھا اجلاس منعقد ہوگا۔ شاہد صدیقی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''ایسی خبروں سے ''مشاعروں'' کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ کانفرنس سے لیکر ''ختنہ تک کوئی تقریب ایسی نہیں ہوئی جس کا اختتام مشاعرے پر نہ ہو''۔(16)

شاہد صدیقی اپنے گرد وپیش کے حالات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اور ساتھ ہی حکومت کے رویے پر بھی طنز کرتے ہیں۔ حادثات کی روک تھام کیلئے یک رخی راستے بنائے جاتے ہیں اور عوام کو فٹ پاتھ پر چلنے کا پابند بنایا جاتا ہے جبکہ فٹ پاتھ پر دہی بڑے، کلیجے کباب اور پھل فروخت کرنے والے ہوتے ہیں اور سڑکوں پر موٹروں، رکشاؤں میں حد فاصل قائم کرنے کیلئے نشانات ڈالے جاتے ہیں۔ لیکن موٹر نشینوں، رکشا میں بیٹھنے والوں کے درمیان جو مصنوعی لکیر کھینچی گئی تھی وہ اب ختم ہوتی جارہی ہے۔ یعنی ہم سوشلزم کی طرف بڑھتے جارہے ہیں۔ معظم جاہی مارکٹ کی سڑک پر جو پانچ فٹ گہرے گڑھے ہیں اور مٹی کے جو ٹیلے بن گئے ہیں اس کے متعلق کہتے ہیں کہ:

> ''یہ اس لئے درست نہیں کئے جارہے ہیں کہ آنے جانے والوں کو زندگی کے نشیب وفراز کا علم ہو سکے''۔ (17)

شاہد صدیقی اپنے ملک کے محکمہ ڈاک اور تار کے شعبے کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں ان کے سسرال نظام آباد سے ایک خط حیدرآباد 6 سال کی مدت میں پہنچا حالانکہ ریل کی ایجاد کے بعد خطوط رسانی آسان ہوگئی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

> ''محکمہ ڈاک کی مہربانی سے اس بات کا امکان پیدا ہوگیا ہیکہ اگر باپ اپنے شادی شدہ بیٹے کو خط لکھے تو وہ اس کے پوتے کو ملے اور اس دوران اس کا

بیٹا جو اصل مکتوب الیہ تھا شادی خانہ آبادی وغیرہ سے فارغ ہوکر اللہ تعالیٰ کے
پاس پہونچ گیا ہو‘‘۔(18)

طنز نگار سماج اور معاشرے کی دکھتی رگ پر نشتر رکھتا ہے اس کی تحریریں تنقید حیات کا کام دیتی ہیں۔ یونس فہمی اپنی کتاب ’’اردو شاعری میں طنز ومزاح‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’طنز نگار کا قلم سماج، آزاد حکومت، مذہبی ٹھیکے داروں اور ادب کی
ان ہی لغزشوں کے خلاف اٹھتا ہے جو غلطی نہیں برائی کے مرتکب ہوتے ہیں
اور یہ صورتحال اسی وقت پیش آتی ہے جب کہ سماجی شعور کی دھارا روانی سے
بہہ رہی ہو‘‘۔(19)

مجتبیٰ حسین اپنے ایک مضمون میں طنز نگار کے فرائض کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’طنز نگار کا سب سے اہم فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ شرطوں پر پہنچی ہوئی اعتدالیوں
کو اپنے طنز کا موضوع بنائے اور بالآخر انہیں اعتدال پر لے آئے‘‘۔(20)

شاہد صدیقی ان ہی بے اعتدالیوں کو پیش کرتے ہیں سرکاری دفاتر میں برتی جانے والی غفلت اور تساہلی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

’’ایک دفتر میں آگ لگ گئی جب حسب معمول عہدیداران بالا کو
اطلاع دی گئی۔ کارروائی کا آغاز ہوا۔ مثلیں بنائی گئی اور تجویزیں ہوئیں
مراسلے ادھر سے ادھر دوڑائے گئے اور آخرکار یہ حکم صادر کیا گیا کہ آگ فوراً
بجھادی جائے۔ یہ حکم اس وقت نافذ ہوا جبکہ سابقہ دفتر کی خاکستر پر دوسری
عمارت تعمیر ہوچکی تھی‘‘۔(21)

شاہد صدیقی نے اپنی تحریروں میں حقیقت کو مزاح کی چاشنی کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی تحریر نہ صرف قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتی ہے بلکہ وہ قاری کیلئے ایک فکر کا

پہلو بھی پیش کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں کئی طرح کے مقابلے ہوتے ہیں۔ جیسے کشتی کے مقابلے، ہائی جمپ، لانگ جمپ، لمبی دوڑ اور آج کل تو مضحکہ خیز مقابلے ہونے لگے ہیں۔ بریانی کھانے کا مقابلہ، زیادہ سے زیاہ حلیم کھانے کا مقابلہ، سینڈوچ کھانے کا مقابلہ وغیرہ وغیرہ حد تو یہ ہیکہ مغربی ممالک میں بوسہ بازی کے بھی مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ اس دور میں دمشق میں حقہ پینے کا مقابلہ ہوا تو اس پر شاہد صدیقی نے طنز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''حقہ تو لکھنؤ میں ایجاد ہوا اور ہم ہندوستانیوں کیلئے عبرت انگیز مقام ہے کہ حقے کا مقابلہ دمشق میں ہو رہا ہے''۔ (22)

اس طرح کے جملوں میں جو پر لطف طنز چھپا ہوتا ہے وہ شاہد صدیقی کی مزاح نگاری کے طرز کا ترجمان ہے۔ شاہد صدیقی سنجیدہ سے سنجیدہ مسئلے کو بھی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں مزاح کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ اپنے کالم پڑھنے والوں کو عید کی مبارکباد دیتے ہیں۔ اس طرح مبارکباد میں وہ طنز کے تیر اس طرح برساتے ہیں۔

☆ ان سب دوستوں کو عید مبارک جو یہ کالم بالکل پسند نہیں کرتے بلکہ اس کے بجائے کوئی جاسوسی ناول پڑھنا بہتر سمجھتے ہیں۔

☆ ان ارباب خرد کو عید مبارک جنہوں نے روزے تو بالکل نہیں رکھے اور سحر وافطار پر حاضری کو ضرور سمجھا۔

☆ ان بھائیوں کو عید مبارک جو عید کی نماز نہیں پڑھتے لیکن اپنی صورت نمازیوں جیسی بنا لیتے ہیں۔

☆ ان بہنوں کو عید مبارک جنہوں نے آج نئی ساڑھی پہننی ضروری سمجھا اور اپنے شوہر کی آدھی تنخواہ اس پر صرف کر ڈالی۔

☆ ان ہوٹل والوں کو عید مبارک جو آج دودھ میں پانی زیادہ ملاتے ہیں اور بھینسوں کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ نہایت ہی خراب دودھ دینے لگی ہیں۔

شاہد صدیقی باتوں باتوں میں طنز کا پہلو پیدا کرتے ہیں وہ نہ صرف سماج میں پھیلی برائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ قارئین کو بھی متوجہ کرتے ہیں۔

شاہد صدیقی نے سیاسی مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے۔وہ سیاسی نظام کی بدانتظامیوں پر چوٹ کرتے ہیں اور طنز کا موضوع بناتے ہیں۔ ہمارے ملک میں آئے دن نئی نئی سیاسی پارٹیاں بنتی ہیں اور کچھ عرصہ بعد ختم ہوجاتی ہیں۔ان دنوں ایک خبر چھپی تھی کہ افریقہ کے ایک کسان نے مختلف درختوں کی پیوندکاری کے ذریعہ ایک ایسا پھل حاصل کیا ہے جس کی شکل سنگترے جیسی اور خوشبو انگور جیسی پھانکیں نارنگی جیسی اور ذائقہ تینوں پھلوں کا مرکب تھا۔شاہد صدیقی اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کسان نے اپنی سرگرمی صرف پھل تک محدود رکھی لیکن ہندوستانی سیاست داں تو پیوندکاری میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ وہ سیاسی پارٹیوں کی پیوندکاری کررہے ہیں۔شاہد صدیقی لکھتے ہیں:

> ’’کیرالا میں اپوزیشن نے ایسی ہی پیوندکاری کے ذریعہ ایک ایسا پھل حاصل کیا جس کی شباہت اپوزیشن جیسی خوشبو فرقہ پرستی جیسی، پھانکیں مفاد پرستی جیسی اور ذائقہ ان تینوں سے بالکل مختلف کڑوا کسیلا اور اس کی تاثیر ٹھیٹ جمہوریت کش ہے۔‘‘(23)

پونا کے ایک اخبار’’بھودان‘‘میں اچاریہ ونوباوے نے مضمون لکھتے ہوئے بتایا تھا کہ طالب علمی کے زمانے میں وہ اکثر اسکول سے بھاگ جایا کرتے تھے۔اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہد صدیقی کہتے ہیں کہ:

> ’’اچاریہ جی کے بیان سے ہم بھی متاثر ہوئے اور اسکول سے غیر حاضر رہنے لگے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ’’آج بہت بڑے آدمی......یعنی بہت مہمل آدمی بنے ہوئے ہیں۔‘‘ (24)

شاہد صدیقی کا خیال ہیکہ اخبارات کسی بھی ملک کے حالات کا اندازہ لگانے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں اور یہ صحیح بھی ہے کہ اخبارات کے مطالعے سے قاری قومی اور بین الاقوامی حالات سے باخبر رہتا ہے وہ اخبارات کی سرخیوں کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

☆ سرکاری ملازم کے ادائے قرض میں مزاحمت

☆ ایک تاجر کے خلاف مقدمہ

☆ تعلیم یافتہ دھوکہ باز نوجوانوں کی گرفتاری

☆ بیروزگاری سے تنگ آکر سرقوں کا ارتکاب

☆ مسجد سے جانماز چراتے ہوئے ایک شخص گرفتار (25)

اس طرح کی سرخیاں موجودہ دور میں بھی پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ اور اس طرح ملک کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شاہد صدیقی جب اپنا قلم اٹھاتے ہیں تو بلا جھجک بناوٹ اور تصنع کی حقیقت کو آشکار کرتے ہیں۔ شاہد صدیقی بحیثیت صحافی بھی عوام کی پسند اور ملک میں ہونے والے واقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ محمد حسن طنز ومزاح کے بارے میں لکھتے ہیں:

''طنز ومزاح اکثر نئے مفاہمے کی کہانی ہوتی ہے اور اس مفاہمے کے دوران جو آڑے ترچھے زاویے آتے ہیں اور اقدار جن ناہمواریوں سے گذرتی ہیں ان کی تصویر کشی سے مزاح کے گل بوٹے اور طنز کے تیر ونشتر بنے ہیں''۔(26)

شاہد صدیقی بھی سماج میں پھیلی ان ہی ناہمواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ دیگر ممالک کی خبروں پر بھی بڑا دلچسپ تبصرہ کرتے ہیں۔ اُن دنوں لاہور سے ایک خبر آئی تھی کہ ایک اخبار نویس نے صحافت کو چھوڑ کر زراعت شروع کردی ہے۔ شاہد صدیقی اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''گویا صاحب موصوف پہلے کاغذ پر الفاظ کی کاشت کرتے تھے اور پیٹ بھرتے تھے۔ اب زمین پر گیہوں کی تخم ریزی فرمائیں گے اور موج اڑائیں گے''۔(27)

شاہد صدیقی ہر چھوٹے بڑے واقعے اور ملک و بیرون کی خبروں پر بڑے ہی پُرمزاح تبصرہ کرتے ہیں ان میں مزاح کی شگفتگی کے ساتھ ساتھ طنز کے نشتر بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ طنز ومزاح میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اعتدال کی حد سے تجاوز نہیں کرتے وہ ہنسی ہنسی میں کام کی بات کر جاتے ہیں اور قارئین کو ان

کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا احساس دلاتے ہیں۔ طیب انصاری، شاہد صدیقی کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''شاہد صدیقی سماج کے شاہد و مبصر ہی نہیں تھے، نقاد بھی تھے۔ اس لئے زندگی اور سماج کے کمزور پہلوؤں کو بڑی بے دردی اور بے جگری سے بے نقاب کرتے ہیں لیکن قاری پر ان کی یہ انگشت نمائی گراں نہیں گذرتی کیونکہ یہاں ان کی بذلہ سنجی ان کے کام آئی وہ مزاح پیدا کرنے کے لئے حالات و واقعات کی مدد لیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے مزاحیہ کالموں میں ایک قسم کی حقیقت پسندی نظر آتی ہے۔ شاہد بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں یا سنجیدہ آدمی، یہ کہنا بے حد مشکل ہے۔ ان کی سنجیدگی اور ان کے مزاح میں اس طرح کا کوئی خطِ تقسیم نہیں کھینچا جاسکتا۔'' (28)

شاہد صدیقی کے طنز میں ہمدردی کا پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی ظرافت نگاری میں مقصدیت نظر آتی ہے۔ معروف مزاح نگار یوسف ناظم لکھتے ہیں۔

> ''طنز کے ساتھ اشک شوئی بھی ان کی تحریر کا جز تھی۔ ان کی ظرافت نگاری میں تنقید کا وہ رنگ موجود ہے جو ''ہمدرد'' کے کالم نگاروں کی تحریروں میں تھا۔ سلطان حیدر جوش بمبوق کی تحریریں جن لوگوں نے پڑھی ہیں انھیں معلوم ہے کہ کالم نگاری صرف ظرافت نہیں چاہتی بلکہ افادیت بھی مانگتی ہے۔''(29)

شاہد صدیقی کے فن اور ان کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں۔

> ''طنز نگار، حاضر جوابی، بے ساختگی خصوصیات ہیں۔ بے حد ذہین اور زور قلم۔ اشعار کی تحریف میں کمال رکھتے ہیں۔ پیروڈی خوب لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ سنجیدہ شاعری بھی کی ہے لیکن اس میں بھی بھرپور طنز ہے۔''(30)

اس پر آشوب دور میں عوام میں مسکراہٹیں بکھیرنے والا یہ فنکار 31 جولائی 1962ء کو یہ کہتے ہوئے اس دارفانی سے کوچ کر گیا:

ہم کو کیا جب اجل کے فرشتے نے سلام
وعلیکم السلام کہا اور مرگئے۔

اہل دکن نے ہر دور میں اصحاب علم وفن کی عزت افزائی کی۔ ایسے ہی قلمکاروں میں شاہد صدیقی بھی شامل تھے۔ ماہر القادری لکھتے ہیں۔

> ''دکن کی سرزمین نے نہ جانے کتنے گمنام غربت زدوں کو چمکا دیا اور نام آور بنادیا' شاہد صدیقی مرحوم کو بھی دکن ہی میں شہرت ملی' انھوں نے بھی سرزمین دکن کے ساتھ دوستی' وفاداری اور احسان مندی کا حق ادا کردیا کہ اسی زمین کا پیوند ہوکر رہ گئے۔ اور جہاں امیرؔ' داغؔ' جلیلؔ اور فانیؔ محوخواب ہیں' اسی خطہ میں وہ بھی قیامت کی نیند سو گئے۔'' (31)

ان کے جسد خاکی کو درگاہ یوسفین نامپلی میں سپرد خاک کیا گیا۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) ماہر القادری　''یادرفتگان''　1994ء ص303
(2) جگر مرادآبادی　''شاہد صدیقی میری نظر میں''　مضمون مشمولہ ''چراغ منزل'' ص4　1960ء
(3) مجتبیٰ حسین　''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین　صفحہ 149
(4) شاہد صدیقی　''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین　صفحہ 151
(5) شاہد صدیقی　''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین　صفحہ 163
(6) ڈاکٹر وزیر آغا　''اردو ادب میں طنز و مزاح''　صفحہ 392
(7) طیب انصاری　''شاہد صدیقی کی کالم نگاری''　مطبوعہ ماہنامہ ''شاعر'' صفحہ 45 سنہ 1978ء

(8) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 152

(9) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 213

(10) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 213

(11) مخدوم محی الدین مقدمہ ''چراغ منزل'' صفحہ 4

(12) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 21

(13) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 13

(14) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 13

(15) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 2

(16) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 5

(17) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 7

(18) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 79

(19) محمد یونس فہمی ''اردو شاعری میں طنز و مزاح'' صفحہ 55

(20) اردو طنز و مزاح کے پچیس سال، مجتبیٰ حسین، مضمون مشمولہ ماہانہ آجکل ص 11، اگست 1972ء

(21) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 79

(22) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 93

(23) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 119

(24) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 120

(25) شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین صفحہ 121

(26) محمد حسن ''قہقہوں کے بین السطور'' مضمون مشمولہ ''عصری ادب'' صفحہ 59 سنہ 1971ء

(27) بحوالہ شاہد صدیقی ''حیات اور کارنامے'' از سیدہ وہاب النساء، مقالہ ایم فل 1983 مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو، سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد، صفحہ 161

(28) طیب انصاری ''شاہد صدیقی کی کالم نگاری'' ماہنامہ شاعر' ص 45 سنہ

(29) یوسف ناظم ''شاہد صدیقی'' مضمون مشمولہ ''سائے ہم سائے'' ص 107

(30) خواجہ عبدالغفور ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' ص 243 سنہ 1983ء

(31) ماہر القادری ''یادِ رفتگان'' ص 304

بھارت چند کھنہ

بھارت چند کھنہ 22 جون 1912ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم سری نگر میں ہوئی۔انٹرمیڈیٹ جموں سے کیا اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا۔1928ء کے آس پاس وہ حیدرآباد آئے جہاں ان کے بڑے بھائی راجہ اقبال چند حکومت آصفیہ میں ڈی آئی جی کے عہدے پر فائز تھے۔راجہ اقبال چند مہاراجہ کشن پرشاد، وزیراعظم سلطنت آصفیہ کے داماد تھے۔بھارت چند کھنہ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے تاریخ کے مضمون میں ایم اے کیا۔اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلینڈ چلے گئے۔کیمبرج یونیورسٹی سے انہوں نے دو مضامین ''ٹرائی پاس'' کا امتحان کامیاب کیا جو آنرس کی ڈگری کے مماثل ہوتا ہے۔مضامین تھے تاریخ اور قانون۔1938ء میں حیدرآباد لوٹے اور سٹی کالج میں درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔لیکن سات مہینے کام کرنے کے بعد محکمہ محاسبی میں سہ رشتہ دار مقرر ہوئے۔ان کی ملازمتوں کی تبدیلی کا یہ سفر سررشتہ داری سے شروع ہو کر 1970ء میں گورنر آندھراپردیش کی سکریٹری شپ پر جاکر ختم ہوا۔اپنی ملازمت کے دوران تیرہ سال کی مدت بحیثیت ڈپٹی سکریٹری جی اے ڈی کے گذاردی۔1993ء کو سکندرآباد میں انہوں نے آخری سانس لی۔

بھارت چند کھنہ ایک پنجابی کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے انکی بیوی کا تعلق بھی پٹیالہ سے تھا وہ ایک اچھے کرکٹ کھلاڑی بھی تھے۔پندرہ سال تک انہوں نے حیدرآباد کی نمائندگی کی۔

بھارت چند کھنہ کی مزاح نگاری کا آغاز 1944ء میں ہوا۔نیم سنجیدہ اور مزحیہ افسانوں کا ایک مجموعہ ''مسکراتے آنسو'' شائع کیا۔انہوں نے اپنی تحریروں میں ایک مخصوص انداز کو اپنایا۔ان میں ایک اچھے مزاح نگار کی صلاحیتیں موجود ہیں۔حالانکہ یہ مضامین ان کی ابتدائی کوشش ہیں اور یہ ہلکے پھلکے سے نظر آتے ہیں لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ دور اردو طنز و مزاح کا بھی بالکل ابتدائی دور تھا۔انکا پہلا مجموعہ ''مسکراتے آنسو'' آغا محمد اشرف کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوا۔اس کتاب کے ناشر سید علی مبشر حاتمی تھے جو عبدالحق اکیڈیمی اور کتاب خانہ انجمن ترقی اردو کے روح رواں تھے۔بھارت چند کھنہ کے بارے میں خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں۔

مزاحیہ مضمون نگاروں میں کافی کہنہ مشق ہیں۔خود لکھتے ہیں دوسروں کو اُکساتے ہیں۔ان کا اپنا انداز افسانہ نگاری سب سے الگ تھلگ ہے۔شائستگی اور تہذیب کا خود بھی نمونہ ہیں اور ان کی تحریریں بھی۔''(1)

ان کی تخلیقات میں ٹریجڈی اور کامیڈی کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔مضمون ''حسرت'' اس کی غمازی کرتا ہے۔طنز کی کاٹ اور مزاح کی چاشنی کو انہوں نے بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے پھیلی عام بیروزگاری کی طرف وہ کچھ اس طرح اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ موجودہ نظام میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔یہ اقتباس دیکھئے :

''یہ موجودہ نظام کتنا عجیب ہے۔ یہاں ہر ایک کو آرام اور خوشی وراثت میں ملتی ہے بعض خوش نصیب اس کو جہیز میں حاصل کر لیتے ہیں مگر جن کو مذکورہ بالا طریقوں سے نہ مل سکے پھر ان کیلئے دنیا ایک بھیانک اور دکھ درد سے بھری ہوئی جگہ ہے جہاں وہ بھوکے رہیں ورنہ بنیے کی کتاب تلے دب مریں''۔(2)

خاکہ نگاری اور مرقع نگاری میں وہ کمال رکھتے ہیں۔بعض اوقات اس قسم کے خاکے کھینچتے ہیں کہ ان کے فن خاکہ نگاری کی قائل ہونا پڑتا ہے۔کسی نازنین کے نظارہ کی امید باندھے ہوئے ہیرو کی کیا حالت ہوگی اور اس کے چہرے پر کس قسم کے مضحکہ خیز تاثرات رونما ہوں گے جب اس نے یہ دیکھا...

''اور سامنے کی کھڑکی کی چلمن کو کسی نے آہستہ آہستہ اٹھانا شروع کیا میری گنگناہٹ خود بخود بند ہوگئی۔کان کھڑے ہوگئے اور آنکھیں چلمن کے پس پردہ سے ظہور میں آنے والی حقیقت دیکھنے کیلئے بیتاب ہوگئیں۔ پہلے سفید دھوتی نظر آئی اور اس کے بعد گویا کہ بجلی سی گری کیونکہ دھوتی ختم ہونے پر ایک دم دھلکا ہوا ننگا پیٹ اپنی گولائی اور عظیم الشان پھیلاؤ کے ساتھ ظاہر ہونا شروع ہوا۔اس پیٹ کی ناف بلا مبالغہ اتنی عمیق تھی اس میں کرکٹ کی

گیند آسانی سے رکھی جاسکتی تھی۔ رفتہ رفتہ پیٹ پورا جلوہ افروز ہوگیا۔ اس کے بعد دو ڈھلکے ہوئے پستان یعنی مری ہوئی جوانی کی نشانیاں نظر آئیں پھر اسکے بعد گلگلے کی مانند پھولا ہوا مگر پلپلا چہرہ سامنے آ گیا۔ گردن چونکہ تھی ہی نہیں اس لئے نظر نہ آسکی۔ اگر تھوڑی بہت ہوگی تو وہ بھی کثیر المقتدر تھوڑیوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔'' (3)

اس طویل اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بھارت چند کھنہ ایک بہترین خاکہ نگار اور افسانہ نویس ہیں لیکن اس کا انہوں نے بعد کے دور میں بہت کم استعمال کیا ہے۔ عبدالحق اکیڈیمی کے زیر اہتمام بھارت چند کھنہ کا دوسرا مجموعہ ''مصیبتیں'' شائع ہوا۔ ''ہمارے بزرگوار'' توجہ طلب اور مکمل طنزیہ مضمون ہے ''ہمارا پیشہ'' ایک مدرس کے شب و روز کی داستان ہے۔ ان دونوں مضامین میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی چاشنی دونوں نظر آتے ہیں۔ کڑوی سچائیوں اور تلخ حقیقتوں اور ناہمواریوں کو اتنی برجستگی سے بیان کرتے ہیں کہ بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

''اگر نوجوان ہو تو نوجوانی کھو بیٹھتا ہے۔ اگر جوان ہو تو جوانی سے خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ اگر بوڑھا ہو تو وظیفہ پانے سے پہلے ہی کسی دن جماعت کی طرف جاتے ہوئے پیشہ استادی پر خود کو بھینٹ چڑھا دیتا ہے''۔ (4)

مدرس پر وہ کچھ اس طرح ریمارک کرتے ہیں:

''جماعت میں جو شخص سب سے زیادہ شور کر رہا ہوتا ہے وہ استاد ہی ہوتا ہے''۔ (5)

ہماری دھوبن، میرا مالی، درزی میں حیدرآبادی ماحول کی بہترین عکاسی کے نمونے ملتے ہیں۔ ''ہماری دھوبن'' تو ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے اور آج بھی اس قسم کے کردار حیدرآباد کے مسلم معاشرے میں نظر آ جاتے ہیں۔

مضامین کے موضوعات وہ اپنے آس پاس ہی تلاش کرتے ہیں۔ ''ہمارا کلرک'' ایک بہترین طنزیہ مضمون ہے یہ مضمون نچلے متوسط درجے کی نمائندگی کرتا ہے۔ کلرک کی گندگی پسند طبیعت کا مضحکہ اس انداز میں اڑاتے ہیں۔ یہ ایک حد تک حقیقت نگاری بھی ہے اور ان کی جذبات نگاری کی دلیل بھی۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''چپراسی بستہ میز پر پٹک دیتا ہے۔جس سے میز پر رکھی ہوئی مثلوں پر کی دھول اپنی جگہ سے اڑتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ وہیں جم جاتی ہے۔کلرک اپنی چھتری پاس کے دروازے کے ایک محفوظ مقام پر ٹانگ دیتا ہے اور پھر دھم سے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔اس امر سے بھی کچھ گرد آس پاس سے اٹھتی ہے۔شائد بیٹھنے والے کی تعظیم کیلئے''۔(6)

اپنے مضامین میں مثالوں کے ذریعہ وہ بہترین طنز کرتے ہیں اور اس کا وار بھی بھرپور ہوتا ہے۔

> ''ماہر فن کام سے ایسا واقف ہے جیسے مفلسی اس سے اور انگریز ہندوستانیوں کی مذہبیت سے۔سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔دیگر محکموں کے قوانین اور ضوابط تک حفظ کر کے رکھے جاتے ہیں۔دفتری دستور العمل کے متعلق اس کا دماغ دیگر محکموں کی غلطیاں اس آسانی سے پکڑ لیتا ہے جس طرح ہندوستانیوں کی انگریز بیویوں کو دوسرے انگریز''۔(7)

بھارت چند کھنہ کے مضامین میں دکنی الفاظ کا استعمال بھی نظر آتا ہے اور بعض الفاظ ایسے ہیں جو خاص طور پر عورتیں اور مقامی لوگ استعمال کرتے ہیں جیسے موتی ،گمالینا،کھند لنا،لڑکے جیسے خاندان وغیرہ۔

1961 میں ان کا ایک اور مجموعہ ''ٹھنڈی بجلیاں'' منظر عام پر آیا۔ادارہ ادبیات کے زیر اہتمام شائع ہونے والے اس مجموعے کا پیش لفظ ادارہ کے بانی ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے تحریر کیا ہے۔

بھارت چند کھنہ کی مزاح نگاری کے بارے میں ڈاکٹر ایس جے صادق لکھتے ہیں

> ''کہانی بیان کرنے کا انداز دل نشین ہونے کے باوجود چونکا دینے والا نہیں۔ ہر افسانہ کی تمہید بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک پرانی تکنیک ہے اور داستان نویسی کے ابتدائی نمونوں میں ملتی ہے۔اس مجموعے کے اکثر افسانے ادھورے تخیل کی مثال ہیں اور وقت گذاری کا ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔ بالغ

نگاہی کا فقدان نظر آتا ہے۔کھنہ پہلی نظر میں محبت کے قائل ہیں اور محبت کے سلسلے میں روایت پسند افسانہ نگاری کی نقل کرتے ہیں۔موضوعات کے انتخاب میں جدت نہیں ہے‘‘(8)

’’ٹھنڈی بجلیاں‘‘ میں بھارت چند کھنہ کا فن اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔اس مجموعے میں بالغ نگاہی، سنجیدگی اور عرق ریزی نظر آتی ہے۔موضوعات میں تنوع نظر آتا ہے۔ یہ مجموعہ ان کی آپ بیتی معلوم ہوتا ہے ہر مضمون میں انکی شخصیت چھائی نظر آتی ہے۔ یہ شخصیت ایک متوسط درجے کے منحنی انسان کی ہے جو اپنے طبقے کی خوشیوں اور غموں کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

سانچ کو آنچ نہیں' کیا یہ سچ ہے' میری پہلی شرارت، چاپلوسی، یہ گتھی میں سلجھا نہ سکا کہ بیوی کو کیوں کر خوش رکھا جائے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ قرض خواہ کا سامنا کیسے کروں، اگر میں ہوتا تغلق کے دور میں اس مجموعے کی بہترین مضامین ہیں۔قرض خواہ کا سامنا کیسے کروں‘‘ میں کھنہ بڑھتی مہنگائی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

’’اس دوران میں آمدنی والدین کی ہٹ کی طرح اپنی جگہ قائم بلکہ ٹیکسوں کے بڑھنے سے کم البتہ جو چیز بڑھنے لگی وہ تھا ہمارا کنبہ اور گرانی‘‘۔(9)

وہ پرانے موضوعات کو بھی بہت دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں اور مبالغہ کے باوجود یہ مضامین مزاح نگاری کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔

’’اور گھر کی روزمرہ ضروریات اور روز افزوں گرانی' بچوں کے حیرت انگیز تیزی سے بڑھنے والے پیروں کے لئے جوتے، ان کی اور ہر چیز حتیٰ کہ پانی کی قیمت تک بڑھ گئی۔ہم نے قرض نہ لینے کیلئے لاکھوں کوششیں اور جتن کئے۔کوٹ ٹائی ہٹائی اور پرانی رضائی کے کپڑوں کے بش شرٹ پہنے اور سگریٹ کے بجائے چلم پینی شروع کردی۔مگر قیمتوں کے اضافہ کی رفتار کچھ ایسی تھی کہ ہم بالآخر مقروض ہوگئے۔کبھی بنئے سے ادھار لیا تو کبھی پارچہ فروش کے مقروض ہوئے۔کبھی چمار سے حساب کتاب کیا تو کبھی لوہار

کے سامنے سرزیر بارمنت ہوا۔غرض ڈیری فارم سے لے کر کلوروفام تک
اودھار لیے جانے لگے۔‘‘(10)

اگر میں ہوتا تغلق کے دور میں، سیاسی طنز کی بہترین مثال ہے۔زبان وبیان پر اچھی قدرت ہے۔رواں زبان کا استعمال کرتے ہیں۔اقتباس دیکھئے:

’’اس پر تیسرے نے بڑھ کر میرے منہ پر ایسا طمانچہ رسید کیا کہ میرے
دماغ سے روس اور مارکس کے نظریے۔جمہوریت کے فائدے اور رائے
عامہ کی قوت کے خیال‘ اس طرح غائب ہوگئے جس طرح اس سے پہلے
میرے سامعین‘‘(11)

بھارت چند کھنہ کے بعض مضامین میرامّن کے اسلوب کی یاد دلاتے ہیں۔’’کاش کہ منہ سے کھواسی سال میں اسی ماہ میں‘‘ اس کی مثال ہے۔ بھارت چند کھنہ اس قسم کی اردو بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔مزاحیہ اور طنزیہ تحریریں کے لئے اس طرح کے جملے اور اسلوب مددگار نظر آتا ہے۔

’’تیرِ نیم کش‘‘ بھارت چند کھنہ کا تیسرا مجموعہ ہے جو 1972 میں زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہوا جس کا پیش لفظ کرشن چندر نے لکھا ہے اور اس میں ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کی رائے بھی شامل ہے۔اس میں 29 مضامین اور ڈرامے شامل ہیں۔ڈرامے ریڈیو کیلئے بہت موزوں معلوم ہوتے ہیں۔’’ٹیلیفون‘‘ میں حیدرآباد کی نسوانی زبان کا عکس نظر آتا ہے۔حیدرآبادی لڑکیوں کے کردار کی اس عمدگی سے عکاسی کی گئی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی الھڑ دوشیزہ کی گفتگو سن رہے ہیں۔ان ڈراموں میں باذوق مزاح نظر آتا ہے۔ابتذال سے دور اور اعلیٰ فنکاری کا نمونہ ہیں۔اس مجموعے میں شامل مضامین کے موضوعات متنوع ہیں۔بعض مضامین پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔قاری مزاح نگار کے فن اور شگفتہ انداز کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔اس مجموعہ میں انہوں نے مبالغہ آرائی سے بچنے کی کوشش کی ہے اور بڑی فنکاری سے ناہمواریوں کو پیش کیا ہے۔’’بڑے پچھتائے گھر نہ بنا کر‘‘ میں صرف واقعاتی بدحواسیوں کو فطری انداز میں پیش کرتے ہیں۔الفاظ کے سہارے وہ موجودہ دنیا پر شگفتہ طنز کرتے ہیں۔اقتباس دیکھئے:

”فی زمانہ کوئی رواداری کیوں ہو جب کہ رواداری کا سب روا (جنوبی ہند کی ایک ڈش) بنانے میں تمام ہو جاتا ہے اور باقی جو چیز بچ رہتی ہے وہ ہے درد جس پر ہمیں چڑھانے کیلئے ہر شخص نہ صرف تیار بلکہ بے قرار نظر آتا ہے“۔(12)

بھارت چند کھنہ نے نئی نسل کو جا بجا غذائی ملاوٹ کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ وہ طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ نئی نسل اس اہم مسئلہ کو اتنی اہمیت نہیں دیتی اور نہ اس نسل کے پاس اتنا وقت ہے کہ کچھ دیر ٹھہر کر اس بارے میں غور کرے کیونکہ یہ نسل اسی ملاوٹ کے زمانے کی پیداوار ہے۔ بھارت چند کھنہ کے پاس عام آدمی کے مسائل نظر آتے ہیں۔ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ایس جے صادق لکھتے ہیں:

”کبھی تو انہوں نے مالک مکان و پڑوسیوں کی شکایت کی ہے اور کبھی تو اپنے کلرکوں کی۔ انہیں سب سے زیادہ قابل اعتراض بات یہ نظر آتی ہے کہ لوگ شہریت کے اصولوں سے واقف نہیں اور نہ صفائی کا ہی خیال رکھتے ہیں۔ مصنف کی نازک مزاجی اور نفاست نے ان سے کئی دلچسپ مضامین لکھوائے ہیں اور کبھی نفاست پسندی اپنی حدوں کو پار کرتی نظر آتی ہے۔ جب کبھی ان کی نظر نشست و برخواست کے غلط طریقوں، بدتمیزیوں، غیر معیاری اور بے ڈھنگی باتوں پر جاتی ہے تو ان کا قلم حرکت میں آجاتا ہے۔ان کی طبیعت کی یہ نفاست نہ تو تانا شاہی دماغ کا نتیجہ ہے اور نہ ہی مصنوعی یا خود پر طاری کردہ نفاست ہے بلکہ یہ ان طبیعت کا خاصہ ہے۔ یہ نفاست ایک دنیا کی تشکیل میں مدد ومعاون ہو سکتی ہے ان کے اکثر موضوعات نچلے متوسط اور متوسط طبقے سے ان کی ہمدردی اور دلچسپی کا ثبوت ہے۔ یہ ان طبقات کی پریشانیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں“۔(13)

بھارت چند کھنہ اپنی تخلیقات میں نہ صرف اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ وہ ہمیشہ وقار اور معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کرشن چندر لکھتے ہیں:

''بھارت چند کھنہ کہنے کو پنجابی ہیں لیکن نازک مزاجی میں لکھنؤ والوں کو شرماتے ہیں احساس ظرافت یوں پاک رکھتے ہیں کہ رکاکت اور کثافت کوسوں دور رہتے ہیں''۔(14)

بھارت چند کھنہ اپنے زمانے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ جیسے گرانی، بیروزگاری، رہائشی مسائل، مالکان مکان کے مطالبے، اشیائے خوردنوش کی عدم دستیابی، ان کی آسمان سے باتیں کرتی قیمتیں اوران میں نقصان رساء اجزاء کی ملاوٹ اور طبع انسانی کے مختلف اور مضحک حرکات کی بوقلمونی کو بھی اپنی ظرافت کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان تحریروں کا جائزہ کرشن چندر کچھ اس طرح لیتے ہیں:

''ان کی طنز نگاری میں اذیت ناکی اور اذیت کوشی کے دردناک عنصر بھی نمایاں ہیں ان کے بعض جملوں پر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جملے پر ہنسا جائے یا رویا جائے۔ جب صورتحال کے مضحک پہلو اور دردناک پہلو یکجا ہوتے ہیں کہ ابتدائی اور انجام مسرت اور مایوسی خوشی خواری ایک ہی سکے کے دو چہرے اور وہ بھی ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوکر انسانی احساس کو یوں چھوتے ہیں کہ اگر آنکھ نم ہے ہونٹوں پر مسرت ہے۔ چہرہ خوشی سے کھلا جاتا ہے تو دل پر کچوکے سے لگتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ظرافت نگاروں کے ہاں یہ انداز کمیاب ہے اور اس کی کامیاب ترین مثالوں میں صرف چارلی چیپلین کی مزاحیہ نظمیں ہی پیش کی جاسکتی ہیں۔''(15)

تیر نیم کش کے بعض مضامین اخبارات ورسائل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ بھارت چند کھنہ لذت کوش اور جمالیاتی حسن سے بھرے دل کے مالک ہیں۔ اپنی بیوی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''سروقد متناسب جسم، سرخ و سپید رنگ، تابناک چہرہ آہو چشم، دراز گیسو، دلفریب صورت، ایک ماہ کامل، زندگی میں پہلی مرتبہ جب دیکھا تھا تو ایک لڑکی تھیں۔ قیس کی لیلیٰ سے زیادہ خوبصورت اور فرہاد کی شیریں سے

بڑھ کر شیریں لڑکی جو عورت پھر ماں بنی۔ گھر کی مالکن گھرانے کی رانی جس کی حکمرانی میں سرکشی اور بغاوت، بے بسی سے پانی پانی جس کا حکم نادر شاہی، جس کے فرامین اٹل، جس کا غصہ گھر بھر کو لرزہ بر اندام کردے۔ جس کے رعب سے سر اور کمر جھکے رہیں۔ جس کی خشمنا کیوں سے گھر کا کتا بھونکنا بند کردے۔ غرض اسی شان سے پرورش کی شاہانہ انداز تحکمانہ لہجہ بے باکانہ، جب لب ہائے شیریں متحرک ہوں یعنی یہ کھولیں اپنا دہانہ تو ان کے الفاظ کی روانی کے سامنے تھم جائے۔ ٹینی سن کی پہاڑی ندی کا پانی اور چوں اور چرا کرنے کا خیال بھسم ہو جائے مانند پروانہ''۔(16)

رواں انداز اور شگفتہ بیانی ان کے مضامین کو خصوصیت فراہم کرتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ یہ شگفتہ بیانی شاعری سے کم معلوم نہیں ہوتی۔ سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل کی تعریف کمیشن ایجنٹ کی زبانی سنئے۔

''حال ہی میں اوور ہال کئے جانے کا حال، اس کے پرانے مالکوں کا بنام احتیاط استعمال، اس کے کم پٹرول کھانے کا کمال، اس کی مشین کی صفات بے مثال، غرض کہ صاحب ان موٹروں کے بے پناہ دلال نے بچھائے کچھ ایسے جال کہ موٹر خریدنے کیلئے ہو گیا میں بے حال''۔(17)

اس مضمون میں بھارت چند کھنہ نے ردیف کے بار بار استعمال سے مردف نثر لکھی ہے اور خوب لکھی ہے اس موٹر کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''اس میں لوہا زیادہ اور پرزے کم تھے۔ جب یہ بالفرض محال چل پڑتی تو اس کے پہیئے لڑکھڑاتے، بمپر کھڑ کھڑاتے، مڈگارڈ پھڑ پھڑاتے اور انجن اس طرح کڑکڑاتا تھا جیسے مشین گن چل رہی ہو... ایسی گاڑی پر سوار ہو کر دفتر جانے والے کا انجام اس سے بہترین نہیں ہو سکتا تھا۔ دیر سے آنے کے عادی کا اہل صحت اچھی

نہیں۔غلاظت پسند نا قابل بھروسہ اس لئے تقری کے نا قابل"۔(18)

"محبوب" میں الفاظ کی فراوانی اور روانی قابل دید ہے ایسا لگتا ہے کہ جیسا اردو شاعری کے دریا کو ایک کوزے میں بند کر دیا ہو۔

> "بہر حال ان کا محبوب گل بیز، گھر بیز، گھر اور گھر تاب تھا وہ تو خواستہ نورس، نوطلعت اور نوخیز تھا۔ اسکی فطرت میں خونریزی، کم آمیزی' دل آویزی اور جنون خیزی تھی لیکن اس کے باوجود خوش چشم، خوش آواز، خوش اطوار اور خوش خرم اس کے علاوہ وہ گل پیرہن، گل بدن' گل رخ، گل رنگ بھی تھا۔اس کا دہن ایسا چھوٹا تھا کہ
>
> بے نشانی سے نشان بھول گیا مانی کو
> کھینچ چکا نقشہ تو پھر اس کو دہن آیا (19)

ان کی تحریروں میں طلسم ہوشربا اور میرامن کی باغ دبیار والی اردو بھی نظر آتی ہے اور جب یہ اس اسلوب نگارش کو اپناتے ہیں تو پھول کھلاتے چلے جاتے ہیں۔

> "آپ کے آنے کی خبر گرم ہے، آپ کا بڑا کرم ہے۔مگر گھر میں نہ صرف بوریا بلکہ دام ہے نہ درم ہے۔ہم ایسے بدنصیب سڑے ہیں کہ دال شکر اور گیہوں کے ڈبے خالی پڑے ہیں"۔(20)

بھارت چند کھنہ کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے نامی انصاری رقمطراز ہیں۔

> "بھارت چند کھنہ اور نریندر لوتھر نے طنز ومزاح کو ادبی سطح پر برتنے کی کامیاب سعی کی ہے۔وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو بڑی چابکدستی سے عام آدمی کی زندگی سے جوڑ دیتے ہیں۔"(21)

وہ کبھی سادہ زبان لکھتے ہیں تو کبھی مقفٰی عبارت کا استعمال کرتے ہیں یہ تمام اوزاران کے اسلوب اوران کے

مزاح کو نیا رنگ عطا کرتے ہیں۔ یہ غالب اور ان گنت شعراء کے اشعار کو موقع محل کی مناسبت سے استعمال کرتے ہیں۔ غالباً اسی لئے ان کے اکثر مضامین نہ صرف موضوعات کی تکرار نظر آتی ہے بلکہ الفاظ اور محاوروں کو بار بار استعمال کرتے نہیں تھکتے۔ ان کی شخصیت کا پرتو ان کے مضامین کی ہر سطر میں نظر آتا ہے۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) خواجہ عبدالغفور ''طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ ص 239 سنہ 1983ء

(2) بھارت چند کھنہ ''حسرت'' مضمون مشمولہ ''مسکراتے آنسو'' ۔صفحہ 55

(3) بھارت چند کھنہ ''حسرت'' مضمون مشمولہ ''مسکراتے آنسو'' صفحہ 57

(4) بھارت چند کھنہ ''ہمارا پیشہ'' مضمون مشمولہ ''مصیبتیں'' صفحہ 21

(5) بھارت چند کھنہ ''ہمارا پیشہ'' مضمون مشمولہ ''مصیبتیں'' مصفحہ 21

(6) بھارت چند کھنہ ''ہمارا کلرک'' مضمون مشمولہ ''مصیبتیں'' صفحہ 28

(7) بھارت چند کھنہ ''ہمارا کلرک'' مضمون مشمولہ ''مصیبتیں'' صفحہ 30

(8) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و زماح آزادی کے بعد'' مطبوعہ نیشنل پریس، حیدرآباد، 1994 صفحہ 344

(9) بھارت چند کھنہ ''قرض خواہ کا سامنہ کیسے کروں'' مضمون مشمولہ ''ٹھنڈی بجلیاں'' مطبوعہ ادارہ ادبیات اردو، صفحہ 961

(10) بھارت چند کھنہ ''قرض خواہ کا سامنہ کیسے کروں'' مضمون مشمولہ ''ٹھنڈی بجلیاں'' مطبوعہ ادارہ ادبیات اردو، 1961، صفحہ 40

(11) بھارت چند کھنہ ''اگر میں ہوتا تغلق کے دور میں'' مضمون مشمولہ ''ٹھنڈی بجلیاں'' صفحہ 55

(12) بھارت چند کھنہ ''بڑے پچھتائے گھر نہ بنا کر'' مضمون مشمولہ ''تیر نیم کش'' صفحہ 62 مطبوعہ زندہ دلان حیدرآباد 1972ء

(13) ڈاکٹر ایس جے صادق، اردو ادب میں طنز ومزاح، آزادی کے بعد، صفحہ 351

(14) کرشن چندر، پیش لفظ ''تیر نیم کش'' صفحہ 8

(15) کرشن چندر، پیش لفظ ''تیر نیم کش'' صفحہ 9

(16) بھارت چند کھنہ ''ذکر اس پری وش کا'' مضمون مشمولہ ''تیر نیم کش'' صفحہ 28

(17) بھارت چند کھنہ ''میری جو شامت آئی میں نے سیکنڈ ہینڈ موٹر خریدی'' مضمون مشمولہ: تیر نیم کش، صفحہ 44

(18) بھارت چند کھنہ ''میری جو شامت آئی میں نے سیکنڈ ہینڈ موٹر خریدی'' مضمون مشمولہ: تیر نیم کش، صفحہ 48

(19) بھارت چند کھنہ ''محبوب'' مضمون مشمولہ ''تیر نیم کش'' صفحہ 65

(20) بھارت چند کھنہ ''تھی خبر گرم ان کے آنے کی'' مضمون مشمولہ ''تیر نیم کش'' صفحہ 80

(21) نامی انصاری ''بیسویں صدی میں طنز ومزاح'' ص 21 سنہ 2002ء

برق آشیانوی

سید موسیٰ کلیم ید اللّٰہی نام ہے شاعری میں کلیم تخلص استعمال کرتے ہیں اور مزاحیہ تخلیقات کیلئے برق آشیانوی قلمی نام اختیار کیا ہوا ہے۔ برق آشیانوی 18 اپریل 1918ء کو سکندر آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ویسلی ہائی اسکول سکندر آباد میں ہوئی لیکن بعد میں اسلامیہ ہائی اسکول مشیر آباد سے میٹرک کامیاب کیا۔ ذریعہ تعلیم حالانکہ انگریزی تھا لیکن انہوں نے عربی فارسی اور اردو کی تعلیم بھی حاصل کی۔ انیسہ سلطانہ نے اپنی کتاب ''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو نما'' میں برق آشیانوی کی تاریخ پیدائش اپریل 1908 لکھا ہے لیکن برق آشیانوی خود اپنی تاریخ پیدائش 18 اپریل 1918ء بتاتے ہیں۔

> ''سنا ہے کہ میں 1918ء میں پیدا ہوا۔ سنا ہے اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ بات میں اپنے والدین سے سنی ہے والدین کوئی بات غلط نہیں بتاتے البتہ اسکول میں شریک کرواتے ہیں تو غلط بتلاتے ہیں۔ اگر صحیح بتلاتے بھی ہیں تو ہیڈ ماسٹر صاحب غلط لکھوانے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ تین چار سال زیادہ ملازمت کرنے کا موقع حاصل رہے۔ بہر حال میرے تعلیمی صداقت نامہ میں میری تاریخ پیدائش 1918ء ہے''۔ (1)

میٹرک کامیاب کرنے کے بعد پیشہ تدریس سے وابستہ ہو کر انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ٹیچرس ٹریننگ حاصل کی۔ جب ٹیچر کی حیثیت سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں ناکام ہوئے تو دل برداشتہ ہو کر مدرسہ چھوڑ دیا اور محکمہ جیل میں ایگزیکیٹیو آفیسر ہو گئے اور 1968ء میں جیلر کے عہدے پر پہنچ کر خرابی صحت کی وجہ سے وظیفہ لے لیا۔ اپنی فارسی دانی کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''والد صاحب (سید امیر الدین صاحب) فارسی زبان کے مسلمہ استاد تھے لوگ ان سے فارسی پڑھنے آتے تھے۔ وہ زبان کے لب و لہجہ پر زیادہ

زور دیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ فارسی زبان کو فارسی میں بولنا چاہئے اردو میں نہیں۔ ان کی زبردستی میں وہ بھی فارسی پڑھ لی اور فارسی زبان نہایت صاف وشستہ اردو میں بولنے لگا''۔(2)

برق آشیانوی نے طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں شاعری، مضمون نگاری، افسانہ نویسی اور ڈرامہ نویسی سے بھی شغف رہا۔ 1935ء میں ان کی پہلی تخلیق رسالہ ''حسن کار'' میں شائع ہوئی ۔ یہ ایک ڈرامہ تھا جس کا عنوان ''نمبر 313'' تھا۔ اس میں طنز و مزاح کا ہلکا سا امتزاج نظر آتا ہے۔ انکی تخلیقات عالمگیر، ادب لطیف، ملاپ اور میزان جیسے معروف رسالوں میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ ان میں شرح غالب مزاحیہ کی سات قسطیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن مہدویہ حیدرآباد کے ترجمان ماہنامہ ''نورِحیات'' میں شامتِ غالب کی اندازاً 25 قسطیں شائع ہوئیں۔ ان کے اکثر مزاحیہ مضامین ''شگوفہ''، ''بیسویں صدی''، ''شبستان''، ''ہما''، ''کتاب'' وغیرہ میں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔

برق آشیانوی کے تین مزاحیہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''یہ ایک تبسم'' زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے شائع ہوا۔ مشہور مزاح نگار بھارت چند کھنہ نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔ وہ سماجی مسائل اور سیاسی حالت کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناتے ہیں انکے پاس موضوعات میں تنوع نظر آتا ہے۔ وہ الفاظ کی بنیاد پر مزاح پیدا کرتے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھئے:

''جس طرح دودھ کا جلا چھانچھ بھی پھونک کر پیتا ہے، ہم ناس سونگھ سونگھ کر لینے لگے یعنی بہت سوچ سمجھ کر لینے لگے''۔(3)

اس مضمون میں وہ نئے نئے الفاظ گڑھ کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے قادرالناس کثافت الناس، تلمیذالناس، استاذالناس اور آخر میں وہ عوام الناس کا لفظ استعمال کر کے اس کی وجہ بھی بتا دیتے ہیں۔

''رسم اجرا'' مضمون میں ادیبوں پر طنز ہے وہ باتوں باتوں میں ایسے ریمارک کر جاتے ہیں قاری بغیر مسکرائے نہیں رہ سکتا ہے۔

''ویسے ہمارے ہاں اب تک آٹھ اجرائیاں عمل میں آ چکی ہیں۔ اور ہر اجرائی کی رسم بھی ادا کی جا چکی ہے۔ لیکن پہلی اجرائی کی رسم جس شاندار پیمانہ پر دھوم دھام کے ساتھ منائی گئی ویسی آخری کی نہیں منائی گئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آخری اجرائی تو صرف اجرائی رہ گئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ رسم کی جگہ شرم نے لے لی تھی''۔(4)

اجراء کے لفظ کو وہ مختلف انداز اور معنوں میں استعمال کرتے ہیں کہ قاری بے اختیا ہنس پڑتا ہے۔

''وہ ہماری کتاب کے بارے میں اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار کرنے والی تھیں۔ اچانک خود ان کے ہاں ایک اجرائی عمل میں آ جانے کی وجہ سے تشریف نہ لاسکیں''۔(5)

برق آشیانوی حیدرآباد کے مزاح نگاروں میں منفرد حیثیت کے حامل ہیں ان کے ہاں مزاح میں مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ وہ واقعات سے مزاح پیدا نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے برجستہ اور خوبصورت استعمال سے وہ فن میں رنگ بھرتے چلے جاتے ہیں۔ کسی معمولی واقعہ کو الفاظ کی جادوگری سے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ ان کے اس وصف کے بارے میں ممتاز مزاح نگار بھارت چند کھنہ لکھتے ہیں:

''ان کے مضامین کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان ٹکسال ہے۔ عبارت سلیس، جگہ جگہ برجستہ محاورے فقروں میں نگینہ کی طرح جڑے ہیں۔ الفاظ کی بندشیں دلکش ہیں۔ مصنف کو اس ظالم زبان پر عبور کامل ہے۔''(6)

ان کی تحریروں میں قاری کو شگفتہ چٹکیاں محسوس ہوتی ہیں۔ قہقہہ بردوش نہیں بلکہ تبسم آمیز مزاح ان کا خاصہ ہے۔

برق آشیانوی کے پاس مزاح کے پردے میں طنز کی کاٹ بھی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی ذات کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور ہنستے ہیں لیکن غور کریں تو یہ ہنسی دراصل ہمارے معاشرے پر گہرا طنز ہوتا ہے ان کے اس اچانک وار

سے قاری چونک پڑتا ہے اور سماج کا کھوکھلا پن اس پر عیاں ہو جاتا ہے۔ اپنے مضمون ''ایک گھر کا جغرافیہ'' میں انہوں نے علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے پورے ملک کے معاشرتی نظام پر باتوں باتوں میں بڑا تیکھا وار کیا ہے جو کافی اثر انگیز ہے۔

> ''آبادی کے لحاظ سے یہ گھر گنجان واقع ہوا ہے اس لئے اس کو درجہ اول کا گھر کہنا چاہئے۔ جیسے کسی شہر کو آبادی کے اعتبار سے درجہ اول کا شہر کہا جاتا ہے''۔ (7)

یہ ایک گھر کا جغرافیہ نہیں بلکہ پورے ملک کا جغرافیہ کہلایا جا سکتا ہے۔

برق آشیانوی زبان و بیان پر بے پناہ قدرت رکھتے ہیں انہوں نے واقعات سے بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی تحریر کا حسن تب جھلکتا ہے جب وہ الفاظ کی مدد سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ معنی خیز اور فکر انگیز فقرے تحریر کرتے ہیں۔ ان کے مضمون ''قصہ پہلی چھتری کا'' جس میں انہوں نے ایک نفسیاتی مسئلہ اور اس کے حل کو بڑی فنکاری سے بیان کیا ہے۔ اس مضمون کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> ''ہمارے ذہن میں زندگی کے ایک مسئلے یعنی زبردست نفسیاتی مسئلے کا حل بھی آ گیا۔ وہ یہ کہ انسان اگر کسی شئے کو پسند کرنے لگتا یا کسی کو کسی پر فوقیت دیتا ہے تو اس کے تمام عیوب پر پردہ پڑ جاتا ہے یا تمام محاسن ابھر آتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہلے جو عیوب نظر آتے تھے وہی محاسن نظر آنے لگتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کوئی شئے اپنے اندر بجائے خود کوئی خوبی یا خرابی نہیں رکھتی بلکہ یہ صرف انسان کے سوچنے کے طریقہ پر موقوف ہے''۔(8)

''قصہ دوسری چھتری کا'' بھی اس سلسلے کی کڑی ہے جس میں برق آشیانوی کی شگفتہ بیانی اور شگفتہ مزاجی کا عکس نظر آتا ہے اس میں ان کا فن اور بھی نکھرا نظر آتا ہے۔ یہ مضمون ''شگوفہ'' کے اکتوبر۔نومبر 1971ء میں بھی شائع ہوا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''جب وزارت فینانس میں دوسری چھتری خریدنے کی درخواست پیش ہوئی تو یہ اعتراض کیا گیا کہ آپ کو چھتری سنبھال کر رکھنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ایک چھتری گنوا کر گیارہ روپۓ پچیس پیسے کا نقصان کر چکے ہیں' اب پھر ایک چھتری کی رقم دے کر مزید رقمی نقصان برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے اس اعتراض کا جواب دیا کہ اس میں شک نہیں کہ ہم نے چھتری گنوائی لیکن اس سے نقصان نہیں بلکہ نفع ہوا ہے وہ اس طرح کہ اگر ہم چھتری کے بجائے واٹر پروف گنواتے تو تیس روپۓ کا نقصان ہوتا۔ چھتری گنوا کر ہم نے اٹھارہ روپۓ پچھتر پیسے بچائے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دھندے میں اٹھارہ روپۓ پچھتر پیسے کا نفع ہوا ہے۔''(9)

برق آشیانوی الفاظ سے کھیلتے ہیں اور الفاظ کو ایک نگینہ کی طرح جڑتے چلے جاتے ہیں جس سے مفہوم میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔''اعضائے رئیسہ اور سر'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''میاں! یہ انگریز بھی بڑے ذی فہم اور عقل مند ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی دانشور ادیب یا شاعر کو جب کوئی خطاب دیتے ہیں تو ''سر'' کا خطاب دیتے ہیں۔ دل، جگر وغیرہ کا خطاب نہیں دیتے''۔(10)

برق آشیانوی ایک کہنہ مشق قلم کار ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین اور انشائیے طنز و مزاح کے روایتی لوازمات سے عبارت ہیں۔ بعض جگہ ناصحانہ ظرافت کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔ وہ زبان و بیان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ وہ ''ایشین گیمس اور ٹی وی'' میں موضوع کے علاوہ محاوروں کا ظریفانہ جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ سن کر بے چارے دوست سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کی بجائے زمین پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے' کیونکہ انتہائی کوشش کے باوجود اپنے پاؤں کو سر پر رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔''(11)

برق آشیانوی کے مضامین کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے ان کی مزاح نگاری میں انشاء پردازی کی

جھلک نظر آتی ہے کسی واقعہ کو بڑی فنکاری سے وسیع کرتے ہیں اپنے مضمون ''گواہ'' میں انھوں نے آٹھ قسم کے گواہوں کو پیش کیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

''زیر بحث گواہ اپنا نام شیر وا پنے باپ کا نام جانوں بتاتا ہے عدالت کا وقت خراب کرنے کا ریکارڈ توڑنے والا یہ گواہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی عقل سلیم Wordly Wisdom کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ ریڈی میڈ گواہ اپنے تعلق سے کہتا ہے ''میں نے دیکھا دنیا میں جتنے پیشے ہیں مثلاً تجارت، زراعت، وکالت، طبابت، وزارت، قیادت، حجامت وغیرہ وغیرہ ان میں بغیر دھوکے، فریب، جھوٹ افترا وغیرہ کے کچھ کام ہی نہیں میں نے ایسا کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا ہے''۔(12)

یہ گواہ بڑے ہی دلچسپ انداز میں اپنی جھوٹی گواہی کو خدمت خلق قرار دیتا ہے اور اسے ہی اپنا ذریعہ معاش بتا کر صحیح قرار دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ایک گواہ نکاح یا شادی کے موقع پر دیکھنے میں آتا ہے جو بدحواسی میں دلہا کی جگہ اپنا اور دلہے کے باپ کی جگہ دلہا کا نام لے لیتا ہے۔ برق آشیانوی ان ہی انسانی حماقتوں Human Follies اور بدحواسیوں پر اثر انگیز چوٹ کرتے ہیں۔ ایس جے صادق ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''برق آشیانوی مزاح نگاری کے کئی حربوں سے واقف ہیں اور ان کی چابک دستی شبہ سے بالاتر ہے ان کا مزاح خیال انگیز ہوتے ہوئے بھی ایک حد تک اثر آفرین ہے۔ ان کی ذہنی نشو نما اور شخصیت کی تعمیر میں متوسط درجے کی ذہنیت اور سفید پوش شرفا کے سوچنے کا انداز جیسے عوامل کارفرما ہیں۔ ان کا مزاح بڑے کنبے کی خوشیوں اور پست متوسط درجے کی آسودہ و مطمئن ذہنی بہاؤ کا نتیجہ ہے۔ یہ تلخ ترش کڑوے تجربہ کا نتیجہ نہیں۔ ان کا مزاح تلخ تجربے کی بھٹی میں نہیں تپا۔ یہ زندگی کے محدود تجربے کا اظہار ہے اور اسکے باعث سماج کی دکھتی رگ پر انکی انگلی نہیں جاتی۔ وہ زندگی کا مطالعہ

گہری نظر سے نہیں کرتے اور زندگی کو پھولوں کی سیج سمجھتے ہیں۔اس طرح
سے زندگی کی اندھیری حقیقتوں تک ان کی نظر نہیں پہنچتی جس کی وجہ سے اکثر
موضوعات سرسری ہوگئے ہیں''۔(13)

برق آشیانوی کے کئی مضامین دلچسپی سے خالی نہیں۔تشریح کلام غالب'' اورشرح غالب (مزاحیہ) ان کے مضامین شامت غالب کے حصے ہیں ۔ یہ مضامین ایک تا چوبیس ''نورحیات'' میں شائع ہو چکے ہیں۔خواجہ عبدالغفور برق آشیانوی کے فن پرتبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''شاعر بھی ہیں اور مزاح نگار۔عبارت سلیس اور برجستہ محاورے
الفاظ کی بندش دلکش ہوتی ہے۔''(14)

بحثیت مجموعی برق آشیانوی ایک کامیاب مزاح نگار ہیں ان کی کامیابی ان کی تحریروں میں کے انشاء پردازی کے رنگ میں مضمر ہے۔زبان و بیان میں مصنوعی پن نہیں ہے ہر جگہ آمد کا جلوہ نظر آتا ہے۔ان کی تحریروں میں ایک وقار اور مزاح آمیز سنجیدگی نظر آتی ہے جو قاری کی دلچسپی کو باندھے رکھتی ہے۔

--- ooo ---

حوالہ جات

(1) برق آشیانوی ''مختصر حالات'' مضمون مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ، ہندوستانی مزاح نمبر (نثر) جون 1985ء صفحہ 253

(2) برق آشیانوی ''خودستائی'' مضمون مشمولہ ''یہ ایک تبسم'' صفحہ 8

(3) برق آشیانوی ''ناس'' مضمون مشمولہ ''یہ ایک تبسم'' صفحہ 35

(4) برق آشیانوی ''رسم اجرا'' مضمون مشمولہ ''یہ ایک تبسم'' صفحہ 45

(5) برق آشیانوی ''رسم اجراء'' مضمون مشمولہ ''یہ ایک تبسم'' صفحہ 46

(6) بھارت چند کھنہ ''دیباچہ'' مضمون مشمولہ ''یہ ایک تبسم'' صفحہ 4

(7) برق آشیانوی ''ایک گھر کا جغرافیہ'' مضمون مشمولہ ''یہ ایک تبسم'' صفحہ 35

(8) برق آشیانوی ''قصہ پہلی چھتری کا'' مضمون مشمولہ ''یہ ایک تبسم'' صفحہ 122

(9) برق آشیانوی ''قصہ دوسری چھتری کا'' مطبوعہ ''شگوفہ'' اکٹوبر نومبر 1971ء ص 7

(10) برق آشیانوی ''اعضائے رئیسہ اور سر'' مضمون مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ' ہندوستان مزاح نمبر (نثر) صفحہ 255

(11) برق آشیانوی ''ایشین گیمس اور ٹی وی'' مطبوعہ ''شگوفہ'' جنوری 1983ء ص 101

(12) برق آشیانوی ''گواہ'' مطبوعہ: ماہنامہ ''شگوفہ'' ہندوستان مزاح نمبر (نثر) صفحہ 130

(13) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز مزاح آزادی کے بعد'' صفحہ 429

(14) خواجہ عبدالغفور ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' ص 238 سنہ 1983ء

خواجہ عبدالغفور

خواجہ عبدالغفور 1918ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ سٹی ہائی اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور جامعہ عثمانیہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر داس، ڈاکٹر جعفری، پروفیسر سعید الدین اور پروفیسر سید محمد جیسے اساتذہ سے اکتساب کیا۔ مخدومؔ، اکبر وفا قانیؔ، میکش وغیرہ آپ کے ہم عصر تھے جن کی صحبت علمی نے آپ کے ذوق کو مزید نکھارا۔ 1948ء میں حیدرآباد سیول سرویس کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں ایچ ایس سی سے وابستہ ہو گئے۔ اپنی ملازمت کے دوران انہوں نے پسماندہ طبقات کی بازآبادکاری بہبودی اطفال و نسواں کیلئے بڑی دلجمعی سے کام کیا۔ اس وقت کے وزیر مال گریکن خواجہ صاحب کے بڑے مداح تھے ان کی کوشش سے حیدرآباد میں سیول ویلفیر کا محکمہ قائم ہوا اور خواجہ عبدالغفور اس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔ خواجہ عبدالغفور کو پسماندہ طبقات کے مسائل کے حل میں بڑی دلچسپی رہی۔ اسی بناء پر انہوں نے Antrhopology پر دس کتابیں لکھ ڈالیں۔ اس کیلئے صحرائی اقوام سے متعلق ان کے تحریر کردہ مونوگرافس کی تعداد بھی خاصی ہے۔ خواجہ صاحب آدی واسی اور نیم تہذیب یافتہ اقوام کو نئی روشنی اور تہذیب سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان اقوام کی فلاح، معاشی و سماجی بہبودی کیلئے مختلف منصوبے تیار کئے۔ خواجہ صاحب کے کام کو بے حد سراہا گیا۔ اس طرح اقوام متحدہ (UNO) کی مختلف ایجنسیاں ان کے کارناموں میں دلچسپی لینے لگیں۔ چنانچہ خواجہ عبدالغفور کو یو این او کے صدر دفتر نیویارک طلب کیا گیا تاکہ وہ امریکہ میں موجود نیم وحشی قبائل ریڈ انڈین اقوام کی فلاح کیلئے اسکیمیں بنا سکیں۔ خواجہ صاحب ریاستوں کی تنظیم جدید کے بعد مہاراشٹرا چلے گئے۔ ڈاکٹر ایس جے صادق لکھتے ہیں۔

> ”1956ء میں ریاستوں کی تنظیم جدید عمل میں آئی اور خواجہ عبدالغفور مہاراشٹرا کو الاٹ کئے گئے یہیں پر وہ آئی اے ایس کیڈر میں آ گئے اور مختلف اہم عہدوں پر فائز رہنے کے بعد وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے“۔(1)

خواجہ عبدالغفور مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے سکریٹری اور ریاست مہاراشٹرا کے پندرہ روزہ پرچہ ''قومی راج'' کے مدیر اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ متعدد سرکاری اور نیم سرکاری ادبی و سماجی اداروں سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ انسانیت (Anthropology) اور عمرانیات جیسے موضوعات پر انگریزی زبان میں بھی ان کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ اردو میں ان کی کتابیں ''قہقہہ زار''، ''شگوفہ زار''، ''گل و گلزار''، 'لالہ زار''، اور ''سمن زار'' شائع ہو چکی ہیں۔ قہقہہ زار کا ہندی اور مراٹھی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ قہقہہ زار کا تعارف کرشن چندر نے لکھا ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ مصنف نے فن لطیفہ گوئی کو ایک مستقل حیثیت دی ہے وہ تحریر کرتے ہیں۔

> ''عبدالغفور صاحب نے یہ کتاب بے حد دلچسپ، دل نشین اور دل کش پیرائے میں لکھی ہے۔ سینکڑوں عمدہ لطیفے مختلف عنوان کے تحت جمع کئے ہیں اور یوں گویا لطیفوں کے جنگل میں گھس کر چمن بندی اور صف آرائی کی کوشش کی ہے جو بہر صورت کامیاب ہے''۔(2)

اس مجموعہ میں ''انتساب''، ''التجا'' اور ''مکرر'' کے عنوان سے جو مضامین شائع کئے گئے ہیں ان میں بلا کی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے لطیفے جمع کئے گئے ہیں۔ جن میں زمانہ طالب علمی کے واقعات بزرگوں کے چٹکلے بچوں کا مزاح اور کچھ اپنے تجربات و مشاہدے ہیں جن کی مدد سے کتاب کو قہقہہ زار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں موجود بیشتر لطیفے ایسے ہیں جو کتاب کے معرض وجود میں آنے سے پہلے کافی مشہور تھے۔ چنانچہ ان لطیفوں کی ایجاد کا سہرا خواجہ صاحب کے سر باندھا نہیں جا سکتا۔ لیکن انہوں نے ان لطیفوں کو ایک منفرد اور انوکھے ڈھنگ سے پیش ضرور کیا ہے۔ یہ لطیفے شگفتہ ہیں اور ان میں بے ساختہ پن بھی ہے جو قاری کو بذلہ سنجی کے ایک الگ موڈ میں بہالے جاتا ہے لیکن اس کے باوجود مزاح میں جو بے ساختگی ہونی چاہئے وہ خواجہ صاحب کی تحریروں میں مفقود ہے۔ لطیفہ گوئی کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے انیسہ سلطانہ رقمطراز ہیں۔

> ''لطیفہ گوئی کا فن بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے، اتنا ہی مشکل ہے کیونکہ اس میں لطافت، نزاکت، خیال، حسن نگارش اور تفریح طبع کا خیال رکھنا پڑتا ہے لطیفوں کا ردعمل سیدھی سادھی ہنسی ہونی چاہئے یا پھر ایسی ہنسی جیسے نقرئی

گھنٹیاں دھیمے دھیمے بج رہی ہوں لطیفے کا اثر وہ نہیں ہونا چاہئے جو پٹاخے کے پھٹنے سے ہوتا ہے بلکہ ایسا ہونا چاہئے جیسے دیوالی کی رات میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں لطیفہ نسیم سحری کا ایسا جھونکا ہے جس کے چلنے سے کلیاں چٹک جاتی ہیں اور غنچے کھل اٹھتے ہیں''۔(3)

مذکورہ کتاب کے چند ایک کو چھوڑ کر ما باقی تمام لطائف ان تمام خصوصیات سے مبرا ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔قہقہہ زار کے بہت سارے لطیفوں کی تشریح اوران کے ادبی جواز کو شگوفہ زار میں پیش کیا گیا ہے جو ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ یہ کتاب طنز و مزاح کے تخلیقی سفر میں ایک اہم سنگ میل اور مجموعی طور پر اردو ادب کے ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ اور موضوع سے مصنف کی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔اردو ادب میں اپنی طرز کی یہ منفرد کتاب متنی محققین کیلئے ایک گائیڈ بک یا رہنما کا کام کرتی ہے۔اس کتاب میں مزاح سے تعلق رکھنے والی کئی اصطلاحات پر گہری نگاہ ڈالی گئی ہے اور ہر اصطلاح کی تشریح کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے ساتھ موزوں مثال کو بھی پیش کیا جاے۔ بیشمار انگریزی اصطلاحات کا بھی اردو ترجمہ ہمیں اس کتاب میں ملتا ہے۔اس طرح اردو میں مزاحیہ صحافت کے تحت مزاحیہ اخبار کے نام اور بعض اخباروں کے مزاحیہ کالموں کے عنوان کالم نگار کے نام کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ساتھ ہی خواجہ صاحب نے کتاب کی تہذیب وتدوین کے دوران تعدیم وتاخیر کوملحوظ رکھے بغیر شعراء اورادباً کا تذکرہ کیا ہے جو زیادہ تشفی بخش نہیں ہے۔سودا کو دور جدید کے شعراء میں لاکھڑا کر دیا ہے۔اصطلاحات کی تشریح بڑی حد تک مکمل کہی جاسکتی ہے۔ زیرک اور باریک بین محققین کیلئے کتاب کا یہ حصہ شائد غیر تسلی بخش ہو۔ بہر حال شگوفہ زار، قہقہ زار کے مقابل میں بے حدٹھس ہے۔اس کتاب میں بیشتر لطیفے، قہقہہ زار ہی سے لئے گئے ہیں۔ دونوں کتابوں کا موازانہ کیا جائے تو یہ بات نہایت آسانی سے کہا جاسکتی ہے کہ قہقہ زار ایک عام قاری کیلئے دلچسپ ہے تو شگوفہ زار تحقیقی ذوق رکھنے والوں کیلئے بیحد کارآمد کتاب ہے۔کتاب کے مشمولات کا جہاں تک تعلق ہے بعض لطائف میں جنسی مسائل کا بھی ذکر آیا ہے جو بسا اوقات ذہن کو مکدر کر دیتی ہیں۔جنس گو کہ شجر ممنوعہ نہیں ہے مگر اس موضوع پر اگر کسی کو قلم اٹھانا ہے تو پھر بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔قاری کا ذہن کسی مشمولہ کارٹون پر نظر پڑتے ہی فوراً جنسی فعل کی طرف جاتا ہے، جبکہ جنسی مزاح کو ایمائی ہونا چاہئے ورنہ سماج میں بھونڈے مزاحیہ ذوق کے رواج پا جانے کا خطرہ ہوگا۔مصنف نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ ان تمام ذرائع کا پتہ لگایا جاسکے جو ہماری دلچسپی

اور شگفتگی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

خواجہ عبدالغفور اخباروں میں شائع ہونے والے لطائف سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ان کے وہ مضامین جن میں لطیفوں پر انحصار نہیں کیا گیا ہے بہت اچھے ہیں اور ان گنے چنے انشائیوں کے باعث ہی وہ مزاح نگاری میں اپنا مقام بنا پائے ہیں۔ان کے مضامین میں لطیفوں کا شعوری استعمال اس لئے بھی عامیانہ لگتا ہے کہ وہ اپنے انداز نگارش میں لطیفوں کو Assimilate نہ کر سکے۔خواجہ عبدالغفور کے مضامین اور انداز نگارش پر ڈاکٹر ایس جے صادق لکھتے ہیں۔

> ''خواجہ عبدالغفور مضامین کو دہراتے ہیں۔موضوعات کو دہراتے ہیں نثر کو دہراتے ہیں لطیفوں کو دہراتے ہیں مطالعہ کا عادی قاری اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔انگریزی اور اردو اخبارات اور رسالوں کا مطالعہ کرنے والا بالکل آسانی سے محسوس کر لیتا ہے کہ وہ ان لطیفوں کو اس سے پیشتر پڑھ چکا ہے۔ یہ لطیفے اس کیلئے نئے نہیں پرانے ہیں سنے ہوئے اور پڑھے ہوئے لطیفے جب دوسری بار نظر سے گذرتے ہیں تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ لطیفوں کو مرتب کرنے کے علاوہ انہوں نے انشائیہ نگاری بھی کی ہے چونکہ ان کی شخصیت میں مزاح کی چنگاری موجد ہے اس لئے وہ اس میدان میں بھی کامیابی سے ہم کنار ہیں۔خواجہ عبدالغفور کے موضوعات نئے نہیں ہیں اور مزاح کے پردے میں ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہیں ساتھ ہی معلومات بھی فراہم کرتے ہیں وہ انشائیے اور سماجی موضوعات پر لکھتے ہوئے شگفتگی اور لطیف مزاح کے دامن کو تھامے رہتے ہیں۔مقصدیت اور افادیت کو وہ مزاح سے الگ کر دیتے تو بہتر تھا''۔(4)

خواجہ عبدالغفور کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں۔

''اس دور کے طنز و مزاح میں خواجہ عبدالغفور کا یہ کارنامہ بھی یاد رہے گا

کہ انہوں نے لطیفہ گوئی کو فن کا درجہ دے دیا۔ خالص مزاح میں انہیں شفیق الرحمٰن کا جانشین کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ظرافت کی جملہ صورتوں کا مطالعہ وقت نظر سے کیا ہے۔ لیکن طبعی مناسبت کی بناء پر ان کا خاص میدان لطیفہ نگاری ہی ٹھہرا۔ غفور صاحب کا حافظہ ساری دنیا کے رنگا رنگ لطائف کا نگار خانہ ہے۔ جنہیں وہ اپنے مزاح میں ہنر مندی سے جڑ دیتے ہیں۔''(5)

وہ اپنے انشائیوں اور مضامین میں لطیفوں کو شعوری طور پر استعمال کرتے ہیں، تاکہ تحریر میں دلچسپی پیدا ہو۔ خواجہ عبدالغفور کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے پریم گوپال متل رقمطراز ہیں۔

''خواجہ صاحب کے فن مزاح نگاری اور لطیفہ گوئی کی وکالت کے قطع نظر ان انشایئے مضامین میں سے بیشتر ایسے ہیں جن میں ان کی قوت تخلیق اور تحریر کی برجستگی اور بے ساختگی کا اظہار ہوا ہے۔ ان کے وہ مضامین جن میں لطیفوں کو موتی کی طرح پرویا گیا ہے بہت اچھے ہیں اور گنے چنے انشائیوں کے باعث ہی وہ مزاح نگاری میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کر گئے ہیں۔ ان کے مضامین میں لطیفوں کا شعوری استعمال بڑی چابکدستی اور روانی سے ہوا ہے۔(6)

خود خواجہ عبدالغفور نے اپنی کتاب قہقہہ زار میں لطیفوں کے بارے میں کچھ یوں اظہار خیال کیا ہے:

''پست درجے کے لطیفے کو عریانی کا سہارا دینا یا لطیفے کو پھسپھسے پن کو چھپانے کے لئے گالی، فحش کلامی، یا گندگی کا آسرا لینا یا برہنگی کے جذبے کی نمائش لطیفے کے مزاج کو نہیں بدلتے، یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے پھیکے اور بدمزہ کھانے کو چٹنی اور اچار کی مدد سے چٹخارہ دار بنا دیا جائے۔''(7)

دوسری طرف انہوں نے اسی کتاب میں شامل مضامین جیسے ''جنسی تعلیم'' اور ''عریاں مگر'' میں اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں اور معیاروں سے انحراف کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ متذکرہ بالا لطیفے یہ بتاتے ہوئے لکھے گئے ہیں کہ عریاں قسم کے لطیفوں پر مہین پردہ ڈال کر الفاظ کی گندگی سے بچا کر بھی اچھے قسم کا مزاح پیدا کیا جاسکتا ہے۔

مگر اچھے قسم کے مزاح کا معیار وہی ہو جوان لطیفوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر ان دونوں باتوں میں کسی قدر مماثلت ہے تو پھر خواجہ صاحب کے پاس گرے ہوئے اور پست قسم کے معیار کا تصور کیا ہے؟ اس بات کی انہوں نے کبھی صراحت نہیں کی ہے۔ شگوفہ زار میں ادبی شان تلاشنا بڑی ہی دشوار کن مرحلہ ہے۔ خالص مزاح کو تیسرے درجے کا ادب قرار کیوں دیا جاتا ہے۔ اس بات کا کبھی کبھی اندازہ اس کتاب کے مطالعہ سے بھی ہوتا ہے۔ اس تعلق سے انیسہ سلطانہ نے بڑی عرق ریزی سے خواجہ صاحب کی کتاب شگوفہ زار میں ادبی شان تلاش کی ہے۔

> ''ایک اور خصوصیت جو ''شگوفہ زار'' کو ادبی شان عطا کرتی ہے وہ اردو
> الفاظ کے انگریزی مترادفات کا استعمال ہے جس میں بعض قابل ذکر جیسے
> ظرافت کیلئے Pleasentry ، رمز کیلئے Irony اور ضلع جگت کیلئے
> Tit-for-Tat''۔(8)

خواجہ صاحب کے مضامین کا جائزہ بعض اہم نکات کو اجاگر کرتا ہے کہ مزاح نگار کیلئے تجربات کا تنوع ضروری ہے۔ جبکہ خود خواجہ صاحب کے تجربات بے حد محدود معلوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر درج ہے کہ ان کے مضامین کے موضوعات بھی گنے چنے ہیں۔ دفتر، دفتریت، افسری اور افسرانہ رعب وجلال ان کے ذہن کے نہاں خانوں پر مسلط معلوم ہوتا ہے جسے انہوں نے متعدد مرتبہ دہرایا ہے۔ انہیں الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کا فن بخوبی آتا ہے مگر انہوں نے اپنے اس ہنر کو بہت کم استعمال کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں وہ دھار نہیں ہے جو ایک عمدہ مزاح نگار کے ہاں لازمی ٹھہرتی ہے۔ ان کے مزاح میں بے ساختگی مفقود نظر آتی ہے۔

خواجہ عبدالغفور تخلیقی کام کرنے کے علاوہ عملی کام بھی کرتے ہیں جیسے مزاح نگاروں کی کانفرنس منعقد کروانا وغیرہ اس طرح انہوں نے اپنی کوششوں سے مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا اس ضمن میں ان کے کارنامے یادگار ہیں۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد'' 1994ء ص460

(2) کرشن چندر ''تعارف'' مضمون مشمولہ: ''قہقہہ زار'' ص4

(3) انیسہ سلطانہ ''حیدرآباد میں اردو طنز و مزاح کی نشو و نما'' ص118 مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد 1986ء

(4) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد'' ص462

(5) پروفیسر قمر رئیس ''عصر حاضر میں اردو طنز و مزاح'' مضمون مشمولہ ''تنقیدی تناظر'' ص191 مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1978ء

(6) پریم گوپال متل حرفِ چند مضمون مشمولہ ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' ص13 سنہ 1983ء

(7) خواجہ عبدالغفور ''قہقہہ زار'' ص23

(8) انیسہ سلطانہ ''حیدرآباد میں اردو طنز و مزاح کی نشو و نما'' ص21

یوسف ناظم

یوسف ناظم کا پورا نام سید محمد یوسف ہے۔اور ناظم تخلص۔ ادبی دنیا میں یوسف ناظم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ والد کا نام محمد ایوب تھا جو جالنہ کے ایک معروف وکیل تھے۔ یوسف ناظم 7 نومبر 1921 (سرکاری ریکارڈ میں 1918 درج ہے) کو جالنہ دکن (موجودہ مہاراشٹر یا مرہٹواڑہ) میں پیدا ہوئے۔ اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق وہ اپنی کتاب ''سائے ہم سائے'' کے کور پر کہتے ہیں۔

> ''میری تاریخ پیدائش نومبر 1921 بتائی جاتی ہے۔لیکن اپنی درج
> شدہ سنہ پیدائش کے حساب سے نومبر 1918 میں نمودار ہوا۔''(1)

یوسف ناظم نے جالنہ ہائی اسکول سے میٹرک کامیاب کیا۔اور 1940 میں اورنگ آباد کالج سے انٹر میڈیٹ کی تکمیل کے بعد 1942 ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے بی اے اور 1944 میں جامعہ عثمانیہ سے ہی اردو میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ جہاں حمیدالدین شاہد اور محمد علی نیّر ان کے جماعت ساتھی تھے۔عثمانیہ یونیورسٹی کا یہ وہ زمانہ تھا جب مخدوم محی الدین، اشفاق حسین، میر حسن، سکندر علی وجد، اور ظفرالحسن جیسی شخصیات ایک ساتھ ایک کہکشاں کی صورت میں موجود تھے۔1944 میں ہی ریاست حیدرآباد کے محکمہ لیبر میں مترجم کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ریاستوں کی تقسیم جدید کے بعد ریاست مہاراشٹر میں لیبر آفیسر کی حیثیت سے منتقل ہوئے۔ ڈپٹی لیبر کمشنر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں، اور دسمبر 1976ء میں بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر آف لیبر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔اردو طنز و مزاح کا یہ شہہ سوار 23 جولائی 2009ء کو طویل علالت کے بعد ممبئی میں انتقال کر گیا۔

یوسف ناظم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اسکول میں ہی شاعری سے کیا۔اس زمانے میں دو چار غزلیں کہیں لیکن اس کے بعد صرف نظمیں کہنا شروع کیا۔1945ء تک صرف شاعر کی حیثیت سے ہی مشہور رہے اور بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی۔1944ء سے نثر لکھنی شروع کی اور طنز و مزاح نگاری کو اپنا میدان بنایا۔ان کی ابتدائی نگارشات روزنامہ ''پیام'' اور ''میزان'' میں شائع ہوئیں۔اس کے بعد ماہنامہ ''شاعر'' اور ''شگوفہ'' میں ان

کے مضامین مستقل شائع ہونے لگے۔

یوسف ناظم کو حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ سے بے حد لگاؤ تھا۔ان کے متعدد مضامین اور خطوط اس کا بین ثبوت ہیں۔راج بہادر گوڑ ان کی شخصیت کے ایسے ہی پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> ''ہنسانا اور ہنسنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔بہت کم لوگ اس کے اہل ہوتے ہیں۔حیدرآباد کے کچھ لوگ اس کام کے ماہر ہیں۔یوسف ناظم عثمانیہ کی پیداوار ہیں اور عثمانیہ کے طلبا میں جینے کا یہ سلیقہ موجود تھا۔یوسف ناظم ہنسنے اور ہنسانے سے کما نہیں سکتے تھے' وہ آمدنی کے لئے سرکاری نوکری کرنے پر مجبور تھے اور وہ بھی مزدوروں کے مسائل پر توجہ دینا۔اتنا سنجیدہ اور غیر مزاحیہ کام کرتے ہوئے وہ مزاح کی رگ پکڑ لیتے تھے۔''(2)

یوسف ناظم کے خطوط اور دیگر تحریروں سے ان کی شخصیت کا ایک نہایت ہی دلچسپ اور شاندار پہلو سامنے آتا ہے۔وہ خطوط میں بھی ادبی موضوعات پر شگفتہ انداز میں اظہار خیال کرتے۔وہ حیدرآباد سے والہانہ محبت کرتے تھے اور یہاں کے ادبی ماحول سے خوش اور مطمئن بھی نظر آتے تھے۔ڈاکٹر لئیق صلاح کو لکھے ایک خط میں وہ اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

> ''سیاست کے دو شمارے پابندی سے وصول ہوجاتے ہیں اور حیدرآباد کے احوال پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہیکہ میں حیدرآباد یعنی بلدہ حیدرآباد میں ہوں۔......حیدرآباد میں اب بھی ادبی فضا قائم ہے۔ممبئی کی فضا میں گرہ پڑ گئی ہے۔(یہ گرہ اس گرہ سے مختلف ہے جو کسی اچھے شاعر کے شعر پر لگائی جاتی ہے۔اور اچھا خاصا شعر (یعنی استاد شاعر کا شعر) مدھم پڑ جاتا ہے آپ اگر بور ہوتی ہیں تو میں سمجھوں گا میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔''(3)

یوسف ناظم پیکر خلوص تھے ادیبوں شاعروں خصوصاً نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔بات دوٹوک کہتے۔کسی ادیب کی کوئی تخلیق معیاری نہ ہو تو دبی زبان سے ایسا اشارہ کردیتے کہ سچائی سامنے

آجائے اور کسی کی دل شکنی بھی نہ ہو۔ خط لکھنے' خط کا جواب دینے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ دوسروں کے جواب کے منتظر رہا کرتے۔ ڈاکٹر حبیب ضیا نے اپنی کتاب حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین' انہیں بھیجی۔ کتاب ملنے کے فوراً بعد جو خط لکھا اس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں

> ''آپ کی تازہ اور وقیع تصنیف' حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین' تین چار دن پہلے ملی' بے حد شکریہ۔ لیکن اس کے سات ہی جو عنایت نامہ وصول ہوا اس پر تاریخ یکم نومبر لکھی ہے (عنایت نامے سے مراد وہ تحریر ہے جو آپ نے کتاب کے صفحہ اول پر میرے نام لکھی ہے) میں ان دنوں علیل چل رہا ہوں (چل رہا ہوں سے مراد بستر پر ہوں) لیکن آپ کی فرمائش انشاء اللہ سال نو کے ابتدائی دنوں میں پوری کردوں گا۔ عائشہ آپ کو سلام لکھواتی ہیں۔ آپ سے مل کر انہیں جو خوشی ہوتی ہے اس کا اندازہ آپ کو ہے یا نہیں پتہ نہیں' مجھے بھی کب تھا۔ لیکن ہیں وہ بہت خوش۔ خدا کرے آپ بھی خوش ہوں۔''(4)

یوسف ناظم کی اب تک بائیس 22 تصانیف شائع ہوچکی ہیں۔ منظوم تراجم' تالیفات اور بچوں کے لئے پانچ کتابیں اس کے علاوہ ہیں۔ زمانہء طالب علمی ہی سے وہ شاعری کرنے لگے تھے۔ مزاح نگاری کی ابتداء 1944 سے کی۔ لیکن شہرت انھیں 1950 کے آس پاس ملی۔ انہوں نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ''کیف و کم'' 1962 میں ادارہ ادبیات اردو کے تحت شائع کیا۔ یوسف ناظم کی اب تک 22 تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

سلسلہ نمبر	کتاب	سنہ اشاعت	ناشر
-1	کیف و کم	1962	ادارہ ادبیات اردو' حیدرآباد
-2	فٹ نوٹ	1964	نصرت پبلشر' لکھنؤ
-3	دیوارے	1971	نقش کوکن پبلی کیشنز' ممبئی

-4	زیرِ غور	1971	بنت حوا پبلی کیشنز، ممبئی
	(1972 میں مضامین کا ایک اور انتخاب کراچی سے بھی شائع ہوا)		
-5	سائے ہم سائے (خاکے)	1975	شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد
-6	فقط	1977	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی
-7	البتہ	1981	شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد
-8	ذکرِ خیر (خاکے)	1982	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی
-9	بالکلیات	1984	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی
-10	فی الحال	1986	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی
-11	فی الفور	1989	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی
-12	فی الحقیقت	1990	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی
-13	فی زمانہ	1991	کارگ پبلی کیشنز (نیروبی) دہلی
-14	فی البدیہہ	1994	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی
-15	امریکہ میری عینک سے	1996	شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد
-16	منجملہ	1996	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی
-17	ورنہ	1998	دارالمعارف، ممبئی
-18	علیک سلیک (خاکے)	2002	بے باک پبلی کیشنز، ممبئی
-19	لہٰذا (انشائیے)	2003	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی
-20	ایک کتاب اور	2006	تخلیق کار پبلی کیشنز، دہلی
-21	جاتے جاتے	2006	تخلیق کار پبلی کیشنز، دہلی
-22	ایک اور چکمہ	2008	تخلیق کار پبلی کیشنز، دہلی

بچوں کے لئے:

-1	پلک نہ مارو	1972	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی

-2	مرغی کی چار ٹانگیں	1982	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ' دہلی
-3	گاندھی جی جنوبی افریقہ میں	1983	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ' دہلی
-4	بکرے کی تعریف میں	1992	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ' دہلی
-5	الف سے یے تک	1992	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ' دہلی

منظوم ترجمے:

-1	ارمغان سنسکرت (بھرتری ہری کی نظمیں)	1985	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ' دہلی
-2	نوائے کبیر (کبیر کے دوہے اور گیت)	1997	ممبئی

تالیفات:

-1	رسالہ ''تکمیل'' شاذ تمکنت نمبر	1977
-2	رسالہ ''کتاب نما'' وجد نمبر	1984
-3	رسالہ ''شگوفہ'' ہندوستانی مزاح نمبر	1985
-4	رسالہ ''امکان'' عزیز قیسی نمبر	1992
-5	رسالہ ''تکمیل'' عزیز قیسی نمبر	1993

ان کے مضامین ماہنامہ' آج کل' دہلی' ماہنامہ کتاب نما' دہلی اور ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہتے تھے۔ کنھیا لال کپور کے بعد طنز و مزاح میں یوسف ناظم ہی سب سے زیادہ زودنویس نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریریں انفرادیت لئے ہوئے ہوتی ہیں اور یہی انفرادیت انھیں مزاح نگاری میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

ایک سچا مزاح نگار صرف تفریح طبع کے لئے نہیں لکھتا بلکہ اس کا ہر لفظ قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یوسف ناظم نے اپنے مزاح کی بنیاد انسانی رویوں پر رکھی ہے ان ہی رویوں میں وہ کوئی مضحک پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں تو مزاح معرض وجود میں آتا ہے۔ یوسف ناظم ایک زندہ دل خوش طبع اور شگفتہ مزاج فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کے تخلیقی استعمال پر بھی کامل قدرت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انکی طنزیہ تحریریں فنی اعتبار سے اعلیٰ معیار کی حامل ہوتی

ہیں۔ڈاکٹر عقیل ہاشمی لکھتے ہیں۔

''یوسف ناظم نہایت زود نویس بلکہ نیاز فتح پوری کے بعد شاید ان ہی کا نمبر ہو تب ہی تو 1962 سے تا حال کوئی بیس اکیس کتابیں لکھیں جن کا محور محض طنز و مزاح ہی ہے جب کہ ہر کتاب کا عنوان اور متن اپنی ندرت و جدت طرازی میں منفرد ہے۔جیسے کیف و کم' فٹ نوٹ' دیوار یئے' زیر غور' سائے ہم سائے (خاکے) فقط' البتہ' ذکر خیر' بالکلیات' فی الحال' فی الفور' فی الحقیقت' فی زمانہ' فی البدیہہ' منجملہ' ورنہ' جاتے جاتے' ایک کتاب اور' گویا بیس مضامین کے مجموعے ایک عدد سفر نامہ' بچوں کے لئے کوئی پانچ کتابیں' منظور تراجم' تالیفات' وغیرہ موصوف کے اس لکھاڑ خاصیت کے مدنظر بہت سے لوگوں نے ان کے اسلوب یا طرز نگارش میں معروف اہل قلم حضرات کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔''(5)

اردو طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا نام ایک معتبر اور مستند نام ہے جس نے جدید نسل کو گذشتہ نصف صدی سے زائد عرصے سے کبھی زیر لب مسکراہٹوں تو کبھی قہقہوں سے زندگی گذارنے کا حوصلہ عطا کیا۔جہاں دکھ اور درد اور مصائب و آلام کی حقیقتیں ہمارے ادیب بیان کرتے ہیں وہیں ہمارے مزاح نگار اپنی نوک قلم اور ذہنی پھلجھڑیوں سے ہنساتے بھی ہیں اور زندگی کے مصائب کو اپنی تحریروں سے چند لمحوں کے لئے ہلکا بھی کر دیتے ہیں اور اس طرح انسانی زندگی اور جذبات میں توازن پیدا کرتے ہیں۔یوسف ناظم کی بسیار نویسی اور معیار پر تبصرہ کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں۔

''یوسف ناظم نے لگ بھگ ستر برس پہلے جس رفتار سے لکھنا شروع کیا تھا اسی رفتا' گفتار اور وقار کے ساتھ آخر وقت تک لکھتے رہے۔ان میں لکھنے کا بڑا زبردست Stamina اور ملکہ تھا پھر ان کی تحریریں بھی ہمہ جہت اور مختلف النوع ہوتی تھیں۔انشائیہ لکھ رہے ہیں' خاکے لکھ رہے ہیں' سفر نامے

لکھ رہے ہیں، تنقید لکھ رہے ہیں، تبصرے لکھ رہے ہیں، ضرورت شعری کے تحت نظمیں بھی لکھ رہے ہیں۔ اخباری کالم لکھ رہے ہیں، دوستوں کو خط لکھ رہے ہیں اور نہ جانے کیا کیا لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کے دامن کو اپنی بے مثال باغ و بہار تحریروں کے ذریعہ مالا مال کیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں کسی دوسرے مزاح نگار نے اتنے لمبے عرصہ تک ایسی آن بان اور اپنی ایک الگ پہچان کے ساتھ مزاح نگاری نہیں کی ہوگی۔'' (6)

اعلیٰ طنزومزاح زندگی گذارنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ مزاح نگار جہاں اپنے فن سے مایوس لوگوں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتا ہے وہیں اپنی تحریروں سے سماج میں پھیلی لعنتوں کے ناسوروں پر طنز کے نشتر بھی چلاتا ہے۔ اس پس منظر میں اگر یوسف ناظم کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ایک بہت ہی کامیاب طنزومزاح نگار نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالستار دلوی لکھتے ہیں۔

''یوسف ناظم جدید اردو ادب میں بحیثیت مزاح نگار بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ انہوں نے اردو میں طنزومزاح کی روایت کو پروان چڑھانے میں اپنی زندگی کے ساٹھ سال گزار دیئے اور لوگوں کے دکھ درد پر مرہم کا کام کرتے رہے۔'' (7)

ان کی ابتدائی چار تصانیف طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر مشتمل تھیں۔ ان کی پانچویں کتاب ''سائے ہم سائے'' میں تقریباً خاکے ہیں جن میں شاعروں، ادیبوں، اور ریسرچ اسکالروں کے مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں باقر مہدی، راجندر سنگھ بیدی، عزیز قیسی، خواجہ عبدالغفور، پروفیسر عبدالستار دلوی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مجتبیٰ حسین، سرور ڈنڈا، شاہد صدیقی، سلیمان اریب، امجد حیدرآبادی اور جاں نثار اختر قابل ذکر ہیں۔

یوسف ناظم کے لکھے خاکے پڑھنے سے ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے اپنا دل نکال کر اپنی تحریر کے الفاظ میں رکھ دیا ہو۔ سلیمان اریب کے انتقال پر لکھے اپنے ایک خاکے میں سلیمان اریب اور مجردگاہ کے کمرہ نمبر 17 (ماہنامہ 'صبا' کا دفتر) کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''حیدرآباد کی معظم جاہی مارکٹ' معظم جاہی مارکٹ کی مجرد گاہ اور مجرد گاہ کے کمرہ نمبر (۱۷) کی شہرت اور غالبؔ کی بدنامی میں قدرے فاصلہ ہے۔ مجرد گاہ کا کمرہ نمبر (۱۷) اور سلیمان اریب دو برابر کے مصرعے تھے...... کمرہ نمبر ۱۷ میں کسی نے کچھ کھویا نہیں' کچھ نہ کچھ پایا ہوگا۔ اس کے در و دیوار پر قہقہوں' گالیوں' تازہ نظموں' افسانوں' جھوٹی سچی خبروں اور لن ترانیوں کا رنگ و روغن چڑھا ہوا ہے۔ سلیمان اریب بے ساختہ بلکہ بے تحاشہ قہقہے لگانے کے ماہرین میں سے تھے ان کا قہقہہ' سب کے قہقہوں سے بلند ہوتا۔ (اس میں ان کے قد کا قصور تھا)''(8)

ان کے لکھے خاکوں میں باقر مہدی کا خاکہ بڑا ہی پُر لطف ہے۔ وہ جس شخص کو جس طرح محسوس کرتے تھے بالکل اسی طرح پیش کر دیتے تھے۔ دلچسپ فقروں اور جملوں کے مزین باقر مہدی کا یہ خاکہ ان کے مجموعہ کلام ''ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں'' کی اشاعت پر بمبئی میں 10 ڈسمبر 1972ء کو ادیبوں اور شاعروں کی ادبی نشست میں پڑھا گیا۔

باقر مہدی صاحب مجھ پر بہت مہربان رہے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ باعلم آدمی ہیں اور میں لاعلم! ایذرا پاؤنڈ کا ذکر کرتے ہیں تو پوچھتا ہوں کہ یہ کس ملک کا سکّہ ہے' وہ اس کی شاعری کا ذکر کرتے ہیں تو مجھے پوچھنا پڑتا ہے کہ عذرا کہاں کی رہنے والی تھیں...... اس لئے مجھ جیسے لاعلم شخص سے اختلاف رائے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس کے لئے دس بیس سیڑھیاں نیچے اترنی پڑتی ہیں اور یہ کام باقر مہدی نہیں کر سکتے۔ باقر مہدی علم کی اس بلندی پر ہیں جہاں خود علم کو پہنچنے میں ابھی دیر ہے۔''(9)

نامی انصاری یوسف ناظم کی خاکہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ان کا مزاح بڑا شائستہ اور لطف انگیز ہوتا ہے۔ لیکن شخصیت پر لکھے گئے

خاکوں میں وہ ذرا بھی رو رعایت نہیں برتتے۔اور جس کو جس طرح محسوس کرتے ہیں اُسی طرح صفحۂ قرطاس پر پیش کر دیتے ہیں۔ان کے مزاح میں شگفتگی کے ساتھ ساتھ متانت بھی موجود ہوتی ہے۔وہ طنز کے نشتر بھی آزماتے ہیں مگر اس کی دھار کُند کر کے پیش کرتے ہیں تا کہ قاری اس کو ہنس کر سہہ لے۔''(10)

یوسف ناظم کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں۔

''یوسف ناظم کو انشائیہ نگاری پر غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔ان کے سارے مضامین عمدہ اور متاثر کن ہیں۔اردو ادب کا رچا ہوا مذاق' روایات کا گہرا شعور نئی قدروں سے ذہنی ہم آہنگی' عصری زندگی کا مطالعہ' بے نیاز بے تکلف اظہار لیکن سنبھلا سنبھلا اور ٹھہرا ٹھہرا انداز تحریر یوسف ناظم کے انشائیوں میں نکھار اور وقار کا باعث ہے۔یوسف ناظم غور و فکر سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں بایں وجہ ان کا فن تفصیل کا نہیں اجمال اور اختصار کا فن ہے۔''(11)

یوسف ناظم فن میں قول محال سے زیادہ کام لیتے ہیں اس طرح وہ اشاروں اشاروں میں یا ایک آدھ جملے میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔کرشن چندر ان کے فن پر تبصرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''یوسف ناظم شستہ ظرافت کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔کہیں کہیں وہ ہنسی کی پھلجھڑیاں ضرور چھوڑتے ہیں مگر ان کا مزاح گراں بار قہقہوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ان کی ظرافت کا معیار متین' شائستہ اور مہذب ہے جو بلند بانگ دیہاتی قہقہوں کے بجائے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتا ہے اور ہنسوڑ ہونے کے بجائے خوش خنداں ہونے پر زیادہ زور دیتا ہے اور اس طرح قاری کے ذہن کو غور و فکر کی طرف مائل کرتے ہوئے اس مرکزی بات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو ہنسی کے پردے میں کہی گئی ہے۔اختصار کے فن میں

وہ پطرس کے قریب ہیں اور اپنے اسلوب کے مزاح کے اعتبار سے رشید احمد صدیقی کے طرفدار نظر آتے ہیں۔ کنھیا لال کپور کی طرح یوسف ناظم بھی کسی خاص ازم کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔''(12)

یوسف ناظم کو اپنے فن پر مکمل عبور حاصل ہے وہ اپنی تحریروں میں نہایت خود اعتماد نظر آتے ہیں۔ یوسف ناظم نے متوقع امور کو غیر متوقع اور غیر متوقع کو متوقع بنا دیا ہے۔ قواعد اردو کی پیروڈی اور مولوی عبدالحق کی صرف ونحو کا خاکہ اڑاتے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ استادانہ طنز و مزاح کے واحد ماہر ہیں۔ اسی طرح مضمون تاریخ اور بچوں کے جغرافیہ کا بھی انہوں نے خاکہ اڑایا ہے۔ اس طرح ان تحریروں میں وہ اس کی آڑ لے کر زندگی اور اس کے مصائب پر تنقید کرتے ہیں۔ اس طرح قاری کو قواعد کا سہارا لے کر تلخ حقائق کے گھونٹ پلاتے ہیں۔ علم صرف ونحو کی تعریف یوسف ناظم کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

''الفاظ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بامعنی اور دوسرے بے معنی۔ بامعنی وہ الفاظ ہوتے ہیں جو سیدھی سادی گفتگو میں استعمال ہوتے ہیں اور بے معنی ان الفاظ کو کہتے ہیں جو سپاس ناموں و دستاویزوں اور خطبات وغیرہ میں استعمال ہوتے ہیں۔''(13)

یوسف ناظم نے اپنے زیادہ تر مضامین میں ادب' معاشرت' سیاست اور عام انسانی مسائل کو موضوع بنایا ہے انہیں ہر مسئلے سے متعلق نئے نئے نکات دریافت کرنے میں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ گلوبلائزیشن اور جدید تہذیب کے نام پر مٹتی ہوئی مشرقی اقدار پر وہ منفرد انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ حجاب کی مخالفت کرنے والوں پر وہ بڑا ہی مہذب اور گہرا طنز کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

''ہم جہاں حجاب کے چھوٹے سے معاملے پر غور کرتے ہیں تو ہمارا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس مشق میں مور نامی پرندہ سے بازی لے جاتا ہے۔ وہ صرف اس لئے جنگل میں ناچتا ہے تاکہ کوئی دیکھ نہ لے جب کہ ہم آدمیوں کے قابل تعریف معاشرے میں ''فیشن شو'' اگر نہ ہوں تو آدمی گنوار اور اجڈ

سے بھی کمتر درجے کا متنفس رہ جاتا ہے۔''(14)

یوسف ناظم نے اپنی عملی زندگی کا زیادہ تر حصہ ممبئی میں گذارا۔ ممبئی ہمارے ملک کی تجارتی راجدھانی کہی جاتی ہے۔ جہاں ہر شخص تیزی سے بھاگ رہا۔ ممبئی شہر کی کئی خصوصیات اور خامیاں ہیں جو اسے دوسرے شہروں سے ممتاز بناتی ہیں۔ وہ ممبئی شہر کی ان ہی خصوصیات کو مضحک انداز میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''بمبئی اور دلی میں ایک نمایاں فرق یہ دکھائی دیا کہ دلی میں سڑکیں خالی پڑی رہتی ہیں۔ بمبئی میں کوئی سڑک' کوئی گلی کوئی کوچہ' ایسا نظر نہیں آیا جہاں آدمی رک کر اپنی سانس ٹھیک کر سکے۔ آدمی نہ چلتے ہوں تو کم سے کم جانور سڑکوں پر ضرور ہوں گے۔ شاہراہوں کے دونوں طرف 'ضرورتمند' عوام الناس مصروف گل کاری نظر آئیں گے۔ وقت کی کوئی قید نہیں ہے' یہ اور بات ہے کہ صبح کے اوقات میں اس قسم کا مجمع ذرا زیادہ ہوگا کام سب ایک ہی کریں گے لیکن اس طرح کہ:
>
> کسے را از کسے کارے نباشد''(15)

یوسف ناظم جہاں زودنویس رہے وہیں اپنے بارے میں کچھ لکھنے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد نے جب جون 2004 میں اپنا خصوصی شمارہ یوسف ناظم نمبر شائع کیا تو اس میں یوسف ناظم سے بہ اصرار ان کی خودنوشت سوانح لکھوائی گئی جو تمہید کے عنوان سے شامل نمبر ہے۔ یوسف ناظم خودنوشت سوانح کے بارے میں کیا فرماتے ہیں ملاحظہ ہو۔

> ''خودنوشت سوانح دراصل ایک سانحہ ہوتی ہے اور میرے حساب سے سوانح سانحہ کی ہی جمع ہے۔ خودنوشت لکھنے والا ہر شخص اپنی عیب جوئی نہیں کر سکتا۔ اردو ادب اس قسم کے اعتراضات سے محفوظ ہے اور یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہے۔...... سفرناموں اور آپ بیتیوں میں جھوٹ کو چھوٹ ہوتی ہے جتنا چاہو جھوٹ لکھو۔ پہلے یہ جھوٹ کتابوں میں ہی دفن رہتا تھا لیکن اب فوراً پکڑا

جاتا ہے کیونکہ سفر صرف ادیب نہیں کرتے قاری بھی کرتے ہیں بلکہ قاری ہی کرتے ہیں۔ادیب تو ''دعوت'' کا انتظار کرتے ہیں (کچھ خود ہی اس کا اہتمام کرنے کے موقف میں ہوتے ہیں) پہلے صرف ادیب ذہین ہوا کرتے تھے (یا ایسا سمجھا جاتا ہے) اب قاری زیادہ ذہین ہو گئے ہیں۔''(16)

یوسف ناظم نے اپنی تخلیقات کو اردو ادب کے نایاب گوہروں سے مزین کیا۔ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ تھا جسے وہ جملوں میں نگینے کی طرح جڑتے تھے۔وہ مزاح میں ابتذال اور پھکڑ پن کے ہمیشہ مخالف رہے اور اپنی تحریروں میں ہمیشہ اعتدال سے کام لیا۔اطہر عزیز کو دیے گئے ایک انٹرویو میں وہ کہتے ہیں۔

''اطہر عزیز: ناظم صاحب! ایک ادیب کو مزاح نگار بننے کے لئے کن شرائط کا پابند ہونا ضروری ہے؟

یوسف ناظم: دوسری اصنافِ ادب میں شرائط ہی شرائط ہیں جب کہ مزاح کے لئے صرف ایک شرط ہے کہ وہ مزاح ہو۔اور یہ ایک شرط کوئی آسان شرط نہیں ہے۔بڑی بلکہ کڑی آزمائش سے گذرنا پڑتا ہے۔مزاح میں موزونیت ہو......مذمومیت نہیں۔'' (17)

یوسف ناظم کی طنزیہ تحریروں میں بعض اوقات تلخی کچھ تیز ہو جاتی ہے۔کہیں کہیں وہ ناشائستہ اشاروں سے بھی کام لیتے ہیں جیسے ''تم'' وغیرہ جس کے باعث ایک ناگواریت سی محسوس ہوتی ہے اور یہ اشارے ان جیسے قد آور طنز نگار کے لئے مناسب معلوم نہیں ہوتے۔سطحی مطالعہ رکھنے والے قاری کو ان کا یہ طنز پہلی نظر میں نظر نہیں آتا۔اس کے لئے باریک بینی سے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان کی بیشتر تحریروں کا نشانہ انسانی زندگی کی مستقل اقدار ہیں۔اپنے مضامین میں وہ موزونیت اور مناسبت کے لحاظ سے اشعار کو برمحل استعمال کرتے ہیں۔اس طرح ان کے بیشتر مضامین انشائیوں کی تعریف میں آتے ہیں۔ ''بارات'' اردو کے کامیاب انشائیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔یوسف ناظم کو شخصیات سے بے حد دلچسپی ہے لیکن محض ان کے خدوخال تک ہی۔وہ شخصیات کی زیادہ گہرائیوں کو ناپنے سے کتراتے ہیں۔اس سلسلے میں ان کا رویہ بے حد

محتاط ہے۔ غالباً اسی لئے یوسف ناظم خاکوں میں گہرائیوں کو ناپنے سے کتراتے ہیں۔ یوسف ناظم خاکوں میں موضوع کی مجلسی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔

یوسف ناظم اسلوب کے اعتبار سے رشید احمد صدیقی کے ہم مشرب نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک بڑے اور واضح فرق کے ساتھ کہ رشید احمد صدیقی ہمیشہ علی گڑھ کی محدود فضاء میں ہی رہے لیکن یوسف ناظم نہ صرف ہندوستان بھر میں بلکہ بیرون ممالک میں بھی، حالانکہ وہ کبھی غیر ملک کے سفر سے مستفید نہ ہو سکے۔ یوسف ناظم ممبئی میں اتنا رہے کہ اب ممبئی اور یوسف ناظم میں کون پرانا ہے اس کا اندازہ ذرا مشکل سے ہوتا ہے۔ یوسف ناظم کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں۔

> ''مزاح نگاری میں یوسف ناظم کا اسلوب منفرد تھا۔ اردو زبان پر انہیں خلاقانہ دسترس حاصل تھی۔ لفظوں، محاوروں اور ضرب الامثال کو نئی معنوی جہات دے کر مزاح اور طنز کے نت نئے پہلو تراشنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کی طرح وہ اشعار اور اقوال کی برجستہ تحریف سے بات میں بات پیدا کرتے ہیں۔'' (18)

یوسف ناظم نے تقریباً نصف صدی تک طنز و مزاح کی آبیاری کی۔ ان کا فن نہ صرف تیزی سے ترقی کی طرف گامزن رہا بلکہ انھوں نے معیار کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ یوسف ناظم کے فن کا گراف معیار کی ایک مناسب سطح سے نیچے کبھی نہیں گرا اور نہ بہت بلند ہو کر اچانک بہت نیچے گرا۔ انھوں نے ہمیشہ اس اعتدال کو برقرار رکھا۔ ان کا اسلوب بہت رواں اور دلکش تھا۔ وہ اپنی بات سمجھانے کے لئے قوسین کا استعمال کثرت سے کیا کرتے تھے۔

> ''سیویاں طرح طرح کی ہوتی ہیں (صرف طرح طرح مصرعہ نہیں ہوتیں) عاشق کے عقل کی طرح موٹی بھی ہوتی ہیں اور محبوب کی کمر کی طرح پتلی بھی ہوتی ہیں۔ لیکن نہیں محبوب کی کمر تو ہوتی ہی نہیں ہے، کہا گیا ہے:
>
> میاں لوگ کہتے ہیں کمر ہے
> کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے

(آبرو کے زمانے میں محبوب کو میاں ہی کہا جاتا تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج
ہر خاتون جواں مرد ہے اور ہر مرد......جیسا بھی ہے آپ کو معلوم ہی ہے)''(19)

رشید انصاری قوسین کے استعمال کو یوسف ناظم کی انفرادیت یا شناخت سے تعبیر کرتے ہیں۔انھوں نے نہایت چابکدستی اور مہارت کے ساتھ قوسین کا استعمال کیا ہے۔اس سلسلے میں رشید انصاری رقمطراز ہیں۔

''قوسین کا استعمال عام طور پر کسی بات کی وضاحت یا شناخت کروانے کے لئے ہوتا ہے۔لیکن قوسین کو یوسف ناظم نے طنز ومزاح کو دوآتشہ بنانے کے لئے استعمال کیا ہے۔جن لوگوں نے ان کے خطوط پڑھے ہیں ان کو یاد ہوگا کہ نجی خطوط میں بھی وہ قوسین کا استعمال کر کے محض چند الفاظ میں بڑی بات لکھ دیتے تھے۔''(20)

یوسف ناظم کے یہاں مزاح اپنی آفاقی قدروں میں جلوگر ہوتا ہے۔اس لئے ان کا تخلیق کردہ مزاح اول درجہ کا کہلایا جاسکتا ہے۔پھر بھی ان کی مزاح نگاری ان کے مضامین میں بیچ بیچ میں درآنے والی چست فقرے بازی کی رہین منت ہے۔وہ ''زیرغور'' کے مقدمے میں اپنے بارے میں یوں گویا ہوتے ہیں۔

''میں کوئی پچیس سال سے مزاح کے نام سے نثر لکھ رہا ہوں۔اب اتنے لمبے عرصے تک خود کو مزاح نگار کہنے کے بعد جی نہیں چاہتا کہ اپنے مضامین کسی اور عنوان سے پیش کروں۔فلسفیوں نے متفقہ طور پر یہ رائے دی ہے کہ جھوٹ اتنا بولو کہ سچ معلوم ہونے لگے۔معلوم نہیں اس جھوٹ کو ثابت کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔''(21)

مشاعروں کے موجودہ معیار پر بھی وہ برملا اظہار کرتے ہیں۔موجودہ دور میں شاعر کم متشاعر زیادہ نظر آنے لگے ہیں ۔اور خاص طور پر خاتون متشاعرات پر وہ اپنے مضمون ''موبائل فون پر......دو گفتگوئیں'' میں کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔

الف: جی ہاں خیریت ہی سمجھ لیجئے۔کل رات وہ ایک مشاعرے میں چلے گئے تھے۔وہاں سے واپس آئے تو ان سے چلا بھی نہیں جارہا تھا۔

ب: ارے اللہ خیر کرے۔کیا ہوا تھا؟

الف: کہہ رہے تھے کہ مشاعرے میں مصرعے اٹھائے اٹھائے تھک گئے تھے۔سارے کے سارے مصرعے گرے ہوئے تھے اور جو ٹھیک تھے ان کی تھکن کی وجہ سے اٹھائے نہیں جارہے تھے۔

ب: کیا اکیلے ہی یہ کام کررہے تھے؟

الف: جی ہاں۔مشاعرہ خواتین کا تھا اور آپ کے شمس الدین خاں صاحب صدارت کررہے تھے۔

جی ہاں۔مجھے معلوم ہے۔خواتین یعنی شاعرات دوسروں کے مصرعے نہیں اٹھاتی ہیں۔اس میں ان کی سبکی ہوتی ہے

الف: ہاں شاید اسی لئے سارے مصرعے صدر صاحب ہی کو اٹھانے پڑے۔مصرعے تھے بھی بہت۔کہہ رہے تھے کہ بعض مصرعے تو ثقیل بھی بہت تھے۔زبان پر چڑھتے ہی مشکل سے تھے۔

ب: لیکن انہوں نے یہ صدارت قبول کیوں کی۔کوئی خاتون ہی صدارت فرمالیتیں۔ہر جگہ تو آگے آگے رہنے کی کوشش میں ہیں۔مشاعرے کی صدارت میں کیا نقص نظر آیا انہیں؟'' (22)

یوسف ناظم سنجیدہ موضوع کو بھی اپنی باغ و بہار طرز نگارش سے دلکش بنا دیتے ہیں۔حیدرآباد کے معروف نقاد یوسف سرمست کی کتاب ''تحقیق و تنقید'' پر ان کے تبصرے کی خواہش کی گئی تو بہت ہی خوبصورت انداز میں اپنے تاثرات کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

''فاضل مصنف نے اپنی کتاب کے نام کی وجہ تسمیہ بیان کرتے وقت صاف الفاظ میں کہا ہے کہ کتاب کا یہ عنوان اس لئے نہیں رکھا گیا ہے کہ اس میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ تحقیق کے بغیر تنقید اور تنقید کے بغیر تحقیق ادھوری رہتی ہے۔ بلکہ گمراہ کن ثابت ہوتی ہے (اپنے اس دعوے کی حمایت میں مصنف نے مدلل اور مسکت حوالے دیئے ہیں) فاضل مصنف اگر حوالے نہ بھی درج کرتے تو خاکسار جو ان دونوں اصناف نثر سے خاصے فاصلے پر ہے اور صرف تماشائی ہے' مصنف سے برضا و رغبت متفق ہے۔'' (23)

یونس اگاسکر یوسف ناظم کے فن کے بارے میں کہتے ہیں۔

''یوسف ناظم بات سے بات پیدا کرتے ہیں۔ سنجیدہ بات کہہ کر اس کے ساتھ Anti-Climax کا جملہ چپکا دیتے ہیں۔ بیان میں مبالغہ کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر پیراگراف کے آخر میں وہ جملہ بازی جسے انگریزی میں Punch Line کہتے ہیں سے کام لیتے ہیں۔ یوسف ناظم کے انشائیے بھی اچانک اختتام کو پہنچتے ہیں اور دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔'' (24)

ان کے اسلوب کا دوسرا اہم پہلوان کا طنز ہے جو خالصتاً طنز نہیں ہوتا جیسا کہ دیگر طنز نگاروں کے ہاں جھلکتا ہے۔ جہاں موقع بے موقع طنز اپنی تیز کاٹ کے ساتھ تلخی سی پیدا کرتا ہے بلکہ یوسف ناظم کا طنز برائے فن نہیں ہوتا اس میں ایک پوشیدہ اصلاحی مقصد بھی کارفرما ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کہتے ہیں۔

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ واقعات یا زبان کے شاطرانہ استعمال سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ یوسف ناظم موقع و محل کی مناسبت سے اور اکثر مد اعتدال میں ان دونوں سے کام لیتے ہیں۔ وہ روزمرہ زندگی کے چھوٹ سے واقعے یا عام مشاہدے کی تلازمات تعبیروں اور ظریفانہ

دلیلوں کے ذریعہ معنی خیز بنا دیتے ہیں۔طویل کلام اور ابتذال سے بچ کر لفظوں کی رعایت اور الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنے کا جیسا ہنر وہ جانتے ہیں اس دور کے کم مزاح نگاروں کے حصے میں آیا ہے۔'' (25)

شخصی اور نجی محفلوں میں بھی وہ اپنی باغ و بہار طبیعت سے ایسی شگفتہ پھلجھڑیاں جلاتے کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ان کے بعض فقرے تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''یوسف ناظم کے بہت سے جملے اردو میں امر ہو چکے ہیں۔مثلاً اردو کے باغی ادیب باقر مہدی کے بارے میں ان کا یہ مشہور جملہ: باقر مہدی علم کی اُس بلندی پر ہیں جہاں ابھی علم کو پہنچنے میں دیر ہے۔یا اردو ادب میں طنز و مزاح کا درجہ کیا ہے'اس پر ہونے والی بحث میں ان کی یہ رائے کہ 'بے شک طنز و مزاح دوسرے درجہ کا ادب ہے۔مشکل صرف یہ ہے کہ اردو میں پہلے درجے کا ادب تخلیق نہیں ہو رہا ہے!'' (26)

یوسف ناظم مزاح نگاری کو لطیفہ گوئی کا چولا پہناتے اور نہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مزاح نگاری لطیفہ گوئی کی مرہون منت ہے۔ان کے مضامین میں گہری سوچ اور فکر جھلکتی ہے۔ممتاز محقق اور ادیب ڈاکٹر محمد حسن جو خود بھی طنز و مزاح پر کافی دور رس نگاہ رکھتے ہیں۔ماہنامہ آج کل نئی دہلی نے جب طنز و مزاح نمبر شائع کیا تو اس میں ڈاکر محمد حسن نے اپنا مضمون ''طنز و مزاح کے نئے رجحانات'' لکھا۔جس میں انہوں نے یوسف ناظم کا تذکرہ ایک مزاح نگار کے طور پر کیا۔ڈاکٹر محمد حسن کا خیال ہے کہ یوسف ناظم مختلف انداز بیان میں اور الفاظ کی مدد سے مزاح پیدا کرتے ہیں اور اس کوشش میں کامیاب بھی رہتے ہیں۔ڈاکٹر محمد حسن ان الفاظ میں یوسف ناظم کی مزاح نگاری کی ستائش کرتے ہیں۔

''یوسف ناظم نے بہت سلجھے ہوئے انداز میں رشید احمد صدیقی کے اسلوب سے فیض اٹھایا ہے۔ان کے ہاں طنز نہیں خوش دلی کا مزاح ہے جو ان کے احساس کی تازگی سے ابھرتا ہے۔یوسف ناظم واقعات اور کرداروں

کے بجائے ندرت احساس اور انداز بیاں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مضامین ایک ایسے خوش دل انسان کا پتہ دیتے ہیں جس نے زندگی کے نشیب و فراز سے سمجھوتہ کرلیا ہے اور ستم ظریفی کو قانون مان کر سرد و گرم عالم سے لطف لے لے کر گذارنے کا عہد کر رکھا ہے۔ان کا تبسم طنزیہ نہیں عارفانہ اور طنز سے بے نیاز۔'' (27)

اودھ پنچ سے وابستہ مزاح نگاروں سے لیکر شگوفہ سے وابستہ مزاح نگاروں کے قافلے پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو طنز و مزاح کی نثری روایات کو فروغ دینے والے ادیبوں میں کئی روشن مینار اور ستون ہیں۔ان میں یوسف ناظم معیار کے اعتبار سے ایک ممتاز اور منفرد مقام کے حامل ہیں۔ پروفیسر مجید بیدار لکھتے ہیں۔

''یوسف ناظم کی تخلیقات اور ان کے اعلیٰ معیار پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ طنز و مزاح کے بے شمار اہم ستونوں کے مقابلے میں یوسف ناظم کو ایک کوہِ بے ستون کا موقف حاصل ہے۔انہوں نے طنز و مزاح کو ہنسی ٹھٹھول سے نکال کر معیاری طنز و ظرافت سے وابستہ کیا اور تخلیقات کا بڑا ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ یوسف ناظم کو طنزیہ و مزاحیہ ادب کا کوہِ بے ستون قرار دینا کوئی مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کو آئینہ دکھانے کے مترادف ہے۔'' (28)

یوسف ناظم سادہ لوح اور خوش طبع شخصیت کے مالک تھے۔انھوں نے کبھی اردو خدمات کے عوض انعام و اکرام کی خواہش نہیں کی۔ حالانکہ ملک کی کئی اکیڈیمیوں کی جانب سے نوازا گیا۔لیکن ان کے بیٹے سید خالد ایوب یہ شکوہ کرتے ہیں کہ انھیں وہ صلہ نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے۔لیکن یوسف ناظم کا اس تعلق سے جواب بھی دلچسپ ہے۔

''میں نے ان سے ادبی کیریئر سے متعلق اس کوتاہی پر ان سے بات کی تھی وہ مسکرائے اور کہا' لوگ مجھے پڑھتے ہیں اور عالمی سطح پر لوگوں کو ہنسنے اور مسکرانے کا موقع ملتا ہے یہی میرا انعام ہے۔'' (29)

یوسف ناظم زندگی بھر طنز و مزاح کی آبیاری میں پوری لگن کے ساتھ جٹے رہے اور آخر سانس تک لکھتے

رہے۔ یوسف ناظم 23 جولائی 2009 کو طویل علالت کے بعد ممبئی میں انتقال کر گئے۔ اور اس طرح بقول نسیم الدین فریس عہد یوسفی کا اختتام ہو گیا۔ مدیر شگوفہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال اپنے اداریے میں کچھ اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

> ''طویل تخلیقی سفر کے حامل کثیر التصانیف اور صاحب طرز طنز و مزاح نگار ادیب جناب یوسف ناظم رکن مجلس مشاورت ماہنامہ شگوفہ اردو طنز و مزاح کی آبرو تھے۔ ان کی شخصیت میں بلا کی کشش اور جاذبیت تھی۔ کوئی ان سے ملتا تو بار بار ملنے کی آرزو کرتا۔ وہ نہایت بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ گفتگو میں ادبی چاشنی اور تحریروں میں کلاسیکی رچاؤ تھا۔ اپنے عہد پر ان کی گہری نظر تھی۔ بنیادی طور پر وہ ترقی پسند تھے لیکن جدیدیت پسند بھی ان کے رسیا تھے۔ ان کے عہد میں ممبئی ادیبوں اور شاعروں اور فنکاروں کا اہم مرکز تھا۔ اور یوسف ناظم ان بلند پایہ تخلیق کاروں کے مرکز نگاہ اور پسندیدہ شخصیت تھے۔ ممبئی ہی نہیں سارے ملک کے نوجوانوں، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی وہ رہنمائی اور سرپرستی کرتے رہے۔ ممبئی کی ادبی دنیا میں ان کے وجود سے ایک اعتبار اور چہل پہل تھی۔ انکے بغیر عالمی سطح پر طنز و مزاح سے وابستہ ادیب و شاعر اور قاری ملول و اشکبار ہیں۔'' (30)

نامی انصاری ان ہمہ جہت شخصیت اور ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''یوسف ناظم ہمارے سینئر مزاح نگار ہیں جن کے مزاحیہ مضامین اور خاکے ہی مشہور نہیں ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے تبصروں اور تنقیدی تحریروں میں بھی طنز و مزاح کے اسالیب کو برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ موقع موقع سے وہ طنز کا استعمال بھی بڑی ہنرمندی اور چابکدستی سے کرتے ہیں۔ ان کے

چند خاکے اس ضمن میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔''(31)

یوسف ناظم اپنے دور کے ایسے فنکار تھے جنہوں نے اپنے فن کی بنیاد تمام تر روزمرہ کے حقائق پر رکھی۔انہوں نے تبصرے نہیں کئے بلکہ فیصلے کئے ہیں۔ان کے فیصلے مبالغے نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ان کی تحریریں متانت لئے ہوئے ہے۔اپنے ہم عصر طنز ومزاح نگاروں کے مقابل ان کے فن میں گہرائی زیادہ ہے۔ان کے فن میں عالمانہ انداز پیدا ہوگیا ہے۔ان کا مزاح شستہ اور مہذب ہوتا ہے۔ابتذال سے وہ کوسوں دور ہیں۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) یوسف ناظم		گردپوش تحریر		مشمولہ: سائے ہم سائے
(2) ڈاکٹر راج بہادر گوڑ		''یوسف ناظم''مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ'بہ یاد یوسف ناظم' اگست 2009 ص9
(3) پروفیسر لئیق صلاح ''کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ''مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ''بہ یاد یوسف ناظم''ص45
(4) پروفیسر حبیب ضیا		''ایک چراغ اور گل ہوا''		مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ''بہ یاد یوسف ناظم''ص45
(5) ڈاکٹر عقیل ہاشمی		''یوسف ناظم......عہد ساز طنز ومزاح نگار''		مطبوعہ: روزنامہ اعتماد 3 اگست 2009
(6) مجتبیٰ حسین		''یوسف ناظم کا خلاء کون پُر کرے گا''مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ'بہ یاد یوسف ناظم' ص15
(7) پروفیسر عبدالستار دلوی ''مہمان اداریہ''		مطبوعہ: شگوفہ''یوسف ناظم نمبر''ص19 جون 2004ء
(8) یوسف ناظم		''آج میں اس سے نہیں پوچھ سکتا' اریب اپنے نام کے معنی بتاؤ!''مضمون مشمولہ: سائے ہمسائے ص92 نومبر 1975
(9) یوسف ناظم		''باقر مہدی''		مشمولہ: سائے ہم سائے ص48-47
(10) نامی انصاری		''بیسویں صدی میں طنز ومزاح'' ص244 سنہ 2002ء
(11) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید		تبصرہ''سائے ہم سائے''		ص5 مطبوعہ زندہ دلان حیدرآباد 1975
(12) کرشن چندر		مقدمہ		مشمولہ''کیف کم''		ص5 1963 (پہلا ایڈیشن)
(13) یوسف ناظم		''قواعد صرف ونحو''		مضمون مشمولہ''کیف وکم''		ص19
(14) یوسف ناظم		''فیشن شو''مضمون مشمولہ''ایک اور چکمہ''		ص69
(15) یوسف ناظم		''ایک پردیسی کا سفرنامہ ہندوستان''مضمون مشمولہ''البتہ''ص74 شگوفہ پبلی کیشنز 1981ء

(16) یوسف ناظم — تمہید (خودنوشت سوانح) — مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ ''یوسف ناظم نمبر'' ص 24

(17) اطہر عزیز — ''رخصت ہوا وہ ناظم طنز و مزاح بھی'' — مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ ''بہ یاد یوسف ناظم'' ص 72

(18) پروفیسر مغنی تبسم — ''سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے'' مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ بہ یاد یوسف ناظم، ص 9

(19) یوسف ناظم — ''شیر خُرمے کے دو ایڈیشن، ایک عام ایک ڈی لکس'' مضمون مشمولہ ''البتہ'' ص 84

(20) رشید انصاری — ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے'' مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ بہ یاد یوسف ناظم، ص 55

(21) یوسف ناظم — مقدمہ مشمولہ ''زیرِ غور'' ص 5 مطبوعہ 1973

(22) یوسف ناظم — ''موبائل فون پر......دو گفتگوئیں'' مضمون مشمولہ ''الہذا'' ص 87 سنہ 2003

(23) یوسف ناظم — ایک کتاب کا ماجرا مع تمہید — مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ ''بہ یاد یوسف ناظم'' ص 89

(24) یونس اگاسکر — ''یوسف ناظم'' مطبوعہ ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی صفحہ 42 1976

(25) ڈاکٹر قمر رئیس — ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' مطبوعہ: ماہنامہ شاعر ممبئی ص 32 مطبوعہ 1977

(26) نصرت ظہیر — ''آہ یوسف ناظم! واہ یوسف ناظم!!'' مطبوعہ: روزنامہ ''اعتماد'' مورخہ 3 اگست 2009

(27) ڈاکٹر محمد حسن — ''طنز و مزاح کے نئے رجحانات'' مطبوعہ: ماہنامہ ''آج کل'' طنز و مزاح نمبر'' دہلی ستمبر 1982 ص 73

(28) پروفیسر مجید بیدار — ''طنزیہ و مزاحیہ ادب کے کوہِ بے ستون......یوسف ناظم'' مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ بہ یاد یوسف ناظم'' ص 61

(29) سید خالد ایوب — ''ہمارے بابا......جناب یوسف ناظم'' مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ بہ یاد یوسف ناظم، ص 68

(30) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال — ''اداریہ'' مطبوعہ ماہنامہ ''شگوفہ'' بہ یاد یوسف ناظم'' اگست 2009 ص 96

(31) نامی انصاری — ''بیسویں صدی میں طنز و مزاح'' ص 21 سنہ 2002ء

عاتق شاہ

عاتق شاہ 7 نومبر 1931ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ نامساعد معاشی حالات کی بناء پر میٹرک سے آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ایک دہے کی مسلسل جدوجہد کے بعد جب حالات کچھ سازگار ہوئے تو عاتق شاہ دوبارہ تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ ہوئے اور مسلسل محنت سے ایوننگ کالج حیدرآباد سے 1963ء میں بی اے کامیاب کیا۔ 1965ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کی سند حاصل کی اور سردار پٹیل کالج سکندرآباد میں بحیثیت اردو لیکچرر برسرکار ہوئے۔

عاتق شاہ نے ادبی زندگی کا آغاز 1945ء سے کیا۔ روزنامہ ''میزان'' حیدرآباد میں ان کی پہلی کہانی ''گرگٹ'' شائع ہوئی۔ 1948ء میں ان کا پہلا مجموعہ ''فٹ پاتھ کی شاہزادی'' منظر عام پر آیا۔ حکومت حیدرآباد کی جانب سے منعقدہ مختصر افسانے کے مقابلے میں جو 1953ء میں عمل میں آیا تھا عاتق شاہ کو ان کے افسانے ''مائی ڈیئر شکنتلا'' پر پہلا انعام حاصل ہوا۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری اور طنز نمایاں نظر آتا ہے۔ عاتق شاہ زود نویس قلم کار ہیں۔ ان کے تقریباً دس مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اپنے ایک مجموعہ ''انڈین کاجو'' میں وہ خود اپنے بارے میں اعلان کرتے ہیں۔

''میں بنیادی طور پر طنز نگار ہوں'' (1)

عاتق شاہ عصری جہتوں سے باخبر اور فن کی نزاکت سے پوری طرح واقف فنکار ہیں۔ طنز ومزاح میں موجود فرق سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ طنز ومزاح کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اپنے اپنے عمل میں طنز اور مزاح نگار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔
> بقول کسی کے طنز نگار وہ ہے جو اپنے شکار کے لئے خوں خوار کتوں کا تعاقب
> کرتا ہے۔ مزاح نگار خرگوش کا، خطرناک کتوں اور نازک خرگوشوں میں جو
> فرق ہے وہی فرق طنز اور مزاح میں ہے''۔ (2)

طنز ومزاح کا یہ فرق نئے زاویئے سے جس طرح عاتق شاہ نے بیان کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس

قدر تیکھے ہیں حالانکہ طنز نگار کسی کی دل آزاری کو اپنا مقصد قرار نہیں دیتا۔ اچھا طنز نگار کبھی کسی کی ذات کو نشانہ نہیں بناتا۔ بلکہ وہ طنز کی آڑ میں حماقتوں کے پردے فاش کرتا ہے۔ طنز نگار بنیادی طور پر سوسائیٹی میں اصلاح لانا چاہتا ہے۔ عاتق شاہ کے طنز میں اذیت کوشی شامل ہے۔ جسمانی اذیت کے مقابلے میں طنز نگاری کی جانب سے اڑایا جانے والا مذاق زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ اس طرح اگر طنز کا مقصد خطرناک کتوں کا شکار ہی رہ جائے تو طنز، طنز نہیں رہے گا بلکہ ''زہر کی بوند'' بن جائے گا جس سے اصلاح تو ہرگز نہ ہوسکے گی۔ حالانکہ عاتق شاہ اس نکتہ سے باخبر ہیں ان کا مضمون ''ناک'' اس کی اچھی مثال بھی ہے۔ عاتق شاہ کے مضامین کے مطالعہ کے دوران قاری صرف زیر لب مسکرا کر رہ جاتا ہے اور اس مسکراہٹ میں بھی کرب ناک سنجیدگی شامل ہوتی ہے جو سماج کے مسائل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ دیکھئے یہ اقتباس:

> ''ویسے ہر چھوٹے بڑے ملک کی ناک کے تحفظ کیلئے یونائیٹڈ نیشنز کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس ادارے کے یہاں دنیا کے تمام ملکوں کے ناکوں کی فوٹو اور اس کی کاپیاں موجود ہیں لیکن آج تک اس ادارے نے کسی کی ناک نہیں بچائی البتہ ناک کٹنے کے بعد اس کی مرہم پٹی کا بڑے پیمانے پر انتظام کرتا ہے''۔(3)

عاتق شاہ کمر کس کر طنز کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ اور بھر پور وار کرنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ ''چمچہ'' کے بغیر انسان ماحضر تناول نہیں کرسکتا۔ اس طرح چمچہ ہمارے سماج میں اس کو کہا جاتا ہے جو کسی بڑے آدمی کا مصاحب اور بے دام غلام ہوتا ہے۔ خصوصاً سیاست میں چمچوں کا معیار کچھ زیادہ ہی گرا ہوا ہے۔ عاتق شاہ ان پر کچھ یوں روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ چمچے نہ صرف کرائیے پر حاصل کئے جاسکتے ہیں بلکہ:

> ''اور ضرورت پڑنے پر مستقل طور پر خریدے جاسکتے ہیں۔ یہ بات افراد کے تعلق سے نہیں بلکہ قوموں اور ملکوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ بڑا ملک اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر چھوٹے ملکوں کو اپنا چمچہ بنالیتا ہے۔ یا بعض اوقات چھوٹی طاقتیں اپنی بقاء کی خاطر بڑی طاقتوں کو سجدہ

کرنے لگتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو آپ یونائیٹڈ نیشنز کے جنرل سکریٹری سے ربط پیدا کیجئے۔ آپ حقیقی صورت حال سے واقف ہی نہ ہوں گے بلکہ آپ کے سامنے صحیح اعدادوشمار بھی آئیں گے''۔(4)

بسا اوقات غیر اہم موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں اور اس کے مضحک پہلوؤں پر طنز کے تیر برسا کر اسے یوں اجاگر کرتے ہیں کہ قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس بات سے میں بھی واقف تھا لیکن میری نگاہ اس پر کیوں نہیں گئی۔ مثلاً گوشت کی دکان، مضمون میں انہوں ایسا ہی گوشہ عیاں کرنے کی کوشش کی ہے ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''اس کے علاوہ آپ کو ایک اور راز کی بات بتاؤں وہ یہ کہ آپ کو بظاہر ایک گوشت کی دکان نظر آ رہی ہے۔ یقین کیجئے اس کے اندر کئی گوشت کی دکانیں آباد ہیں۔ چلتی پھرتی بولتی ہوئی لیکن یہ کاروبار میں دن میں نہیں کرتا رات میں دس بجنے کے بعد اور دوسری ہی شان سے یہ دکان جگمگاتی ہے۔ آپ کا کبھی جی چاہے تو بلا تکلف یہاں تشریف لائیے لیکن سورج کی پہلی کرن کے ساتھ آپ کو یہاں سے لوٹ کر جانا پڑے گا۔''(5)

عاتق شاہ نے اپنے مضمون ''قینچی'' میں مختلف قینچیوں اور اور ان کے استعمال پر نہایت شگفتہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ جیسے ٹیلر کی قینچی، ڈاکٹروں کی قینچی، حجام کی قینچی وغیرہ اس کے علاوہ کچھ قینچیاں دکھائی نہیں دیتیں جیسے نقادوں کی قینچی، سنسر بورڈ کی قینچی، انکم ٹیکس عہدیداروں کی قینچی، وغیرہ۔

''سنا کہ ٹیلر حضرات کبھی اپنے بچوں کے لئے کپڑا نہیں خریدتے گاہکوں کے کپڑوں میں سے اتنا بچالیتے ہیں کہ ان کی گھریلو ضروریات پوری ہوجاتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ محض افواہ ہو اور کسی دل جلے نے یہ خبر اڑادی ہو۔ لیکن قینچی کی کرامات سے بھلا کون انکار کرسکتا......لیکن قینچی کے چند منفی پہلو بھی ہیں۔ جہاں تک ادبی حلقوں کا تعلق ہے اردو کے کم وبیش تمام نقادوں کے ہاتھوں میں ایک ایک قینچی ہے۔ بڑی قینچی بڑے نقاد کی

نشان دہی کرتی ہے اور چھوٹی قینچی چھوٹے نقاد کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ چھوٹا نقاد برا نقاد کہلانے کے شوق مے ں چھوٹی قینچی پھیک کر بڑے سائز کی قینچی بازار سے خرید لاتا ہے۔لیکن اس بات کا وہ ضرور خیال رکھتا ہے کہ وہ میڈ اِن انگلینڈ یا امریکہ ہو۔'' (6)

آخر میں عام آدمی کو اپنے مضمون کا حصہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس خوبصورت آلے کی مدد سے وہ اپنے ماہانہ بجٹ کی تخیف کرتے ہیں۔

عاتق شاہ کے کئی مجموعہ شائع ہوئے لیکن ان کی طنز نگاری ابراہیم جلیس کی طرح منفرد نہیں ہے۔ بعض افراد عاتق شاہ کے فن میں کرشن چندر کی چھاپ اور ان کے نقوش تلاش کرتے ہیں حالانکہ کرشن چندر کے ہاں منفرد اسلوب اور لب ولہجہ میں خطابت کا جادو تھا جو عاتق شاہ کے ہاں بالکل نہیں ہے۔ دراصل عاتق شاہ کو زندگی کے نامساعد حالات نے طنز نگار بننے پر مجبور کیا جس کی بناء پر ان کے لہجے میں ان کے طنز میں غصہ اور جھلاہٹ بری طرح در آئی ہے۔ یہ سچ ہیکہ زندگی میں ہر ہر قدم پر غم موجود ہیں لیکن انسان کے حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ سیاہ رات کے بعد ایک روشن دن کی ابتداء ہر حال میں ہوتی ہے۔غم کی سیاہی کے بعد خوشیوں کا خورشید ضرور طلوع ہوتا ہے۔ عاتق شاہ کی نظر زندگی کے ایک ہی پہلو پر رہتی ہے۔ کاش وہ زندگی کے خوشگوار لمحات سے بذلہ سنجی بھی کشید کرتے تو ان کے طنز کا یقیناً بھلا ہوتا۔

----000----

حوالہ جات

(1) عاتق شاہ باتیں　مضمون مشمولہ: ''انڈین کا جو'' صفحہ 10

(2) عاتق شاہ ''ناک''　مضمون مشمولہ ''انڈین کا جو'' صفحہ 20

(3) عاتق شاہ ''ناک''　مضمون مشمولہ ''انڈین کا جو'' صفحہ 20

(4) عاتق شاہ ''چمچے''　مضمون مشمولہ ''انڈین کا جو'' صفحہ 44

(5) عاتق شاہ ''گوشت کی دکان''　مضمون مشمولہ ''انڈین کا جو'' صفحہ 119

(6) عاتق شاہ ''قینچی''　مضمون مشمولہ: شگوفہ' جنوری فروری 1991ء (سالنامہ) ص 53

نریندر لوتھر

نریندر لوتھر 23 مارچ 1933ء کو ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق سرزمین پنجاب سے ہے۔ حیدرآباد ان کا وطن ثانی ہے لیکن آج گوناگوں خصوصیات اور وجوہات کی بنا ان کا شمار حیدرآباد کے چنندہ مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے آنرس امتیازی نشانات کے ساتھ کامیاب کیا۔ بعد ازاں ہوشیار پور سے پولیٹکل سائنس میں ایم اے کیا اور آئی اے ایس کیلئے منتخب ہوئے۔ کرنول میں تعینات ہوئے۔ بعدازاں سیکریٹریٹ کے جی اے ڈی سیکشن کے ڈائرکٹر انفارمیشن کی حیثیت سے کارگذار رہے جہاں وہ اسکالرشپ پر لیڈز یونیورسٹی گئے اور وہاں سے انڈسٹریل مینجمنٹ میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما حاصل کیا۔ اس کے بعد مرکزی وزارت اسٹیل مائنیز اور میٹل میں ڈپٹی سکریٹری مقرر ہوئے۔ نریندر لوتھر نے کئی بیرونی ممالک کا دورہ بھی کیا ہے۔ 1972ء میں وہ لیبیاء کے صنعتی مشیر بن کر وہاں گئے۔ وہ اردو' ہندی اور انگریزی میں لکھتے ہیں۔

طنز و مزاح ان کا پسندیدہ اسلوب ہے۔ ان کے اکثر مضامین، کہانیاں آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہوتی ہیں۔ کہانیوں اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل ان کا پہلا مجموعہ ''بند کواڑ'' 1962 میں شائع ہوا۔ طنز و مزاح پر مشتمل دوسرا مجموعہ ''مزاج پرسی'' 1973ء میں شائع ہوا۔ بند کواڑ میں شامل تین مضامین ''مزاج پرسی'' میں دوبارہ شامل کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ''الف تحاشہ'' (1985) اور ''ہوائی کولمبس'' ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ ''بے تحاشہ' اردو کا ایک معروف لفظ ہے اسی کے وزن پر انہوں نے لفظ ''الف تحاشہ'' کی ترکیب بنائی ہے۔ انہوں نے انگریزی زبان میں ایک ناول بھی لکھا ہے۔ اخبار ''ہندو'' میں انگریزی زبان میں ہفتہ وار کالم پابندی سے لکھ رہے ہیں۔ اپنی گوناگوں مصروفیات اور ذمہ داریوں کے باوجود وہ لکھنے کیلئے وقت نکال لیتے ہیں۔

نریندر لوتھر کا مزاح بڑا سلجھا ہوا اور اس میں طنز نہ ہونے کے برابر یعنی مزاح کے آٹے میں طنز بقدر نمک ہوتا ہے۔ وہ اپنے مضمون ''پانچواں کاف'' میں بڑے ہی دلچسپ انداز میں اپنے بچپن کو یاد کرتے ہیں۔

''ایک دن ہم پانچ بچوں پر مشتمل ایک ڈیپوٹیشن اماں کے پاس گئے

اور راست سوال کیا۔ کیا آپ کو کتے پالنا پسند نہیں ہے۔ نہیں تو' اماں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا'' تم سب کو جو پال رہی ہوں'' (1)

ایک اور مضمون ''حجام کی دوکان'' کا تفصیلی جائزہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ الفاظ کے ذریعہ مزاح خود بخود پیدا ہوتا ہے۔

''حجام کی دوکان میں بات کا بتنگڑ بنایا جاتا ہے۔ رائی کا پہاڑ بنایا جاتا ہے، آدمی کا ادمنگڑ بنایا جاتا ہے۔ دوسرے پیشے کے لوگوں نے بھی حجاموں سے اس معاملے میں بہت کچھ سیکھا ہے اور بہت کچھ سیکھنا ہے۔ ابھی تک تاجروں نے صرف ایک بات ہی حجام سے سیکھی ہے اور وہ ہے گاہک کو مونڈھنا'' (2)

تحریر کا سارا حسن'' گاہک کو مونڈھنا'' میں سمٹ کر آ گیا ہے۔ جس سے مزاح کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ اس مختصر تحریر میں انہوں نے کئی محاوروں کا برجستہ استعمال کیا ہے۔ مزاح کی چاشنی میں طنز کا نشتر بھی نمایاں ہو گیا ہے۔

جب ریڈیو کی ابتداء ہوئی۔ ریڈیو عام ہوا تو لوگ اسے حیرت سے دیکھنے اور سننے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ریڈیو عام زندگی کا ایک خاص حصہ بن گیا۔ جس کے گھر ریڈیو ہوتا اس کی زمانے میں سماج میں عزت ہوتی لوگ اس سے مرعوب ہوتے۔ وائرلیس ٹکنالوجی کی ترقی کی سمت ریڈیو پہلا قدم تھا۔ لیکن اس کے مضر اثرات پر نریندر لوتھر نے جس شگفتہ انداز میں روشنی ڈالی اور اس پہلو کو نمایاں کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

''اب تو میں نے ریڈیو والوں سے درخواست کی ہے کہ بہنوں کے پروگرام کے فوراً بعد بہنوئیوں کا پروگرام ہونا چاہئے۔ جس میں پیٹ کی ان تمام بیماریوں کے علاج بتائے جائیں جو بہنوں کے پروگرام میں بتائے گئے پکوانوں کو کھانے سے ہوتی ہیں۔ اس پروگرام کی افادیت ضرور بڑھ جائے گی''۔ (3)

نریندر لوتھر نے بیروزگاری اور وقت کا زیاں کرنے والے لوگوں پر خوب تنقید کی ہے۔ حیدرآباد میں آج بھی ایسے کئی لوگ مل جائیں گے جو ہوٹلوں، چوراہوں اور کھیل کے میدانوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ہمارے

ملک میں کرکٹ سے لوگوں کو جنون کی حد لگاؤ ہے لیکن اس سے جو وقت کی بربادی ہوتی ہیں۔ اس پر نریندر لوتھر بڑے ہی شگفتہ انداز میں طنز کرتے ہیں۔

''کبھی کبھی ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سوالات آب حیات پی کر آئے ہیں۔ ایک شکل میں حل کیا تو دوسری شکل میں نمودار۔ لوگ کرکٹ کیوں کھیلتے ہیں جب کہ وقت ضائع کرنے کے اور بہتر ذرائع موجود ہیں۔ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں'' (4)

کہا جاتا ہے کہ تندرستی ہزار نعمت اور اس کے لئے لوگ کئی جتن کرتے ہیں۔ صحت مند رہنے کے لئے اکثر صبح چہل قدمی کرتے ہیں۔ اپنے مضمون ''سویرے کی سیر'' میں انھوں نے پارکوں اور باغات میں سیر یا چہل قدمی کرنے والے مختلف لوگوں سے قارئین کو روبرو کرایا ہے۔ وہ بڑے شگفتہ انداز میں ان لوگوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

''ان خالص سیر کرنے والوں کے علاوہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سیر کے بہانے کچھ ضروری کام کر لیتے ہیں...... ان لوگوں کے علاوہ ایک طبقہ ''قدرت پرستوں'' کا ہے۔ یہ لوگ پو پھٹنے سے پہلے اپنی سیر ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر اندھیرے میں غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عموماً ان لوگوں کے ہاتھوں میں ایک ٹوٹا ہوا ڈبّہ یا برتن ہوتا ہے۔ موقع ملتے ہی یہ لوگ درختوں کے پیچھے یا جھاڑیوں کی اوٹ میں غائب ہوجاتے ہیں' پھر نمودار ہوتے ہیں تو منہ میں لکڑی کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جسے چبانے کی وہ ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ لکڑی چبانے کی کوشش میں جو دانت بچ جائیں وہ نہایت مضبوط ہوجاتے ہیں۔ ایسے لوگ باقی سیر کرنے والوں سے بازی لے جاتے ہیں۔ واپس گھر پہنچنے تک یہ لوگ دو بٹا تین تیار ہوتے ہیں۔ کیا کیا جائے کچھ لوگ زندگی کی ہر تفریح سے کچھ نہ کچھ مفید نا جائز اور کارآمد پہلو نکال لیتے ہیں۔'' (5)

''ہم نے کیا کیا نہ کیا۔ بیوی سے جھگڑا نہ کرنے کے لئے'' ایک دلچسپ مضمون ہے۔ جس میں لوتھر نے اپنی گھریلو زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ لیکن اگر بین السطور پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو لیکر جھگڑے ہوتے ہیں اور ازدواجی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ لیکن اگر مصلحت سے کام لیا جائے تو ازدواجی زندگی نہایت کامیاب ہوجاتی ہے۔

> ''ہم نے ذرا غور کیا۔ اپنی پچیس سالہ ازدواجی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالی۔ وہ وقت یاد آیا جب بیگم کو ابھی کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ پہلی بار اپنے ہاتھ سے کھانا بنایا تھا۔ ہم نے کھایا تو پیچش کا زبردست حملہ ہوا۔ ٹھیک ہوئے تو پھر ویسا ہی کھانا بنایا۔ وہ کھانا کُتّا کھا گیا۔ بیگم روتی ہوئی آئیں اور شکایت کی کہ آپ کے لئے بنایا ہوا خاص کھانا کتا کھا گیا۔ ہم نے تسلی دی۔ کوئی بات نہیں ہم آپ کے لئے ایک اور کتا لے آئیں گے۔ اور واقعی لے آئے۔ اور ایک بار نہیں کئی بار۔ پھر ایک بار ہم نے کسی ہوٹل میں بہت ہی لذیذ کھانا کھایا۔ بیگم نے کہا'' اگر میں آپ کے لے ایسا ہی کھانا بناؤں تو مجھے آپ سے کیا ملے گا۔'' ہم نے کہا'' ہماری لائف انشونس کی پالیسی''۔ جھگڑا نہیں ہوا۔ پھر ایک بار شروع شروع میں رات سونے سے پہلے بیگم نے پوچھا۔ ''سب کچھ بند کردیا آپ نے''''ہاں۔ جو کچھ بند ہوسکتا تھا۔'' مطلب ! ''سوائے تماری زبان کے سب کچھ بند کردیا۔ جھگڑا ہوا'' (6)

ہر سال موسم گرما کے دوران پانی کی قلت ایک عام مسئلہ ہے۔ حکومت اس مسئلے سے نمٹنے کے لئے بلند بانگ دعوے تو ضرور کرتی ہے لیکن نتیجہ صفر ہی رہتا ہے۔ ''کمپیوٹر اور پانی'' مضمون میں وہ اس مسئلہ کے سہارے حکومت کی مختلف کوتاہیوں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

> ''پینے کے پانی کی قلت کی وجہ سے حکومتنے شراب بندی منسوخ کردی ہے۔ اب اگر آپ کو شدت کی پیاس لگی ہوئی ہو تو آپ بیر پی سکتے

ہیں۔اس میں پانی ملانے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔مناسب مقدار میں اسے پینے سے کافی دیر تک کسی قسم کی بھوک اور پیاس کا احساس نہیں ہوتا۔تھوڑی اور پینے سے بھوک اور پیاس تو کجا آپ کو اپنے گردوپیش اور چھوٹے بڑے کا فرق بھی محسوس نہیں ہوتا۔شراب کی مانگ بڑھانے کے لئے حکومت نے دوسال تک شراب بندی رائج رکھی۔جب مانگ بڑھی تب اسے برخاست کردیا گیا۔اس کو حکمت عملی کہتے ہیں۔"(7)

وہ کسی کی دل آزاری کو اچھا نہیں سمجھتے۔مزاح میں اصلاً جو بات پیش کرنی ہوتی ہے وہ عبارت میں کہیں آخر میں یا درمیان میں چھپی ہوتی ہے جسے پڑھنے کے بعد ان کے قاری کے ہونٹوں پر یکا یک مسکراہٹ کھل اٹھتی ہے۔ نریندر لوتھر کی زبان بہت زیادہ سادہ اور انداز سلجھا ہوا سنجیدہ اور سجیلا ہوتا ہے۔عصمت چغتائی نے ان کے مجموعہ مزاج پرسی کے ڈسٹ کور پر ان کی زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"نہ جانے لوتھر نے یہ زبان کہاں سے اٹھائی ہے"۔(8)

"ہوائی کولمبس"(سفرنامہ امریکہ) میں امریکہ کے مختلف شہروں کا مرقع بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔وہ ہمیشہ معیار کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس مجموعے میں شامل مضمون "جھنڈا ابھر تارے" میں امریکی حکمرانوں اور ہمارے سرکاری عہدیداروں کا جائزہ وہ بڑے شگفتہ انداز میں لیتے ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہم نے وائٹ ہاؤس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن دیکھنے میں یہ عمارت اتنی بڑی اور شاندار نہیں جتنا اس کا دبدبہ ہے۔ہندوستان میں کئی کلکٹروں کے سرکاری مکان اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہندوستان کا کوئی سرکٹ ہاؤس۔یہ عمارت چاروں طرف سے بڑی آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے۔اُس کی پچھلی طرف ایک چھوٹا سا کھمبا ہے۔وہ امریکہ کا مرکز ہے اور اسی نقطہ سے امریکہ کے تمام فاصلے ناپے جاتے ہیں۔......ہم نے اس مکان کے پیچھے کی طرف کھڑے ہوکر تصویر کھنچوائی

کیوں کہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر تصویر کھچوانا تو عام ہے۔''(9)

امریکی طرز معاشرت کا مضحکہ خیز جائزہ لیتے ہوئے کرسمس کے موقع پر دئے جانے والے تحفوں کے تعلق سے لکھتے ہیں:

آج کل تعریف کے طریقے بھی بدل گئے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تعریف سال کے ساتھ بھی کی جاتی ہے۔ ہم نے جس خاتون کو تحفہ دیا اس نے بظاہر فرط مسرّت سے ہمیں پوچھا۔ کیا یہ شاندار نہیں ہے؟ (Is'nt wonderful) ہم نے قدرے جھینپ کر کہا ''نہیں یہ تو بڑی معمولی سی چیز ہے۔ اسے ہم نے ڈسکاؤنٹ پر خریدا ہے۔'' سروج نے ہمیں سمجھایا کہ ایسے سوال کے جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ صرف شکریہ یا خوش آمدید پر ہی اکتفا کرنا چاہیے۔''(10)

''ہوائی کولمبس''، میں شامل مضامین میں نریندر لوتھر نے امریکی امارت، طاقت، جارحیت، ریشہ دوانیوں، بیرونی ممالک کے داخلی امور میں مداخلت، عالمی برتری، پراگندہ تہذیب اور دنیا کے مختلف گوشوں میں اس کا بالجبر فروغ، سائنسی ترقی بشمول طبی اور ایٹمی صلاحیتوں پر مزاحیہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان کا یہ سفر نامہ فنی لوازمات سے آراستہ نظر آتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''امریکہ دنیا کے بیشتر پچھڑے ہوئے ملکوں کو مالی اور ہتھیاری 'ایڈ' دیتا ہے۔ جب کئی ملک صیغہء واحد کی 'ایڈ' سے مطمئن نہیں ہوئے تو امریکہ نے 'ایڈس' دینا شروع کر دیا۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی جھگڑا ہو، تحریک آزادی ہو، انقلاب کی لہر ہو، رجعت پسندی کا ہنگامہ ہو، امریکن وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ وہاں پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں اور بسا اوقات سب ہنگامے ان کی موجودگی کی وجہ سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ ان حالات میں پہلے وہ ایک فریق کی مدد کرتے ہیں۔ پھر ثالث بن جاتے

ہیں۔اور کوئی اعتراض کرے تو دوسرے فریق کی مدد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔اس طرح امریکن فوجوں کی پریکٹس جاری رہتی ہے'اور ہمیشہ'فِٹ' رہتی ہے۔امریکن فوجیں ہر گھڑی یا تو کسی ملک میں'ورزش' کر رہی ہوتی ہیں'یا حقیقی جنگ۔دوسری فوجوں کی طرح وہ نِکمّا بیٹھ کر مفت کھانا پسند نہیں کرتیں۔''(11)

نریندر لوتھر اپنے اسلوب میں شائستگی کو برقرار رکھتے ہیں۔ان کا مشاہدہ کافی تیز ہے'وہ سماج کی ناہمواریوں کو اپنا ہدف بناتے ہیں۔ان کا طنز لطیف اور اثر انگیز ہوتا ہے۔اس سلسلے میں نامی انصاری رقمطراز ہیں۔

''نریندر لوتھر کی مزاحیہ تحریروں میں ظرافت بڑے شائستہ انداز میں اُجاگر ہوتی ہے۔بظاہر ان کے موضوعات ہماری روزمرہ زندگی کے اطراف سے آتے ہیں لیکن ان کی تیز نگاہیں ان میں چھپی ہوی بوالعجبیوں اور ناہمواریوں کو بھی دیکھ لیتی ہیں اور ان ہی سے وہ مزاح کی گلکاریاں پیدا کرتے ہیں ان کا طنز بھی لطیف اور خوشگوار انداز میں اُجاگر ہوتا ہے۔اور اس کا وار بھی موثر ہوتا ہے۔''(12)

ڈاکٹر ایس جے صادق نریندر لوتھر کے فن پر کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''نریندر لوتھر مزاح نگار سے زیادہ طنز نگار اور طنز نگار سے زیادہ لطیف طنز نگار ہیں۔کہتے ہیں کہ جارج برنارڈ شاہ نے زندگی بھر حملے کئے مگر کسی کو زخمی نہیں کیا۔نریندر لوتھر نہ تو حملہ کرتے ہیں اور نہ ان کے طنز کا مقصد زخمی کرنا ہے۔بلکہ ان کا لہجہ ویراگیوں کا سا ہے۔ان کے پاس نہ تو طنز نگار کی بالوث جذباتیت ہے اور نہ مزاح نگار کی معصومانہ کوشش''۔(13)

نریندر لوتھر ادب میں اہنسا کے پجاری ہیں۔انہوں نے نہ تو کسی کو زخمی کیا اور نہ کسی پر حملہ کیا اور ان کے طنز سے ان کے قاری یا سامع پر شائد کبھی ایک معمولی سی خراش پڑی ہو۔ان کا لہجہ ایک دبے کچلے آدمی کی سسکی جیسا ہوتا

ہے۔اسی لئے ان کے پاس طنز نگار کی جذباتیت اور مزاح نگار کی معصومانہ کوشش کی تلاش بے سود معلوم ہوتی ہے۔وہ خود کہتے ہیں کہ وہ بہت کم جذبات کے آدمی ہیں۔دوسری طرف وہ اپنے فن کی توصیف وتعریف کرواتے نظر آتے ہیں۔مزاج پرسی جوان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کا پیش لفظ انہوں نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ (جواس وقت جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبہ اردو کی سربراہ تھیں) سے لکھوایا اور ڈسٹ کور پر نثار احمد فاروقی،عصمت چغتائی،علی جواد زیدی اور بھارت چند کھنہ کے ذریعہ اپنے فن کی حمایت میں تعریفی اور تاثراتی خیالات کا پوسٹر لگوایا ہے۔اس طرح نریندر لوتھر نے نقادوں کو اپنے فن پر قلم اٹھانے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔اردو کے مشہور محقق پروفیسر گیان چند جین کا کہنا ہے کہ جس فنکار کو اپنے فن پر بھروسہ نہیں ہوتا وہ دوسروں کی تعریف وتوصیف کی بیساکھیاں تلاش کرتا ہے۔

ان کے موضوعات متنوع ہیں۔مزاح کو اچھوتا رنگ دینے کی کوشش میں ان کے ہاں الٹرا ماڈرن رنگ نمایاں ہوگیا ہے۔’’بیمہ‘‘ہم نے بچہ بٹھایا اور’’پانچواں کاف‘‘اچھے مضامین ہیں ’’مزاج پرسی‘‘اور’’ملاوٹ‘‘مزاحیہ ادب کے پامال موضوعات ہیں۔جبکہ ان کا مضمون’’ٹیلی فون‘‘پھیکا پھیکا سا ہے۔نریندر لوتھر کے مزاح کے بارے میں رائے دینے کا کام تو صرف اہل نقد کا ہے ہاں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مزاح کے میدان میں نریندر لوتھر کا قد زیادہ بڑا نہیں ہے۔

----OOO----

حوالہ جات

(1) نریندر لوتھر ''پانچواں کاف'' مضمون مشمولہ ''بند کواڑ'' صفحہ 60، مطبوعہ 1962ء

(2) نریندر لوتھر ''حجام کی دوکان'' مضمون مشمولہ ''مزاج پرسی'' صفحہ 119-120، مطبوعہ 1973ء

(3) نریندر لوتھر ''ریڈیو سے عشق'' مضمون مشمولہ ''مزاج پرسی'' صفحہ 1

(4) نریندر لوتھر ''چیستاں چیستاں ہے زندگی اپنی''، مضمون مشمولہ ''مزاج پرسی'' صفحہ 157

(5) نریندر لوتھر ''سویرے کی سیر'' مضمون مشمولہ: ''الف تحاشہ'' ص 83

(6) نریندر لوتھر ''ہم نے کیا کیا نہ کیا۔ بیوی سے جھگڑا نہ کرنے کے لئے'' مضمون مشمولہ: شگوفہ' جنوری فروری 1991ء (سالنامہ) ص 18

(7) نریندر لوتھر ''کمپیوٹر اور پانی'' مطبوعہ 'شگوفہ' خلیج نمبر جون 2004 ص 186

(8) عصمت چغتائی ''گرد پوش تحریر'' مشمولہ: مزاج پرسی' از نریندر لوتھر

(9) نریندر لوتھر ''جھنڈا ابھر تارے'' شگوفہ جون 1990ء ص 31

(10) نریندر لوتھر ''ایک ملک دو تہوار'' (ہوائی کولمبس) مطبوعہ: شگوفہ' اگست 1990ء

(11) نریندر لوتھر ''ہوائی کولمبس'' مطبوعہ ''شگوفہ' جنوری 1989ء ص 47-46

(12) نامی انصاری ''بیسویں صدی میں طنز و مزاح'' ص 276 سنہ 2002ء

(13) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و مزاح، آزادی کے بعد'' صفحہ 515

مسیح انجم

نام مسیح الدین قلمی نام مسیح انجم ہے۔ان کی پیدائش ضلع میدک کے سدی پیٹ تعلقہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ویلکٹور میں 6 اکتوبر 1933ء کو ہوئی۔ ان کے چچا چونکہ لا ولد تھے اس لئے انہوں نے مسیح کو گود لے لیا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کی چاوڑی میں ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب حکومت یا کوئی رضا کار ادارہ گاؤں میں اسکول قائم نہ کرتا تو گاؤں والے ہی کسی تھوڑے بہت پڑھے لکھے آدمی کو برائے نام فیس پر بچوں کو پڑھانے پر مامور کردیتے تھے۔ یہ تلگو وغیرہ پڑھایا کرتا تھا۔قلم و تختی سے شناسائی کے بعد مسیح انجم کو سدی پیٹھ ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ جہاں سے انہوں نے میٹرک کامیاب کیا اور روزگار کی تلاش میں حیدرآباد چلے آئے اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے۔خانگی طور پر بی اے اور بی ایڈ کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی اور پیشہ تدریس سے وابستہ ہوئے۔

1966ء میں حیدرآباد میں شائع ہونے والے روزنامے ''ملاپ'' میں افسانہ شائع کرتے ہوئے اپنے ادبی سفر کی شروعات کی۔ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ''چھٹتی نہیں منہ سے'' روزنامہ ''رہنمائے دکن'' میں شائع ہوا۔اُس وقت رہنمائے دکن کے ادبی ایڈیشن کے مدیر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال تھے۔انہوں نے مسیح انجم کی کافی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح اردو دنیا کو جو چند بہترین مزاح نگار ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد سے ملے ان میں سے ایک مسیح انجم بھی ہیں۔ جن کے متعدد مضامین ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے اپنے ماہنامے ''شگوفہ'' میں شائع کئے۔

مسیح انجم نے اپنے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ''سائیڈ سے چلئے'' 1972ء میں شائع کیا اپنی مزاح نگاری میں وہ سنبھلی ہوئی کیفیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ مسیح انجم ایک معمولی قد و قامت کے حامل' منکسر المزاج، حلیم طبع، بردبار خاموش اور گمبھیر طبیعت کے مالک تھے۔ممتاز مزاح نگار پرویز یداللہ مہدی نے اپنے ایک خاکہ ''قبل مسیح سے قبلہ مسیح تک'' میں بڑی خوبصورتی سے ان کا مرقع کھینچا ہے۔ یہ خاکہ انہوں نے مسیح انجم کے انتقال پر لکھا تھا۔جس میں انہوں نے مسیح انجم کی چند پوشیدہ خصوصیات اور ان کی انسان دوستی کی طرف توجہ دلائی ہے۔لکھتے ہیں:

مسیح صاحب بنیادی طور پر درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے

وہی درس وتدریس جو کبھی واقعی باعزت پیشہ ہوا کرتا تھا۔لیکن خدا بھلا کرے چند تاجرانہ ذہنیت کے حامل اساتذہ کا جن کی مہربانیوں سے علم بھی فی زمانہ متاع کوچہ و بازار کے دریچہ پر پہنچ چکا ہے البتہ مسیح صاحب چونکہ اکل حلال کے قائل تھے اس لئے اپنے شاگردوں کے ساتھ کبھی بے ایمانی نہیں کی جو مضامین ان کے ذمہ تفویض ہوا کرتے وہ تو خیر پوری دیانت داری کے ساتھ پڑھایا کرتے ان کے علاوہ وہ مضامین بھی فاضل اوقات میں پڑھا دیا کرتے جو ان کے ذمہ نہیں ہوا کرتے۔ان کا یہ ایمانداری، دیانت داری سے بلا معاوضہ عہدہ برآ ہونا دوران ملازمت بھی ان کے کام آیا اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کام آیا۔چنانچہ ان کے شاگرد جب اور جہاں انہیں دیکھتے،عقیدت اور احترام سے ان کی گردنیں جھک جایا کرتیں۔اس طرح مسیح صاحب نے اس باعزت پیشے سے وابستہ علم کے بیوپاریوں کی طرح علم بیچ کر چاندی کے سکے نہیں کمائے۔سعادت مند شاگرد کمائے تھے‘‘۔(1)

مسیح انجم اپنی مزاح نگاری میں ایک سنبھلی ہوئی اور سلجھی ہوئی کیفیت کے حامل نظر آتے ہیں۔وہ بے ہنگم شور سے پرہیز اور لطیفوں سے گریز کرنے والوں میں سے ہیں اور اپنی تحریروں کو ان دوحربوں سے پاک رکھنے کی حتیٰ الامکان کوشش کرتے ہیں۔اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہیکہ وہ مزاحیہ انداز میں افسانے پیش کرتے ہیں یا افسانوی رنگ میں مزاحیہ سچوئشن پیدا کرتے ہیں۔ان کے پاس کسی قسم کی بے اعتدالی نہیں پائی جاتی چنانچہ ڈاکٹر ایس جے صادق مسیح انجم کی مزاح نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’نہ تو شورغوغا سے کام لیتے ہیں اور نہ لطیفوں کی بیساکھی کے سہارے چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے پاس کسی قسم کی بے اعتدالی نہیں ملتی۔جس طرح وہ منکسر المزاج،حلیم الطبع، بردوبار، خاموش اور گمبھیر ہیں۔اسی طرح مزاح نگاری میں بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے شائد اسی لئے ان کا مزاح کوئی ہنگامہ برپا نہیں کرسکتا۔افسانہ بُننے یا رنگین زبان لکھنے کی ان

میں صلاحیت نہیں پائی جاتی۔اس اپنے مزاح کی اساس، حرکت اور واقعات پر رکھتے ہیں''۔(2)

اپنے مزاح کو حادثات اور واقعات سے پیدا کرنے والے مسیح انجم بے حد خاموشی سے ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو روانی میں شائد سمجھ میں نہ آئے۔لیکن اگر بعد میں غور کیا جائے تو ہونٹوں پر تبسم کی لکیر ضرور آ جاتی ہے۔انہوں نے سماج اور ملک کی سیاست کو طنز کا نشانہ بنانے سے گریز کیا ہے اور اپنی ذات کو نشانہ بناتے ہوئے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے ایک مضمون سے اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔

''ایک بار سڑک پر چلتے چلتے ہمارا ہاتھ عالم بے خیالی میں اپنے پینٹ کی جیب میں چلا گیا۔اسی وقت اچانک 4-6 مسٹنڈے ہمارے اطراف یوں نمودار ہو گئے جیسے گھیراؤ کر رہے ہوں۔ہم نے فوراً گھبرا کے پوچھا''کیا ہے؟ سب نے ایک ساتھ گمبھیر آواز میں کہا''کچھ نہیں خیرات، ہم نے اضطراری کیفیت کے تحت فوراً چونی دے دی اور قدرے غصیلے لہجے میں کہا ''بھیک مانگتے وقت دھمکانے کا سا انداز اچھا نہیں''ان میں سے ایک مسکراتا ہوا بولا اس طرح مانگنے سے انسان کو سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں ملتی اور وہ گھبراہٹ کے تحت فوراً کچھ نہ کچھ دے دیتا ہے'' یہ وضاحت سن کر ہماری زبان سے''آہ'' کے بجائے''واہ'' نکل گئی۔کیونکہ واقعی اس وقت ہماری نیت خیرات دینے کی نہیں تھی''۔(3)

اپنے آپ کو مذاق کا نشانہ بنانا انتہائی اعلیٰ ظرفی کا متقاضی ہوتا ہے۔مسیح انجم کی اس اعلیٰ ظرفی کے وصف سے متعلق ان کی دوسری تصنیف در پردہ کے ڈسٹ کور کے فلیپ پر کرشن چندر لکھتے ہیں:

''ان کے دلچسپ مزاح کی اساس پر زیادہ تر حرکی اور واقعاتی ہے۔ان کے مضامین میں نہ محض لطیفہ بازی ہے نہ فقرے بازی بلکہ مزاحیہ اور مضحک واقعات کے تواتر اور ترتیب سے مزاح اور استہزا کی تخلیق کی گئی ہے جو دلچسپ

اور کامیاب ہے انکے مزاح کی ایک اور خصوصیت بھی مجھے بے حد پسند آئی وہ
یہ کہ دوسروں پر ہنسنے کے بجائے وہ خود اپنے آپ پر ہنستے ہیں''۔(4)

مسیح انجم نے اپنی مزاحیہ تحریروں میں جو زبان استعمال کی ہے وہ عام وسادہ ہے ان کی زبان بے حد رواں ہے۔عموماً ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ مزاح نگار محض مزاح پیدا کرنے کیلئے زبان کو بگاڑ کر پیش کرتے ہیں لیکن مسیح انجم نے زبان کی حرمت کو ہمیشہ باقی رکھا۔ان کے مزاح میں رکاکت اور عامیانہ پن کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ان کا مزاح شائستہ اور مہذب ہوتا ہے۔ان کے مضامین محض قاری کو ہنسانے کیلئے نہیں بلکہ انہیں پڑھنے کے بعد وہ کچھ سوچنے پر مجبور بھی ہوتا ہے۔ان کے مضمون ''سائیڈ سے چلئے'' کا اقتباس دیکھئے:

''یہ جو نوجوان سائیکل پر سوار ہے اپنی مقررہ سائیڈ سے پتنگ کی طرح
کٹ گیا ہے۔نہ جانے اسے ریس کی کیوں سوجھی اب وہ موٹروں سے بھی
آگے نکل جانا چاہتا ہے مگر افسوس کہ وہ موٹروں کی سائیڈ کاٹ کر اس قدر
آگے نکل گیا ہے کہ اب اس دنیا میں اس کی واپسی کا امکان نہیں''۔(5)

متوسط طبقہ کا آدمی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے اور اسے زندگی بہت حساس اور ذمہ دار بنا دیتی ہے۔یہی وجہ ہیکہ مسیح انجم اپنے مزاح کے موضوعات کا انتخاب بڑی ہوشیاری سے کرتے ہیں یہ اقتباس دیکھئے:

''ایک دوست کی سفارش سے سر چھپانے کیلئے ایک مشترکہ مکان میں
ایک کمرہ مل گیا۔مگر اس مکان میں کمرہ حاصل کرنے کیلئے، ہمیں کئی پاپڑ بیلنے
پڑے۔سب سے پہلے ہمیں شادی کر کے ایک اور مصیبت اپنے گلے ڈال
لینی پڑی کیونکہ مشترکہ مکان میں کنواروں کا داخلہ ممنوع ہے۔نہ صرف ہمیں
شادی کرنی پڑی بلکہ مالک مکان کے بے حد اصرار پر ان کے آگے ''سیہ
نامہ'' پیش کرنا پڑا تا کہ شادی کے ''بوگس'' ہونے کا شبہ رفع ہو جائے۔یہی
نہیں ہمارے کیریکٹر اور تنخواہ وغیرہ کے بارے میں اتنی ساری پوچھ گچھ کی گئی
کہ ہمارے سسرالی رشتہ دار ہمارے تعلق سے عجیب وغریب شک وشبہات

میں مبتلا ہوگئے...... چنانچہ ہم نے مالک مکان کے سامنے پوری سعادت مندی کا مظاہرہ کیا تب کہیں جا کر سر چھپانے کو جگہ ملی''۔(6)

مضمون''ریڈی میڈ عید'' میں مسیح انجم نے ایک ایسے نوکری پیشہ شخص کی تصویر کشی کی ہے جو اپنی محدود آمدنی کے سبب اپنے گھر والوں کی خواہشات کو پورا نہیں کر پاتا لیکن اس کی بیوی مختلف طریقوں سے اپنی خواہشات کا اظہار کرتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

''جب بیوی نے ہمیں اڑوس پڑوس کی عید کی تیاریوں کے حوالوں سے طعنے دینے شروع کئے تو ہم نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا اور جب کبھی جوش میں آنے کی نوبت آئی تو فوراً ہم نے برف کی تھیلی اپنے سر پر کھولی۔ اگر برف نہ ملا تو ٹھنڈے پانی کی پٹیاں استعمال کیں۔ جب تمام حربے ناکام ثابت ہو چکے تو بیگم نے ایک آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے افسردہ لہجے میں یوں کہا تھا۔ ہمارا کیا ہے... ہم بغیر نئے کپڑوں کے بھی عید منا سکتے ہیں... آپ کا حال مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔... کم از کم اس عید کے بہانے ایک ٹریلین کی شیروانی سلوالیں تو کتنا اچھا رہے گا... دفتر جانے والوں کو ایک سے دو قیمتی جوڑے ہونے ہی چاہئیں۔ اگر آپ ان جملوں کی گہرائی میں جائیں تو پتہ چلے گا کہ کس طرح بیوی نے ہمارے توسط سے اپنے لئے ٹریلین کی ساڑی کا بندوبست کر لیا تھا وہ تو ہم ہی تھے جو اپنے آپ کو صاف بچا لے گئے''۔(7)

مسیح انجم اپنی تحریروں میں میانہ روی اختیار کرتے ہیں ان کی تخلیقات میں ایک لطیف سی کیفیت نظر آتی ہے۔ وہ لوگوں کو ہنسانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔

''ہمارے کھلاڑی اتنے گئے گذرے بھی نہ تھے۔ صرف قابل رحم حالت تھی تو ہماری تھی۔ کھلاڑیوں میں ہماری حیثیت انگشت ششم کی سی تھی۔

جو بدن کا ایک بدنما حصہ تصور کی جاتی ہے۔ اتفاق سے ہماری بنیان پر نمبر چھ
ہی درج تھا۔ ایک شور و غوغا بلند ہوا نمبر چھ کو بھیجو۔ چھکا Wanted، چھنگلی
وانٹیڈ ... مشاقان دید کی فرمائش پر ہمارے کپتان نے ہمیں اپنا فن پیش
کرنے کا اشارہ کیا۔ یہ ہمارے حق میں اشارہ نہیں تھا بلکہ موت کا ایک سگنل
تھا۔ کپتان کے حکم کی تعمیل میں ہم مجمع پر ایک حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے
سنٹر لائن کی طرف بڑھے۔ اس وقت ہم پر سکرات کا عالم طاری تھا اور نہ
جانے کیوں رہ رہ کر یہ شعر زبان پر آتا تھا۔

دیکھ کر اسکرات کا سگنل اسے سمجھ مت کھیل
چھوڑ مسافر لائن بقا کی آئی فنا کی ریل! (8)

مزاح نگاری کی اولین شرط بیوقوفی اور بے احتیاطی سمجھی جاتی ہے لیکن مسیح انجم ان پر خطر راہوں سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ وہ خطرات کو کبھی دعوت نہیں دیتے بلکہ اس سے دامن بچا کر میانہ روی اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا مخصوص مزاج اور ان کی مخصوص ذہنیت انہیں اس بات کی طرف مائل ہونے ہی نہیں دیتی۔ ان کے مضامین میں مزاح کی ایک لطیف سی کیفیت اور سرور نظر آتا ہے۔ گہرا طنز ان کے پاس ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ اس لئے وہ ہلکے پھلکے اشاروں کنایوں سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے مزاح میں چستی اور روانی نظر نہیں آتی اسی لئے ان کے بیشتر مضامین سست روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بالآخر ارباب مقتدر کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ نقل مارتے مارتے اس پارٹی کے اراکین کی عقل ماری گئی ہے۔ اور اب وہ کسی طرح ماننے والے نہیں تو انہوں نے تجرباتی اساس پر ایک علٰحیدہ ریاست ''مملکت'' کے قیام کی منظوری دیدی۔ بس پھر کیا تھا۔ نقالوں نے تالیں پیٹیں۔ اور گنتی کے چند دانشور اپنا اپنا سر پیٹ کر رہ گئے۔ نتیجتاً ان کے سر کے رہے سہے بال بھی جھڑ گئے۔ چنانچہ 31 مارچ کی رات کو ٹھیک بارہ بج کر ایک سیکنڈ پر جبکہ گھڑی ''فرسٹ اپریل'' کا اعلان کرتی ہے ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ اُلو کی صدا

بلند کر کے ''مملکت نقلستان'' کے قیام کا اعلان بڑے دھڑلے سے کیا گیا۔
اور دوسرے ہی روز ایک بہت بڑا بورڈ شہر کے بیچوں بیچ نصب کیا گیا جس پر
لکھا ہوا تھا:

"Experimental State To Promote Acting and
Duplicating in Each And Every Feild" (9)

مسیح انجم کی تحریروں میں وعظ و نصیحت کا عنصر بھی ملتا ہے۔ یہ بات کسی بھی تخلیق کے لئے مناسب نہیں اور مزاح نگاری میں تو بری طرح کھٹکتی ہے۔ مزاح میں نصیحت اور راست اشارہ انگشت نمائی کے زمرے میں آتا ہے۔ چنانچہ ایس جے صادق لکھتے ہیں:

''Moralsing بری عادت ہے۔ مسیح انجم کو اس بات سے واقف ہونا چاہئے کہ مزاح نگاری میں نصیحت Advise نہیں چلتی۔ وعظ تو مزاح اور طنز کے لئے پوٹاشیم سائنائیڈ ہے۔ یہ بات نہیں کہ مسیح انجم مزاح نگاری کے حربوں سے واقف نہیں ہیں وہ لوگوں کو ہنسانے کے گر سے بخوبی واقف ہیں'' (10)

مسیح انجم کی تحریروں کو اگر اس عیب سے قطع نظر کر کے پڑھیں تو محسوس ہوگا کہ انہیں بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے اور وہ اس فن سے بخوبی واقف ہیں کہ کس موضوع کو کس ڈھنگ سے پیش کیا جائے۔ مزاح لکھتے وقت وہ عام قاری کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں موضوعات کی رنگارنگی ہے جن کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ جس میں ہمیں اس طبقہ کی روزمرہ زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ بعض جگہ انہوں نے معمولی معمولی واقعات سے بھی مزاح پیدا کیا ہے۔ مسیح انجم کی تصانیف کے بارے میں مجتبیٰ حسین کی رائے سے بڑی حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مسیح انجم ایک باشعور اور چوکس مزاح نگار ہیں ایک اچھے مزاح نگار کیلئے صرف کسی کا مذاق اڑانا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اسے یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ آخر کس کا مذاق اڑایا جائے۔ یہی وجہ ہیکہ وہ اپنے مزاح کے موضوعات کا انتخاب بڑی ہوشیاری سے کرتے ہیں اور وہ اپنے مزاح میں شدید بھی

نہیں ہوتے بلکہ ان کا مزاح ہم آہنگی اور رچاؤ کے تابع ہوتا ہے''۔(11)

مسیح انجم کی تحریروں میں شگفتگی، ظرافت اور مزاح کی ہلکی ہلکی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔طنز کی کڑواہٹ سے ان کی تحریر دور نظر آتی ہے۔ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال' مسیح انجم کو ان کے ہم عصر مزاح نگاروں میں سب سے آگے قرار دیتے ہیں۔لکھتے ہیں:

> ''وہ ہر بات میں مزاح کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ اپنی تحریر کو لطیفوں، مسخرگی اور مبالغہ سے بوجھل نہیں کر دیتے۔مبالغہ ان کے ہاں ہے ضرور، لیکن اس قدر نہیں کہ محض وقتی اور لمحاتی تاثر پیدا کرے۔وہ بڑے مہذب انداز میں قاری کا دل جیت لیتے ہیں''۔(12)

حیدرآباد میں طنز ومزاح کے فروغ کے سلسلے میں دوسروں کے بہ نسبت مسیح انجم نے غیر معمولی خدمات انجام دیں ہیں۔مسیح انجم ایک ایسے مزاح نگار ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں سے لوگوں کو نہ صرف محظوظ کیا بلکہ سنجیدہ مسائل کی فکر کرنے کی دعوت بھی دی۔حیدرآباد کے مزاح نگاروں میں وہ ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔

-- OOO--

حوالہ جات

(1) پرویز یداللہ مہدی ''قبل مسیح سے قبلہ مسیح تک''مضمون مطبوعہ ''شگوفہ''پرویز یداللہ مہدی نمبر ،صفحہ 72
(2) ڈاکٹر ایس جے صادق'' اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد'' صفحہ 525
(3) مسیح انجم ''اگر اور جیتے رہتے حاتم طائی''مضمون مشمولہ:''در پردہ'' صفحہ 42 مطبوعہ 1976ء
(4) کرشن چندر گرد پوش تحریر اندرونی فلپ مشمولہ''در پردہ'' از مسیح انجم
(5) مسیح انجم ''سائیڈ سے چلئے'' مضمون مشمولہ:''سائیڈ سے چلئے'' صفحہ 135
(6) مسیح انجم ''مشترکہ مکان'' مضمون مشمولہ''در پردہ'' صفحہ 9-8
(7) مسیح انجم ''ریڈی میڈ عید'' مضمون مشمولہ''در پردہ'' صفحہ 75
(8) مسیح انجم ''ہم نے بھی کبڈی کھیلی''مضمون مشمولہ''در پردہ'' صفحہ 65
(9) مسیح انجم ''نقلستان'' مضمون مشمولہ''در پردہ'' صفحہ 46-45
(10) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد'' صفحہ 596
(11) مجتبیٰ حسین گرد پوش تحریر بیرونی فلپ مشمولہ''در پردہ'' از مسیح انجم
(12) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال گرد پوش تحریر بیرونی فلپ 'مشمولہ''در پردہ'' از مسیح انجم

مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین نے 15 جولائی 1936 کو ضلع گلبرگہ کے تعلقہ چنچو لی میں آنکھیں کھولیں۔مجتبیٰ حسین کے دادا محمد حسین ریاست حیدرآباد کی تحصیل عثمان آباد میں بحیثیت اہلکار برسرکار تھے۔محمد حسین کے دو بیٹے تھے۔احمد حسین اور محمد اسحق۔احمد حسین بچپن ہی سے ذہین واقع ہوئے تھے۔تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازم ہوئے اور تحصیلدار کے عہدے تک ترقی کی۔ملازمت کے وجہ سے ان کا زیادہ عرصہ گلبرگہ میں گذرا۔انھیں دس اولادیں ہوئیں' نولڑکے اور ایک لڑکی۔ان میں محبوب حسین جگر' ابراہیم جلیسؔ اور مجتبیٰ حسین نے اردو ادب وصحافت میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔اس کے علاوہ ان کے دیگر بھائیوں کے نام اس طرح ہیں۔عابد حسین' یوسف حسین' اقبال حسین' محمود حسین' خورشید حسین' اور سرتاج حسین۔

مجتبیٰ حسین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی بعد ازاں سیدھے چوتھی جماعت میں گلبرگہ کے مدرسہ تحتانیہ آصف گنج میں داخل کردیئے گئے۔ملک کی تقسیم اور سقوط حیدرآباد کے وقت مجتبیٰ حسین آٹھویں جماعت میں زیرتعلیم تھے۔1953 میں انھوں نے گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا۔اور گریجویشن کی تکمیل کے لئے حیدرآباد کا رخ کیا۔حصول تعلیم کے دوران مجتبیٰ حسین اکثر ہاسٹلوں میں مقیم رہے۔مجتبیٰ حسین اپنے مجموعہ ''تکلف برطرف'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

> ''اپنی چھوٹی سی زندگی کا نصف حصہ ہاسٹلوں میں گذار چکا ہوں اسی لئے اپنے
> گھر کو بھی ہاسٹل کی طرح استعمال کرتا ہوں اور بیوی کو وارڈن سمجھتا ہوں۔''(1)

1956 میں عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی۔گریجویشن کی تکمیل کے بعد 1956 میں ہی ان کی شادی ان کی چچازاد بہن ناصرہ رئیس کے ساتھ ہوئی۔اسی دوران انھوں نے ایوننگ کالج سے ڈپلوما اِن پبلک ایڈمنسٹریشن کا امتحان بھی کامیاب کیا۔

مجتبیٰ حسین چند مہینے حیدرآباد کے محکمہ مال میں ملازم رہے لیکن یہ ملازمت ان کی طبیعت سے میل نہ کھاتی تھی اسی لئے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ 31 جولائی 1962 کو جب روزنامہ سیاست کے مشہور کالم نگار شاہد صدیقی کا انتقال ہوا تو محبوب حسین جگر کے مشورے پر روزنامہ 'سیاست' سے جڑ گئے اور ''کوہ پیا'' کے فرضی نام سے 12 اگست 1962 سے کالم نگاری کرنے لگے۔ یہ کالم ''شیشہ و تیشہ'' کے عنوان سے آج بھی جاری ہے لیکن کوئی اور اس کو لکھ رہا ہے۔ اسکے علاوہ رسالہ ''پونم'' کے لئے بھی انھوں نے کالم لکھا۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے اصلی نام سے پہلا مزاحیہ مضمون ''ہم طرفدار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں!'' 1964 میں لکھا۔ یہ مضمون ماہنامہ ''صبا'' میں شائع ہوا۔

مجتبیٰ حسین 1962 سے 1972 تک حکومت آندھرا پردیش کے محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ سے بھی وابستہ رہے۔ حکومت ہند نے جب اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لئے گجرال کمیٹی تشکیل دی تو انہیں اس کمیٹی کے شعبہ تحقیق میں کام کرنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ 10 نومبر 1972 کو مجتبیٰ حسین اپنی نئی ذمہ داری کا جائزہ حاصل کرنے کے لئے دہلی روانہ ہوگئے۔ کمیٹی کا جب کام ختم ہوا تو 19 ستمبر 1974 کو نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT) سے وابستہ ہوکر کونسل کے پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ میں شعبہء اردو کے ایڈیٹر بن گئے اور پھر 1991 میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

مجتبیٰ حسین کی چار اولادیں ہیں، دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ بڑی لڑکی راشدہ گلبرگہ میں تاریخ کی لیکچرر ہیں، بڑے داماد غلام صمدانی الیکٹریکل انجینئر ہیں اور گلبرگہ میں مقیم ہیں۔ بڑے لڑکے ہادی حسین ریاض (سعودی عرب) میں سیول انجینئر ہیں۔ چھوٹے بیٹے مصباح حسین نے ماسکو کی لومبا یونیورسٹی سے میکانیکل انجینئر نگ میں ایم ایس کی ڈگری لی ہے۔ آج کل وہ دہلی کی ایک فرم میں ملازم ہیں۔ چھوٹی بیٹی نجیبہ نے بی اے بی ایڈ کیا ہے اور دہلی میں مقیم ہے، چھوٹے داماد لیاقت علی خاں مرکزی وزارت فینانس میں ملازم ہیں اور دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔

حیدرآباد میں سرکاری ملازمت کے دوران وہ کسی بھی طرح ''شیشہ و تیشہ'' کالم کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ دہلی منتقل ہونے کے بعد کالم نگاری تو ممکن نہ تھی لہٰذا انھوں نے دہلی میں ہونے والے ادبی جلسوں کی رپورٹنگ کے ذریعہ خود کو روزنامہ 'سیاست' سے جوڑے رکھا۔

زندہ دلان حیدرآباد کے قیام کے بعد ملک بیرون ملک طنزومزاح کے فروغ کے لئے ''زندہ دلان'' کی

انجمنیں قائم ہونا شروع ہوئی۔اسی طرح کی ایک اکیڈیمی فرانس کے دارالحکومت پیرس میں بھی قائم ہوئی۔اس خبر کو موضوع بناتے ہوئے مجتبیٰ حسین ''شیشہ و تیشہ'' (18 اگست 1962ء شنبہ) میں لکھتے ہیں۔

''یوروپ میں گونگوں، بہروں، اندھوں اور دردمندوں کی انجمنوں کی کوئی کمی نہیں، بلکہ ایک ڈھونڈ یئے تو ایسی ہزاروں انجمنیں مل جاتی ہیں۔لیکن ''زندہ دلان پیرس'' نے ایک نئی وضع کی اکیڈیمی قائم کی ہے۔جس کا مقصد فرانس میں ہنسی مذاق کو فروغ دینا ہے اس اکیڈیمی کے بے شمار اغراض و مقاصد میں سے ایک حقیر مقصد یہ بھی ہے کہ یکم اپریل کو عام تعطیل دلوانے کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا جائے تاکہ اس دن فرانس کے سارے باشندے فلک شگاف قہقہہ بلند کرتے رہیں اور سرزمین فرانس زعفرانِ زار بن جائے۔'' (2)

22 اگست 1962ء کے ''شیشہ و تیشہ میں انھوں نے سویڈن میں چوری کی ایک خبر کو اپنا موضوع بنایا' لکھتے ہیں۔

''ان دنوں دنیا کی ہر شئے نہ صرف مقصدی بلکہ ہمہ مقصدی ہونے لگی ہے۔مثال کے طور پر ادب مقصدی ہوتا ہے، فلمیں مقصدی ہوتی ہیں اور پراجکٹس ہمہ مقصدی ہوتے ہس۔مقصدی اور ہمہ مقصدی کی طرح بے مقصدی کی ایک اصطلاح وجود میں آرہی ہے۔مقصد اب چوری کی لاتعداد اقسام کو دو بڑے شعبوں، مقصدی اور غیر مقصدی میں تقسیم کیا جانے لگا ہے۔مقصدی چوری تو وہ ہے جس سے ہمارے آبا واجداد بھی واقف تھے اور ہم بھی واقف ہیں۔غیر مقصدی چوری ذرا نئی بات ہے جس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ''مال صاف کرنے'' کے بجائے صرف ہاتھ صاف'' کیا جائے۔

اس تمہید کا مقصد اس بے مقصد سرقہ کی واردات کی طرف اشارہ کرنا ہے جو مغربی سویڈن کے شہر گوتھن برگ میں ہوئی ہے۔ہوا یہ ہے کہ وہاں ایک

نوجوان نے مگر مچھ کے ایک بچے کی چوری کی ہے جو تین فٹ لانبا ہے۔‘‘(3)

مجتبیٰ حسین کی اب تک 20 تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

-1	تکلف برطرف	1968
-2	قطع کلام	1970
-3	قصہ مختصر	1972
-4	بہر حال	1974
-5	آدمی نامہ	1981
-6	بالآخر	1982
-7	جاپان چلو جاپان	1983
-8	الغرض	1987
-9	سو ہے وہ بھی آدمی	1987
-10	چہرہ در چہرہ	1993
-11	شیشہ و تیشہ	1994
-12	سفر لخت لخت	1995
-13	آخر کار	1997
-14	ہوئے ہم دوست جس کے	1999
-15	میرا کالم	1999

اس کے علاوہ ان کے مضامین اور کالموں پر مشتمل کتابیں جسے دوسروں نے مرتب کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

-16	مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں	2002
-17	مجتبیٰ حسین کے سفر نامے	2003
-18	مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم	2004
-19	آپ کی تعریف (دو جلدوں میں)	2005

-20	کالم برداشتہ	2006
-21	اردو ادب کے تین بھائی	2009

ہندی میں ان کی 7 سات تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں بعض اردو کتابوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔

-1	قصہ آرام کرسی کا	1987
-2	جاپان چلو جاپان چلو	1988
-3	سوئیز بنک میں کھاتا ہمارا	1990
-4	سندباد کا سفرنامہ	1994
-5	چہرہ در چہرہ	1999
-6	مجتبیٰ حسین رچناولی	
-7	مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں	

مجتبیٰ حسین کی کئی تصانیف دوسری زبانوں بشمول انگریزی، روسی، جاپانی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ''شیشہ و تیشہ'' شاہد صدیقی مرحوم کے مزاحیہ کالموں کا انتخاب ہے جو مجتبیٰ حسین نے مرتب کیا ہے۔ اور ''جاپان چلو جاپان چلو'' ایک سفر نامہ ہے۔ مختلف معروف اور غیر معروف اشخاص کے مرقعوں کو انھوں نے ''آدمی نامہ'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں سماج کے دبے کچلے مجبور و لاچار انسانوں کے لئے دردمندی کا احساس خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جس سے ان کی تحریروں میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین میں ایسے کردار کثرت سے ملتے ہیں جو دلچسپ اور خاص ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف طبقات کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے تعلق سے کرشن چندر نے ''تکلف برطرف'' کے گرد پوش پر یہ رائے لکھی ہے۔

> ''مجتبیٰ حسین صحیح معنوں میں مزاح نگار ہیں وہ ان مزاح نگاروں میں سے ہیں جو شائستہ اور نفیس ادب کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ ان کے مزاح میں وہ تندی اور بیباکی نہیں جو طبیعت کو مکدر کر دیتی ہے بلکہ وہ رچاؤ اور لطافت ہے جو پڑھنے والے کو کبھی زیر لب تبسم، کبھی بلند آہنگ قہقہے کی دعوت دیتی ہے۔ مزاح نگاری

ایک مشکل فن ہے۔مجتبیٰ حسین ان مشکلات سے بخوبی واقف ہیں۔مجتبیٰ کا فن
اردو کے مزاحیہ ادب میں یقیناً ایک خوشگوار اضافہ ہے۔“(4)

کرشن چندر کی یہ رائے مجتبیٰ حسین کے فن پر جامع تنقید اور تحسین ہے۔مجتبیٰ حسین کا شمار دور حاضر کے صف اول کے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔انھیں اپنے دونوں بڑے بھائیوں محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیسؔ سے زیادہ شہرت ملی۔خود مجتبیٰ حسین اپنے ادبی مقام سے واقف ہیں۔لیکن کبھی وہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ برجستگی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی مجتبیٰ حسین کی شخصیت کا خاصہ ہے۔نامی انصاری لکھتے ہیں۔

”مجتبیٰ حسین نے زندگی کو ایک عام آدمی کی طرح برتا ہے اور وہ اس کی کھٹاس، مٹھاس کا ہر ذائقہ خود چکھا ہے۔اسی لئے ان کے فن میں زندہ دلی اور روشن دماغی کی آب و تاب بھی ہے اور وہ ادبی حسن کاری بھی جس سے کوئی فن وقار اور اعتبار حاصل کرتا ہے۔وہ انسانی جبلت اور انسانی نفسیات کے ماہر نبض شناس ہیں۔ان کا مزاح بھی انسانی صورت حال ہی کی نشاندہی کرتا ہے۔وہ محض لفظوں کے ہیر پھیر سے مزاح پیدا نہیں کرتے بلکہ صورت حال کو ایک گھماؤ دے دیتے ہیں جس سے مزاح خود بخود معرض وجود میں آجاتا ہے۔“(5)

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کو ہنسایا جائے تاکہ وہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی زندگی کی تلخیوں کو بھول جائیں۔ان کا مشاہدہ کافی تیز ہے وہ اپنی بصیرت کے سہارے سماج اور معاشرے کی ناہمواریوں کو دیکھتے ہیں۔ایسے پرآشوب دور میں ہنسنا ہنسانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں۔

”سچ پوچھئے تو موجودہ حالات میں ہنسنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔جب بھی دنیا کے کسی حصے میں قتل و غارت گری کی خبریں پڑھتا ہوں ،نسلی اور فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں سنتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہیکہ جیسے صدیوں کا ذہنی سفر طئے کرنے کے باوجود انسان ابھی تک ہنسنے کا اہل نہیں بن

سکا۔ اگر وہ ہنستا بھی ہے تو اس کی ہنسی بڑی پر آشوب ہے' بڑی بھیانک ہے......لیکن اس کے باوجود میں ہنسنے کا قائل ہوں۔'' (6)

مجتبیٰ حسین صرف ہنسنے کے قائل نہیں بلکہ ہنسانے کے بھی قائل ہیں۔ ان کی تحریروں کی ہر سطر اس بات کی شاہد ہے جس سے قاری محظوظ ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ انکا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا نہیں بلکہ اس کے پیچھے اصلاح کا مقصد بھی پوشیدہ ہے۔ ان کی تحریروں میں صرف مزاح ہی نہیں بلکہ گہرا طنز بھی ملتا ہے۔ ان کے طنز کا نشانہ عموماً سیاسی وسماجی حالات ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں گہرا سماجی شعور پایا جاتا ہے جو صرف کتابی نہیں بلکہ حالات کی چکی میں پسنے کے بعد تجربات کا نچوڑ مصنف قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جو گہرے مشاہدے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

''تکلف برطرف'' مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو فروری 1968 میں شائع ہوا۔ اس میں 13 تیرہ مضامین اور ایک رپوتاژ شامل ہے۔ اس مجموعے میں ''مجھ سے ملئے'' ''ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں'' ''تکیہ کلام'' ایسے مضامین ہیں جو اعلیٰ ترین مزاحیہ ادب کا نمونہ کہلانے کے حقدار ہیں۔ ''ہم طرفدار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں'' اس مضمون میں پیروڈی کے فن سے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ کلام غالبؔ کی شرح لکھی گئی ہے اور غالبؔ کے کئی اشعار میں مضحک تصرف سے کام لیا گیا ہے۔ برق آشیانوی نے بھی غالبؔ کے اشعار کی مزاحیہ شرح لکھی ہے۔ لیکن مجتبیٰ حسین نے واقعات کو نہایت فنکاری سے فطری رنگ دے دیا ہے اور یہ واقعات کرداروں کے بجائے Types کے سہارے پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ دراصل مزاح نگار طرفدارانِ غالب اور غیر سخن شناس قسم کے لوگوں میں گھرا ہے۔ اس شرح میں سادگی نہیں ہے بلکہ غالبؔ کو نام نہاد طرفداروں کے نرغے میں سے نکالنے کی ہمدردانہ کوشش ہے۔ مضحک تاثر پیدا کرنے کے لئے مزاح نگار ایسا رویہ اختیار کرتا ہے کہ الفاظ اس کے آگے رقصاں ہیں۔ الفاظ سے کھیلنے والی فضاء اس مجموعے کے تمام مضامین پر حاوی ہے۔

مجتبیٰ حسین نے یہ مضامین مختلف محفلوں کے لئے لکھے تھے جسے بعد میں مجموعے کی شکل دیدی گئی۔ الفاظ کو توڑ مروڑ کر اور محاوروں میں حسب ضرورت تحریف کر کے مضحک سچویشن پیدا کرنا مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ فن کی خوبی ہے۔ مجتبیٰ حسین کے بارے میں ڈاکٹر ایس جے صادق لکھتے ہیں۔

''کل ہند مزاح نگاروں کی کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہزار ہا افراد کے مجمع کے سامنے مضمون سنانا کوئی معمولی بات نہیں اور مضمون سنا کر انھیں ہنسانا تو اور بھی مشکل کام ہے۔ چاہے اس ہنسی کے پیچھے سطحی الفاظ کا کھیل ہی کیوں نہ ہو۔ انکے بام عروج پر پہنچنے کا راز یہی ہے کہ وہ مشاعرے کو لوٹ لینے والے کسی کامیاب شاعر کی طرح اپنا مضمون سنا کر محفل کو لوٹ لیتے ہیں۔ کل ہند مزاحیہ کانفرنس کے بڑے بڑے جلسوں میں انھوں نے مضامین سنائے اور بہت کامیاب ہوئے۔ پڑھنے کا انداز بڑا دل آویز ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین بہت ذہین فنکار کے روپ میں پیش ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے فن میں کسی بھی قسم کی لاپرواہی نہیں برتی ہے۔ مضمون کی دروبست اور تراش خراش پر اس طرح توجہ دیتے ہیں جیسے کوئی سنار اپنے کسی جڑاوی زیور کی تزئین پر توجہ دیتا ہے۔ آج بھی مجتبیٰ حسین کی خود اعتمادی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ شہرت پالینے کے پیچھے اسی خود اعتمادی کا ہاتھ ہے۔''(7)

مجتبیٰ حسین لطیفے گڑھتے بھی ہیں اور جمع بھی کرتے ہیں۔ انھیں الفاظ سے کھیلنے کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ دیکھئے وہ لطیفے کس طرح جمع کرتے ہیں۔

''ان سے ایک سوال پوچھا گیا کہ جناب والا! اردو کے تین شعراء کے نام بتایئے۔ تو موصوف نے کہا کہ غالبؔ، مرزا غالبؔ اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ۔ اس پر ہم نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ آگے ان کی دال نہ گلے گی پوچھا لگے ہاتھوں چوتھے بڑے شاعر کا نام بھی بتایئے تو کہنے لگے نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالبؔ۔ غرض غالبؔ سے ان کا تعلق خاطر بھی غبار خاطر سے کچھ کم نہیں۔''(8)

''تکلف برطرف'' کے مضامین کا موضوع طلباء، شعراء اور ادباء کی مجلسی زندگی ہے۔ اس میں تنوع اور ہمہ

گیریت کم ہی نظر آتی ہے۔مثلاً ادیبوں کے پریم پتر،غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی،ایک پلیٹ تخلص بھوپالی،علامہ نارسا کی موت اور دیگر مضامین میں ہمہ گیریت کم کم ہی ہے۔الفاظ کے نئے مضحک پیکر تراشنے کے علاوہ وہ اخلاقیات کا درس دینے والے معلم نظر آتے ہیں۔وہ اس مجموعے میں مزاح کو طنز پر ترجیح دیتے نظر آتے ہیں۔''قصہ پہلے گریجویٹ کا'' میں تعلیم یافتہ بیروزگار نوجوانوں کے حالات کو ایسے مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اس میں سماجی بصیرت کو تلاش کرنا ذرا مشکل امر ہے۔اس میں ایمپلائمنٹ اکسچینج کی عدم کارکردگی کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔دراصل جذباتیت جب مزاح کے پردے میں نمودار ہوتی ہے تو قاری اپنے آنسوؤں کو روک لیتا ہے۔یہ اقتباس دیکھئے۔

''اس شہر میں عوام کی تفریح کے لئے ایمپلائمنٹ اکسچینج کا ایک دفتر قائم تھا جہاں بڑے بڑے نامی گرامی تعلیم یافتہ نوجوان اپنے اسم ہائے گرامی درج کروانے آتے ہیں اور اوقات فرصت میں اس دفتر کے احاطہ میں بیٹھ کر خوش گپیوں اور کبھی کبھار رنج گپیوں میں مصروف رہتے تھے۔جب بھی کوئی ناعاقبت اندیش نوجوان یونیورسٹی میں علم کی پیاس بجھالیتا تو وہ اپنی بھوک مٹانے کے لئے اس دفتر کا رخ کرتا اور برسوں اس دفتر سے واپس نہیں لوٹتا۔''(9)

غلام احمد فرقتؔ کاکوروی ''تکلف برطرف'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس مجموعے میں بعض مضامین تو ایسے ہیں جو اردو کے مزاحیہ ادب میں افسانہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے انداز بیان میں جو مزاح کی پاکیزگی ،شگفتگی اور ذہانت ہے وہ تو ایک ایسی سعادت ہے جو خداداد ہے مگر ان کے بیشتر مضامین پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی سے بہت متاثر ہیں۔چنانچہ ان دونوں بلند پایہ اور ممتاز ادیبوں کے انداز بیان کی جھلکیاں اس مجموعہ میں ہم کو جگہ جگہ ملتی ہیں۔بڑی خیرت ہوئی کہ چند مزاح نگار مجتبیٰ حسین سے پہلے پیدا ہوئے ورنہ یقین جانئے کہ اگر خدانخواستہ ان سے

سنہ پیدائش کے لگ بھگ پیدا ہوگئے ہوتے تو ہم سبھوں کو کون گھاس
ڈالتا۔اللہ ہم لوگوں کی عزت و آبرو کو امان میں رکھے ورنہ ہم لوگوں کی عمر کو پہنچتے
پہنچتے نہ جانے کتنوں کے چراغ گل کر چکے ہوتے۔''(10)

مجتبیٰ حسین کی تربیت میں ان کے والد کا اہم رول رہا۔انھوں نے ان کی تعلیم پر خاص توجہ دی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ ان کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے ان کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا۔خود مجتبیٰ حسین لکھتے ہے۔

''ہر شخص کی ایک شخصیت ہوتی ہے اور اسے بنانے میں کسی اور شخص کا دخل
ضروری ہوتا ہے۔میری شخصیت (جیسی بھی وہ ہے) کی تشکیل میں میرے بڑے
بھائی محبوب حسین جگر،جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ ''سیاست'' کا ہاتھ ہے۔''(11)

دراصل مجتبیٰ حسین کی ذہانت اور ان میں چھپے ہوئے مزاح نگار کو ان کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے خوب پہچانا۔مجتبیٰ ایک اور جگہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔

''مجھ جیسے سنجیدہ آدمی کو خواہ مخواہ مزاح نگار بنانے کی ذمہ داری میرے
بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر اور ایڈیٹر سیاست جناب میر عابد علی خاں
صاحب پر عائد ہوتی ہے۔''(12)

ڈاکٹر ایس جے صادق اس خصوص میں لکھتے ہیں۔

''محکمہ تعلقات عامہ اور 'سیاست' میں وہ اچھی خاصی تربیت پا چکے
تھے۔عملی تربیت پا کر ہی وہ باضابطہ مزاح نگاری کے میدان میں اترے تھے
اور ان میں غالب کے کلام سے خوشہ چینی کی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ان
کے اندر جو مزاح نگار چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔اب تک موقع نہ ملنے کی وجہ سے
اونگھ رہا تھا۔شاہد صدیقی کی موت نے انہیں مزاح نگاری کی صلاحیتوں کے
استعمال کا موقع دیا۔کوئی شخص بغیر کسی فطری صلاحیتوں کے مزاح نگاری

نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض لوگوں میں یہ صلاحیت شہاب ثاقب بن کر نمودار ہوتی ہے اور پلک جھپکتے ہی راکھ بن چکی ہوتی ہے مگر مجتبیٰ حسین کا یہ حال نہیں ہے۔ یہاں پر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ تھا۔''(13)

ابتداء میں مجتبیٰ حسین نے موضوع کے انتخاب میں اپنے پیش رو مزاح نگاروں کے چراغ سے چراغ جلانے کی کوشش کی۔ 'مجھے میرے دھوبی سے بچاؤ' مضمون ہمیں سجاد حیدر یلدرم کے مضمون 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' کی یاد دلاتا ہے۔ جس میں یلدرم نے اپنے دوستوں کی مصیبتوں کا ذکر کیا ہے اور مجتبیٰ حسین دھوبی کی ستم ظریفی کا شکار ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے بھی دھوبی پر مضمون لکھ کر داد و تحسین حاصل کی تھی۔ 'دھوبی' اردو مزاح کے لئے کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ اور مجتبیٰ حسین نے اسے اس وقت برتا جب وہ پامال ہو رہا تھا۔

مئی 1966 میں حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ مجتبیٰ حسین نے ایک طویل رپوتاژ جو تقریباً 27 صفحات پر محیط تھا ''ایک پلیٹ تخلص بھوپالی'' کے عنوان سے سنایا تھا۔ جس میں شاعروں کے بجائے مزاح نگاروں کا تعارف نہایت دلنشین اور پرمزاح انداز میں کروایا گیا ہے۔ یہ رپوتاژ تکلف برطرف میں بھی شامل ہے۔ تکلف برطرف میں مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری اپنے شباب پر ہے۔ طنز بالکل نہیں پایا جاتا۔ ان کی تحریروں میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ سیاسی یا سماجی تحریکات کا کوئی عکس اس کتاب میں نظر نہیں آتا۔

مجتبیٰ حسین کا دوسرا مجموعہ ''قطع کلام'' موضوعات کے اعتبار سے پہلے مجموعے کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے۔ دراصل اب ان کا قلم ایسی رواں نثر لکھنے پر قادر ہے کہ بات سے بات نکلتی ہی چلی جاتی ہے۔ ان کے پاس موضوع کو پرت در پرت کھولنے کا ہنر بدرجہ اتم موجود ہے۔ ڈاکٹر ایس جے صادق کا خیال ہے۔

''قطع کلام کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ مجتبیٰ حسین نے جن موضوعات کو برتا ہے ان کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے بہت زیادہ ہے۔ ان کا امتیازی رجحان اس مجموعہ میں یہ ہے کہ انہوں نے طنز کی جانب توجہ دی ہے۔ ان موضوعات پر انھوں نے سنجیدگی سے سوچا ہے۔ وہ ایک کھلے

ذہن کے مالک ہیں اس لئے ان کا فن مزاح نگاری کے ارتقاء سے روشناس
ہوا۔اور ان کے مضامین کے لہجہ میں بتدریج تبدیلی آتی گئی۔نئی ہوا اور نئی
فضاء سے وہ ہمیشہ اثر قبول کرتے آئے ہیں ۔اپنی جزئیات نگاری سے
حقیقت پسندی کے رنگ کو اور نکھارتے ہیں۔" (14)

قطع کلام میں شامل مضمون "یہ رکشہ والے" اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے ایک کامیاب مزاحیہ مضمون ہے۔جس کی زیریں لہروں میں طنز کا نشتر بھی اپنا کام کر رہا ہے۔یہ طنز جو کہ سیدھا سادا ہے لیکن تجربے کی گہرائی میں ڈوبا ہوا ہے۔یہی طنز کسی کامیاب مزاحیہ مضمون کو یادگار بنانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔رکشہ پر کون نہیں بیٹھتا لیکن جس ہمدردی اور دردمندی سے انہوں نے رکشہ والوں کی زندگی کا جائزہ لیا وہ بے حد اہم بات ہے۔یہ لوگ سخت محنت کے باوجود کسمپرسی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ایک صاحب چار مینار چلنے کے لئے رکشہ والے سے کرایہ دریافت کرتے ہیں تو رکشہ والا آٹھ آنے بتاتا ہے اس پر وہ صاحب کہتے ہیں کہ چار مینار تک کا کرایہ بس والا صرف دس پیسے لیتا ہے اس پر رکشہ والا جواب دیتا ہے۔

"جی دس پیسے ہوتا ہے مگر آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ بس پٹرول سے
چلتی ہے۔رکشہ خون سے چلتا ہے! خون سے۔" (15)

"سند باد جہازی کا سفر نامہ" ہندوستان میں رونما ہونے والے فسادات پر گہرا طنز ہے۔سند باد جہازی کا کام سفر کرنا اور سفر نامہ مرتب کرنا ہے۔اس کے دوست ایک مرتبہ مشورہ دیتے ہیں کہ اب کے ہندوستان کا سفر کیا جائے کیونکہ یہاں فسادات دیکھنے کو ملتے ہیں۔جو بالکل خالص ہوتے ہیں۔دوستوں کا یہ مشورہ مجتبیٰ حسین کے قلم سے دیکھئے۔

"اگر آپ خالص فسادات دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہندوستان ہی چلے
جائیں یہاں کے فسادات اتنے خالص ہوتے ہیں کہ ان میں کہیں بھی
انسانیت کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔" (16)

مجتبیٰ حسین ابتداء میں صرف مزاح سے لوگوں کو لطف اندوز کرتے رہے بعد میں ان تخلیقات میں طنز کے نشتر

بھی نظر آنے لگے۔اس مضمون میں بھی ایسے سیاسی لیڈروں پر طنز کیا گیا ہے جو اپنے حقیر مالی مفاد کے لئے فساد کرانے سے نہیں چوکتے۔

اچھا مزاح وہی ہوتا ہے جو روزمرہ زندگی کو پیش کرے اور اچھا مزاح نگار وہی ہے جو مستقل انسانی اقدار کو موضوع بناتا ہے۔مجتبیٰ حسین ایسے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جو انسانی فطرت کا آئینہ ہوتے ہیں۔''دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے''، مضمون مستقل انسانی اقدار کی جانب واضح اشارہ ہے۔ریس دنیا کے تقریباً ہر ملک میں کھیلی جاتی ہے۔اور یہ نشہ اس کے شائقین کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔اور بعض تو کھڑے کھڑے کنگال ہو جاتے ہیں۔بقول مجتبیٰ حسین ریس کورس ایسی جگہ ہے جہاں گھوڑے دوڑتے اور گدھے دیکھتے رہتے ہیں۔یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''آپ ریس کھیلنے کے بجائے دوڑنے کی تربیت حاصل کرتے تو شاید آج آپ خود گھوڑوں کے ساتھ دوڑنے کے قابل ہو جاتے اور لوگ آپ پر بازی لگاتے اور آپ کا نام ہر شخص کی زبان پر ہوتا۔ہزار بار سمجھایا کہ بھائی گھوڑے کو گھوڑا سمجھو مگر وہ گھوڑے کو اپنا محسن اور کرم فرما سمجھتے ہیں۔ایک دن ریس میں بری طرح ہار گئے واپس ہوئے تو صورت پر ریس کورس کا گمان تھا۔کہنے لگے: آخر ریس میں میرے مسلسل ہارنے کا سبب کیا ہے؟ ہم نے کہا: گدھا جب گھوڑے پر بازی لگاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔یہ سن کر وہ ہماری جانب یوں بڑھے جیسے دولتی جھاڑنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔''(17)

مجتبیٰ حسین باتوں باتوں میں طنز کا نشتر چبھو دیتے ہیں اور ایسی فنکاری اس نشتر زنی میں پنہاں ہوتی ہے کہ مضروب کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ کب نشتر چبھویا گیا۔ایک اور مضمون 'ناز اٹھانے کو رہ گئے ہم ڈاکٹروں کے' ڈاکٹر عبدالمنان کے مضمون 'ناز اٹھانے کو رہ گئے ہم مریضوں کے' کا جواب ہے۔جو ڈاکٹروں کے حسب حال ہے۔اس کے علاوہ ہمارا نوکر' باورچی' ٹرین میں پڑھنا' سیکنڈ ہینڈ موٹر سیکل وغیرہ عام آدمی کی زندگی سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔مجتبیٰ حسین نے حقیقت نگاری سے ان موضوعات میں جان ڈال دی ہے۔

مجتبیٰ حسین کا تیسرا مجموعہ''قصہ مختصر''اپریل 1972 میں شائع ہوا۔اس میں نو مضامین اور تین خاکے

ہیں۔اس مجموعے میں شامل مضمون ''ریلوے منتری مسافر بن گئے'' محکمہ ریلوے پر بھرپور طنز ہےاور حرکاتی مزاح کی بہترین مثال بھی۔

موضوعات کے لحاظ سے اس مجموعے میں ندرت اورنئی تکنیک پائی جاتی ہے۔قصہ مختصر' کے مطالعے کے بعد اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مزاح نگار اب مزید پختہ اور سنجیدہ ہوگیا ہے۔ان کی مزاح نگاری کے رجحان میں بنیادی تبدیلی محسوس کی جاسکتی ہے۔ایسامحسوس ہوتا ہے کہ وہ لفظوں کے سحر سے' اس کی گرفت سے آگے نکل آئے ہیں۔لیکن مقفیٰ نثر کی شعبدہ بازی اب بھی ان کے تعاقب میں ہے۔ڈاکٹر ایس جے صادق اس ضمن میں مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نثر مقفیٰ شعبدہ بازی اب تک ان کا تعاقب کررہی ہے۔خصوصاً عنوانات کے انتخاب میں وہ اب بھی بھٹک جاتے ہیں۔جیسے سردی کی گرما گرمی (قصہ مختصر) گرمی کی سرگرمی مطبوعہ 'سیاست' ماہ مئی 1972 الفاظ کے طوطا مینا اڑا کر فرمائشی قہقہے لگانے کا مقصد قوم کی اصلاح ہونا چاہیئے یہ بہت غلط نظریہ ہے۔مگر تسکین اس بات کی ہے کہ یہ کم ازکم اس قابل ہوئے کہ کوئی نظریہ تو قائم کرسکیں 'بہرحال' تک پہنچتے پہنچتے وہ مشتاق احمد یوسفی کے ہم زبان ہوکر کہنے لگے ہیں کہ اگر دنیا کی اصلاح مزاح سے ہوسکتی ہے تو لوگوں کو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ابتداء سے ان کا فن مائل بہ ابتذال نہیں رہا۔اکثر صورتوں میں غائب کی تضحیک کیئے بنا ثالث کوہنسی نہیں آتی اس لئے غیر شعوری طور پر کسی کی تضحیک کے وہ مرتکب ہورہے ہوں تو قابل معافی ہیں۔''(18)

مجتبیٰ حسین اپنے مضامین میں ان تمام لوازمات کا خیال رکھتے ہیں جس کے وہ متقاضی ہوتے ہیں۔ان کے مضامین پوری نوک پلک اور نک سک درست رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔چونکہ وہ موضوع کا انتخاب پہلے کرلیتے ہیں اس لئے ذہنی طور پر اس کا مکمل تجزیہ کرلیتے ہیں اوراس کے بعد اس کے چند پہلوؤں کو لے کر لطیفے بنالیتے ہیں اور

بھرپور مزاحیہ نکات ان لطیفوں کے سہارے آگے بڑھاتے جاتے ہیں۔اس مجموعے میں موضوعات کی رنگا رنگی ہے۔انہوں نے کبھی سیاسی موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے کبھی معاشرتی اور سماجی تو کبھی گھریلو مسائل کو بھی انہوں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ان کی تحریروں میں طنز پر مزاح غالب ہے۔جس کی وجہ سے طنز کی تلخی ظاہر نہیں ہونے پاتی۔

مرزا ایک ایسا کردار ہے جو مجتبیٰ حسین کی تخلیق ہے۔لیکن مجتبیٰ حسین کی یہ تخلیق ان کی خالص تخلیق نہیں کہلائی جاسکتی کیونکہ ماضی میں پطرس بخاری، مشتاق احمد یوسفی، غلام فرقت کاکوروی کے ہاں بھی یہ کردار موجود ہے۔مرزا دراصل لکھنوی تہذیب کا ایک بھونڈا پہلو ہے۔'مرزا کی یاد میں' میں مزاح نگار نے مرزا کے کردار کو کلرک کی ذہنیت کو سامنے رکھتے ہوئے خوبی سے استعمال کیا ہے۔دوسرے مضامین میں بھی جیسے ہوٹل شبانہ، چاند اور آدمی اور مرزا دعوت علی بیگ وغیرہ میں بھی یہ کردار نظر آتا ہے۔یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کے مرزا میں جو گہرائی اور دل آویزی نظر آتی ہے وہ مجتبیٰ حسین کے مرزا میں کم ہے۔

مجتبیٰ حسین کے مزاح کے تین پہلو خاص ہیں۔یعنی خالص مزاح، طنز آمیز مزاح اور حزنیہ مزاح اور یہ تینوں پہلو ان کے مضامین میں ابھرتے رہتے ہیں۔غیر شخصی طنز آمیز مزاح کا صرف ایک نمونہ دیکھئے۔''ہوٹل شبانہ'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''دنیا کا بڑے سے بڑا مسئلہ اس ہوٹل میں پہنچ کر بہت چھوٹا ہو جاتا تھا۔کئی پیچیدہ مسائل کے بارے میں یہاں کھٹا کھٹ فیصلے صادر کئے جاتے تھے۔یہ اور بات ہے کہ ان فیصلوں پر عمل کوئی نہیں کرتا تھا۔مرزا کہتے تھے کہ جب دنیا 'اقوام متحدہ' کے فیصلوں پر عمل نہیں کرتی تو ہوٹل شبانہ کے فیصلوں کو کون سنے گا۔''(19)

مجتبیٰ حسین ایک ہمدرد انسان ہیں اور دردمند دل رکھتے ہیں۔مجتبیٰ حسین اپنے فن مزاح نگاری کے بارے میں ایک خاص زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔جس کا تفصیلی ذکر انھوں نے 'قصہ مختصر' میں شامل اپنے دیباچے میں لکھا ہے۔

> ''میرے نزدیک مزاح' انسان کے پیمانۂ وجود کے لبریز ہو کر چھلک پڑنے کا نام ہے۔جب انسان کے وجود کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو وہ قہقہوں

کی شکل میں چھلکنے لگتا ہے۔سچا مزاح وہی ہے جس کی حدیں سچے غموں کی حدوں کے بعد شروع ہوتی ہیں۔زندگی کی ساری تلخیوں اوراس کی تیزابیت کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد جو آدمی قہقہے کی طرف جست لگاتا ہے وہی سچا اور باشعور قہقہہ لگا سکتا ہے۔ہنسنے کے لئے جس قدر گہرے شعور اور ادراک کی ضرورت ہوتی ہے۔اتنے گہرے شعور کی ضرورت شاید رونے کے لئے نہیں ہوتی۔"(20)

قصہ مختصر میں دیگر مضامین کے علاوہ خاکے بھی شامل ہیں۔جنھیں مصنف کے سوائے چند لوگ خاکہ ماننے کو تیار نہیں۔ڈاکٹر ایس جے صادق کا خیال اس خصوص میں پیش ہے۔

"مجتبیٰ حسین کے خاکے' خاکے کی تعریف میں پورے نہیں اترتے۔ خاکہ نگاری Profile Writing کا فن انگریزی سے اردو ادب میں داخل ہوا ہے۔خاکہ قلم یا برش کے ذریعہ ایک ایسے فن پارے کی پیش کش ہے جس میں کسی شئے یا کسی انسان کی خصوصیت کا اظہار مبالغہ آمیز مضحک انداز میں کیا جائے۔"(21)

مرزا فرحت اللہ بیگ' شوکت تھانوی اور رشید احمد صدیقی نے خاکہ نگاری کی روایت قائم کی تھی۔جسے مجتبیٰ حسین نے آگے بڑھایا ہے۔دراصل مجتبیٰ حسین کے خاکے' خاکے کم مرقعے زیادہ ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا ہر خاکہ انکشاف ذات وصفات کے عمل سے عبارت ہے جس پر ان کا مزاحیہ اسلوب سونے پہ سہاگہ کا کام کرتا ہے۔اپنی خاکہ نگاری کے بارے میں خود مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں۔

"میں نے یہ خاکے کسی کے حق میں یا خلاف بالکل نہیں لکھے۔جس طرح دل و دماغ نے کسی شخصیت کا اثر قبول کیا اسے ہو بہو کاغذ پر منتقل کر دیا۔یہ اور بات ہے کہ خاکے میں خاکہ نگار کا زاویہ نگاہ بھی در آتا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ خاکہ نگار جب کسی شخصیت کا خاکہ لکھتا ہے تو وہ انجانے

طور پر خود اپنا بھی خاکہ لکھ ڈالتا ہے۔'' (22)

مجتبیٰ حسین نے اپنے ہم عصروں پر جتنے خاکے اور مضامین لکھے ہیں ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہو۔ مظہر الزماں اور یوسف ناظم وغیرہ پر لکھے ان کے مضامین (خاکے) اس کی عمدہ مثال ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے طنز و مزاح لکھنے والوں کے علاوہ افسانہ نگاروں اور دیگر ادیبوں کے بھی خاکے لکھے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

''قصہ مختصر'' کے خاکے سنجیدہ خاکوں کے زمرے میں شامل کیے جاسکتے ہیں جیسے سلیمان اریبؔ' آرٹسٹ ایم ایف حسین اور سعید بن محمد کے خاکے۔ دراصل یہ خاکے چند اہم شخصیتوں کی مزاح نگاری سے وابستگی کا مظہر ہیں اور اس مجموعے کا اس اعتبار سے ایک اہم حصہ ہیں۔

''بہر حال'' مجتبیٰ حسین کے مضامین کا چوتھا مجموعہ ہے۔ 'تکلف برطرف' سے بہر حال تک کے سفر میں مصنف سماجی شعور کی بالیدگی کی کئی منزلوں کو طئے کرتا نظر آتا ہے۔ یہ کتاب 1974 میں شائع ہوئی۔ جبکہ تکلف برطرف 1968 میں شائع ہوچکی تھی۔ چھ 6 برسوں کے اس ادبی سفر میں ان کے فن میں ارتقاء کا عمل تیز تر ہو چکا ہے۔ ''بہر حال'' میں بھی 9 مضامین اور تین خاکے شامل ہیں۔ ان کے خاکے پچھلے خاکوں کی طرح ہی بندھے ٹکے اصولوں پر قائم ہیں۔

'انتخابی نعرے' ان کا ایک شاہکار مضمون ہے جس میں تمام سیاسی پارٹیاں طنز و مزاح کا نشانہ بنتی ہیں۔ اسی طرح 'ہائے وہ مجرد زندگی' بہترین انشائیہ قرار دیا جاسکتا ہے جسمیں مجرد زندگی کی آزادیاں' ازدواجی زندگی کی قید و بند میں مزید کھلنے لگتی ہیں اور مزاح نگار انھیں یاد کرکے دہرا ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے یہ اقتباس۔

> ''ادھر ہماری بیوی نے ہمارے گھر میں قدم رکھا اور ادھر ہماری ساری خوشیوں نے اپنا قدم گھر سے باہر نکال دیا۔ جب تک مجرد تھے تو ہمیں ہمیشہ گھر واپس ہونے کی جلدی رہا کرتی تھی۔ کیونکہ ان دنوں گھر واقعی سکون کی جگہ تھی مگر اب گھر کو واپس ہوتے وقت ہم یہ سوچتے ہیں کہ گھر جانے کے بجائے کسی جنگل کی طرف کیوں نہ نکل جائیں۔'' (23)

ممتاز نقاد کلیم الدین احمد 'سخن ہائے گفتنی' کے صفحہ 225 پر محفوظ احمد صدیقی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں ظرافت فطری نہیں اکتسابی ہے۔ لیکن مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے بارے میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کا مزاح فطری ہے' اکتسابی نہیں۔ مجتبیٰ حسین نے ان ہی فطری صلاحیتوں کی بنا پر مزاح نگاری کے میدان میں اس قدر تیزی سے شہرت کی منزلیں طئے کرلیں کہ وہاں تک فی الحال کسی کی رسائی نہیں ہے۔

مجتبیٰ حسین کا مشاہدہ کافی تیز اور وسیع ہے۔ وہ سماجی صورتحال کی تقریباً ہر گوشے سے واقف ہیں کیونکہ انھوں نے انسانوں کو ہر سطح پر برتا ہے اور ان کی خامیوں' مجبوریوں' تضادوں اور بوالعجبیوں کا مطالعہ باریک بینی سے کیا ہے۔ ان کے مطالعے کے حصار میں ہر طرح کے افراد ہیں۔ مزاح نگار اپنی تحریر سے سماج کی اصلاح کے ساتھ ساتھ انسان کو ایک بہتر زندگی کے تصور سے ہم کنار کرسکتا ہے۔ اس کے ذہن کے دریچوں کو کھول سکتا ہے اور اس کے اندرونی تناؤ کو کم کرسکتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے قیام دہلی کے دوران وہاں کی زندگی کو بھی اپنے مضامین میں برتا ہے۔ دہلی میں آٹو رکشا ایک عام سواری ہے لیکن دہلی کی بعض ناہموار سڑکیں سواریوں پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں مجتبیٰ حسین اس کی ایک جھلک اس طرح دکھاتے ہیں۔

> ''ہوا یوں کہ ادھر آٹو رکشا اسٹارٹ ہوئی اور ادھر (پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی) لڑکی' ایک جھٹکے کے ساتھ ہمارے دوست کی بانہوں میں بے ساختہ گرگئی۔ انھوں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو عین اس وقت آٹو رکشا کے نیچے ایک کھڈا آ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے دوست خود لڑکی کی بانہوں میں پہنچ گئے۔ آدھ گھنٹے تک یہ انقلاب اور جوابی انقلاب جاری رہا۔ وہ کمبل کو چھوڑنا چاہتے تھے لیکن کمبل انھیں نہیں چھوڑ رہا تھا اور جب آٹو رکشا رُکی تو دونوں اس پوز میں پائے گئے جس پوز کی تشہیر اکثر اوقات ہمارے فلمی پوسٹروں میں کی جاتی ہے۔'' (24)

مجتبیٰ حسین کو بات سے بات پیدا کرنے کا فن خوب آتا ہے۔ انسانی فطرت کی بوالعجبیوں اور سماجی ناانصافیوں کو ہدف بنانے میں کے ساتھ ساتھ شگفتگی بھی قائم۔ طنز کے تیرونشتر کو اس چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں

کہ قاری اس کے وار کو ہنس کر سہہ لیتا ہے۔ان کے مضمون ’’ڈائریکٹر کا کتا‘‘ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

’’ڈائریکٹر کے ڈرائیور نے پھر ایک بار پکار کر کہا’’بھائیو! ڈائریکٹر صاحب کا کتا بھاگ گیا ہے تم لوگ اسے پکڑنے کی کوشش کرو ورنہ میری نوکری خطرہ میں پڑ جائے گی۔‘‘

ورما جی نے جواباً پکار کر کہا’’جوزف! اب اس بات کا زیادہ اعلان کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں اکیلا ہی اس کتے کو پکڑوں گا۔سوال تمہاری نوکری کا ہی نہیں، میری پرموشن کا بھی ہے۔‘‘ مگر اس وقت تک جوزف کی آواز نٹراجن کے کانوں میں بھی پڑ چکی تھی۔نٹراجن دفتر کا اکاؤنٹنٹ تھا اور بعض حسابی دھاندلیوں کے سلسلہ میں اس کے خلاف تحقیقات چل رہی تھی اور فائل اس وقت ڈائریکٹر کی میز پر زیر تصفیہ تھی۔

نٹراجن نے پکار کر کہا’’جوزف تم فکر نہ کرو، میں اس کتے کو پکڑوں گا۔ڈائریکٹر صاحب کے کتے کے لئے میں اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔ میں اس کے لئے آخری قطرۂ خون بھی بہا سکتا ہوں، جہاں جہاں اس کا پسینہ گرے گا وہاں وہاں میں اپنا خون بہا دوں گا۔‘‘(25)

اس مضمون میں گرتے ہوئے اخلاقی اقدار پر بھرپور طنز کیا گیا ہے۔انھوں نے چاپلوسی اور خوشامد کرنے والے لوگوں پر لطیف طنز کیا ہے۔ یہ منظر ہمیں ہر روز بیشتر دفاتر میں نظر آتا ہے جہاں ملازمین اپنی ذمہ داریوں کو ایمانداری سے نبھانے کے بجائے رشوت خوری، غبن، اور مالی خرد برد میں ملوث ہو جاتے ہیں۔اور جب تادیبی کاروائی کا سامنا ہوتا ہے تو خوشامد اور چاپلوسی پر اتر آتے ہیں۔اسی طرح کا ایک اور مضمون ’’خوشامد کا فن‘‘، مجتبیٰ حسین کے مجموعے ’’الغرض‘‘، میں بھی شامل ہے۔مجتبیٰ حسین کے تخلیقات اردو ادب کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے نامی انصاری رقمطراز ہیں۔

عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں اب اور زیادہ بلاغت

> اورادبی حسن پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنی مزاحیہ تحریروں میں اردو کے ادب عالیہ کی رمزشناسی کے جوہر بکھیرنے لگے ہیں۔ بلاشبہ ہندوستان میں ان کی تحریروں سے اردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب میں قیمتی اضافہ ہوا ہے۔(26)

مزاح نگاری مجتبیٰ حسین کے نزدیک اپنی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ جس کے اندر کئی رنگ ہیں۔ اور ہر رنگ کا شیڈ الگ الگ ہے۔ جس سے ان کے فن میں کئی رنگوں کا حسین امتزاج پیدا ہوتا ہے۔ ان کے ہر مجموعے کا رنگ ان کے فن پر پہلے رنگ کے مقابلے گہرا چڑھتا نظر آتا ہے۔ اور وہ خوب سے خوب تر کی جانب گامزن ہیں۔ ان کا مزاح ہمدردی اور دردمندی سے معمور ہے۔ الفاظ سے کھیلنے سے باز آجانا ان کے فن کو معراج پر پہنچا دیتا ہے۔ مزاح نگاری ایک ایسی کیفیت ہے جہاں پہنچ کر مزاح نگار خود اپنی شخصیت کو بھول جاتا ہے۔ اور یہ مزاح انسان کے پیمانۂ وجود کے لبریز ہو کر چھلک پڑنے کا نام ہے۔

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا مجموعہ 'آدمی نامہ' شائع ہو چکا ہے جس میں پندرہ15 شخصیتوں کے مرقعے ہیں۔ یہ شوکت تھانوی کے 'شیش محل' کی طرز پر ہیں۔ اس طرح 'جاپان چلو جاپان چلو' ان کے سفر جاپان کے دنوں کی روداد ہے جس میں جاپان کی تہذیب وثقافت اور وہاں کے تمدن اور سماجی زندگی کا پرمزاح اور دلچسپ انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ سفرنامے میں وہ حصہ بے حد دلچسپ لگتا ہے جب سیاح جاپانی طرز فکر' انداز معاشرت اور سماجی شعور کا موازانہ ہندوستانی سوچ' تہذیب اور تمدن و کلچر سے کرتا ہے۔

مجتبیٰ حسین یار باش آدمی ہیں' محفلوں کی جان ہیں۔ دوستوں کا ایک وسیع حلقہ رکھتے ہیں۔ دہلی' کراچی' امریکہ' سعودی عرب' حیدرآباد اور گلبرگہ میں ان کے متعدد دوست ہیں۔ سب ان سے اور وہ سب سے محبت کرتے ہیں۔ پطرسؔ' غالبؔ کے حافظ اور یوسفیؔ کے مداح مجتبیٰ حسین جو بنیادی طور پر ایک صحافی بھی ہیں۔ اب بھی لکھ رہے ہیں اور گاہے بہ گاہے ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد کے شماروں کے علاوہ بہ پابندی روزنامہ 'سیاست' میں مختلف عنوانات پر ہفتہ واری کالم لکھ رہے ہیں۔ ہندوستان میں فکاہیہ کالم نگاری اور مجتبیٰ حسین کالم نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے نامی انصاری لکھتے ہیں۔

> 'فکاہیہ کالم نگاری کو ہندوستان میں بہت کم لیکن پاکستان میں بہت

زیادہ فروغ حاصل ہوا...... ہمارے ملک میں مجتبیٰ حسین ہی ایک ایسے کالم نگار ہیں جن کی رسائی طنز ومزاح کے اعلیٰ معیار تک ہوئی ہے۔اور جن کی سادگی میں بھی ایسی پُرکاری اور طرّاری ہے جس سے صرفِ نظر کرنا آسان نہیں۔ان کے مزاح میں طنز کی ہلکی سی لہر ضرور ہوتی ہے مگر اس کے پیچھے انسان دوستی اور خلقی دردمندی کی ایک زیریں لہر بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہتی ہے۔''(27)

مجتبیٰ حسین نے اپنے مزاحیہ مضامین' انشائیوں' خاکوں' سفرناموں' ادبی وسیاسی کالموں سے اردو ادب میں نہ صرف اعلیٰ درجہ کے طنز ومزاح کی کمی کو پورا کیا ہے بلکہ فکر ونظر کے نئے دریچے بھی کھولے ہیں۔معاصر طنزیہ ومزاحیہ ادب میں کم ازکم ہندوستان کی حدتک ان کا ادبی مرتبہ سب سے بلند ہے۔

----OOO----

حوالہ جات

(1) مجتبیٰ حسین پیش لفظ مشمولہ ''تکلف برطرف'' مطبوعہ مارچ 1968

(2) مجتبیٰ حسین مشمولہ ''شگوفہ مجتبیٰ حسین نمبر'' نومبر 1987ء ص 303

(3) مجتبیٰ حسین کالم ''شیشہ وتیشہ'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ 22 اگست 1962ء چہارشنبہ

(4) کرشن چندر گردپوش تحریر مشمولہ ''تکلف برطرف'' مطبوعہ مارچ 1968

(5) نامی انصاری ''مجتبیٰ حسین' فکروفن ''، مضمون مشمولہ: آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز ومزاح ص 130- 129

(6) مجتبیٰ حسین ''پس وپیش لفظ'' مشمولہ ''قطع کلام'' ص 9 مطبوعہ 1970

(7) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز ومزاح آزادی کے بعد'' ص 539

(8) مجتبیٰ حسین ''ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں'' مشمولہ ''تکلف برطرف'' ص 56

(9) مجتبیٰ حسین ''قصہ پہلے گریجویٹ کا''، مضمون مشمولہ ''تکلف برطرف'' ص 66

(10) غلام احمد فرقت کاکوروی تبصرہ ''تکلف برطرف'' مطبوعہ ماہنامہ آج کل نئی دہلی جون 1968

(11) مجتبیٰ حسین خودنوشت مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ ہندوستانی مزاح نمبر نثر ص 293 مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد

(12) مجتبیٰ حسین ''مجھ سے ملئے'' مشمولہ ''تکلف برطرف'' ص 11

(13) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد'' ص 541 - 540

(14) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد'' ص 544

(15) مجتبیٰ حسین ''یہ رکشہ والے'' مضمون مشمولہ ''قطع کلام'' ص 40

(16) مجتبیٰ حسین ''سند باد جہازی کا سفر نامہ'' مضمون مشمولہ ''قطع کلام'' ص 66

(17) مجتبیٰ حسین ''دوڑا دیے گھوڑے ہم نے'' مضمون مشمولہ ''قطع کلام'' ص 51

(18) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد'' ص 579

(19) مجتبیٰ حسین ''ہوٹل شبانہ'' مضمون مشمولہ ''قصہ مختصر'' ص 26

(20) مجتبیٰ حسین ''میں اور میرا مزاح'' مضمون مشمولہ ''قصہ مختصر'' ص 19

(21) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد'' ص 549

(22) مجتبیٰ حسین ''آدمی نامہ'' ص 6

(23) مجتبیٰ حسین ''ہائے وہ مجرد زندگی'' مضمون مشمولہ ''بہر حال'' ص 90

(24) مجتبیٰ حسین ''آٹو رکشا'' مضمون مشمولہ ''بہر حال'' ص 45

(25) مجتبیٰ حسین ''ڈائریکٹر کا کُتّا'' مضمون مشمولہ ''چہرہ در چہرہ'' ص 55 سنہ 1993ء

(26) نامی انصاری ''بیسویں صدی میں طنز و مزاح'' ص 252 سنہ 2002ء

(27) نامی انصاری ''بیسویں صدی میں طنز و مزاح'' ص 21

پرویز یداللہ مہدی

پرویز یداللہ مہدی 21 جون 1943ء کو فرقہ مہدیہ کے ایک سادات گھرانے میں پیدا ہوئے میٹرک تک تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ان کا پیدائشی نام سید یداللہ مہدی حسینی ہے۔ادبی دنیا میں پرویز یداللہ مہدی کے نام سے معروف ہوئے۔آپ کے والد کا نام سید منور میاں تھا۔ریفریجریشن انجینئرنگ میں مختلف فنی اداروں سے سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما حاصل کئے۔1957ء میں جب لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تقسیم جدید عمل میں آئی تو اس وقت پرویز بمبئی میں تھے۔پرویز بمبئی میں جز وقتی لیکچرر کے ساتھ ساتھ دوسری سرگرمیوں میں مصروف رہے۔جیسے ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھنا، کہانیاں اور فلموں کیلئے کمرشیل لکھنا وغیرہ، اپنی مصروفیات کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک ملازمت کا تعلق ہے کسی پیشہ کا مستقل غلام کبھی نہیں رہا۔فری لانسنگ کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔جز وقتی لیکچرر شپ سے لے کر ریڈیو کے ڈراموں، کہانیوں اور فلموں کے لئے کمرشیل پروگرام تک لکھے ہیں اور لکھتا ہوں''۔(1)

پرویز یداللہ مہدی ایک بھرے پرے پریوار کے مالک ہیں۔ان کی شادی صابرہ بانو سے ہوئی۔وہ گذشتہ چار دہائیوں سے ان کے ہر سکھ دکھ کی ساتھی بنی ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انہیں تین اولادوں سے نوازا ہے دو صاحبزادے، سید گلریز محسن مہدی، سید شہزاد تحسین مہدی اور ایک صاحبزادی سیدہ سارہ تزئین مہدی۔دو بہویں سیدہ عافیہ حجاب، سیدہ فرحانہ نسرین دو نواسے عیسیٰ سید اور علی سید ہیں۔

پرویز یداللہ مہدی ایک ہمدرد اور حساس انسان ہیں۔انہیں دوسروں کے درد کا شدید احساس رہتا ہے۔اپنے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

> ''ایک مزاح نگار جو دنیا بھر کو طرح طرح سے ہنسانے کی کوشش کرتا ہے۔خود اس کی آنکھوں میں بیشمار آنسو چھپے ہوئے ہیں۔سماجی برائیوں کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنانے والا مزاح نگار خود کبھی کبھی قدرت کے بھیانک

مذاق کا نشانہ بنتا ہے۔اس کی زندہ مثال میں خود ہوں‘‘۔(2)

پرویز نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔لیکن مختلف راہوں سے ہوتے ہوئے مزاحیہ نثر نگاری کی طرف آ پہنچے۔ان کے اندر کا شاعر ان کے مضامین میں بھی نظر آجاتا ہے۔ان کے ابتدائی مضامین زیادہ دلچسپ نہیں تھے لیکن فطری طور پر ان کا رجحان مزاح کی طرف زیادہ تھا۔کچھ عرصہ بعد ان کے قلم نے جو رفتار پکڑی وہ آج بھی جاری ہے بلکہ ان کے فن میں اور بھی نکھار آ گیا ہے۔ان کے مضامین کئی اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔حیدرآباد کے رسالوں میں ’’شگوفہ‘‘ اور دہلی کے رسائل میں ’’بانو‘‘ قابل ذکر ہیں جن میں پرویز کے مضامین تواتر سے شائع ہوتے ہیں۔’’شگوفہ‘‘ میں ان کا ایک مزاحیہ ناول ’’چہ خوب‘‘ بھی قسط وار شائع ہوا ہے۔پرویز یداللہ مہدی کے بارے میں مدیر ’’شگوفہ‘‘ نے ’’ترکی بہ ترکی‘‘ کی رسم اجراء کے موقع پر کچھ اس طرح اظہار خیال فرمایا:

> ’’پرویز کا شمار اردو کے ان گنے چنے ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے رشحات قلم کو روزگار کا ذریعہ بنایا اور ادب میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔پرویز پہلے مزاح نگار ہیں جنہوں نے اپنی طنز و مزاح نگاری کے ذریعہ ادب اور میڈیا کو ایک دوسرے سے مربوط کیا‘‘۔(3)

’’چھیڑ چھاڑ‘‘ ان کی پہلی تصنیف ہے جو 1974 میں شائع ہوئی۔جس میں دواخانے اور دیگر مزاحیہ مضامین ہیں۔اس کتاب میں ممتاز افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی قارئین سے مصنف کا تعارف کچھ اس انداز میں کراتے ہیں:

> ’’ہر فقرے اور ہر سچویشن کو الٹانے پلٹانے اور اسے مضحک دکھانے میں مہدی یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ایک ہنسی اور دوسرے ہنسی کے بیچ وقفہ ہونا چاہئے۔مہدی اس قدر چوکنّے ہیں کہ ہر فقرہ وضع کرتے ہی اس کے ہر ممکن معانی گردانیں ان کے ذہن میں آجاتی ہیں۔جنہیں وہ یوں استعمال کرتے ہیں جیسے کوئی شعبدہ باز بیک وقت پانچ چھ گیندیں اچھالتا ہے اور جو زمین پر گرتی ہے وہ گیند نہیں ہماری

نظر کا دھوکہ ہے‘‘ ۔(4)

ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین چھیڑ چھاڑ کے ڈسٹ کور کی تحریر میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

’’وہ لگاتار، مسلسل متواتر لکھتے ہیں ۔ شائد کوئی ایسا خوش قسمت رسالہ ہو جوان کی زد میں نہ آیا ہو۔ یوں لگتا ہے انہوں نے مزاح نگاری کا ٹائم ٹیبل بنا رکھا ہو۔ لکھنے کی یہ روش ان کی لگن جستجو اور ریاض کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ جس کے بغیر کوئی بھی فن نکھر نہیں سکتا۔ پرویز کے ہاں واقعی مزاح کا لطیف احساس بھی ملتا اور مزاح کیلئے درکار مخصوص بے تکلف زبان کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ مزاح نگاری کے سارے ہی حربوں کے استعمال میں وہ ماہر ہیں‘‘(5)

پرویز ایسے منفرد مزاح نگار ہے جواُن چھوٹے موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جن پر دوسروں کی نظر نہیں جاتی ۔ بالخصوص عورتوں سے متعلق موضوعات کو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جہیز کی لعنت بڑھتی جارہی ہے اور جس کی وجہ سے کئی لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی ہوئی ہیں اور یہ احساس ’’چوڑی کے غلام‘‘ کا انتساب دیکھنے پر اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔

’’مفلسی کی شاخ پر کھلنے والی ان معصوم کلیوں کے نام، جن کے کنوارے ارمان ، جہیز اور گھوڑے جوڑے کی بے رحم سولی پر چڑھا دیئے جاتے ہیں‘‘ ۔(6)

پرویز کی تحریروں میں مزاح کی فراوانی فرحت اللہ بیگ کی یاد دلاتی ہے۔ ان کے پاس پند و نصائح کے دفتر کے بجائے بے ساختگی نظر آتی ہے۔ شوخی، طراری ، بذلہ سنجی اور پر لطف مزاحیہ انداز ہے جس کی وجہ سے قاری اکتاہٹ کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے۔

یوسف ناظم کے خیال میں پرویز کی منزل بہت آگے ہے ان کا ادبی مستقبل نہایت تابناک ہے۔ وہ لفظوں کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں یہ پھیر نئے رجحانات اور امکانات کی طرف اشارہ بھی کرتی ہیں۔ یوسف ناظم

کے خیال میں پرویز اکیلے اتنا مزاح بکھیرتے ہیں کہ چار پانچ مزاح نگار بھی مشترکہ طور پر اتنا مزاح نہیں بکھیر سکتے۔

''اس بیچ میں انہوں نے پانچ کتابیں لکھی ہیں۔ یہ پانچ کتابیں ادرک کا پنجہ نہیں ہیں کیونکہ یہ کوئی خام مال نہیں۔ چھیڑ چھاڑ، چوڑی کے غلام، تو تو میں میں اور ٹائس ٹائیں فش کے بعد پروفیسر یداللہ مہدی حسینی کا پانچواں مجموعہ ''کچوکے'' 1993 کے اواخر میں چھپا ہے۔ ادھر جتنی بھی کتابیں چھپ رہی ہیں ان کی تعداد 600 سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن کچو کے ایک ہزار کی تعداد میں چھپی ہے۔ یہ افراط زر کا معاملہ نہیں اور نہ کسی خوش فہمی کا معاملہ ہے۔ بلکہ معاملہ یہ ہے کہ پروفیسر یداللہ مہدی کی کتابوں کا لوگوں کو انتظار رہتا ہے''۔(7)

ابھی حال ہی میں ان کا چھٹا مجموعہ ''ترکی بہ ترکی'' بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ پرویز کے ہاں مختصر تحریریں نظر نہیں آتی۔ ان کی تحریر طویل طویل ہوتی ہیں۔ کبھی کبھار بے سر پر کی اور بے محابہ پن اور برجستگی بھی درآتی ہے۔ موضوع کو برتنے کا ڈھنگ پرویز کو آتا ہے۔ اسی بناء پر طوالت کے باوجود ان کی تحریروں میں تازگی سی محسوس ہوتی ہے۔ پرانے اور گھسے پٹے موضوعات میں بھی پرویز نے اپنی فن سے جان ڈال دی ہے۔ کئی عنوانات مکان سے لامکاں تک، سسرال جی کا جنجال، آٹھواں عجوبہ پہلے بھی استعمال ہو چکے ہیں لیکن پرویز نے انہیں جیسے نئی شکل دی ہے اس کے علاوہ لفافہ بم، امریکہ کا چکر، عید کے ہنگامے، چلتا پھرتا لٹریچر جیسے نئے عنوانات پر بھی پرویز نے اپنے فن کا جادو بکھیرا ہے۔ ان کی مزاح نگاری، موضوعات کی تکرار کے بارے میں ڈاکٹر ایس جے صادق لکھتے ہیں۔

''آج کل کے مزاح نگاروں کے ہاں ایک ہی قسم کے مسائل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ پرویز ہی کا نہیں سارے مزاح نگاروں کا المیہ ہے پرویز کے ہاں کھلنڈرا پن اور سطحی پسندیدگی زیادہ اور گہرائی کم ہے۔ ان کا جھکاؤ مزاح کی جانب زیادہ اور طنز کی طرف کم ہے مگر طنز کی ایک لطیف لہر موسیقی ریز زبان میں لکھے گئے ہر فن پارے میں جاری وساری رہتی ہے۔ رواں دواں نہج سے ایک سماں باندھ دیتے ہیں''۔(8)

پرویز کی تحریروں میں مقامی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔انہیں حیدرآباد سے جنون کی حد تک پیار ہے۔ یہاں کی زبان، ثقافت، مقامات کی خوبصورت جھلکیاں ان کی تخلیقات میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے مزاح کی تیاری کے لئے خام مواد حیدرآباد کے کلچر اور مقامی ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے کئی علاقے مثلاً فلک نما، چار مینار، گنگ کوٹھی، پتھرگٹی، مشیرآباد وغیرہ کا ذکر اکثر پایا جاتا ہے۔

پرویز کی اب تک کئی مزاحیہ تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جن میں ''چھیڑ چھاڑ''، ''چوڑی کے غلام''، ''تو تو میں میں''، ''ٹائیں ٹائیں فش''، ''کچوکے'' اور ''ترکی بہ ترکی'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ''چہ خوب'' (ناول) ''دامانِ خیال یار'' کے عنوان سے انہوں نے ناولٹ بھی لکھا ہے۔ پرویز کی مزاح نگاری اور لفظیات سے متعلق ڈاکٹر ایس جے صادق لکھتے ہیں۔

> ''لفظ گھوڑ، ڈوغلا، صرف حیدرآباد میں بولا جاتا ہے۔ مبالغہ جب غلو کی حدوں کو پار کرنے لگتا ہے تو ان کی بد احتیاطی کی قلعی کھل جاتی ہے۔ مزاح میں مبالغے اور Possible Improbability کی بھی ایک حد ہوتی ہے جب پرویز ان حدوں کو پار کرنے لگتے ہیں تو الفاظ کا نقاب جو ان کے چہرے پر پڑا ہوا ہے اترنے لگتا ہے اور ان کے صحیح روپ سے واقف ہونے لگتے ہیں۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب ان کی زندہ دلی اور مزاح کا اسپارک کان کا ساتھ چھوڑنے لگتا ہے اور وہ مضامین کی آورد پر بھروسہ کرنے لگتے ہیں۔ ان کے پاس آورد اور آمد کا ایک واضح خط فاصل موجود ہے۔ آہستہ آہستہ بے ساختگی ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور وہ اب خواہ مخواہ ڈھکوں کا سہارا لے کر آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہیکہ ان کی شوخی خود ان کو نشانہ بنانے لگتی ہے''۔(9)

لفظ گھوڑ ادراصل دکنی لفظ جو صرف حیدرآباد میں ہی نہیں بلکہ پورے دکن میں استعمال کیا جاتا ہے یہ اور بات ہیکہ حیدرآباد میں اس کا استعمال کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ پرویز کے مضامین میں تب تک بے ساختگی ہوتی ہے جب تک وہ قاری کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چھیڑ چھاڑ میں سولہ مضامین ہیں جس میں سب سے پہلا مضمون ''چھیڑ غالب سے چلی جائے ہے اسدؔ'' جو ہر اعتبار سے ایک اچھا مضمون ہے۔اس میں طنز ومزاح متوازن معلوم ہوتے ہیں۔اس میں ان تقاریب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو غالب صدی کے نام سے منائی گئی اور مزے کی بات یہ تھی کہ ان تقاریب کا انعقاد ایسے لوگ کررہے تھے جو غالب کے 'غ' کو بھی صحیح طور پر ادا نہیں کرسکتے تھے۔اور نہ جنہیں غالب سے یا اردو ادب سے کسی قسم کا لگاؤ رہا۔ یہ افراد محض خود کو ادب نواز کہلوانے کے خواہشمند تھے۔غالب کے ایک محقق کی زبانی جنہوں نے غالب پر تحقیق کی تھی۔ پرویز نے ان نام نہاد ادبی انجمنوں اور ادب نوازوں پر سخت چوٹ کی جو آج بھی اردو کا چندہ کھاتے ہیں اور غالب کو ''گالب'' کہتے نہیں شرماتے۔غالب کے ایک محقق غالب کے تعلق سے کہتے ہیں:

> ''تاریخ گواہ ہے کہ اردو ہی وہ واحد زبان ہے جس میں کسی بھی شاعر یا ادیب پر تحقیق وتقلید کیلئے محقق کا پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں بلکہ ہر اُردو داں جو شدھ بدھ اردو پڑھ لکھ لیتا یا صرف سمجھ لیتا ہو وہ بھی بغیر روک ٹوک بڑے سے بڑے شاعر یا ادیب پر تحقیق یا تنقید کرسکتا ہے۔جہاں تک مرزا غالب کا تعلق ہے تو ان پر تحقیق یا تنقید کرنے کیلئے زبان کی بھی قید نہیں''۔(10)

اسی طرح ایک اور محقق غالب کے خطوط کا جائزہ لیتے ہوئے ایک نہایت عمدہ اور اہم انکشاف کرتے ہیں۔

> ''بے مطلب خط لکھنے کا سلسلہ جو مرزا نے شروع کیا تھا اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ جدید رنگ میں Blank Verse قسم کی نظمیں لکھنا چاہتے تھے۔ان کے خطوط جدید شاعری کی بہترین مثال کہلائے جاسکتے ہیں۔ان کے اس بے مقصد خط لکھنے کی تحریک نے آگے چل کر ترقی پسند تحریک کی شکل اختیار کی پھر اس نے چولا بدل کر جدیدیت کا روپ دھار لیا''۔(11)

پرویز یداللہ مہدی کے عنوانات میں رشید قریشی اور مسیح انجم کے عنوانات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔مزاح پیدا کرنا پرویز کا اہم مقصد ہوتا ہے۔اس لئے وہ روزمرہ اور اردو محاوروں کو مسخ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔مسخ کرنے کا رجحان پرویز کے ہاں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔الفاظ کی بہتات سے وہ محاورے کو اوٹ پٹانگ جامہ

پہناتے ہیں۔اس طرح یا وہ گوئی کی مدد سے دلچسپ فضاء قائم کرتے ہیں یہ الفاظ کو متعدد بار استعمال کرنے میں ید وطولیٰ رکھتے ہیں۔

''ابھی حال ہی میں برخوردار نے ہمارے سامنے یہ انکشاف کیا کہ ان کی اردو کا درسی کتاب میں جو محاورے اور کہاوتیں زیور طبع سے آراستہ کی گئی ہیں ان میں اکثر غلط ہے۔جب ہم نے ان سے معہ مثال وضاحت طلب کی تو مسمی پھٹاک سے بولے

''اب یہی محاورہ دیکھئے انکل، ناچ نہ جانے آنگن تیڑھا''
ہم نے مسکرا کر کہا''محاورہ تو صحیح ہے برخوردار
بولے غلط انکل ایک دم غلط۔آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم۔
ہم نے حیرت سے پوچھا''پھر صحیح محاورہ کیا ہے بیٹے؟
برجستگی سے فرمایا''صحیح محاورہ ہے، ناچ نا جانے اسٹیج ٹیڑھا۔

کیونکہ ڈانسر لوگ ناچ کا پروگرام اسٹیج پر پیش کرتے ہیں نا، اسی لئے محاورے میں آنگن کی جگہ اسٹیج ہونا چاہئے''۔ہم نے برخوردار کو سمجھاتے ہوئے کہا''بیٹے جس زمانے میں اس محاورے کا چلن عام ہوا تب آج کی طرح کرائے کے اسٹیج ایجاد نہیں ہوئے تھے۔اس لئے لوگ اپنے ٹیڑھے آنگن ہی میں ناچا کرتے تھے۔

برخوردار نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا''آخر آنگن ہوتا کیا ہے انکل؟
ہم نے انہیں سمجھانا شروع کیا۔''آنگن ایک دم کھلا کھلا ہوتا ہے خوب بڑا سا، جس میں تم دوڑ سکتے ہو، کرکٹ، فٹ بال اور ہاکی جیسے گیم کھیل سکتے ہو اور....''برخوردرا نے فوراً قطع کلام کرتے ہوئے کہا میں سمجھ گیا انکل آنگن کا مطلب جو ہو چوپاٹی''۔(12)

یہ آج ایک تہذیبی المیہ ہے جس کی طرف پرویز نے طنزیہ انداز میں اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لفظوں کو ایک منفرد انداز میں استعمال کرتے ہیں یہ صرف انہی کا حصہ ہے مضمون چاہے جتنا بھی طویل ہو، پرویز کو اس کی فکر نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کے پاس زور بیان کا وہ ہتھیار ہے جس سے سبھی رام ہو سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''ایک نوجوان اچانک آپ کے پیچھے سے فریم میں داخل ہوں گے۔
جن کی جینس کی پشت پر واضح الفاظ میں لکھا ہوگا No Entry۔ نوجوان
کے منظر سے فیڈ آؤٹ ہوتے ہی ایک چنچل حسینہ سامنے سے نمودار ہوگی
جس کی جرسی پر مصرع تر کی طرح یہ وارننگ چسپاں ہوگی No Parking
پھر اسی حسینہ کے فیگر کو ایک اور نازک انداز کا پیکر کراس کرے گا جس کی
ایمپورٹیڈ جینس پر پیچھے کی طرف یہ گرما گرم فقرہ درج ہوا Clean
Bowled'' (13)

ان کا کہنا ہیکہ یہ انگریزی میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں بلکہ اس کیلئے لباس کے ان خاص مقامات کا انتخاب کیا جاتا ہے جہاں لڑکیوں کے اعضائے جسمانی نمایاں نظر آتے ہیں۔ پرویز کا یہ بھی استدلال ہے ملبوساتی لٹریچر صرف انگریزی کے بجائے اردو میں بھی ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر حبیب نثار لکھتے ہیں:

''شکایت پرویز صاحب کو یہ ہیکہ انگریز تو ہندوستان سے چلے گئے
لیکن انگریزی کی غلامی ہم اب بھی کررہے ہیں۔ اسی لئے ملبوساتی لٹریچر
تمام انگریزی میں ہوتا ہے جب کہ اسے اردو میں بھی ہونا چاہئے''۔ (14)

پرویز مزاح پیدا کرنے کیلئے سب کچھ کر جاتے ہیں وہ مزاح پیدا کرنے کے کسی بھی حربے یا موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ حالات اور زبان دونوں کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ مضحک سچویشن پیدا کرنے کی جانب وہ کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ دراصل وہ قاری کی مسکراہٹ کے بجائے قہقہوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اِزار بند کی روایت کو وہ کچھ اپنے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں۔

''دور حاضر میں ازار بند کے اس شاعرانہ استعمال سے محرومی کا سب سے

بڑا سبب آج کے بیشتر شعراء کی ازار بند کی سہولت سے محرومی ہے کیوں کہ شاعر برادری کی اکثریت دور جدید کے تقاضوں کے پیش نظر پتلون اپنائے ہوئے ہے۔ دن میں تو خیر مجبوری ہے البتہ رات کے وقت ہمارے خیال میں پاجامہ پہن کر ازابند کی سہولت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ بلکہ اگر کسی شاعر بھائی کے ہاں پاجامہ نہ ہو تو صرف ازار بند عرف ناڑا ہی کمر سے باندھ کر چچا غالبؔ والی شاعرانہ سہولت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے''۔(15)

ان کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے مکاں سے لامکاں تک میں رہائشی مسائل کی طرف توجہ دلائی تو ''امریکہ پلٹ'' اور ''ایک ویزے کا سوال ہے بابا'' اور ''امریکہ کا چکر میں دیار غیر'' اور ''بیروزگاری'' سنگین مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''امریکہ پلٹ'' میں ایک طرف وہ تعلیم یافتہ بیروزگار نوجوان سے معاشرے کی سردمہری پر طنز کرتے ہیں تو دوسری جانب اپنے نوجوانوں کو غیرت دلانے کی کوشش کرتے ہیں جو اپنے وطن میں ملازمت کرنے کو کسر شان سمجھتے ہیں۔

''کہاں تو وہ زمانہ تھا جب مڈل پاس کرنے پر برخوردار کے ساتھ خاندان بھر کو پھولوں سے لاد دیا جاتا تھا اور کہاں یہ وقت آ لگا ہے کہ ایم اے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد بھی کوئی دو پھول چڑھانے کا روادار نہیں... چنانچہ آج کے بیشتر نوجوان یونیورسٹی سے ڈگری ملتے ہی اس بدنصیب دوشیزہ کی طرح منہ چھپانے لگتے ہیں جو نادانی میں شادی سے پہلے کسی کے جھانسے میں آ کر اپنی دوشیزگی گنوا بیٹھتی ہو''۔ (16)

اچھے مستقبل کی تلاش میں بیرون ملک پہنچنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی حالت زار اور ان کی زندگی کے شب و روز کی تصویر کچھ اس طرح کھینچتے ہیں۔

''غرض سارے تعلیم یافتہ ہم وطن نوجوان یہاں ہر وہ کام کرتے نظر آئے جنہیں وطن میں کرنا کسر شان سمجھتے تھے۔ سچ ہے

''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے''

اپنے مقام پر جو اپنی جوتیاں سیدھی کرنا معیوب سمجھتے ہیں آج پرائے دیس میں کتنی عقیدت سے دوسروں کی جوتیاں الٹی سیدھی کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر مارے غیرت کے ہمارے رونگھٹے کھڑے ہوگئے۔ ہم نے جوتیوں سے توبہ کرنا چاہا لیکن اس ارادے کو فوراً ملتوی کر دینا پڑا کیونکہ ہماری جوتیاں تو یہاں آتے ہی ضبط کر لی گئی تھیں اور مقامی لوگ ''جوتیاں'' نہیں بلکہ ''جوتے'' استعمال کرتے ہیں''۔(17)

ایک اچھا فنکار اپنے گردوپیش پر گہری نظر رکھتا ہے۔ پرویز اپنے مضامین کے موضوعات اپنے آس پاس ہی تلاش کرتے ہیں اور ایسے خوبصورت اور شگفتہ انداز میں طنز کے تیر چلاتے ہیں کہ قاری واہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے جہیز کے موضوع کو متعدد بار اپنے مضامین میں پیش کیا ہے۔ سسرال جی کا جنجال، عمر بھر کا ساتھ' شادی کا سوٹ وغیرہ میں انہوں نے اس سنجیدہ مسئلے کو مزاحیہ پیرائے میں نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

''آج کے ننانوے فیصد نوجوانوں کی طرح ہونے والی سسرال کو ہماری طرف سے مطبوعہ مجموعہ کلام یعنی فرمائشوں کی فہرست بھجوائی گئی۔ اس میں سوٹ کی مانگ سرفہرست تھی لیکن بعض پارٹیوں کی طرف سے سوٹ کی رقم کے بارے میں یہ اعتراض کیا گیا کہ بہت زیادہ ہے۔ جبکہ اس کی نصف رقم میں مکمل سوٹ معہ جوتے، موزے، ٹائی، قمیض، بنیان وغیرہ تیار ہوسکتا ہے۔ اس نامعقول اعتراض کا معقول جواب ہم نے یہ دیا کہ اس زائد رقم میں کئی ضروری مدیں شامل ہیں مثلاً کپڑے کی خریدی، بغیر دوست احباب کے مشورے کے ناممکن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں اس شہر کا قصد کرنا پڑے جہاں دو نمبر کے کاروبار دو نمبر کے امیروں اور دو نمبر کے ہنگاموں کیلئے ملک بھر میں پہلے نمبر پر آتا ہے۔ ایسی صورت میں آمدرفت کا خرچہ، قیام و طعام کے تمام تر اخراجات کا بار قاعدے کے مطابق لڑکی والوں کو ہی اٹھانا ہے

علاوہ ازیں اس رقم میں مستقبل میں سوٹ کی ڈرائی کلیننگ، آلٹرنگ اور آوٹ فٹنگ کے اخراجات بھی تخمیناً جوڑ کر پیشگی شامل کر دئے گئے ہیں تا کہ دونوں پارٹیاں بار بار کی زحمت سے بچ جائیں۔ ہمارا یہ جواز اس قدر ٹھوس بلکہ مدلل ثابت ہوا کہ کئی پارٹیوں نے اپنی اپنی نورچشم کو مثل چشمہ ہماری آنکھوں پر بٹھانا، بہ الفاظ دیگر پارٹیز بنانا اپنی خوش نصیبی تصور کیا مگر ہم نے اسی نورچشم کا انتخاب کیا جس کے چشمے میں صورت وسیرت کا نور بہت کم بلکہ مفقود تھا۔لیکن ''مال پانی'' کے اعتبار سے چشمہ لبریز تھا''۔(18)

پرویز یداللہ مہدی کے پاس طویل طویل جملے اور الفاظ کی تکرار نظر آتی ہے۔بعض وقت یہ طوالت قاری کو اصل موضوع سے دور کر دیتی ہے۔لیکن پرویز کی خوبی یہ ہیکہ وہ دوبارہ قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے مخصوص حربے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ان کے اب تک مضامین میں حیدرآبادی تہذیب واضح نظر آتی ہے۔ان کے مضامین شہری زندگی کے عکاس ہیں ان کے مضامین عصری حسیت کی مشرقی اقدار کے مٹتے نقوش کی عمدہ مثال ہیں۔

پرویز یداللہ مہدی کے انشائیوں اور مضامین کے عنوانات بڑے شگفتہ انوکھے اور چونکانے والے ہوتے ہیں۔''ترکی بہ ترکی''میں شامل ان کے مضامین کرکٹ نامہ،گدھا گشت' جنت امکانی،اردو کے شیر سے انگریزی کے شیئر تک اور مارکٹنگ گائیڈ اس کی مثال ہیں۔ یہ اقتباس دیکھئے جس میں میڈیا کے غیر اخلاقی اور تخریبی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''ایک صابن کی اشتہاری فلم میں میاں، بیوی اور ان کے شیرخوار فرزند تینوں ایک ہی ساتھ، ایک ہی صابن سے، ایک ہی حمام میں نہاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس سے ایک عام آدمی کو یقیناً یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ مذکورہ صابن کا استعمال صرف اس صورت میں کیا جاسکتا ہے جب تمام افراد خاندان مل کر ایک ہی حمام میں ایک ہی ساتھ باجماعت غسل کرنے کو تیار ہوں''۔(19)

پرویز کی قوتِ مشاہدہ اور معاشرتی ادراک بڑا تیز ہے وہ حال سے مستقبل کا اندازہ لگا لیتے ہیں مارکٹنگ گائیڈ میں بڑی دردمندی کے ساتھ ٹیلی ویژن کے پروگراموں اور اشتہاروں پر اثر انگیز طنز کرتے ہیں۔ پرویز یداللہ مہدی کے فن پر اور خاص طور پر تر کی بہ تر کی جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر اشرف رفیع لکھتی ہیں:

''میڈیا کے اصلاحی اور فلاحی پہلو معاشرے پر اتنے اثر انداز نہیں ہوتے جتنے غیر اخلاقی اور تخریبی پہلو اثر پذیر ہوتے ہیں۔ ہمارے اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی زوال پذیری میں بڑا دخل میڈیا کا ہے جس کا جادو سبھی پر چل رہا ہے۔ خصوصاً ایسے دیش میں جو تعلیمی اعتبار سے اب تک پچھڑا ہوا ہے... ایسے نازک مرحلے میں مزاح نگار مسیحا بن کر سامنے آتا ہے۔ پرویز کی قوت مشاہدہ، دور بینی دروں بینی کے علاوہ تہذیبی اور معاشرتی ادراک بڑا تیز ہے وہ حال سے مستقبل کا اندازہ نہیں لگاتے، اندیشہ بھی کر لیتے ہیں''۔(20)

پروفیسر یداللہ مہدی نہ صرف ایک حساس دل رکھتے ہیں بلکہ ایک ہمدرد انسان بھی ہیں۔ ان کی تحریروں میں بھی ان کی شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے۔ وہ لوگوں کو گرویدہ کرنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ مسیح انجم سے وہ کچھ زیادہ ہی قریب رہے شائد اس کی وجہ یہ رہی کہ دونوں نے ایک ساتھ لکھنا شروع کیا تھا۔ مختلف موقعوں پر طالب خوندمیری، برق آشیانوی، اشرف خوندمیری، رشید عبدالسمیع جلیل وغیرہ اپنے اپنے انداز میں انہیں تہنیت پیش کی ہے۔ فیروز حیدر تو انہیں کنگ سائز مزاح نگار قرار دیتے ہیں۔

''ایک سرد مزاج آدمی "Cool" سگریٹ ہے تو ایک تلخ مزاج آدمی چارمینار سگریٹ اور سگریٹوں کی اس دنیا میں پرویز یداللہ مہدی کا وجود ایک کنگ سائز سگریٹ کی طرح ہے۔ اس کو پینے کے بعد جس لطیف فرحت کا احساس ہوتا ہے ویسی ہی فرحت پرویز کے مضامین پڑھ کر حاصل ہوتی ہے۔ پرویز کے ساتھ میں نے لفظ کنگ سائز King Size صرف ان کے تن وتوش کی مناسبت سے استعمال نہیں کیا ہے بلکہ سبھی جانتے ہیں کہ کنگ سائز سگریٹ میں ایک Filter ہے جو سگریٹ پینے والے کی زبان پر

تمبا کو کی تلخی کو محسوس ہونے نہیں دیتا اس طرح پرویز کے مضامین میں طنز تمبا کو ہے تو مزاح فلٹر اور جب ہم مضمون پڑھتے ہیں تو طنز کا تمبا کو مزاح کے فلٹر سے ہوتا ہوا ہماری زبان تک پہنچتا ہے اور زبان کو طنز کی تلخی کا نہیں بلکہ صرف مزاح کی حلاوت کا احساس ہوتا ہے''۔(21)

شگوفہ کی روایت رہی ہے کہ وہ نہ صرف نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتا ہے بلکہ کہنہ مشق اور مقبول مزاح نگاروں کے فن کو عوام تک پہنچانے کیلئے خاص نمبر بھی شائع کرتا ہے۔ جب پرویز یداللہ مہدی نمبر شائع ہوا تو اس کی رسم اجراء کے موقع پر مختلف لوگوں نے مضامین پڑھے۔اس موقع پر ڈاکٹر حبیب نثار نے کہا:

''سماجی برائیوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ وہ بناتے ہیں جو اپنی عمریں تہذیب وتمدن کے مطالعہ میں صرف کر دیتے ہیں۔ پرویز یداللہ مہدی نے اپنی تحریروں میں شہری زندگی اس کی عصری حیثیت اور مٹتی ہوئی مشرقی تہذیب کے نقوش کو موضوع بنایا ہے''۔(22)

اس تقریب میں پرویز نے ہر شخص کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔ مدیر شگوفہ مصطفیٰ کمال سے لے کر اپنے اہل خاندان کے ہر فرد کا انہوں نے شکریہ ادا کیا۔اس موقع پر وہ اشرف خوند میریؔ اور مسیح انجم کو بھی نہیں بھولے۔حیدرآباد اور دکنی زبان سے ان کے لگاؤ کا اندازہ ان کے خطبہ شکرانہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔یہ اقتباس دیکھئے:

''آج دکنی کی حیثیت ایک بولی کی سی ہو کر رہ گئی ہے ورنہ ایک دور وہ بھی تھا جب اسے زبان کا درجہ حاصل تھا۔ جہاں تک دکنی کو بحثیت زبان کے مزاحیہ شاعری میں برتنے کا تعلق ہے اگر صرف پچھلی نصف صدی سے ذرا پہلے نظر ڈالی جائے تو بے شمار نام ملیں گے جیسے نذیر دہقانی، اعجاز حسین کھٹا، سرور ڈنڈا، علی صائب میاں، سلیمان خطیب، گلی نلگنڈوی وغیرہ برادرم اشرف خوند میری اسی سلسلے کی ایک معتبر کڑی ہیں۔ دکنی زبان اور اس کے محاورے ان کی شاعری کا خاصہ ہیں''۔(23)

ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک کامیاب مزاح نگار ہیں۔ان کے پاس مزاح نگاری مقصدی ہے اور مقصد بھی بڑا عظیم ہے کہ اس سے اصلاح کا کام ہو جائے وہ اپنے مقصد میں کتنے کامیاب ہوئے ہیں۔بحیثیت مزاح نگار ادب میں ان کے مقام کا تعین کرنا نقادوں کا کام ہے۔مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مضامین میں موضوع کی یکسانیت گراں گذرتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کا ادبی خلوص ان کی ان کوتاہیوں کو نظر انداز کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) پرویز یداللہ مہدی ''بک رہا ہوں جنوں میں'' مشمولہ ''چھیڑ چھاڑ'' صفحہ 11

(2) پرویز یداللہ مہدی ''بک رہا ہوں جنوں میں'' مشمولہ ''چھیڑ چھاڑ'' صفحہ 14

(3) مصطفیٰ کمال ''اداریہ'' مطبوعہ ''شگوفہ'' پرویز یداللہ مہدی نمبر' مارچ 2009۔ صفحہ 85

(4) راجندر سنگھ بیدی مشمولہ ''چھیڑ چھاڑ'' صفحہ 7

(5) مجتبیٰ حسین ''ڈسٹ کور تحریر'' مشمولہ ''چھیڑ چھاڑ''

(6) پرویز یداللہ مہدی ''انتساب'' مشمولہ ''چوڑی کے غلام'' صفحہ 3

(7) یوسف ناظم ''شہر ظرافت کے پرویز، یداللہ مہدی'' مطبوعہ: شگوفہ پرویز یداللہ مہدی نمبر صفحہ 124

(8) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و مزاح' آزادی کے بعد'' صفحہ 571

(9) ڈاکٹر ایس جے صادق ''اردو ادب میں طنز و مزاح' آزادی کے بعد'' صفحہ 572

(10) پرویز یداللہ مہدی ''چھیڑ غالب سے چلی جائے اسد'' مشمولہ ''چھیڑ چھاڑ صفحہ 92

(11) پرویز یداللہ مہدی ''چھیڑ غالب سے چلی جائے اسد'' مشمولہ ''چھیڑ چھاڑ'' صفحہ 92

(12) پرویز یداللہ مہدی ''میں تلسی تیرے فلیٹ کی'' مشمولہ ''کچوکے'' صفحہ 44-43 سنہ 1993ء

(13) پرویز یداللہ مہدی ''چلتا پھرتا لٹریچر'' مشمولہ'' مشمولہ ''کچوکے'' صفحہ 13

(14) ڈاکٹر حبیب نثار ''کچوکے پر ایک نظر'' مشمولہ ''مطالعہ'' صفحہ 92

(15) پرویز یداللہ مہدی ''مرزا غالب اور ازاد بند'' مشمولہ ''چھیڑ چھاڑ'' صفحہ 30

(16) پرویز یداللہ مہدی ''امریکہ پلٹ'' مشمولہ ''ٹائیں ٹائیں فش'' صفحہ 40

(17) پرویز یداللہ مہدی ''امریکہ پلٹ'' مشمولہ ''ٹائیں ٹائیں فش'' صفحہ 42

(18) پرویز یداللہ مہدی ''شادی کا سوٹ'' مشمولہ ''چوڑی کے غلام'' صفحہ 45

(19) پرویز یداللہ مہدی ''مارکٹنگ گائیڈ'' مشمولہ ''ترکی بہ ترکی'' صفحہ 35

(20) پروفیسر اشرف رفیع ''ترکی بہ ترکی... پرویز یداللہ مہدی، مشمولہ: شگوفہ' پرویز یداللہ مہدی نمبر صفحہ 130

(21) فیروز حیدر ''پرویز یداللہ مہدی' کنگ سائز مزاح نگار'' مطبوعہ ''شگوفہ، جولائی 1975، صفحہ 45

(22) ڈاکٹر حبیب نثار مضمون: غیر مطبوعہ

(23) پرویز یداللہ مہدی ''خطبہ شکرانہ'' مشمولہ: ماہنامہ ''شگوفہ'' مارچ 2009 صفحہ 16

ممتاز مہدی

15 فروری 1952ء کو بیگم بازار محلّہ، حیدرآباد دکن میں سید منجو قمر ممتاز ڈرامہ نویس وادیب کے گھر سید ممتاز مہدی کا جنم ہوا۔ گھر کی فضاء ادبی تھی ممتاز مہدی کو بچپن ہی سے ادبی ماحول میسر رہا۔ ممتاز مہدی کی ابتدائی تعلیم اردو مدرسہ تحتانیہ بیگم بازار میں ہوئی۔ بعدازاں گوشہ محل ہائی اسکول معظم جاہی مارکٹ سے وسطانیہ کی تعلیم حاصل کی اور مدرسہ گوشہ محل عثمان گنج سے ایچ ایس سی کی سند حاصل کی۔ گورنمنٹ سٹی کالج سے 1975ء میں انہوں نے بی کام میں کامیابی حاصل کی۔ 1976 میں شعبہ اردو، حیدرآباد ایوننگ کالج بشیر باغ میں داخلہ لیا اور 1978 میں امتیازی نشانات کے ساتھ ایم اے کامیاب کیا۔ حیدرآباد ایوننگ کالج میں انہیں حمید الدین شطاری، ڈاکٹر حفیظ قتیل، زینت ساجدہ، ڈاکٹر ہاشم علی، ڈاکٹر یوسف سرمست اور ڈاکٹر مغنی تبسم جیسے یکتائے روزگار اساتذہ سے کسب فیض کا موقع ملا۔

ممتاز مہدی کی تحریریں دلچسپ شگفتہ اور بذلہ سنجی لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ ان کے مضامین انسانی اعمال سے متعلق ہیں۔ اگر چہ ان کی ابتدائی تخلیقات مادی موضوعات پر مبنی ہیں لیکن بعد کو انہوں نے عقلی موضوعات کو اپنایا اس طرح جو ابتدائی مضامین ہیں ان کا تاثر لمحاتی ہے عارضی ہے لیکن عقلی موضوعاتی میں یہ اثر نہ صرف پائیدار ہے بلکہ عقلی مسرت وانبساط کو دوآتشہ کردیتا ہے۔

ممتاز مہدی کا مطالعہ وسیع ہے اور موضوع پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ ان میں مزاح کی صلاحیت قدرتی ہے۔ موضوعات بے حد ہلکے پھلکے اور انسانی افعال پر مبنی ہوتے ہیں جیسے رونا، بیٹھنا، کھڑا ہونا یا بھاگنا وغیرہ۔ یہ ایک لفظی موضوعات ہیں جن کو پھیلانا اور اس پر مزاح لکھنا بے حد مشکل کام ہے۔ لیکن ممتاز مہدی اس کام میں بڑے ماہر ہیں۔ دیکھئے یہ اقتباس ان کے مضمون ''لکھنا'' سے پیش ہے۔

> ''جب قدرت ساتھ دیتی ہے تو انسان اچھا اور سچا لکھتا ہے (یعنی طنز ومزاح لکھتا ہے) جب شیطان بھٹکاتا ہے تو انسان ''شیطانی کلمات'' لکھتا ہے'' (1)

اسی طرح یہ انداز دیکھئے اس اقتباس میں

''بہتر یہ ہوگا کہ مردانگی کے نام پر رونے کو روکنے کے بجائے رونے کے کسی موقع کو ضبط کے نام پر ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ ادھر تنخواہ دیکھی رو دیئے، ادھر بجٹ دیکھا رو دیئے، مکان دار کی شکل دیکھی رو دیئے، دودھ والے کی آواز سنی رو دیئے، راشن کی دوکان دیکھی رو دیئے، حد یہ کہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا رو دیئے کہ بھلا ہی میک اپ خراب ہو جائے''۔(2)

اسی طرح یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے

''تحریری کام تو بیٹھے بیٹھے ہی کرنا ہوتا ہے جبکہ تقریر کرنے کیلئے کھڑے ہونا لازمی ہے حجامت بیٹھے بیٹھے، لڑائی کھڑے کھڑے ... ہر تخریبی کام کھڑے کھڑے ہی انجام پاتا ہے...''(3)

ممتاز مہدی اپنے مشاہدات اور محسوسات کو جاندار اور جاذب نظر بنا کر پیش کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ خوشنما تحریر ان کے اسلوب کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ شامت اعمال میں شامل تخلیقات اور ان کے موضوعات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حبیب نثار رقمطراز ہیں۔

''ممتاز مہدی کے ان مضامین کو جو ایک لفظ کے محور پر گھومتے ہیں ایک لفظ کے وسیلے سے بیان ہوئے ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ مضمون کہنا شاید ٹھیک نہیں' ان کے یہ مضامین انشائیہ کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ اس لئے ان کو انشائیے قرار دینا چاہیے۔ طنز و مزاح ان انشائیوں کا ایک جُز ضرور ہے لیکن طنز و مزاح ان مضامین کا محور نہیں اسی لئے ان کو انشائیہ کہنا ہوگا۔''(4)

ان کا ایک فکر انگیز مضمون ہے ''سوچنا'' جس میں انہوں نے بڑی خوبی سے وضاحت کی ہے کہ آدمی چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے' کھاتے پیتے سوچتا ہے اور اسی سوچ کے مختلف نتیجے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک اقتباس

ملاحظہ ہو جس میں وہ طنز کی کڑواہٹ کو مزاح کی مٹھاس کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

''جب غالبؔ سوچتے ہیں تو 'دیوانِ غالب' ایک عالم میں اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑھتا ہوا صدیوں تک دانش گاہوں کی سوچ کا مرکز بن جاتا ہے اور جب ہم سوچتے ہیں تو' کالے بال سفید ہوجاتے ہیں نہ کوئی دیوان وجود میں آتا ہے نہ ہی دیوان خانہ ٔادراک کی معصومیت کی انتہاے ہے کہ نہ صرف مسجد کو توڑیں گے بلکہ مندر کی شکل میں موڑیں گے چاہے دیش کتنا ہی مڑجائے ٹوٹ جائے جیسے زو کے بندر بغیر سوچے سمجھے ان کے آرام کے لئے لگوائے گئے جھولے حفاظت کی جالی توڑ کر پھینک دیتے ہیں مگر سوچتے بھی نہیں کہ کیا سے کیا ہوگیا ہے۔''(5)

ممتاز مہدی کی تحریریں عموماً دلچسپ اور شگفتہ ہوتی ہیں' وہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ان کے اور باتوں باتوں میں طنز کا بھرپور وار کرتے ہیں۔

''بچوں نے مسلسل کامنٹری دینا شروع کردیا جب ہم کھانا کھا رہے ہوں بچے آواز بلند کرتے۔چکنی کھا رہی ہے'' جب آرام کے لئے لیٹتے تو کہتے ''چکنی سو رہی ہے''۔سب سے چھوٹی منی نے غضب ہی کردیا' گھر میں جب بھی داخل ہوتے تھے ''چاچا'' کہہ کر لپٹ جاتی تھی لیکن 'حالت زار' کو جو دیکھا تو اتنی سہم گئی کہ جب بھی نظر پڑتی بھاگ کر اپنی امی کی گود میں امان پاتی ۔ایک دن ہم گہری نیند میں تھے وہ ڈرتے ڈرتے ہمارے قریب آئی ہمت سے کام لے کر آہستہ سے سر کو چھو کر دیکھا' جب بھلا محسوس ہوا تو سہلانے لگی پھر نجانے کیا جی میں آئی ایک چپت لگا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔یہ تو گھر کے اندر کا فسانہ تھا محلّہ میں چلنا پھرنا دشوار ہوگیا' وہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جو ہماری طرف آنکھ

اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں کرتی تھیں ہمیں دیکھ کر کورس شروع کر دیا:

چکنی ہانڈی چاکنا' پیسہ لے کر بھاگنا' چکنی ہانڈی چائے گرم' پینے والا......''(6)

ممتاز مہدی کا مشاہدہ کافی تیز ہے' وہ اپنے اطراف ہونے والے واقعات اور انسانی بوالعجبیوں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناتے ہیں۔ باتوں باتوں میں معلومات فراہم کرنا ان کے اسلوب کی ایک انفرادی خصوصیت ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''تلاش پیار' تلاش معاش اور تلاش یار کی طرح اُردو کے ذاتی الفاظ کی تلاش بھی جوکھم کا کام ہے۔ لفظ ''مرغ'' کو ہی لیجئے۔ فارسی اصیل ہے بمعنی ''پرند''۔ یہ لفظ اُڑتے اُڑتے ہندوستان' سونے کی کان کے آنگن میں اتر کر پُھد کنے لگا تو اسے پرندے تک محدود کر دیا گیا جو پرواز میں کوتاہی محسوس کرتا ہے۔ بلکہ پرواز کا قائل ہی نہیں۔ لفظ مرغ کو ایک عدد مونث لفظ سے بھی سرفراز کر دیا گیا یعنی مرغی! اور یہ اصیل سو فیصد اُردو کا لفظ ہے' اس طرح خالص اُردو کے الفاظ گنتی کے ہیں۔''(7)

ممتاز مہدی حیدرآباد کے اُن مزاح نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے مزاح کو اس کی حدود کے اندر رہ کر برتنے کی کوشش کی۔ ان کے ہاں انسانی افعال و حرکات و سکنات سے متعلق موضوعات کی بھر مار ہے اور وہ ان موضوعات کو بڑی خوبی سے انلارج (Inlarge) کرتے ہیں اور باتوں باتوں سے طنز کے تیر چلاتے ہیں تو کبھی مزاح کا پھایا ان زخموں پر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مدیر ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ''شامت اعمال'' کے پس ورق پر مصنف کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''ان سے ملئے تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ مزاح لکھتے ہیں۔ نہایت بے ضرر قسم کے خود رفتہ، کم گو انسان ہیں، جن کے چہرے پر عجیب بے تعلقی جھلکتی

ہے۔لیکن ان کے قلم میں نوک سناں کی صفت اور تحریروں میں برق تپاں کی تڑپ ملتی ہے۔ خیال سے خیال پیدا کرنے اور لفظوں سے کھیلنے میں بڑی چابک دستی کا ثبوت دیتے ہیں۔(8)

مزاح کے مروجہ موضوعات اور اندازِ بیان سے بچتے ہوئے ممتاز مہدی نے اپنی الگ ڈگر بنانے کی سعی کی ہے اور ان ہی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے کم کم شیرینی اور کم کم نمکینی کو اپنایا ہے۔

کم گو اور کم سخن آدمی بڑے کام کی باتیں کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ باتونی آدمی کے مقابلے میں اپنی انرجی کو ضائع ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔ دوسرے وہ سوچ سمجھ کر ہر معاملے اور واقعہ کے ہر ہر پہلو کو خوب اچھی طرح غور و خوص کے بعد اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''شامت اعمال'' میں سب سے بہترین مضمون برنارڈ شا ہے۔ یہ مضمون ممتاز مہدی نے ایک جلسہ میں جب کہ وہ ایم اے کے طالب علم تھے لکھا اور سنایا تھا۔ لیجئے ایک اقتباس مضمون برنارڈ شا سے پیش ہے:

''ہم نے برنارڈ شا کی غذا کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ وہ گوشت انڈا وغیرہ نہیں کھاتے تھے ہمارا حال یہ تھا کہ ہر نوالے میں گوشت لازمی تھا۔ لیکن برناڈ شا کے طور پر عمل کرتے ہوئے ہم نے گوشت انڈا وغیرہ سے پرہیز شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہفتہ بھر میں بارہ پونڈ وزن گھٹ گیا۔ آنکھیں اندر چلیں گئیں بلکہ اتنی کمزور ہوگئیں کہ ان کو''فارن ایڈ'' یعنی بیرونی امداد کی ضرورت پیش آئی''۔(9)

ممتاز مہدی مزاح پیدا کرنے کی دُھن میں بعض وقت معیار کو برقرار نہیں رکھ پاتے ہیں۔ بعض تحریروں میں سطحیت اور ابتذال بھی نمایاں ہوجاتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ننگے پاشومیاں کا واقعہ یہ ہیکہ ایک بار باوجود ضعیفی انہوں نے درجن دامادوں اور بیٹوں کی عالیشان لڑائی جھگڑے مار پیٹ والی محفل دروازے کھڑکیاں بند کر کے منعقد کی تھی۔ دھکم پیل میں جب ان کی لُنگی کھل گئی، تو

لُنگی کاندھے پر ڈال لڑائی کی شدت میں کمی آنے نہیں دی۔'' (10)

ممتاز مہدی معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں پر عمیق نظر رکھتے ہیں اور انسانی افعال کو موضوع بنا کر مزاح پیدا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سید موسیٰ کاظم لکھتے ہیں۔

''ممتاز مہدی کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں، نہ مشاہدہ کی۔ طنزیہ و مزاحیہ واقعات کی مدد سے وہ اپنے قارئین کو ہنسانا بھی جانتے ہیں اور رُلانا بھی۔'' (11)

جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے ممتاز مہدی نے واقعی اپنی الگ راہ نکالنے کی سعی کی ہے۔ معمولی معمولی باتوں اور واقعات کی مدد سے وہ مزاح پیدا کرتے ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنے اور الفاظ سے کھیلنے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ ظرافت کا بنیادی کام فرحت و انبساط پیدا کرنا ہے۔ مزاح کے بارے میں خود مصنف کی رائے ہے۔

''کبھی کبھار آدھی بات کہنے یا لکھنے سے بھی مزاح کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے اضافی لفظ کا حذف ہو جانا ''رامو کا گدھا'' میں سے ''کا'' نکال دیجئے ''راموگدھا'' ہو جائیگا۔ کسی اسم کو الٹا پڑھنے سے بھی استہزاء کی کیفیت ہوتی ہے جیسے قاسم کو ''مساک'' پڑھا جائے تو ان باتوں کو سامنے رکھ کر جب ہم نے انیسہ سلطانہ صاحبہ کی کتاب کے سرورق پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ کاتب صاحب نے عنوان کو الٹا پڑھنے کی ترغیب دی ہے پہلے نظر میں یہ کچھ یوں لگے گا ''نشو ونما کی طنز و مزاح میں حیدرآباد''۔ (12)

ممتاز مہدی ہمارے ان مزاح نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے خاموشی کے ساتھ طنز و مزاح کی خدمت کی ہے اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہتے ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ میدان ظرافت میں وہ کبھی کبھی اکیلے کھڑے نظر آتے ہیں۔

----OOO----

حوالہ جات

(1) ممتاز مہدی ''لکھنا'' مضمون مشمولہ ''شامت اعمال'' صفحہ 24 مطبوعہ دائرہ پریس حیدرآباد 1994ء

(2) ممتاز مہدی ''رونا'' مضمون مشمولہ ''شامت اعمال'' صفحہ 46 تا 47

(3) ممتاز مہدی ''لکھنا'' مضمون مشمولہ ''شامت اعمال'' صفحہ 56

(4) ڈاکٹر حبیب نثار ''دل کے آئینے میں'' مضمون مشمولہ ''شامت اعمال'' ص 16

(5) ممتاز مہدی ''سوچنا'' مضمون مشمولہ ''شامت اعمال'' ص 61

(6) ممتاز مہدی ''چکنے گھڑے'' مضمون مشمولہ ''شامت اعمال'' ص 110

(7) ممتاز مہدی ''کرنا پیار اُڑ نچھوکا'' مضمون مشمولہ ''شامت اعمال'' ص 102

(8) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ''پس ورق'' تحریر مشمولہ ''شامت اعمال''

(9) ممتاز مہدی ''برناڈ شاہ'' مضمون مشمولہ ''شامت اعمال'' صفحہ 124

(10) ممتاز مہدی ''جھگڑنا'' ''شامت اعمال'' ص 56

(11) سید موسیٰ کاظم ''ممتاز مہدی کی مزاح نگاری'' مضمون مشمولہ ''شامت اعمال'' ص 22

(12) ممتاز مہدی ''آدھی تنقید آدھی تاریخ'' مضمون مشمولہ: ''شامت اعمال'' صفحہ 126

ڈاکٹر سید عباس متقی

سید عباس متقی، 17 جنوری 1953ء کو حیدرآباد کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا شوق تھا چنانچہ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے پہلے اردو میں ایم اے کیا بعد ازاں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

ڈاکٹر سید عباس متقی کی اب تک 9 تصنیفات منظر عام پر آ چکی ہیں۔ 1989ء میں ''دکھتی رگیں''، 1990ء میں ''تسلیماً کثیرا''، 1992ء میں ''مثنوی نوال السبحانی''، 1993ء میں ''تنہائیاں''، 1993ء میں ہی ''چھوٹی انگلی''، 1996ء میں ''فی ظلال البردہ'' اور ''میری بلا سے''، 2001ء میں ''رودِ دود''، 2003ء میں ''ڈرتا ہوں آئینے سے'' اور 2007ء میں ''لگے ہاتھوں'' شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ''دکھتی رگیں، چھوٹی انگلی، میری بلا سے، ڈرتا ہوں آئینہ سے اور لگے ہاتھوں'' مزاحیہ تصانیف ہیں۔

آج کی اس مصروف ترین دنیا میں ہر شخص کو اپنے کام کی پڑی ہے۔ بے شمار مسائل، مشکلات سے دوچار ہے۔ اسے مسکرانے کے چند لمحے بھی شائد میسر ہوں۔ طنز و مزاح کی موجودہ صورتحال اور لوگوں کی مصروف زندگی اور مطلب پرستی کے بارے میں عباس متقی لکھتے ہیں:

> ''اس دور میں کہاں لوگوں کو اتنی فرصت کہ ہنسنے اور مسکرانے کیلئے بھی وقت نکالیں۔ انسان ہمہ اقسام کی تکلیفوں، رنجشوں اور مصیبتوں اور کچھ نہیں تو الجھنوں میں اتنا دبا ہوا ہے کہ نہ ذہن تبسم کی اجازت دیتا ہے اور نہ دل قہقہہ کا پروانہ۔ اور ایک زمانے سے طبیعتوں کو گدگدانے والی باتوں کی ایجاد و اختراع گویا ایک خواب بن کر رہ گئی ہے۔ نہ وہ قہقہہ بردوش لوگ رہے نہ بزلہ سنج شخصیتیں رہیں۔''(1)

ڈاکٹر سید عباس متقی ایک بسیار نویس مزاح نگار ہیں۔پچھلی دو دہائیوں میں انہوں نے بے تحاشا لکھا اور اسے شائع بھی کیا۔ان کے متعدد مضامین ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ڈاکٹر سید عباس متقی کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔اس کے ساتھ ساتھ دہرائے ہوئے موضوعات پر بھی وہ منفرد انداز سے روشنی ڈالنے میں ماہر ہیں۔پطرس نے مرحوم کی یاد میں سائیکل کو دوامیت بخشی۔ڈاکٹر سید عباس متقی نے سائیکل کے عنوان پر مضمون لکھ کر اس کے دیگر مضحک پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ملاحظہ ہو ان کے مضمون سائیکل سے یہ اقتباس:

> ''خوش نصیب ذاتی سائیکل رکھتے ہیں اور کم نصیب کرایہ کی سائیکل چلاتے ہیں۔ جب کوئی کرایہ کی سائیکل چلاتا ہے تو اس کے مزاج میں قدرتی طور پر بلا کا تحمل پیدا ہو جاتا ہے۔کرایہ کی سائیکل چلانے والا دنیا کا ہر کام بحسن وخوبی انجام دے سکتا ہے۔اگر کوئی کرایہ کی سائیکل پر جائے اور ہوٹل میں چائے پی کر ہمہ اقسام کی ہم رنگ اور ہم ہیئت سائیکلوں سے سائیکل نکال لائے اور دوسری سائیکلوں کو نہ گرائے تو وہ کسی صوبے کی وزارت اعظمیٰ کی اہلیت کا حامل سمجھا جائے گا۔کیونکہ وہ فریس، معاملہ فہم اور جفاکش ہے۔جو کرایہ کی سائیکل کو پہچان لے۔وہ ہندوستانیوں کے مزاج کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کریگا''(2)

ڈاکٹر سید عباس متقی نے اس مضمون میں مزاح پیدا کرنے کی زبردست کوشش کی ہے املا کے لحاظ سے بھی مضمون میں متعدد خامیاں ہیں۔مثلاً سائیکل کو انہوں نے مسلسل سیکل لکھا ہے۔بسیار نویسی کی سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ بیان وزبان سے سطحیت آجاتی ہے۔مثلاً یہاں انہوں نے لکھا ہے کہ اگر کوئی کرایہ کی سائیکل پر جائے اور ہوٹل میں چائے پی کر ہمہ اقسام کی ہم رنگ اور ہم ہیئت سائکلوں میں سائیکل نکال لائے، زبان و بیان میں اگر فروعات سے روگردانی کی جائے اور مصنف ایسی زبان میں عبارت تحریر کرے جو عرف عام میں بولی کہلاتی ہے تو تحریر کا حسن تو برباد ہوگا ہی ساتھ میں اس صنف جس سے عبارت مذکور متعلق ہے اس کا وقار اور رکھ رکھاؤ بھی ختم ہو جاتا ہے۔اگر فاضل مصنف واقعہ کی جزئیات نگاری کو بھی بیان کرتے تو اس میں پایا جانے والا عموی تاثر ختم

ہوجاتا اور بات گہری اور مزید مزاح لئے ہوئے ہوتی۔ ڈاکٹر سید عباس متقی کے ہاں طنز کی کاٹ فراوانی سے ملتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مضمون تحریر کرنے سے پہلے اس کے عنوان کو خوب ذہن میں رکھتے ہیں اور اس کی مناسبت سے طنز و مزاح کو الگ الگ کردیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین مزاحیہ رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں تو بعض طنز کے نشتروں سے چھلنی۔ یہ اقتباس ان کے مضمون ''گدھ جوعنقا ہوئے'' سے ملاحظہ ہو:

> ''پارسیوں کے اجلاس میں گدھ کے چوزوں کی پرورش کی تجویز پیش کی گئی۔ اس بات پر ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ گدھ بچوں کی پرورش پر بارہ کروڑ کا خرچ آئے گا لیکن ہم یہ پڑھ کر لرز گئے کہ گدھ بچوں کو انسانی گوشت کھلایا جائے گا۔ ہم سوچنے لگے کہ کیا اب انسان گدھ بچوں کے کام کا رہ گیا ہے۔ اقبال نے تو انسان کو ''شاہین بچوں'' کا سبق دیا تھا اور اب انسان گدھ کے بچوں کا رزق بنے گا۔ افسوس لوگ انسانی بچوں پر چند ہزار نہیں خرچتے لیکن گدھ بچوں پر بارہ کروڑ، بارہ کروڑ کے تخمینے پر ہمیں سماج کے وہ لاکھوں مفلوک الحال بچے یاد آ گئے۔ جنہیں مدارس میں ہونا چاہئے تھا لیکن وہ بارہ آنوں کیلئے کارخانوں میں نظر آتے ہیں اور یہ کارخانے وخمے نظر آتے ہیں کچھ بھی ہو ہندوستان میں وخموں کی کمی نہیں البتہ گدھوں کا رونا ہے''۔ (3)

ڈاکٹر عباس متقی کے موضوعات میں تنوع ہے۔ وہ اپنے موضوعات اپنے اردگرد ہی تلاش کرتے ہیں۔ وہ انسان کی بوالعجبیوں کو اپنے مزاح میں برتنے میں ماہر ہیں۔ وہ روزمرہ کے واقعات کو بھی اپنے منفرد اسلوب سے مزاح کا روپ دیدیتے ہیں۔ چونکہ وہ ایک اسکول ٹیچر ہیں اسی لئے ان کی سوچ بھی ایک استاد جیسی ہوتی ہے۔ ان کے مضمون ''مردم شماری سے مردم آزادی تک'' کا یہ اقتباس دیکھئے جس میں ٹیچر سے اس کے اصل کام سے ہٹ کر دیگر کام لینے کا نتیجہ اپنے منفرد انداز میں بیان کرتے ہیں۔

> ''معلوم ہونا چاہئے کہ مدرس تدریس کے علاوہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ یہ اس کا اپنا نصیب ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ بندر نچانے والے کو ریچھ نچانے کا

کام سونپا جائے۔ ظاہر ہے کہ بندر نچانے والا ریچھ کو تو نہیں نچا سکتا البتہ ریچھ کے اشارے پر خود ضرور ناچ سکتا ہے۔ یہی حال کچھ ہمارا ہوا۔ چار کا پہاڑہ یاد دلانے والے کو مردم شماری جیسا انتہائی اہم کام سونپا گیا نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ مردم شماری مردم آزادی کی شکل میں ظاہر ہوگئی...... احتیاط کے باوجود کئی ایک غلطیاں رہ گئیں مثلاً یہ کہ فارم میں چنو میاں کی عمر 30 سال تھی اوران کی اہلیہ 25 سال کی تھیں۔ چنو میاں کی شادی کے وقت ان کی عمر 16 سال اوران کی اہلیہ کی عمر 40 سال مرقوم تھی۔ وہ اپنی پیدائش سے پہلے ہی میٹرک کامیاب تھے۔ ان کا ہر بچہ ان سے عمر میں بڑا تھا۔ البتہ ان کے والدین عمر میں ان سے بہت چھوٹے تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور بیروزگار بھی۔ ان کے ایک بھائی دونوں ٹانگوں سے معذور تھے اور ہاکی کے پلیر تھے۔ چنو میاں کی بہن محبوب بی عینکوں کی دوکان پر کام کرتی تھی اور نابینا تھی۔ پاشو میاں کے فارم سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی پیدائش سے بہت پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ وہ لاولد تھے اور اپنے بال بچوں کے ساتھ کڑپہ سے حیدرآباد منتقل ہوگئے تھے۔ پاشو میاں کی والدہ لاولد تھیں''۔(4)

ڈاکٹر سید عباس متقی روزمرہ پیش آنے والے واقعات و حادثات کو مضحک انداز میں پیش کرتے ہیں اور ایسے چست جملے اور لفظیات کا استعمال کرتے ہیں کہ قاری خود بخود مسکرانے لگتا ہے اور دھیرے دھیرے یہ مسکراہٹ قہقہے کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ وہ واقعات کو مزاحیہ انداز میں پیش کرنے میں ماہر ہیں۔ وہ بعض دفعہ دکنی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں جس سے ان کے اسلوب میں انفرادیت آجاتی ہے۔ منظر کشی وہ نہایت خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ ان کے مضمون ''سارے جہاں میں دھوم ہمارے کچن کی ہے'' میں وہ صنف قوی کی برتری کو اس طرح مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ صنف نازک بھی مسکرانے لگتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''غرض ہم نے بھی ایک لائق مرد کی لکھی ہوئی کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے پکوان کے طریقے سیکھے اور اسے روبہ کار لاتے ہوئے ایک

اچھا باورچی کہلانے کی بھرپور کوشش کی.... چنانچہ ہمارے ہاتھ کا پکوان کھا کر جانے والے چنو سیٹھ نے گھر جانے کے ایک گھنٹے بعد ہی فون کیا کہ بھائی آخر آپ نے کیا کھلا دیا ہے۔ جو کھایا تھا معہ سود کے اگل رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے سے میں ہوں اور میرا بیت الخیال ہے۔ مرچ کی زیادتی کا اب احساس ہو رہا ہے۔ کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ والا معاملہ ہے۔ برق باراں ہیں، آندھی ہے، اولے ہیں پھر سیلاب ہے۔ ایک باڑھ ہے جو امڈ امڈ کر آرہی ہے ان سب باتوں کے سبب نحیف ٹانگوں میں لرزہ ہے۔ اب تو متلی بھی ہو رہی ہے۔ شائد منہ کی باری ہے''۔(5)

ہر ظرافت نگار کی طرح ڈاکٹر عباس متقی کے ہاں بھی ''مرزا'' پائے جاتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی اور دیگر مزاح نگاروں نے مزاح کی تخلیق کیلئے ''مرزا'' جیسے کردار کی کیا تخلیق کی کہ ہر مزاح نگار خود اپنے مزاحیہ مضامین میں مرزا کے بغیر ادھورا سا محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر عباس متقی کے ''مرزا'' عظیم بیگ چغتائی کے ''مرزا'' یا یوسفی کے ''مرزا'' نہیں بلکہ وہ کسی قدر شاعرانہ مزاج بھی رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ ان کے مضمون ''سو میں سے بارہ'' سے یہ اقتباس:

''ہم مرزا سے بہت گھبراتے ہیں سنتے ہیں کہ انہوں نے اردو، غدر کے مارے کسی شہزادے سے اور فارسی عاشق مزاج کسی ایرانی سے سیکھی ہے۔ ان کے آگے ہماری زبان نہیں چلتی، مرزا گھورتے ہیں تو الفاظ ذہن سے زبان تک کا فاصلہ طئے کرنے سے انکار کرنے لگتے ہیں۔ ویسے ہیں تو وہ منشی کامیاب لیکن ان کی مقراض تنقید میں آ کر اچھے اچھوں کے پر کٹ جاتے ہیں۔ پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں کہ دوسروں کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ نکتہ چینی کی عادت بدگھٹی میں پڑی ہے لیکن دکھانا گناہ، کہا سنانا غضب اتنے نقائص عیاں کرتے ہیں کہ کچھ نہیں رہتا''۔(6)

مضامین کی کتابت میں زبان و بیان کی غلطیوں اور زبردستی مزاح پیدا کرنے کی کوشش سے قطع نظر، ڈاکٹر

عباس متقی اپنی طنز نگاری میں خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ طنز کے کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ کبھی کبھی گمان ہوتا ہے کہ وہ معاشرے ہی سے نالاں ہوں۔ پیشے سے مدرس ہیں۔ غالباً یہی وجہ رہی ہوگی کہ وہ تیزی سے بگڑتے معاشرے، نوجوانوں کی بے راہ روی اور اس سے ہونے والی تباہی اور سماج اور اس کی اقدار کی شکست و ریخت پر برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور اپنی تحریروں میں معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ دہانی کرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) ڈاکٹر سید عباس متقی ''حرف اولین''، مضمون مشمولہ ''لگے ہاتھوں''، صفحہ 5 مطبوعہ دائرہ پریس حیدرآباد 2003ء

(2) ڈاکٹر سید عباس متقی ''سائیکل'' مضمون مشمولہ ''ڈرتا ہوں آئینے سے'' صفحہ 9، مطبوعہ دائرہ پریس حیدرآباد 2003ء

(3) ڈاکٹر سید عباس متقی ''گدھ جو عنقاء ہوئے''، مضمون مشمولہ ''ڈرتا ہوں آئینے سے''، صفحہ 16

(4) ڈاکٹر سید عباس متقی ''مردم شماری سے مردم آزادی تک'' مضمون مشمولہ ''شگوفہ'' 37 ویں سالگرہ نمبر جولائی 2005ء ص 55

(5) ڈاکٹر سید عباس متقی ''سارے جہاں میں دھوم ہمارے کچن کی ہے''، مضمون مشمولہ ''لگے ہاتھوں'' صفحہ 97

(6) ڈاکٹر سید عباس متقی ''سومیں سے بارہ'' مضمون مشمولہ ''ڈرتا ہوں آئینہ سے'' صفحہ 88

ڈاکٹر عابد معز

عابد معز کا پیدائشی نام سید خواجہ معز الدین ہے۔ادبی دنیا میں عابد معز کے نام سے معروف ہیں۔ وہ 25 اپریل 1955ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد 1979ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج حیدرآباد سے ایم بی بی ایس 1985ء میں تغذیہ اور استحصالی امراض میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ چند برس حیدرآباد میں سیول اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1982ء میں سعودی عرب روانہ ہوئے جہاں وہ منسٹر آف ہیلتھ میں خدمات انجام دے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

عابد معز کے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ 1982ء میں ماہنامہ ''شگوفہ'' سے شروع ہوا۔ان کے مضامین ہندو پاک کے رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد کے علاوہ ماہنامہ ''آج کل'' نئی دہلی، ''کتاب نما'' نئی دہلی، ''رابطہ''، ''افکار'' لاہور، چہارسو دہلی میں باقاعدگی سے چھپتے رہتے ہیں۔ ملک و بیرون ملک کے مختلف ادبی اجتماعات میں مضامین سنا چکے ہیں۔ زندہ دلان حیدرآباد سے وابستہ ہیں۔جنوری 1992ء سے ماہنامہ ''شگوفہ'' کے اوورسیز ایڈیٹر کی حیثیت سے ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔

عابد معز کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''واہ حیدرآباد'' کے نام سے جنوری 1994 میں شائع ہوا۔ان مضامین میں حیدرآباد کے مختلف پہلوؤں کو دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔عابد معز کے مضامین کا دوسرا مجموعہ 1995ء میں ''سگ گزیدہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔عابد معز کے مضامین ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد کے تقریباً ہر شمارے کی زینت بنتے ہیں۔

''واہ حیدرآباد'' شہر حیدرآباد سے مصنف کی محبت اور لگاؤ کا اظہار کرتا ہے۔اس مجموعے کی تمام مضامین میں حیدرآباد کی سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ایک مخصوص شہر اور اس کے عوامی مسائل پر لکھی جانے والی طنز و مزاح کی یہ ایک منفرد تصنیف ہے۔ڈاکٹر عابد معز چونکہ ایک ڈاکٹر ہیں چنانچہ وہ موضوع کو سائنٹفک نگاہ سے دیکھتے اور جانچتے ہیں۔ان کے بعض مضامین موقتی ہوتے ہیں جو عصری حسیت اور تاثر لئے ہوئے ہوتے ہیں۔لیکن

بعض موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اور خاص ٹریٹمنٹ کے نتیجے میں موقتی اہمیت کے حامل نہیں بلکہ کسی بھی دور کے قاری کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ عابد معز نے زندگی کے عام معاملات کو جدید نکتہ نگاہ عطا کرتے ہوئے اس کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ حالانکہ یہ روزمرہ کی ہی باتیں ہیں لیکن حقیقت پسندی اور واقعیت پسندی کے تناظر میں مزاح کو انگیز کرنے والے نئے نئے دلچسپ منظر ان کی تحریروں میں آجاتے ہیں۔ وہ کئی برسوں سے سعودی عرب مشرق وسطی میں ہیں۔ طنز و مزاح کے فروغ اور اس کی ترقی کیلئے ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

عابد معز اپنی ظرافت نگاری کے ذریعہ قاری کو جھنجھوڑنے پر نہیں بلکہ چٹکیاں لینے پر یقین رکھتے ہیں۔ معمولی واقعات کو وہ منتخب کرتے ہیں اور اس کے مضحک پہلوؤں کو بڑی عمدگی سے مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ پیشے سے ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر و مریضوں کے باہمی ارتباط سے اچھی طرح واقف ہیں۔ عابد معز کی شخصیت اور ان کا قلم دو متضاد باتیں معلوم ہوتے ہیں۔ قلم سے جتنے شگوفے وہ کھلاتے ہیں اتنی ہی تنگ دلی سے وہ مسکراتے ہیں۔ وہ ایک کم گو اور بسیار نویس فنکار ہیں۔ بظاہر ان کا رویہ اور لہجہ سرد مہری کو ظاہر کرتا ہے لیکن بہ باطن وہ بڑے گرم جوش اور ہمدرد واقع ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا تاثر عابد معز کی شخصیت کے بارے میں کچھ اس طرح ہے۔

''عابد معز عجیب انسان ہیں۔ آپ ان سے ملیں گے تو انہیں خاموش طبع پائیں گے۔ ان کی کم گوئی سے آپ ایسے چڑیں گے جیسے عام طور پر لوگ کسی باتونی کی خرافات سے چڑتے ہیں آپ عاجز بھی آئیں گے تو ان کی اس عادت سے کہ جہاں لوگ کسی بات پر ہنستے ہوئے محفل کو قہقہہ زار بنادیتے ہیں وہاں عابد معز لبوں کو ہلکا سے خم دے کر ایک پھیکی سی مسکان کا ہلکا سا اشارہ دینے پر اکتفا کرتے ہیں'' (1)

''واہ حیدرآباد'' شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے مختلف معاشرتی اور سماجی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ اس کے تمام مضامین حیدرآباد کی روزمرہ زندگی کا چلتا پھرتا آئینہ ہیں۔ خود عابد معز لکھتے ہیں۔

''مضامین پڑھ کر یہ احساس بھی ابھر سکتا ہے کہ ہم نے صرف شہر

حیدرآباد کے منفی پہلوؤں کو تلاش کیا ہے اور خوبیوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔
ہمارے شہر کی خوبصورتی اور اس کی خوبیوں کو پسندیدگی کی سند کئی دانشوروں،
ادیبوں اور شاعروں نے عطا کی ہے۔ہم نے اپنی راہ الگ نکالی ہے‘‘۔(2)

جون 1983ء سے مارچ 1987ء تک ماہنامہ ’’شگوفہ‘‘ میں ’’مرا شہر لوگاں سوں معمور کر‘‘ کے عنوان سے شہر حیدرآباد پر موضوعاتی مضامین کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ جسے بعد میں جنوری 1994ء میں ’’واہ حیدرآباد‘‘ کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔اس کتاب میں جملہ 33 مضامین ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون ’’واہ حیدرآباد‘‘ کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔جس سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

’’حیدرآباد میں املی کے درخت زیادہ تعداد میں اُگتے ہیں جس کی وجہ سے حیدرآبادی دانت کھٹے ہونے کی حد تک کھٹا کھاتے ہیں۔املی تو املی ہے پتوں کی کٹھاس تک نہیں چھوڑتے۔املی کے پتوں کو چگّر کے نام سے کھاتے ہیں۔حیدرآباد کے ہر اچھے پکوان میں کھٹا ملا ہوا ہوتا ہے۔ ہمارے دشمنوں کے مطابق ہماری رگوں میں کٹھا دوڑتا ہے اور ہم ایک دوسرے کی کاٹ میں رہتے ہیں‘‘۔(3)

عابد معز نے اس مجموعہ مضامین میں ہلکے پھلکے مسائل کا انتخاب کیا ہے اور جن جن مسائل کا انہوں نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے وہ مسائل کم و بیش ہندوستان کے ہر شہر اور ہر چھوٹے ٹاؤن میں ہیں اور پھر اس میں نیا کیا ہے؟ نئی بات تو ان کی اپنی انفرادیت ہے۔مندرجہ بالا اقتباس ایسی ہی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔واہ حیدرآباد میں مصنف کی یہی کوشش ہےکہ الفاظ کے ذریعہ فضاء باندھی جائے اور مزاح بھی پیدا ہو۔مزاح پیدا کرنے شعوری کوشش میں وہ قاری کو بھی اپنی سنجیدہ مزاح نگاری کا حصہ بنا لیتے ہیں۔

عابد معز طوالت کو پسند نہیں کرتے۔ان کے ہاں اختصار پسندی ملتی ہے۔سیاسی و جماعتی جانبداری اور دیگر تنازعوں سے گریز نظر آتا ہے۔ان کے ہاں ایسی مسرت نہیں نظر آتی ہے جو آسودگی کے بعد حاصل ہوتی ہے جو دیرپا نہیں ہوتی۔ جو ہنسی محرومی اور ناآسودگی سے حاصل ہوتی ہے وہی کھنکتی ہوئی نہیں ہوتی ہے جس کے پس پردہ ہزار غم

اور آنسو چھپے ہوتے ہیں۔ عابد معز کے ہاں زندگی کی تلخ حقیقتوں اور سچائیوں کا بیان بہت کم ملتا ہے۔ (غالباً اس لئے کہ وہ مشرق وسطی میں پُر آسائش زندگی کے جویا ہوگئے ہیں) اور اگر اس کا اظہار کرتے بھی ہیں تو صرف سرسری انداز میں۔ ان کے بعض موضوعات وقتی ہوتے ہیں چنانچہ تاثر پیدا کرنے میں مطلق عاری بھی ہیں۔ جیسے ''ہماری سڑکیں''، مضمون میں انہوں نے حیدرآباد کی سڑکوں کے متعلق لکھا ہے۔

> ''یوں بھی شہر کی سڑکوں پر چلنا ایک آرٹ ہے۔ کبھی ٹھوکر کھا کر سنبھلنا پڑتا ہے تو کبھی گر کر اٹھنا پڑتا ہے۔ کبھی چھلانگ لگانی پڑتی ہے تو کبھی اچھلنا اور کودنا پڑتا ہے۔ کبھی ایک ٹانگ سے لنگڑانا پڑتا ہے تو کبھی ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے جانوروں کی طرح پھدکنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں پیدل چلنے سے بہتر کوئی ورزش نہیں اگر آپ اس مقولے کی حقیقت کو جانچنا چاہیں تو حیدرآباد کی سڑکوں پر پیدل چلا کیجئے۔ ورزش کے علاوہ بعض مرتبہ آپ کی مرمت بھی ہوجائے گی۔ گھٹنے اور کہنیاں چھل جاتی ہیں۔ پنڈلیوں پر ورم آجاتا ہے۔ اعضا شکنی ناقابل برداشت ہوتی ہے''۔ (4)

عابد معز کا یہ تاثر بائیس برس قبل کے ماضی سے تعلق رکھتا ہے۔ فی زمانہ حیدرآباد کی سڑکیں انتہائی صاف شفاف اور مسطح ہیں۔ ایسی کوئی سڑک جیسی کہ مزاح نگار نے بیان کی ہے کہیں نظر نہیں آتی یقیناً ایک آدھ جگہ ہوگی جس کی حیثیت مستثنی ہے۔ موقتی موضوعات کی یہی خرابی ہوتی ہے کہ مزاح نگار کے نزدیک ہمیشہ ایسے مسائل ہونے چاہئیں جو ان انشائیوں کو حیات دوام عطا کرے۔ ایسا نہ ہو کہ مزاح نگار مزاح پیدا کرنے اور بقول مصنف اپنی راہ الگ نکالنے کے چکر میں موقتی موضوعات کا انتخاب کرے اور مزاح نگاری بیچ راہ میں ہی دم توڑ دے۔

عابد معز کا دوسرا مجموعہ جنوری 1995ء میں منظر عام پر آیا۔ دونوں مجموعوں میں ایک بات قابل توجہ ہے کہ عابد معز کی کتابوں کے نام جن موضوعات پر رکھے گئے ہیں وہی مضمون کتاب کی فہرست میں سب سے پہلا نظر آتا ہے۔ یعنی ''واہ حیدرآباد'' اور ''سگ گزیدہ'' کے عناوین سے لکھے گئے مضامین دونوں ہی مجموعوں کے اولین مضامین ہیں۔ ''سگ گزیدہ'' میں 16 مضامین ایک مقدمہ بقلم یوسف ناظم اور پیش لفظ از عابد معز شامل ہیں۔ یوسف ناظم

کتاب کے مقدمہ میں عابد معز کے فن کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عابد معز کوئی پندرہ سال کے مزاح نگار ہیں یعنی ان کی تحریر عنوان شباب سے آشنا ہو چکی ہے لیکن پیرایہ بیان صرف شاعرانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ادب اور خاص طور پر مزاحیہ ادب کو جانچنے کے پیمانے پر ماہ وسال کی لکیریں نہیں کھینچی ہوتیں ہیں۔ عابد معز نے اس مجموعے سے صرف مزاح نگار ہونے کا ثبوت نہیں دیا اس میدان خارزار میں کہنہ مشق ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اپنی ذکاوت، ذہن کی بڑائی کو خوش سلیقگی کے ساتھ برتتے ہوئے وہ ایک شوخ وشنگ شگفتہ مزاح نگار بلکہ ایک شریر یا آمادہ بہ شرارت ادیب کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ وہ مزاجاً متین اور عادتاً رکھ رکھاؤ کے سمٹے سمٹائے آدمی ہیں لیکن ان کی تحریر بشاشت انگیز ہے۔ انہیں پڑھتے ہوئے قاری آگے بڑھنے کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتا چلا جاتا ہے۔ عابد معز کی تحریر پڑھنے کا وہی لطف ہے جو جھولا جھولنے اور پینگیں لینے میں ہے۔''(5)

عابد معز فطرتاً ایک کم گو اور خاموش انسان ہیں لیکن ان کا قلم نئے نئے شگوفے کھلاتا رہتا ہے۔ ''سگ گزیدہ'' مضمون میں عابد معز کی موشگافیاں کس طرح رنگ بکھیر رہی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے یہ اقتباس:

'''دوسرے دن ہم لکڑی کا سہارا لئے کتے کی تلاش میں نکل پڑے۔ ہر کتے پر یہ گمان گذرتا کہ ہمارا شریک زندگی یہی کتا ہے۔ پریشانی میں کتے کا حلیہ بھی یاد نہ رہا۔ اگر کتے کی جنس کا ہی اندازہ ہوتا تو پچاس فیصد ڈھونڈنے میں سہولت ہوتی۔ یاروں کے سہارے ہم اس مقام پر پہنچے جہاں کتے نے ہمیں کاٹا تھا۔ ایک صاحب جنھوں نے شائد ہماری مدد کی تھی ہمیں پہچانا اور کہا ''کیوں اہنساوادی'' آج دوسری ٹانگ پیش کرنے آئے ہو''۔(6)

موجودہ دور کے ڈاکٹر اور خاص طور پر اشتہاری ڈاکٹروں کی بھرمار اور عوام کی معصومیت کے استحصال سے

کھلواڑ پر عابد معز نے بڑی اچھی روشنی ڈالی ہے۔ اپنے مضمون ''ہمارے بھی ڈاکٹراں کیسے کیسے'' میں انہوں نے ڈاکٹرز کی مختلف ''مخصوص اوصاف'' پر بڑا گہرا طنز کیا ہے اور عوام کی سادگی اور ڈاکٹرز کی ابن الوقتوں کی چالاکیوں کا نہایت خوبی سے مضحکہ اڑایا ہے۔ دیکھئے یہ اقتباس:

> ''پوشیدہ ڈاکٹر تبدیلی جنس پر اختیار رکھتے ہیں۔ ہم نے ایک اشتہار دیکھا ہے۔ آپ اپنی پسند کا کھا سکتے ہیں، پہن سکتے ہیں تو پھر اپنی پسند کی جنس کیوں نہیں اپنا سکتے؟ ہم حسب خواہش آپ کو مرد یا عورت میں تبدیل کرتے ہیں'' ایک پوشیدہ ڈاکٹر دوران حمل جنس مقرر کرنے میں ماہر ہیں ان کا اشتہار یوں ہے۔ ''جو چاہئے لیجئے ہماری دوا سے حسب منشا اولاد ہوگی۔ لڑکا چاہئے لڑکا ہوگا لڑکی چاہئے لڑکی ہوگی۔ لڑکے کیلئے دی جانے والی دوا کی قیمت تین گناہ وصول کی جاتی ہے۔ پوشیدہ ڈاکٹر سے رجوع ہونے والے مریض علاج اور معالجے کے تعلق سے کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس سے پوشیدہ ڈاکٹر کی شہرت پر حرف آتا ہو۔ مریض کی زبان بند پوشیدہ ڈاکٹر کی کامیابی کا راز ہے۔''(7)

عابد معز کا مشاہدہ عمیق اور تیز ہے اور ''سگ گزیدہ'' میں ان کا سماجی شعور اور بھی نکھرا نظر آتا ہے۔ بعد میں انہوں نے ہلکے پھلکے مسائل اور دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔

عابد معز عموماً واقعات کے اوپری پہلوؤں کو ہی دیکھتے ہیں وہ اس کی گہرائی میں جانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے مضامین میں بصیرت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ شائد ان کی مصروف زندگی ان مسائل کی گہرائی میں جانے کی اجازت نہ دیتی ہو۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے وہ بڑی دلکش، شگفتہ اور پر بہار انداز تحریر کے مالک ہیں۔ نہایت سادہ اور سلیس زبان استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی زبان میں مغربی دانشوروں کے حوالے دے کر خواہ مخواہ مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

عابد معز اپنی تخلیقات میں لفظوں کے انتخاب پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اور اس خوبی سے جملوں میں استعمال کرتے

ہیں کہ اس کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ عابد معز کی شخصیت اور فن پر تبصرہ کرتے ہوئے سارہ جبین لکھتی ہیں۔

''ہماری روزمرہ کی زندگی ہمارے ادا کئے ہوئے الفاظ بہت اہمیت رکھتے ہیں، الفاظ ہی ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں یا دور لے جاتے ہیں۔ لفظوں کے صحیح انتخاب اور ادائیگی سے زندگی خوبصورت اور معنویت سے بھرپور ہوجاتی ہے۔ الفاظ انسانی دماغ کا آئینہ اور ترجمان فکر ہیں جن سے زندگی کا نظم پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اپنے قلم سے نکلے ہوئے لفظوں سے کسی کا درد باٹنا الجھنوں کو دور کرنا چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنا ایک فن ہے۔ اس فن کی مثالی شخصیت عابد معز صاحب ہیں۔ اور ان کا فن اردو ادب کے فروغ کے لئے بے لوث خدمت کررہا ہے......عابد صاحب تہذیب وادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے طنز ومزاح سے بھرپور اپنے احساسات کو قلم بند کرنے کے فن میں اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔'' (8)

عابد معز ایک ڈاکٹر ہیں جسے مسیحا بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی پیشہ وارانہ مہارت سے قطع نظر وہ ایک ایسے مزاح نگار ہیں جو جانتے ہیں کہ مزاح کا استعمال صرف نمک کی طرح کیا جاتا ہے۔ سبز یا سرخ مرچ کی طرح نہیں۔ عابد معز کی تحریروں میں ان کی شخصیت کا پرتو پوری طرح چھلکتا ہے۔ نہ وہ پوری طرح قہقہہ لگاتے ہیں اور نہ قاری کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی تحریروں میں ان کی متانت روی پوری طرح چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اب بھی مسلسل لکھ رہے ہیں اور انشاءاللہ آئندہ بھی اسی طرح خوب لکھتے رہیں گے۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) ڈاکٹر ستیہ پال آنند ''شہر میں گھومتا ہوا آئینہ'' مشمولہ ''واہ حیدرآباد'' از عابد معز ص 15 جنوری 1994ء

(2) عابد معز ''پیش لفظ'' مشمولہ ''واہ حیدرآباد'' ص 2

(3) عابد معز ''واہ حیدرآباد'' مضمون مشمولہ ''واہ حیدرآباد'' ص 15

(4) عابد معز ''ہماری سڑکیں'' مضمون مشمولہ ''واہ حیدرآباد'' ص 56

(5) یوسف ناظم ''مقدمہ'' مشمولہ ''سگ گزیدہ'' ص 7 مطبوعہ اسپیڈ پرنٹرس، حیدرآباد 1995ء

(6) عابد معز ''سگ گزیدہ'' مضمون مشمولہ ''سگ گزیدہ'' ص 14

(7) عابد معز ''ہمارے بھی ڈاکٹر اں کیسے کیسے'' مضمون مشمولہ ''سگ گزیدہ'' صفحہ 41

(8) سارہ جبین ''عابد معز......ایک بے مثال شخصیت'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ 27 جون 2009

عبدالکریم نوؔر

حیدرآباد میں طنز وظرافت کے دور کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر میں ہوا ہے۔بعض دانشوروں نے اس کے قطعی نقطہء آغاز کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔پروفیسر سیدہ جعفر کی زیر نگرانی لکھے گئے مقالہ ''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشونما'' میں مقالہ نگار انیسہ سلطانہ نے سید عبدالکریم نوؔر کو حیدرآباد کے سب سے پہلے مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔اور مرزا فرحت اللہ بیگ کو پہلا مزاحیہ نثر نگار قرار دیا ہے۔یہاں یہ بات بھی واضح کردینی ضروری ہے کہ نور نے دکنی میں طبع آزمائی نہیں کی۔بلکہ اردو کو ہی ذریعہ اظہار بنایا۔بحیثیت پہلے مزاحیہ شاعر عبدالکریم نوؔر کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

عبدالکریم نوؔر حیدرآباد میں پیدا ہوئے ان کا سنہ پیدائش 1292ھ ہے۔جو عیسوی تقویم کے مطابق 1871ء کے قریب قرار پاتا ہے۔انیسویں صدی کے آخرد ہوں میں پیدا ہونے والے تین اہم مزاح نگاروں میں سید عبدالکریم نوؔر' مرزا فرحت اللہ بیگ' اور عظمت اللہ خاں شامل ہیں۔ان میں نور شاعر اور باقی دو مزاح نگار نثر سے تعلق رکھتے ہیں۔

عزیز ابرار اپنے مقالے ''شگوفہ کی ادبی خدمات میں'' عبدالکریم نوؔر کے تعلق سے رقمطراز ہیں۔

> ''نور حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔وہ ایک پُرگو مزاحیہ شاعر تھے۔ان میں اچھی شاعرانہ صلاحیتیں تھیں۔توفیق حیدرآبادی کے تلمذ نے ان کے فن میں نکھار پیدا کیا۔پروفیسر اشرف شمسی اور نواب بہادر یار جنگ کی دوستی نے ان کے فن کو مزید حسن بخشا۔ان کے کلام میں غزلیات' نظمیں' رباعیات' قطعات' ٹھمریاں اور سہرے وغیرہ شامل ہیں۔غزلوں کا مجموعہ ''ضیائے نور'' شائع ہوا۔نظموں میں 'غافل' 'استقلال' 'تلاطم' 'موسم گرما' 'مسدس قوم' 'شہیدانِ وفا' اور 'گمشدہ لکڑی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان میں عصری حسیت کے علاوہ صحت مند طنز ومزاح ہے۔''(1)

نوؔر نے بدلتی ہوئی تہذیب اور سماجی اقدار کی شکست وریخت کو اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے۔قدیم تہذیبی

ورثے سے انحراف وروگردانی کی روش اور تہذیب نو کے اثرات کی قبولیت کو وہ اہل وطن کی ذہنی مرعوبیت قرار دیتے ہیں۔ایک حساس شاعر کو قوم کی یہ روش ناگوار گذرتی ہے۔وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ تہذیبی رد وقبول ظاہری چند مروج چیزوں اور طور طریق کو چھوڑ دینا اور چند کو اختیار کر لینا نہیں بلکہ اس کی جڑیں انسان کے عقیدہ اس کے طرزِ فکر اور نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کے یہ اشعار دیکھئے

کیا اگلی باتوں سے ہم نے کنارا گریبان تقلید سے پارہ پارہ
ہمیں اس طرح نیو فیشن نے مارا بدلتا چلا اولڈ فیشن ہمارا

نہ پہلی سی ہے طرزِ گفتار باقی
نہ دستار باقی نہ رفتار باقی

نوؔر فی البدیہہ شعر کہنے میں ماہر تھے۔گمشدہ لکڑی ان کی برجستگی اور شگفتگی کی آئینہ دار ہے۔نور نے اپنے کلام میں سماجی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ان کے کلام کے مطالعہ سے اس عہد کے سماجی مسائل واضح ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔اور ان کی تخلیقات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کل جو سماجی مسائل ہمارے معاشرے کا ایک جز بنے ہوئے تھے وہ ہنوز آج بھی موجود ہیں۔

حوالہ جات

(1) عزیز ابرار ''شگوفہ کی ادبی خدمات'' مقالہ برائے ایم فل ص 17-16 غیر مطبوعہ' مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد 1989ء

رحیم صائب میاں

دکنی شعراء کے تذکرے میں رحیم صائب میاں کے ذکر سے صرف نظر کر کے آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ رحیم صائب میاں کا کوئی تحریری کلام دستیاب نہیں ہوسکا جس کی بنیاد پر ان کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکے لیکن انہیں جدید دکنی شاعری کی خشتِ اول ضرور کہا جا سکتا ہے۔

عبدالرحیم نام اور رحیم صائب میاں تخلص تھا والد کا نام محمد حفیظ الدین تھا۔ جو پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے اور ریاست حیدرآباد کے ضلع بیڑ (مہاراشٹر) کے رہنے والے تھے۔ رحیم صائب میاں نے منشی فاضل تک تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد محکمہ داخلہ میں ملازم ہوگئے۔ وہ نہایت ذہین اور حاضر دماغ انسان تھے ان کی طبیعت میں بلا کی شگفتگی وشوخی پائی جاتی تھی، روساء وامراء انہیں وقت گذاری کیلئے کھینچ لے جاتے۔ رسول یار جنگ، عماد جنگ، ظہیر یار جنگ، نواب دوست محمد خاں جاگیردار عالم پور، گدوال کے راجا اور جاگیرداروں کے ہاں ان کا آنا جانا تھا۔

ابتداء میں عام اردو میں سنجیدہ ومزاحیہ کلام موزوں کیا کرتے تھے طبیعت میں شوخی وشگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ سنجیدہ شاعری کے پڑاؤ پر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے اور یکا یک عوام الناس کی زبان یعنی دکنی میں شعر کہنا شروع کیا دوست احباب کے سلیس اردو کی بہ نسبت دہقانی اور دکنی صوتی شاعری کو زیادہ پسند کیا تو پھر وہ اسی زبان میں شعر کہنے لگے۔ انہوں نے کسی سے کسب واستفادہ نہیں کیا۔ البتہ نذیر احمد دہقانی نے ان سے متاثر ہو کر دہقانی زبان میں شاعری کا آغاز کیا، رحیم صائب میاں فی البدیہہ شاعری کیا کرتے تھے۔ اسی لئے بھی ان کا کلام محفوظ نہ رہ سکا اور جو کلام تحریری حالت میں تھا وہ پولیس ایکشن کے بعد کے حالات سے دلبرداشتہ ہو کر خود اپنے ہاتھوں کنویں میں پھینک دیا۔ عظیم الدین محبت رحیم صائب میاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''رحیم صائب میاں باب حکومت میں ملازم تھے۔ پہلے سنجیدہ شعر کہتے
> تھے۔ عروض پر کافی عبور تھا۔ ان کی نظم ''چیونٹی اور انسان'' کافی مشہور ہوئی۔
> بعد میں دکنی کی زبان میں مزاحیہ شعر کہنے لگے۔ آخر میں صوتی شاعری کرنے

لگے''۔(1)

رحیم صائب میاںؔ نے سب سے پہلے دکنی زبان میں مزاحیہ شاعری کا آغاز کیا۔عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام نے دکنی شاعری کے احیاء میں اہم کردار ادا کیا۔علی صائب میاںؔ کے مجموعہ کلام ''گھوکرو کے کانٹے'' پر مقدمہ لکھتے ہوئے مولانا معزالدین ملتانی رحیم صائب میاںؔ سے متعلق لکھتے ہیں:

''عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آچکا تھا اور اردو ذریعہ تعلیم بن چکی تھی۔ ایسی فضاء میں دیہاتی یا بگڑی زبان میں رحیم صائب میاں نے مزاحیہ شاعری کی پہل کی۔لیکن رحیم صائب میاںؔ کی شاعری کا مقصد ہنسنے ہنسانے سے آگے نہ بڑھ سکا۔رحیم صائب میاںؔ نے دراصل صوتی شاعری کی صدابندی کی تھی۔شیر و ببر کی آواز سے لیکر تیتر بٹیر تک کو انہوں نے اپنی شاعری میں ڈھال لیا۔''(2)

محمد نورالدین خان رحیم صائب میاںؔ کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

''رحیم صائب میاںؔ دہقانی زبان میں شاعری کے افق پر روشن ستارے کی طرح جگمگاتے ہیں۔ ابتداء میں وہ سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری کیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے دہقانی زبان میں شعر گوئی شروع کی اور اس فن میں انہوں نے اتنی مہارت حاصل کی کہ اس میدان کے نامور شعراء مثلاً نذیر احمد دہقانیؔ، اعجاز حسین کھٹاؔ، سلیمان خطیبؔ، سرور ڈنڈاؔ اور حمایتؔ اللہ وغیرہ نے ان کی قائم کردہ ڈگر پر اپنا شعری سفر جاری رکھا''۔(3)

رحیم صائب میاںؔ اپنی تخلیقات اور اپنی متنوع شخصیت سے لوگوں کو محظوظ کیا کرتے۔ وہ جس محفل میں موجود ہوتے وہ محفل زعفران زار بنی رہتی۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''رحیم صائب میاں بڑی متنوع شخصیت کے مالک تھے وہ اپنی گفتگو،

اپنے لطائف، اپنی آواز اپنے حرکات و سکنات کے ذریعہ ہنستے ہنساتے اور جانِ محفل بنے رہتے۔ رحیم صائب میاںؔ کی شاعری کا بھی یہی حال تھا۔ کوئی معاشرتی، اصلاحی مقصد نہیں اور نہ کوئی خاص بات۔ بس تفریح طبع اور وقت گذاری۔ جہاں تک لسانی حیثیت کا تعلق ہے انکی دکنی بس غنیمت تھی''۔(4)

نذیر الدین احمد نے انہیں دہقانی شاعری کو بطور فن استعمال کرنے والے واحد شاعر قرار دیا۔ لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں وہ واحد شاعر تھے جنہوں نے دہقانی شاعری کو بطور فن کے اختیار کیا اور بڑی شہرت پائی۔ اصناف شاعری میں انہوں نے باقاعدہ ایک اور صنف کا اضافہ کیا یعنی صوتی شاعری۔ جانوروں کی آوازیں، پرندوں کی بولیاں، ہوائی جہاز، ریل، موٹر اور دیگر سواریوں کے چلنے کی آوازیں۔ بیانڈ باجہ کی دھنا دھن، پٹاخوں کی پھٹا پھٹ، غرض ہر قسم کی آوازوں کو اس خوبصورتی اور کمال فن سے شعر میں سمویا کہ نقل اور اصل میں کوئی فرق معلوم نہ ہوتا تھا''۔(5)

ڈاکٹر سید بشیر احمد نے بھی رحیم صائب میاںؔ کو دہقانی شاعری کا نقش اول قرار دیا ہے اور اس خاص رنگ سخن کا موجد بھی۔

''انہوں نے اس وقت دہقانی زبان میں شاعری شروع کی جب کسی شاعر کو ایسی شاعری کا خیال تک بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ بلاشبہ وہ طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو دہقانی انداز میں بیان کرنے والے پہلے شاعر ہیں''۔ (6)

شائستہ رفعت اپنے مقالے میں رحیم صائب میاں کو صوتی شاعری کا واحد شاعر قرار دیتی ہیں۔

''رحیم صائب میاںؔ منفرد طرز کے شاعر تھے۔ صوتی شاعر کا اعزاز حاصل کرنیوالے وہ واحد شاعر تھے جنہوں نے ہر قسم کی آوازوں کو کمال فن

کاری سے اپنے اشعار میں سمویا ہے‘‘(7)

شائستہ رفعت کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دکنی شاعری میں صوتی شاعری کوئی نئی یا رحیم صائب میاںؔ کی اختراعی صنف یا وصف نہیں ہے۔ دکنی کے قدیم شعراء کے یہاں صوتی شاعری کے اعلی نمونے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر حبیب نثار نے اپنی کتاب دکن کی مخصوص شعری اصناف میں ابن نشاطی، حسن شوخی ونصرتی کے کلام میں موجود صوتی آہنگ کی نشاندہی کی ہے۔(8)

رحیم صائب میاںؔ نے بیسویں صدی میں دکنی شاعری کے صوتی عنصر کو منظر عام پر لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے اپنے کلام کی اشاعت کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ بلکہ جب 1948ء میں دکن میں پولیس ایکشن ہوا تو دلبرداشتہ ہوکر اپنا سارا کلام ''باؤلی برد'' کردیا۔ جو چند غزلیں اور قطعے یادگار رہیں ان میں سے صرف چند یہاں بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں جو صوتی شاعری کے بھی نمائندہ ہیں۔

آگیا ماہ محرم دے دھنا دھن کی دھنا دھن سینہ کوبی کا ہے ماتم دے دھنا دھن کی دھنا دھن
تیلی کے گھانے کے کُھلگے کھاکے ہوتے ہیں مستنڈے جان جائے تو نہیں غم دے دھنا دھن کی دھنا دھن
لڑکے اسکول کو جاکر چھٹی بارے بجے پاکر گھونسے لڑتے ہیں گھما گھم دے دھنا دھن کی دھنا دھن
ماہ شعبان کے پٹاخے وہ پٹاخے وہ دھڑاخے تازہ منڈل کی وہ سرارا بھم دے دھنا دھن کی دھنا دھن

مدراسی حضرات کے تعلق سے ان کی ایک مزاحیہ نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

حیدرآباد اس میں مُدراسی فرزنداں آکو ہیں بھاری گیری پین کو پوشاکاں سب اترا کو ہیں
کی جی بھایاں بول کو باتاں میں راگاں کھیچے ہیں کھا کو جھنگا کی کڑی کیوں گردناں اکڑا کو ہیں
ہے کہاں مدراس اور یہ توپ کا سانچہ کہاں سونگھ کو ڈلیاں کی بوبلیاں کے نادیچ آکو ہیں
چھیڑ خانی کاڑیں مُدراسیاں کی رحیم صاب میاںؔ بائکاں کے ناد سارے مردوئے شرما کو ہیں

رحیم صائب میاںؔ نے اپنے اشعار میں اپنے گرد وپیش کے حالات کو نظم کیا ہے۔ وہ دیہی رسم ورواج کی بڑی خوبصورت منظر کشی کرتے ہیں۔ انکی ایک نظم ''گاؤں کا سہرا'' میں وہ ایک شادی کی تصویر کشی کرتے ہیں اس نظم

میں وہ تعلیم کی اہمیت پر بھی زور دیتے ہیں۔ان کی یہ نظم عصری حسیت کی عمدہ مثال ہے۔

کیوں اکڑ کو بیٹھا ہے دلھا یہ مہماناں کے بیچ　　زر کے تاراں دِس رہے ہیں سہرے کے لڑیاں کے بیچ
مرزاں پلی کی ہیں ٹھسن سے اتر جاتیں تمام　　لوگاں پو لوگاں ہیں آتیں بیٹھکو بنڈیاں کے بیچ
دیکھ کو مکھڑے کو دولھا بولیا دولن سے یہ بات　　اب رہا پرداچ نیں ہمنا اور تمناں کے بیچ
ایسا گاؤں اور ایسی بستی آج تلک کا نیں دسی　　ہم بھی آخر پھر کو آئیں بھوت سے گاواں کے بیچ
ایک سے اک ہے نوادر آ کو شاعر آج یاں　　تلے منڈی مار کو بیٹی ہے سب فکراں کے بیچ
تو نے کاسم صاب نیں مانیا علی صاحب کی بات　　لکھنا چھوڑیا پڑھنا چھوڑیا پڑگیا بھٹیاں کے بیچ
منجے سب لوگاں ہیں بولیا کرئے رحیم صاب میاں　　کیوں کہ مضموناں میں پھڑ کاتاں ہوں اشعاراں کے بیچ

رحیم صائب میاں مادۂ تاریخ نکالنے میں بھی ماہر تھے ڈاکٹر سید بشیر احمد ان کے داماد سید ظہیر الدین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''رحیم صائب میاں کو مادۂ تاریخ نکالنے میں بھی ملکہ حاصل تھا۔عثمانیہ یونیورسٹی کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد آصف سابع کو اس کی افتتاح کی تاریخ درکار تھی۔اس خصوص میں ایک اعلان عام بھی کیا گیا تھا۔رحیم صائب میاں نے تاریخ نکال کر ذریعۂ پہ حکمران وقت کے پاس بھجوادی جس کو آصف سابع نے بے حد پسند کیا اور جامعہ عثمانیہ کے باب الداخلہ پر سنگ مرمر کی تختی پر انکی نکالی ہوئی تاریخ کندہ کی جو ذیل میں درج ہے۔
>
> قال نبی صلی اللہ علیہ انا مدینۃ العلم و علی بابھ 1358'' (9)

رحیم صائب میاں کی منفرد شاعری سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مختلف قسم کی آوازوں کو کتنی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ اپنے اشعار میں سمودیتے تھے۔اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رحیم صائب میاں نے نہ کسی سے کسب واستفادہ کیا اور نہ ہی کوئی ان کی پوری طرح تقلید کرسکا۔صوتی شاعری کی روایت کے عصر حاضر میں وہ تنہا علمبر دار نظر آتے ہیں۔

---000---

حوالہ جات

(1) عظیم الدین محبت　''مملکت آصفیہ''　صفحہ 505

(2) معزالدین ملتانی　''مقدمہ''مشمولہ''گھوکرو کے کانٹے''صفحہ 12

(3) محمد نورالدین خان　''یادداشت''　صفحہ 66، مطبوعہ 2003ء

(4) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید''عصر حاضر میں دکنی شاعری''مضمون مشمولہ''تنقیدی افکار''صفحہ 152

(5) نذیرالدین احمد　''دکنی ادب کے چار مینار میں ایک اور اضافہ''　مشمولہ روزنامہ سیاست 1992ء

(6) ڈاکٹر سید بشیر احمد، رحیم صائب میاں، مضمون مشمولہ: مزاح نگاران حیدرآباد، صفحہ 8

(7) شائستہ رفعت''مقالہ''دکنی شاعری کے فروغ میں علی صائب میاں کا حصہ''مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد۔ صفحہ 56

(8) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو''دکنی کی شعری اصناف''از ڈاکٹر حبیب نثار ص98　سنہ اشاعت 1990ء

(9) محمد نورالدین　''یادداشت''　صفحہ 69 سنہ اشاعت 2003ء

سرپٹ حیدرآبادی

حیدرآباد کے طنزیہ ومزاحیہ شاعروں میں سرپٹ حیدرآبادی کا ایک اہم نام ہے ان کا پورا نام محمد اسد حسن انصاری ہے' والد کا نام محمد سعید الدین انصاری ہے۔ حیدرآباد کے محلے مغل پورہ میں 5 اگست 1905ء میں پیدا ہوئے۔ صاحب حیدرآبادی نے تذکرۂ شعراء میں تاریخ پیدائش 16 فبروری 1916ء لکھی ہے۔ ہم نے جو تاریخ پیدائش لکھی ہے وہ خود مصنف کی تحریر سے ماخوذ ہے۔ (1) ان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد کی مشہور درسگاہوں' مدرسہ مفید الانام' مدرسہ منصب داران' اور جامعہ نظامیہ میں ہوئی۔ بعدازاں سٹی کالج سے میٹرک کامیاب کیا۔ (2) اس کے بعد فرنگی محل لکھنؤ کی علوم مشرقیہ کی مشہور درس گاہ مدرسہ عالیہ نظامیہ سے مولوی' فاضل حدیث کے اسناد حاصل کیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے مولوی' عالم' فاضل ادیب' دبیر کامل کے امتحانات امتیازی نشانات سے کامیاب کئے۔ امریکن ہومیو پیتھک کالج لکھنؤ سے یم ڈی ایچ اور طبّیہ وہاجیہ کالج لکھنؤ سے حکیم الفاضل کی سندیں حاصل کیں۔ حکومت آندھرا سے آر ایم (R.M) کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری میں نام کمایا۔ سنجیدہ شاعری میں اسدؔ اور مزاحیہ میں سرپٹؔ حیدرآبادی تخلص اختیار کیا تھا۔ ***

لکھنؤ میں انہوں نے ادبی ماہنامہ ''میخانہ'' ''قیام الدین'' ''فلمی ہفتہ وار'' ''نگارخانہ'' کی ادارت کے فرائض انجام دئے۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے ایک ادبی ماہنامہ ''ننھا'' اپنی ادارت میں عرصہ تک شائع کیا۔

1930ء میں سنجیدہ شاعری کی ابتداء کی اور اسدؔ تخلص اختیار کیا۔ سنجیدہ شاعری میں حمد' نعت' سلام' غزلیات نظمیں' گیت' رباعیات' قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ مختلف اصنافِ سخن کا ایک مجموعہ ''نسیاں'' کے نام سے مرتب کیا۔

*** محمد اسد حسن انصاری نے سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں طرح کی شاعری کی ہے۔ سنجیدہ شاعری میں انہوں نے اسدؔ اپنا تخلص اختیار کیا اور مزاحیہ شاعری میں سرپٹؔ حیدرآبادی تخلص اپنایا۔ ان کے ان دونوں تخلص نے بعض اہل قلم کو غلط فہمی میں مبتلا کردیا۔ چنانچہ صاحب حیدرآبادی نے صرف سرپٹؔ کے تحت ان کا ذکر کیا ہے جبکہ محمد عباس علی نے اپنے مقالے میں ان کا اسم گرامی اسد حسن انصاری بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو ''فرید انجم شخص وشاعر'' از محمد عباس علی مقالہ برائے ایم فل' غیر مطبوعہ مخزونہ کتب خانہ شعبہء اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی' حیدرآباد۔

1961ء سے مزاحیہ شاعری شروع کی اور اپنا تخلص سرپٹ اختیار کیا۔ ان کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ ''دھر گھسیٹ'' کے نام سے 1979ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں طنز ومزاح کے امتزاج کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔

سرپٹ حیدرآبادی کے یہاں اپنے عصر کے مسائل کا بیان ملتا ہے۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کو مختلف مسائل کا سامنا رہا۔ اور المیہ یہ کہ اردو زبان کو مسلمانوں سے منسوب کر کے اس کے ساتھ سوتیلا سلوک اختیار کیا گیا۔ ملک کی آزادی کے بعد جب قومی سرکاری زبان کا مسئلہ درپیش ہوا تو عوامی زبان کے پیش نظر کئی قائدین اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دلانا چاہتا تھے اور چند قائدین ہندی کو۔ چونکہ پاکستان نے اپنی سرکاری زبان اردو کو قرار دیا تھا اسی لئے اس کی مخالفت ہوئی اور پارلیمنٹ میں رائے دہی کے ذریعہ ہندی کو قومی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ اس مضمون کو سرپٹ اپنے شعر میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

چھٹانک میں بھی کمی تھی کل تک ہے وزن اب سوگرام اپنا
جدید باٹوں کو نمستے' قدیم کو ہے سلام اپنا (3)

آزادی کے بعد معاشرے میں کئی ایک تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ مغرب کی اندھی تقلید کا رجحان فروغ پانے لگا۔ فیشن کے نام پر نوجوان مغرب زدگی اور بے راہ روی کا شکار ہونے لگے۔ سرپٹ کہتے ہیں۔

چوٹیاں حسن کی ہوجائیں گی نذرِ فیشن
پھر نہ لہرائے گی یہ کالی گھٹا اب کے برس (4)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

مذکروں میں نہیں علامت ِ تذکیر
بنے ہیں روکش تانیث آج کے مردانے
تھی داڑھی لاپتہ اب تو نہیں ہیں مونچھیں بھی
زنانی شکل میں رہنے لگے ہیں مردانے(5)

سرپٹ حیدرآبادی حالانکہ سلیس اردو میں شعر کہتے تھے لیکن دکنی الفاظ اور روزمرہ اور محاوروں کا استعمال بھی

وہ خوب کرتے ہیں۔ دیسی شراب کو حیدرآباد میں عام طور پر ''گڑمبہ'' کہا جاتا ہے۔ دو شعر دیکھئے جس میں اس لفظ کا استعمال خوب کیا ہے۔

لازمی ہوکے رہے گا یہ گرانی کا اثر
بادہ کش ہوں گے گڑمبے پہ فدا اب کے برس
میں ہوں بیمار گڑمبے کا شِفا دے ساقی
کچھ نہیں چاہیے دو گھونٹ پلا دے ساقی (6)

شراب نوشی کی لت اور شراب خانوں کی بڑھتی تعداد کے تعلق سے کہتے ہیں۔

نکالی جیب سے پی لی جہاں بھی پیاس لگی
قدم قدم پہ بنائے ہیں میں نے مئے خانے

سرپٹؔ حیدرآبادی اپنے مشاہدات اور تجربات کو اپنی تخلیقات میں بڑی شگفتگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ حیدرآبادیوں کی مہمان نوازی مشہور ہے۔ لیکن مہنگائی کے سبب اس میں بھی تبدیلی آتی جارہی ہے۔ لکھتے ہیں:

رواج کتانا بدلتا ہے یہ خدا جانے
طعامِ شب کی جگہ رہ گئے ہیں عصرانے

جب عام آدمی پر مہنگائی کی مار پڑتی ہے تو اس کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ اور شاعر تو ہمیشہ ہی تنگدستی کا شکار رہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

نہ صبر و شکر میں وہ بھی قبول کرلوں گا
ملیں گے اگر مجھے فی شعر صرف پانچ آنے

عام طور پر شعراء کے یہاں شمع و پروانہ گل بلبل اور حسن وعشق کے مضامین کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ سرپٹؔ اسی مضمون میں مقصدیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے عملی زندگی کو اپنا محور بناتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہے کام شمع کا جلنا، جلے گی محشر تک
ہیں بے وقوف جو مرتے ہیں جل کے پروانے

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ سیاسی قائدین اپنے آپ کو عوامی خدمت گار ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد ملک کی ترقی کے لئے امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔لیکن اس میں بھی سیاسی قائدین کی لوٹ کھسوٹ جاری رہتی ہے۔ سرپٹ کہتے ہیں

تعاون باہمی پہ عمل کر کے عمل چلاتا ہے کام اپنا
وہ ہم کو سمجھے غلام اپنا، ہم ان کو سمجھے غلام اپنا

سرپٹؔ حیدرآبادی کا کلام عصری حسیت کی غمازی کرتا ہے۔قوم اور وطن کی حقیقی خدمت کرنے والے آج بھی مفلسی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں جبکہ مفاد پرست سیاست داں اپنی تجوریاں بھرنے میں لگے ہیں۔ ایسے ہی سیاسی رہنماؤں پر طنز کے تیر و نشتر چلاتے ہوئے کہتے ہیں۔

خادمانِ وطن کریں فاقہ
لیڈروں کے لئے ڈنر آیا

☆☆☆

بجائے غلّہ کے سب لوگ کھائیں صرف نمک
نمک کے سوا ہر چیز کو گراں دیکھا

☆☆☆

سوکھے ٹکڑوں پہ جو کر رہے تھے بسر وہ بدستور ہیں آج بھی در بدر
کھاتے تھے جو مرغن غذا روز و شب ان امیروں کو اب مفلسی کھا گئی

سرپٹؔ حیدرآبادی نے صنف رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس میں بھی مزاحیہ اسلوب کی آمیزش کرتے ہیں۔اردو ادب میں استاد سخن مرزا غالبؔ کو چچا غالب بھی کہا جاتا ہے۔لفظ چچا سے مزاح کا عنصر پیدا کرتے ہوئے اپنی رباعی میں وہ کہتے ہیں۔

غالبؔ کی عمارت مری تھی بنیاد — وہ میرے تھے استاد میں اونکا اُستاد
نزدیک کے رشتہ سے وہ چچا تھے میرے — تھا دور کے رشتے سے میں اونکا داماد

بیشتر شعراء نے واعظ، زاہد، شیخ کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اپنی ایک رباعی میں وہ مذہب کے نام پر معصوم عوام کا استحصال کرنے والے مذہبی قائدین پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

واعظ کی زباں رہیں خدا کی باتیں — راس آئی ہیں پنڈت کو کتھا کی باتیں
اے غنڈو ادھر آؤ کہاں جاتے ہو — کچھ ہم سے سنو مکر وریا کی باتیں

انیسویں صدی میں ریڈیو کی ایجاد ہوئی اور بیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں ریڈیو سنا جانے لگا۔ ابتداء میں لوگ حیران تھے کہ صرف ایک ڈبہ مختلف قسم کی آوازیں کس طرح نکال سکتا ہے۔ اور ہر شخص بڑی دلچسپی سے ریڈیو سنا کرتا تھا۔ اسی مضمون کو سرپٹؔ اپنی ایک رباعی میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

بجتا نہیں گم سم ہے یہاں عقل کا ساز — کھلتا نہیں کچھ ریڈیو کے بکس کا راز
بوڑھا بچہ جوان عورت مرد — ہر اک کی نکلتی ہے اس سے آواز

سرپٹؔ مشرقی اقدار کے پروردہ ہیں۔ وہ اخلاقی پستی اور بے راہ روی کو شدید طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ موجودہ دور میں لوگ دولت اور طاقت کے نشے میں دوسروں کو انسان بھی گوارا نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح کی صورتحال پر سرپٹ طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بخشی گئیں رونے کی دھنیں گانوں کو — اپنایا گدھوں نے بھی مدُھر تانوں کو
اس دور میں انسان اوسے کہتے ہیں — حیوان سمجھتا ہے جو انسانوں کو

سرپٹؔ خودداری اور غیرت کا درس بھی دیتے ہیں۔

ہیں قوتِ بازو سے کمانے والے — ہم لوگ نہیں مانگ کے کھانے والے
ہم پڑھتے ہیں محفل میں ترنم سے غزل — قوال نہیں ہم نہ ہیں گانے والے

سرپٹ حیدرآبادی نے اپنے کلام میں سماجی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ان کے کلام کے مطالعہ سے اس عہد کے سماجی مسائل واضح ہوکر ہمارے سامنے آتے ہیں۔اوران کی تخلیقات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کل جو سماجی مسائل ہمارے معاشرے کا ایک جز بنے ہوئے تھے وہ ہنوز آج بھی موجود ہیں۔

حوالہ جات

(1) ملاحظہ ہو سووینئر ''زندہ دلان حیدرآباد'(دوسرا کل ہند مزاحیہ مشاعرہ) مئی 1967ء ص 49

(2) صاحب حیدرآبادی ''جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔تذکرۂ شعراء 1984ء ص 118

(3) سرپٹ حیدرآبادی ''غزل'' سووینئر ''زندہ دلان حیدرآباد'(دوسرا کل ہند مزاحیہ مشاعرہ) ص 49

(4) سرپٹ حیدرآبادی ''پیشن گوئیاں'' مطبوعہ ''شگوفہ'' نومبر ڈسمبر 1969ء ص 84

(5) سرپٹ حیدرآبادی ''غزل'' مطبوعہ ''شگوفہ'' ستمبر اکتوبر 1972ء ص 25

(6) سرپٹ حیدرآبادی ''غزل'' مطبوعہ ''شگوفہ'' نومبر 1976ء ص 48

علی صائب میاں

سید غلام علی نام، تخلص صائب اور علی صائبؔ اور قلمی نام علی صائب میاںؔ تھا۔ ادب کی دنیا میں اسی نام سے معروف ہوئے۔ سید غلام علی 1906 میں سید خواجہ محی الدین اور سیدن بی صاحبہ کے گھر حیدرآباد کے محلّہ ترپ بازار میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد آصف جاہ اول کے عہد میں حیدرآباد آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ خاندانی نسبت سے آپ نجیب الطرفین تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ غوث اعظم دستگیرؒ سے ملتا ہے۔

سید غلام علی کے والد سید محی الدین نے زمینداری وراثت میں پائی تھی۔ یہ زرعی اراضی نظام آباد کے تعلقہ بانسواڑہ میں واقع تھی۔ اسکے باوجود سید خواجہ محی الدین نے محکمہ پولس کے ملازمت اختیار کی اور امین کے عہدے پر خدمات انجام دیں۔ ملازمت کے دوران وہ حیدرآباد میں ہی مقیم رہے۔ حیدرآباد میں آپ کا مکان محلّہ ترُپ بازار (نوبل پلازا کامپلکس) میں تھا۔

سید خواجہ محی الدین کی اولاد میں چار لڑکے بالترتیب سید کبیر احمد، سید غلام احمد، سید غلام علی (علی صائب میاں) اور سید غلام سجاد تھے۔ سید غلام علی نے علی صائب میاںؔ کے نام سے پہچان بنائی۔

سید غلام علی (علی صائب میاں) کی ابتدائی تعلیم و تربیت اشرف المدارس واقع ترُپ بازار میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مکمل ہونے کے بعد چادرگھاٹ ہائی اسکول میں داخل کردیے گئے۔ ذہین و شوخ طبع غلام علی کو چادرگھاٹ ہائی اسکول کی فضا راس آئی۔ وہ نصابی تعلیم کے علاوہ دیگر سرگرمیوں اور کھیل کود میں حصہ لینے لگے۔ چادرگھاٹ ہائی اسکول سے میٹرک میں کامیابی کے بعد انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی۔ اور جامعہ عثمانیہ ہی میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔ طبیعت میں شوخی و شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جو کسی پل نچلا بیٹھنے نہ دیتی تھی۔ جس کے نتیجے میں یکسوئی کے ساتھ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ اور ان کا گرائجویشن کی تکمیل کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

زمانہ طالب علمی سے ہی غلام علی ڈراموں اور کھیل کود میں دلچسپی لیتے رہے۔ کالج کے اسٹیج پر انھوں نے نام

کمایا تھا۔وہ بڑے ہی شوخ اور ظریف واقع ہوئے تھے۔بات میں بات پیدا کرنے اور ہنسنے ہنسانے میں کمال حاصل تھا سید مصطفیٰ کمال لکھتے ہیں۔

''علی صائب بالطبع بڑے شوخ اور ظریف واقع ہوئے......کالج کے شریر وشیطان طالب علموں میں انکا شمار ہوتا تھا۔جامعہ کی ادبی صحبتوں میں ان کا بڑا شہرہ رہا موصوف ہاسٹلر نہ تھے لیکن ہاسٹل کی شرارتوں میں برابر کے شریک تھے۔''(1)

علی صائب میاںؔ کوفنون لطیفہ سے کچھ خاص ہی دلچسپی تھی۔شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ درجہ کے فنکار بھی تھے۔جامعہ عثمانیہ کے طالب علموں کے ساتھ انھوں نے مقبول عام ڈراموں میں فنکاری کے جوہر دکھائے۔یحییٰ صدیقی لکھتے ہیں۔

''علی صائب میاں نے زمانہ طالب علمی سے ہی مزاحیہ فنکاری میں بڑا شہرہ حاصل کیا۔اپنی عجیب وغریب حرکات سے لوگوں کے مرکز نگاہ بنے رہے۔معمولی سے معمولی پارٹ کو بھی وہ اس خوبی سے ادا کرتے کہ لوگ داد دینے پر مجبور ہوجاتے۔مخدوم کا لکھا ہوا ڈرامہ ''ہوش کے ناخن'' میں وہ 'ویٹر' کے روپ میں پہلی بار عوام کے سامنے آئے۔''(2)

ڈرامہ ''ہوش کے ناخن'' میں علی صائب نے بے مثال فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔'ویٹر' کے کردار کے بارے میں علی صائب کی فنکاری کا ذکر کرتے ہوئے مرزا ظفر الحسن لکھتے ہیں۔

''اِسی کھیل میں بالکل پہلی مرتبہ نوکر کے کردار نے دکنی زبان استعمال کی......''میں نے بولا تھا صائب' پر حاضرین کئی منٹ تک قہقہے لگاتے رہے۔کمال نوکر کے لہجے اور حرکات سے زیادہ چست مکالمے اور موقع محل کا تھا۔

ہوش کے ناخن کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ حیدرآباد کے وزیر اعظم اور

جامعہ عثمانیہ کے چانسلر نے جو سب سے پہلا ڈرامہ دیکھا وہ یہی تھا۔ سراکبر حیدری کے ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور اور سروجنی نائیڈو بھی تشریف لائے تھے۔''(3)

علی صائب میاںؔ زائد از نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول سے ہی وہ فٹبال ٹیم کا حصہ بن گئے تھے۔ وہ گھڑ سواری میں بھی ماہر تھے۔ وہ شکار کے بھی بے حد شوقین تھے۔ نہ صرف علی صائب میاںؔ بلکہ ان کے تینوں بھائی بھی شکار کے رسیا تھے اور بہت اچھے شکاری مانے جاتے تھے۔ ولیعہد پرنس اعظم جاہ بہادر شکار کے شوقین تھے وہ اکثر علی صائب میاںؔ کو اپنے ہمراہ شکار پر لیجاتے تھے۔

دکن اسکول آف آرٹ میں مجسمہ سازی' لکڑی کی اشیا بنانا اور نقاشی وغیرہ کے کام سکھائے جاتے تھے۔ علی صائب میاںؔ کے بارے میں یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ انھوں نے دکن آرٹ اسکول سے باقاعدہ کسب و استفادہ کیا ہے۔ لیکن وہ ان تمام امور میں ماہر تھے۔ لکڑی پر نقاشی کرتے' ناخن کے ذریعہ نقاشی کے نادر نمونے بناتے اور مجسمہ تیار کرتے۔ وہ نہ صرف شطرنج کے شوقین تھے بلکہ بڑی مہارت سے شطرنج کھیلتے اور شطرنج کے مہرے عمدہ لکڑی میں خود اپنے ہاتھ سے بناتے۔

مزاحیہ فنکاری کے علاوہ اسکاؤٹنگ سے دلچسپی رکھنے والے ہر فن مولا قسم کے علی صائب میاں کو شعری ملکہ مبداء فیاض کی جانب سے ودیعت ہوا تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی علامہ اقبالؔ' فیض احمد فیضؔ اور فانیؔ کے کلام کی پیروڈیاں لکھتے اور اپنے ساتھیوں کو مزے لے لے کر سناتے تھے۔ پیروڈیوں کے علاوہ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے طبع زاد نظمیں بھی لکھیں جن کو مخدوم محی الدین اورن جیل (اوریجنل) کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ (مخدومؔ زمانہ طالب علمی میں عثمانیہ یونیورسٹی میں علی صائب میاںؔ کے ساتھی تھے۔)

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد آصف جاہی فرمانروا میر عثمان علی خان اور ان کے ولیعہد اور دیگر ارباب اقتدار جامعہ عثمانیہ آتے رہتے تھے۔ ولیعہد اعظم جاہ بہادر' پرنس آف برار نے ایک تقریب میں ہونہار علی صائب میاںؔ کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور قدر دان نگاہوں نے اس جوہر قابل کو دربار میں رسائی دیدی۔ یہ وہ دور تھا جب علی صائب میاںؔ طالب علم ہی تھے۔ یہ وابستگی صرف دربار تک محدود نہ رہی بلکہ وہ ولیعہد کے بہت قریب پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ نجی معاملات تک رسائی ہوگئی۔ جب کبھی ولیعہد کو کسی بھروسہ مند اور دیانت دار صاحب معاملہ کی ضرورت پیش آتی وہ

فوراً علی صائب میاںؔ کو ذمہ داری سونپنے سے گریز نہیں کرتے۔تنک مزاجی اور طبع نازک کے حامل علی صائب میاںؔ کو کوئی بات ناگوار گذرتی تو دربار سے چلے جاتے اور اس وقت تک دربار کا رخ نہ کرتے جب تک کہ پرنس خود اپنی موٹر لیکر لینے نہ آتے۔پرنس کے دونوں صاحبزادے پرنس مکرم جاہ اور پرنس مفخم جاہ علی صائب میاں سے بہت زیادہ مانوس ہو گئے تھے۔ان کے اتالیق منجھلے میاں بھی،علی صائبؔ کا بہت احترام کرتے تھے۔

ان دنوں نظام سرکارڈیپوٹیشن پر طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھجوایا کرتے تھے۔علی صائب میاں (غلام علی) کو انگلستان جانے کی دیرینہ تمنا تھی۔مرزا ظفر الحسن اس سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

''کسی دوست نے پوچھا غلام علی تم لندن میں کیا کروگے؟ کہنے لگے میری صرف ایک آرزو تھی جو اتنی مدت بعد پوری ہو رہی ہے وہ یہ کہ انگریز سے اپنے جوتے پر پالش کراؤں۔لندن میں ضرورت ہو یا نہ ہو روز آنہ ایک نئے انگریز سے اپنے جوتے پالش کراؤنگا۔(4)

علی صائب میاں اور ولیعہد کی رفاقتیں بیس سالہ عرصہ پر محیط رہیں۔چند ناگزیر وجوہات نے علی صائب میاں اور ولی عہد کے درمیاں فاصلوں کو بڑھادیا۔حضور نظام کے تخت وتاج سے محرومی اور پھر راج پرمکھ بنادیے جانے کے اثرات زندگی کے تمام شعبوں پر مرتب ہوئے۔معاشی طور پر شاہی خاندان عدم استحکام کا شکار ہو گیا۔ان حالات کا اثر علی صائب میاں پر بھی پڑا۔ان کی مقررہ یافت سال میں یا پھر چھ ماہ میں ایک بار مل پاتی۔پرنس نے کئی بار کوشش کی کہ علی صائب میاں کی دربار میں آمد ورفت باقی رہے لیکن علی صائب میاں کے لئے بدلتے حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ان کے لیے اب ممکن نہ رہا کہ اپنی خودداری کو مجروح کرتے ہوئے درباری کے تقاضوں کو پورا کرتے۔درباری روابط ختم ہو گئے اور یاران خوش ذوق کی محفلیں ترپ بازار میں علی صائب میاں کی رہائش گاہ پر منعقد ہونے لگیں۔یا پھر معز الدین ملتانی کے مکان واقع تالاب کٹہ یا بیچلر کوارٹرس معظم جاہی مارکٹ کے حجرہ میں یہ منچلے دوست احباب جمع ہوتے اور محفلیں قہقہہ زار بن جاتیں۔

علی صائب میاں نے اپنی ساری زندگی تجرد میں گذاردی۔فطرتاً آزاد طبع ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی ضد بھی ان کی فطرت کا حصہ بن گئی تھی۔جس بات پر اڑ جاتے اس سے ذرہ برابر نہ ہٹتے۔اسی ضدی طبیعت نے

انھیں مجرد زندگی گذارنے پر مجبور کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ غم گسار رہا نہ کوئی وارث۔ صرف دوست احباب کا سہارا تھا جو خوشی و غم میں ساتھ رہتے تھے۔ ان احباب کے ساتھ تاش کی محفل جمتی یا رمی کی محفل یا پھر خوش ذوق محفلیں منعقد ہوتیں اور دوست احباب کے ساتھ زندہ دلی کا ثبوت دیتے نظر آتے تھے۔ مزاحیہ فنکاری کے جوہر نے انھیں کامیاب فنکار بنا دیا۔ ''نالگو برادران'' سے وابستہ ہو کر کبھی بھوئی کا کردار نبھایا یا پھر دکن ریڈیو پر مزاحیہ مشاعرہ میں شرکت کی۔ یا کل ہند صنعتی نمائش کے مزاحیہ مشاعرے کے روح رواں بنے رہے۔ سقوط حیدرآباد کے بعد ایک نیا حیدرآباد ابھر کر سامنے آیا۔ تلنگانہ تحریک اور کمیونسٹ تحریک سیاسی سطح پر وقفہ وقفہ سے اپنا وجود منواتی رہی۔ مصروفیات کا رخ بدلتا گیا۔ مخدوم محی الدین روپوشی کی زندگی گذار رہے تھے۔ ان کو علی صائب میاں سے اس قدر تعلق خاطر تھا کہ روپوشی کے دنوں میں چوری چھپے گھوڑا گاڑی میں ملاقات کرنے آجاتے۔

1950 کے بعد علی صائب میاںؔ نے شاعری کرنی چھوڑ دی۔ پرانا کلام احباب کے اصرار پر مشاعروں میں سنایا کرتے۔ سامعین ان کا کلام ذوق وشوق سے سنا کرتے۔ مشاعروں میں لوگوں کی خواہش کا احترام کرتے اور حافظہ کے بل بوتے پر جتنا کلام یاد آتا سنا دیا کرتے۔ جونیر شعراء علی صائب میاں کا بڑا احترام کرتے اور تعارف کرواتے ہوئے ''ہمارے بزرگ شاعر'' کہا کرتے۔ علی صائب نے گرچہ سلیس اردو میں بھی قطعات کہے ہیں اور وہ بھی کمیاب ہیں۔

علی صائب میاں کے قریبی ساتھیوں میں عابد علی خاں، اشفاق احمد، مرزا ظفر الحسن، مرزا شکور بیگ، مخدوم محی الدین، نظر حیدرآبادی، صاحبزادہ میکش، شہریار کاؤس جی، معز الدین ملتانی وغیرہ تھے۔

مولانا معز الدین ملتانی، علی صائب میاں کے دیرینہ رفیق تھے۔ علی صائب میاں مولانا کا بے حد احترام کرتے۔ عمر کے لحاظ سے دونوں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ مولانا بڑی ہمہ رنگی شخصیت کے مالک تھے۔ فقہ وحدیث کے عالم، صاحب تصنیف، فنون لطیفہ کے ماہر اور ایک اچھے نعت گو شاعر تھے۔ مولانا کے بیٹوں کو علی صائب میاں سے بڑا تعلق خاطر رہا۔ وہ انھیں علی چچا کہا کرتے تھے۔ مولانا کے چھوٹے صاحبزادے حکیم سید مظفر الدین سعید کو علی صائب سے بہت قربت حاصل رہی۔ علی صائب میاں کی رحلت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ''مولانا معز الدین ملتانی کی وفات کے بعد برسی کے موقع پر علی صائب رات میں حکیم صاحب کے گھر ہی میں مقیم رہے اسی رات طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ اور دو دن کی مختصر علالت کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔'' (5)

ترپ بازار میں واقع ان کی رہائش گاہ جوان کی زندگی کے نشیب وفراز کی امین وشاہد تھی اب نوبل پلازہ میں تبدیل ہوچکی ہے۔اپنی زندگی کے آخری ایام انھوں نے اپنے بھتیجے سید حیدر کے ہاں ترپ بازار میں گذارے اور بیاسی 82 برس کی عمر میں یہیں وفات پائی۔تدفین آبائی قبرستان ضلع نظام آباد کے تعلقہ بانسواڑہ کے قصبے ''بستوے پلی''میں عمل میں آئی۔

علی صائب میاں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں زمانہ طالب علمی سے ہی شعر کہنا شروع کردیا تھا۔انہوں نے اپنی شعری کاوش کا آغاز سلیس اردو میں کیا تھا۔اس زمانہ میں حیدرآباد مشاعروں کا مرکز مانا جاتا تھا۔جامعہ عثمانیہ میں بھی مشاعرے طلبا سرگرمیوں کا ایک جز بن گئے تھے۔اقامت خانوں میں مقیم طلبا ان مشاعروں میں اپنی طبع زاد نظمیں سنایا کرتے تھے۔مرزا شکور بیگ کی نظم ''دال'' اور مخدوم محی الدین کی نظم ''پیلا دوشالہ'' اسی عہد کی یادگار ہیں۔علی صائب میاں بھی اپنے ان ساتھیوں سے پیچھے نہ تھے۔ان کی شعری کاوش کے آغاز کے بارے میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال لکھتے ہیں۔

> ''علی صائب کی شاعری کا آغاز غالب،مومن،جگر،فانی وغیرہ کی پیروڈیوں سے ہوا...... یہ پیروڈیاں سلیس اردو میں لکھی گئیں اوراس وقت تک دکنی میں لکھنے کا کوئی خیال پیدا نہیں ہوا تھا۔''(6)

پیروڈیوں کے علاوہ علی صائب میاں نے طالب علمی کے زمانے میں طبع زاد نظمیں لکھا کرتے تھے۔مرزا ظفرالحسن لکھتے ہیں۔

> ''شاعری کی طرف توجہ کی اپنا تخلص 'علی صائب' رکھا۔ابتداء میں فانی اور دوسرے شعرا کے کلام کی دکنی پیروڈی لکھی اُس کے بعد خوداُن کے قول کے مطابق ''ذاتی نظمیں تخلیق کیں یعنی اوریجنل جنہیں مخدوم مذاق میں ''اورن جیل'' کہتا تھا۔''(7)

علی صائب میاں نے نہ کسی سے اکتساب کیا اور نہ ہی کسی سے اصلاح لی۔جامعہ عثمانیہ کا ماحول طلبا کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں معاون ثابت ہوا اور طلبا کی پوشیدہ صلاحیتیں ابھرنے لگیں۔یہ وہ عہد تھا جب دکنی شاعری

کے ایوان میں نذیر دہقانی کا طوطی بول رہا تھا۔مجلس اتحادالمسلمین کے جلسوں میں نذیر دہقانی کے کلام کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔علی صائب میاں نے ایسے ہی ایک جلسے میں شرکت کی۔نذیر دہقانی کا کلام سنا اور اس قدر متاثر ہوئے کہ دکنی میں شعر کہنا شروع کر دیا۔مصطفیٰ کمال لکھتے ہیں۔

''دکنی میں تو علی صائب میاں نے بعد کو لکھنا شروع کیا ورنگل کے کسی مشاعرہ میں دہقانی کو سن کر اس قدر متاثر ہوگے ٔ کہ خود بھی اسی ڈھنگ میں شعر کہنے لگے۔اور بلا شبہ دہقانی کے ہم پلہ ہو گئے۔''(8)

علی صائب میاں نہ صرف اسٹیج سے جڑے رہے بلکہ دکن ریڈیو سے پیش ہونے والے مزاحیہ پروگراموں سے بھی لوگوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہے۔اس زمانے کے ایک پروگرام میں علی صائب میاں نے ''بھوئی'' کا کردار ادا کیا جو بہت مقبول ہوا۔1947 میں تقسیم ہند اور پھر اس کے بعد ہونے والی سیاسی اُتھل پُتھل نے لوگوں کے دلوں کو دہلا دیا۔اس عہد کی منظرکشی کرتے ہوئے عزیز ابرار سعادت علی خاں کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''ماحول اس قدر ہیبت ناک ہو گیا تھا کہ لوگ ہنسنا بھول گئے تھے۔اس دردانگیز فضا میں مزاحیہ فنکار برق آشیانوی،رشید قریشی،علی صائب میاں،بھارت چند کھنہ،سرور ڈنڈا......وغیرہ ہنسی بانٹنے میں مصروف ہو گئے۔''(9)

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ 1947 سے قبل اور اس کے بعد بھی علی صائب میاں،اپنے ظریفانہ اشعار سے لوگوں کا غم غلط کرنے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

حیدرآباد کی صنعتی نمائش میں ایک روایت مزاحیہ تشہیری پروگرام کی رہی ہے اس میں اشتہارات کو منظوم شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔یہ پروگرام اتنے دلچسپ ہوا کرتے تھے کہ بعض لوگ انھیں سننے کے لئے ہی نمائش جایا کرتے تھے۔اعجاز حسین کھٹا جب تک حیدرآباد میں رہے ان پروگراموں کے وہ روح رواں رہے۔1952 میں جب وہ پاکستان چلے گئے تب علی صائب میاں نے یہ ذمہ داری سنبھال لی اور اعجاز حسین کھٹا کی کمی کو کبھی محسوس ہونے نہیں دیا۔

فائن آرٹس اکیڈیمی،حیدرآباد کا ایک ممتاز ثقافتی ادارہ رہا ہے اس اکیڈیمی نے کئی ممتاز و منفرد پروگرام پیش کئے۔علی صائب میاں بھی اکیڈیمی کی جانب سے منعقد ہونے والے پروگراموں میں اور مشاعروں میں بحیثیت

شاعروفنکار حصہ لیتے تھے۔

1952 میں کل ہند صنعتی نمائش کے دوران مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں علی صائب میاں، محمد حمایت اللہ، سلیمان خطیب، مصطفیٰ علی بیگ، فریدالدین گردہ نے بطور شعرا شرکت کی۔اس کے بعد ہر سال باضابطہ یہ مشاعرہ منعقد ہونے لگا۔اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

سالانہ مشاعروں کی روایت تسلسل کے ساتھ جاری تھی کہ 1961 میں نشر گاہ کے سبزہ زار پر منعقد ہونے والے مشاعرہ کے بعد اس میں مزید پیشرفت ہوئی۔اس مشاعرہ میں ایاز احمد انصاری ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے مشورہ دیا کہ فائن آرٹس اکیڈیمی کے اس ادبی شعبے کو ''زندہ دلان پنجاب'' سے استفادہ کرتے ہوئے ''زندہ دلان حیدرآباد'' کا نام دیا جائے۔اس طرح 1962 میں ''زندہ دلان حیدرآباد'' کا قیام عمل میں آیا۔اور اس ادارہ نے طنز ومزاح کی سرگرمیوں کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔''زندہ دلان حیدرآباد'' کے تحت پہلا ریاستی مشاعرہ 17 مارچ 1962 کو اردو ہال میں منعقدہ ہوا۔اور علی صائب میاں کو اس اولین مشاعرے کی صدارت کا اعزاز حاصل ہوا۔اس کے بعد پابندی سے یہ مشاعرہ ہر سال منعقد ہوتا رہا۔علی صائب میاں ان مشاعروں میں شرکت کرتے اور اپنا کلام سنا کر خوب داد حاصل کرتے۔لوگوں میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان سے مشاعرہ میں بار بار فرمائش کر کے کلام سنتے۔اس تعلق سے ڈاکٹر مجیب الاسلام لکھتے ہیں۔

> ''دکنی مشاعروں کو مقبول عام کرنے میں علی صائب میاں نے خاص کارنامہ انجام دیا ہے۔''(10)

1967 میں منعقدہ سالانہ مشاعرے کی صدارت علی صائب میاں نے کی اور صدر کی حیثیت سے اپنی نظم ''پتنگ'' سنائی۔1968 میں زندہ دلان حیدرآباد نے اپنی مطبوعات کا سلسلہ شروع کیا۔شمالی ہند کے رضا نقوی واہی کے مجموعہ کلام ''نشتر و مرہم'' کا انتخاب ہوا تو جنوبی ہند سے علی صائب میاں کے مجموعے کلام ''گھوکرو کے کانٹے'' کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔اس طرح زندہ دلان حیدرآباد کی اولین مطبوعات میں اس کا نام سرفہرست ہے۔

علی صائب میاں نے زیادہ تر فی البدیہہ شاعری کی ہے۔ان کا کوئی تحریری کلام موجود نہ تھا۔زندہ دلان حیدرآباد نے جب ان کا کلام شائع کرنا چاہا تو علی صائب میاں نے شدید مخالفت کی اور اپنا کلام شائع کرانے میں

محرکین سے تعاون نہیں کیا۔ یہ حمایت اللہ کی کاوش تھی جس نے ان کو گمنام ہونے سے بچالیا۔ ان کے کلام کی اشاعت کے مختلف مراحل کے بارے میں مصطفیٰ کمال رقمطراز ہیں۔

''زندہ دلان حیدرآباد نے جب مجموعہ کلام شائع کرنے کا ارادہ کیا تو محرکین سے علیک سلیک بھی بند کردی مگر علی صائب کی کمزوری حمایت اللہ ہیں۔ جنھیں وہ ٹال نہ سکے۔ پہلے تو وہ راضی ہوئے لیکن جب کلام دینے کا وقت آیا تو فرمایا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم پریشان ہوئے۔ انھیں ٹٹولا گیا تو دو چار چیزیں سینکڑوں برس کے قدیم مخطوطات کی شکل میں دستیاب ہوئیں۔ جیسے تیسے کتابت کروائی گئی۔ پھر تصحیح کا وقت آیا تو شاعر دنیا و شہرت سے بے نیاز ہو کر خواجہ کے دربار میں پہنچ چکا تھا۔''(11)

شائستہ رفعت ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

''مجموعہ کلام کی اشاعت سے قبل چند اہم نظمیں جو فراہم ہوسکیں تھیں اس کو تصحیح کر کے علی صائب میاں کو دی گئیں تو انہوں نے تصحیح کے بہانے ان نظموں کو لے کر اپنے ہاتھوں تلف کر دیا۔ اور یہ وجہ بتائی کہ وہ سیاسی نظمیں تھیں ان کی اشاعت کی وہ اجازت نہیں دیں گے۔ اس طرح کئی اہم نظمیں خود انہوں نے اپنے ہاتھوں تلف کر دیں۔''(12)

جب مجموعہ کلام زیور طباعت سے آراستہ ہوا اور زندہ دلان حیدرآباد نے 1968 میں اس کی تقریب رسم اجراء منعقد کی تو علی صائب میاں گلبرگہ چلے گئے۔ رضا نقوی واہی کے مجموعہ کلام ''نشتر و مرہم'' کی تقریب رسم اجرائی میں شرکت کے لئے رضا نقوی واہی پٹنہ سے حیدرآباد آئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''گھوکرو کے کانٹے' اور 'نشتر و مرہم' کے تقریب اجراء کے موقع پر علی صائب میاں ڈائس پر موجود نہیں تھے۔ حیدرآباد کے دو بزرگ شخصیتوں معزالدین ملتانی اور شہر یار کاؤس جی نے ان پر مضمون سنایا۔''(13)

علی صائب میاں نے اپنے اس مجموعہ کلام کو اردو کے صاحب طرز اور اپنے رنگ کے منفرد شاعر نذیر دہقانی کے نام معنون کیا ہے۔ان کے اس مجموعہ کلام کے علاوہ بہت سارا کلام شائع ہونے سے رہ گیا۔اس کے علاوہ کچھ چوے(قطعات) شگوفہ کے شمارے میں موجود ہیں وہ بھی شامل نہ ہوسکے۔مندرجہ ذیل چوے(قطعات) زندہ دلان حیدرآباد کے چودھویں سالانہ کل ہند مشاعرہ میں علی صائب میاں نے سنائے تھے۔

بھیک کے خرمے سے دال اپنی بگھاری اچھی
غیر کی گاڑی سے پیدل کی سواری اچھی
عزت ایمان گنواں لیکے اگر ملتی ہے
ایسی بریانی سے تو پیلی جواری اچھی

☆☆☆

دغل بازی' ظلم' کو کاں چلے گئے روکنے والے
کدھر چھپ گئے مصیبت کے وقت خم ٹھوکنے والے
فقط تقریراں جھاڑیں گے کریں جھوٹے ویدے سب
یہ مسئلہ ہے پرانا کاٹتے نئیں بھوکنے والے

کچھ کلام حمایت اللہ کے پاس کیسٹ میں ریکارڈ ہے جو یہاں درج کیا جاتا ہے۔اس چوے میں سلیس اردو کا رنگ جھلکتا ہے۔

حرص و ہوس سے عقل جو بدرنگ ہوگئی
دنیا اندھیر ہوگئی اور تنگ ہوگئی
انسانیت جو ہاتھ سے چھوٹی تو کیا رہا
دنگے فساد ہوگئے اور جنگ ہوگئی

دکنی مزاج اور محاورہ اور صنعت سیاقتہ الاعداد سے مزین یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

تین سو ساٹھی میں سب کوڑی کو بارہ ہوگئے

کیسے کیسے تین تیرہ نو اٹھارہ ہوگئے
چینیاں پنیاں نہلے دہلے سر اٹھائے تھے بہت
بھاؤ کی بارہ کی پڑیچ نو دو گیارہ ہوگئے

علی صائب میاں کے کئی قطعات (چوے) بہت مقبول ہوئے۔ایک چوے میں جدید شاعری پر اپنے رد عمل کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

گھی ترئی املی کی بوٹاں لگ گئے انجیر کو
اک گلہری بند دیئے ہیں بھینس کی زنجیر کو
شاعراں اب بول رئیں نوے قسم کی شاعری
ایک مصرع تیر کو تو ایک مصرع میر کو

ناظم مرزائی گڑبڑ حیدرآبادی کے سانحہ ارتحال پر علی صائب میاں نے یہ اشعار کہے تھے

ڈنڈے بجاکے جس طرح ڈنڈا چلا گیا
گڑبڑ مچاکے حضرت گڑبڑ چلے گئے
دنیا کے رنج و غم کو وہ ہنس ہنس کے سہہ گئے
''کل من علیھا فان'' کا وہ درس دے گئے
ناظم تھے وہ یارباش اکیلے نہ جاسکے
مرزا کو بھی ساتھ میں اپنے وہ لے گئے

علی صائب میاں کا کلام اختصار میں جامعیت کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔فی البدیہہ شاعری کی وجہ سے ان کا کلام محفوظ نہیں رکھا جاسکا۔لیکن انھوں نے عوام میں مزاحیہ فنکاری اور اپنے شاعرانہ کمال کی بدولت مقبولیت حاصل کرلی۔ بلاشبہ زندہ دلان حیدرآباد کا یہ عظیم کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس نے گوشہ گمنامی میں دفن ہونے والے شعراء کی شناخت کو باقی رکھا اور انہیں ایک نئی زندگی بخشی۔علی صائب میاں کا مجموعہ کلام ''گھوکرو کے کانٹے'' ان کی شاعرانہ صلاحیت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

''گھوکرو کے کانٹے''میں پندرہ مشمولات ہیں۔ایک غزل، نظمیں اور چوے (قطعات) شامل ہیں۔آغاز میں ایک منقبت ہے جو حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی شان میں لکھی گئی ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے اس منقبت میں دکنی لب ولہجہ کو برقرار رکھا ہے۔یہ منقبت عرس کے موقع پر گلبرگہ میں پڑھی گئی۔آٹھ مصرعوں پر مشتمل اس منقبت میں عقیدت کا اظہار اعلیٰ درجہ پر ہوا ہے۔یہاں ایک دیہاتی کے جذبات اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔

دروجے پو تیرے جو پڑکو ہوں خواجہ   محوبت میں تیری سپڑ کو ہوں خواجہ
حشر اور دوزک کو اب کیا سمجھتوں   میں دامن تمارا پکڑ کو ہوں خواجہ
فلخ سے بی اونچا ہے چڑکو نصیبہ   میں گیارہ سیڑھی جب سے چڑکو ہوں خواجہ
غلامی میں تیری وہ طاقت ملی ہے   مقدر سے پٹکیاں میں لڑکو ہوں خواجہ

پروفیسر مبارزالدین رفعت نے ''مدح خواجہ دکن'' کے عنوان سے جو مجموعہ مرتب کیا ہے اس میں صفحہ گیارہ 11 پر علی صائب میاںؔ کی یہ منقبت شامل ہے۔

علی صائب میاں بنیادی طور پر طنز ومزاح کے شاعر ہیں۔انھوں نے معاشرتی ناہمواریوں اور خرابیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔اقربا پروری، مفاد پرستی، رشوت ستانی اور اخلاقی اقدار کی گراوٹ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اخلاقی بحران پر بھی انہوں نے سخت چوٹ کی ہے۔اس کے علاوہ معاشی، معاشرتی مسائل، فرقہ وارانہ کشاکش، سماجی استحصال کو بھی انہوں نے اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے۔

تھیلے نہ تھیلے رقم لوٹ کو کِتا سیتائے
خون کیوں لوگوں کا جوک کے سرکا پیتائے
کام آ دوسروں کے جانا ہے خدا کے آگے
پیٹ کے واسطے یہوں جینے کو کُتا جیتائے

جھوٹے بلاں بناکو کمالیوں گا کیوں بھی میں
رشوت تو گھٹ ہے کام چلالیوں گا کیوں بھی میں

فرقہ وارانہ کشاکش کوانھوں نے اپنے اشعار میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

اپنا گلا ہاتھ بھی اپنے　　　اپنی کمر ہے لات بھی اپنے
ہندو مسلم نفاق کیوں بولوں　　　ہونٹ بھی اپنے دانت بھی اپنے

بیکاری اور بیروزگاری غریب عوام کے لئے ہمیشہ ایک مسئلہ رہی ہے۔علی صائب میاں نے اس سماجی مسئلے کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔

ہڈیاں ٹوٹے تلک ایٹیاں کراتے رہے　　　گنڈوں کی بات آئی تو بھرکیاں پھراتے رہے
عمر تمام ہیچ کٹی علی صاب کی　　　اماں کا کھائے ماموں کے بکریاں چراتے رہے

علی صائب میاں کا سیاسی شعور بھی بہت پختہ تھا اسی لئے سیاست کی چالبازیوں اور سیاست دانوں کی مفاد پرستی پر کھل کر چوٹ کرتے ہیں۔

لیڈری ملتیچ پھگٹ کا دانہ چارہ ہوگیا　　　پیٹ اس کا ڈنراں کھاکو نقارہ ہوگیا
موٹراں بنگلے خریدیا ہور غلے بلاک　　　پاپ لیڈر، قوم کے غم میں غبارہ ہوگیا

علی صائب میاں کے کلام میں محاورے، ضرب الامثال کا استعمال پورے عروج پر نظر آتا ہے۔وہ دکنی زبان کے مزاج اور اس کے اصل رنگ کی مناسبت سے ان کا استعمال کرتے ہیں۔بعض چوؤں (قطعات) میں تو انھوں نے ہر مصرعہ میں ایک محاورہ باندھا ہے۔اور بعض چوؤں میں دو دو محاورے باندھے ہیں۔

منہ سے پانی چلیا ہے دیکھ کو چکنی ڈلی
کبھی بھی نئیں ہورہائے تو بس کھبے کھکر رہئی بلی
ہانپتے کانپتے آرہے تھے ہڑپ کرجانے کو
گھر کو دیکھے تو ابھی دور نظر آرہی دلی

☆☆☆

تھپکنا کتوں میں زمانے کی تالو

جسے دیکھو بخشا ہوا ہور چالو
سدھرتی کے سالے تو چار ہوتیں
بگڑتی کا بھوئی نہ چچا نہ خالو

اگر چہ ان کے ہاں صنعتوں کے استعمال کی شعوری کوشش نظر نہیں آتی لیکن کہیں کہیں انھوں نے بعض صنعتیں بہت خوبصورت انداز میں استعمال کی ہیں۔اس چوے میں صنعت سیاقۃ الاعداد موجود ہے۔صنعت کی خوبی یہ ہے کہ وہ کلام پر حاوی نہ ہو بلکہ اصل روح برقرار رہے۔

تین سو ساٹھی میں سب کوڑی کو بارہ ہوگئے کیسے کیسے تین تیرہ نو اٹھارہ ہوگئے
چینیاں پنیاں نہلے دہلے سر اٹھائے تھے بہت بھاؤ کی بارہ کی پڑ تیچ نو دو گیارہ ہوگئے

دیہی زندگی کی عکاسی کرنا دکنی کے مزاحیہ شاعر کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔''کنبی کی آس'' میں انھوں نے دیہی زندگی اور کسانوں کے جذبات کی تصویر کشی کی ہے۔جب کسان اپنی فصل کے لئے بارش کا منتظر ہے۔

ہوایاں اڑ رہئے تھے منہ کو کنبی کے کھڑیا باہر نگہ آسمان پو تھی کڑکو پانی نئیں پڑیا آخر
نگہ آسمان سے پھر نیچے کھیتوں پو گری آ کو وہ پیلے مولکوں میں چپکے ڈھنڈلاتی پھری جا کو
مگر نئیں دیکھ سک کو وہاں سے بھی انکھیاں ہٹایا اُن سدر نے نئیں لگیا دل میں بہت نقشے بٹھایا پن
اُنے پھر دھوپ میں کمّل پو بیٹھا بڑبڑا لیتا کھڑے چٹے پو کی انگار چکمک سے جھڑا لیتا

''گھوکرو کے کانٹے'' میں شامل نظم ''طالب علم'' علامہ اقبال کے مصرعہ'چمن کے ذرہ ذرہ کو شہید جستجو کردے' کی تضمین ہے۔تضمین کے اصطلاحی معنی کسی مشہور شعر کو اپنی نظم میں داخل کر لینا یا کسی مصرعہ پر مصرعہ لگانا ہے۔یہ تضمین لگ بھگ 1940 کے آس پاس لکھی گئی ہے یہ وہ عہد تھا جس میں طلبا اور نوجوان کمیونسٹ تحریک سے متاثر تھے۔ترقی پسند مصنفین' معاشرے کی بدحالی' سماجی پستی' اور سیاسی غلامی کو ہدف بنائے ہوئے تھے۔علی صائب میاں بھی اس سے متاثر تھے۔حکومت وقت نے اس تحریک پر قابو پانے کے لئے تحریر اور تقریر کی آزادی پر پابندی عائد کر دی تھی۔

1943 میں جب تحریر وتقریر کی آزادی سلب کرلی گئی تھی۔ ’’آل حیدرآباد اسٹوڈنٹ کنونشن‘‘ کا پہلا سیشن حیدرآباد میں منعقد ہوا جس میں طلبا کو اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے اور اپنا رول ادا کرنے کے لئے متوجہ کیا گیا۔ ان دنوں طلبا سرگرمیوں سے حیدرآباد کی نامور شخصیات سروجنی نائیڈو، راج بہادر گوڑ، مخدوم محی الدین، اکبر وفا قانی صاحبزادہ میکش اور سلیمان اریب وابستہ تھے۔ اس کنونشن کے بارے میں ڈاکٹر داؤد اشرف لکھتے ہیں۔

> ’’پرچم کشائی کے بعد مس پدمجا نائیڈو نے مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے طلبہ سے اپنے آپ کو اس رول کے لئے تیار کرنے کے لئے کہا جو انھیں مستقبل میں ادا کرنا ہے۔ انھوں نے موجودہ نازک دور میں دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے باخبر رہنے کی تاکید کی لیکن عملی سیاست میں داخل نہ ہونے کا مشورہ دیا گیا۔ سروجنی نائیڈو نے اپنے پیام...... کے آخر میں انھوں نے طلبہ کو ان کے مختلف فرائض کی جانب ان الفاظ میں توجہ دلائی۔ اگرچہ طلبہ کی پہلی ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ تعلیم کے لئے وقف کردیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی تعلیم کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے کہ طلبہ دنیا کی تاریخ پر اثر انداز ہونے والی تحریکوں میں بھی اپنی ذہانت کی اتھاہ گہرائیوں کے ساتھ وسیع تر دلچسپی لیں اور ترقی کے متعلق تمام عصری خیالات و نظریات سے بھی آگاہ رہیں۔ ریاست حیدرآباد کے نوجوانوں کا وقت اور حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ مشن یہ بھی ہوگا کہ وہ ریاست کے تمام طبقات میں جو ریاست کے جزو لاینفک ہیں اتحاد اور اشتراک باہم کو فروغ دیں۔‘‘ (14)

اسٹوڈنٹس کنونشن کے اس اجلاس کے اہم نکات اور علی صائب میاں کی تضمین میں جن امور پر توجہ دلائی گئی ہے ان میں بڑی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ علی صائب میاں نے اس نظم میں سلیس اردو کا استعمال کیا ہے۔

پریشانیاں جو دنیا میں ہیں منتر پڑھ کر چھو کردے
وقت ہے ہاتھ ملنے کا، ختم سب گفتگو کردے

وطن کی آس تجھ سے ہے تو پوری آرزو کردے
ترے اب ہاتھ میں ہے بیڑہ پار تو کردے

دکن کے بچے بچے کو وطن کی آبرو کردے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کردے

علی صائب میاں، نامساعد حالات کو بدلنے اور اپنے حق کے موافق ماحول بنانے کی جانب طلبا کی توجہ مبذول کرواتے ہیں۔

دھتوروں کو چنبیلی اور موتیا کے ہوبہو کردے
فرش کے سرکا مخمل کے ببول اورگھوکرو کردے
پلاس ہوا تاڑ، املی اور پیپل کو سرو کردے
قلم کے زور سے سب بھانس کی جھاڑاں برو کردے

علم کے پیچھے اپنا اک پسینہ ہور لہو کردے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کردے

شاعر، ادیب اور فنکار اپنے عصر کے ترجمان ہوتے ہیں۔علی صائب میاں کا عہد بادشاہت کے ٹوٹتے بکھرتے وجود اور جمہوریت کے درمیان کشمکش کا دور تھا۔حکومتی اختیارات دو حصوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ایک جانب عملاً مداخلت کار انگریز ریزیڈنٹ اور دوسری طرف حکمران وقت میر عثمان علی خاں۔علی صائب میاں نے اس بحرانی کیفیت سے آنکھیں نہیں چرائیں بلکہ ایک سماجی اور سیاسی مبصر کی حیثیت سے حالات کا مشاہدہ کرتے رہے۔اس دور میں ہر نوجوان کی خواہش تھی کہ وہ دکن کو آزاد اور خود مکتفی دیکھے۔حکومت برطانیہ اپنے مفاد کے لئے سلطنت حیدرآباد پر خصوصی مہربان تھی۔آزادی کے بعد اسے انڈین یونین میں انضمام کی کوشش ہونے لگی۔ان تمام حالات کی عکاسی علی صائب کے اس چوے میں نظر آتی ہے۔

نگل رئیں کدھر یہ املتاس ہے کیا
زبردستی دل میں یہ وسواس ہے کیا

جسے دیکھو چوپ اس کو گُھرنے لگے ہیں
ہماری ریاست ہرا گھانس ہے کیا

ملکی وسائل پر غیر ملکیوں کا قبضہ اور اہل وطن کی اس سے محرومی کی کیفیت پر وہ اس طرح طنز کرتے ہیں۔

باغ لگاروں محنت سے پھل دُسرے کھارئیں لیو خطبہ		آنکھ میں مٹی ڈالے سوڈالے منہ میں بھی بھارئیں لیو خطبہ
بلیاں دُبکی مار کو بیٹھیں کُتے بھو بھو بولے تو		کوئل بلبل غپ چپ ہے ہور کوے گارئیں لیو خطبہ
پھترے ہوا میں اُڑتے پھر رئیں کیا زمانہ آیا ہے		گاڑے آگے گھوڑا پیچھے چال بتارئیں لیو خطبہ
رشوت سے سب کٹھ چھنی کتے سُراخاں بند کرنا		لانڈگے بن کو ساؤستے بکریاں چُرارئیں لیو خطبہ
پوچھنے والا کون ہے یاں اب تم بھی تڑی دیو علی صائب		غزلاں نظماں لوگ چُراکو سِکّے جمارئیں لیو خطبہ

1930 کے بعد ریاست حیدرآباد کے افق پر فرقہ وارانہ کشاکش کے منحوس بادل منڈلانے لگے تھے۔علی صائب میاں کی بصیرت اور ان کا فہم یہ محسوس کر چکا تھا کہ یہ تناؤ اور تصادم دونوں فرقوں کے لئے خطرناک ثابت ہوگا۔دشمن دونوں فرقوں میں پھوٹ ڈال کر اپنا مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے۔اس ذہنیت کے خلاف وہ لوگوں کو متنبہ کرتے ہیں۔

رکھواب ہاتھ تک مانجا آپس کی چھوڑ دیو ان بن
تماری سادی میں سے کھینچنے کو دیکھ رئیں دشمن

پھر وہ اتحاد اور یکجہتی کا درس دیتے ہیں۔

کریلا نیم چڑھ کو رہے تو کیا اس کو مٹھا کر
بکھر گئیں چوطرف کاڑیاں ملاکو اک گٹّھا کر

دکنی طنز و مزاح کا مقصد وقتی طور پر ہنسی ٹھٹھے کا موقع فراہم کرنا نہیں بلکہ وہ تنقید حیات کا فریضہ انجام دیتا ہے۔علی صائب میاں کے ہاں بھی طنز و مزاح کا مقصد وقتی طور پر خوشی و مسرت سے ہمکنار کرنا نہیں ہے بلکہ وہ قاری کو دعوت فکر دیتے ہیں۔طنز کے ذریعہ وہ معاشرے کی منافقانہ روش پر پڑے ہوئے پردے کو چاک کرتے ہیں۔علی صائب میاں کے کلام میں طنز و مزاح کے حسین امتزاج کے بارے میں یونس فہمی لکھتے ہیں۔

''طنز و مزاح کا باہمی میل کسی نثر و نظم کو چار چاند لگا دیتا ہے اور یہ چمک نظم کے رخسار پر غازہ کا کام کرتی ہے۔ یہی خصوصیت علی صائبؔ کی شاعری کو نذیر دہقانیؔ کے ہم پلہ کر دیتی ہے۔ علی صائب نذیر دہقانی سے بھی اونچی پروازیں کرنے لگتے ہیں۔'' (15)

علی صائب میاں نے کسی ایک موضوع یا کسی ایک صنف میں طنز و مزاح کو نہیں برتا بلکہ موضوع سخن اور صنف سخن میں اس تکنیک کو استعمال کیا۔ غزل میں عموماً عشقیہ مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔ اور عشقیہ مضامین کے ساتھ طنز و مزاح کا امتزاج برقرار رکھنا دشوار کام ہے۔ لیکن علی صائب نے غزل میں بھی طنز و مزاح کو بڑی کامیابی اور توازن کے ساتھ برتا ہے۔ غزل کے چند شعر دیکھئے۔

خط کو میرے سب کے اننگے پھاڑ ڈالے کائیکو
کون نئیں سو وقت پرزے سنبھالے کائیکو

نام میرا سن کو کیوں انکھیاں میں پانی آ گیا
کچرے کے بھانے آنسو جھاڑ ڈالے کائیکو

کاں سندوری میں پڑیا تھا پی کو زاہد رات بھر
انگ بھر کو دھول کیوں ہور سر پو جالے کائیکو

سر میں چکّر انگ دکھتائے پاؤں میں مہندی لگی
دل میں نئیں آنے کا ہے وہ سب مسالے کائیکو

علی صائب میاں اپنے ''چوے'' میں تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ چوے بھی طنز و مزاح سے خالی نہیں ہیں۔ چار مصرعوں میں انہوں نے بلند معانی اور وسیع مفاہیم کو خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ایک چوا ملاحظہ ہو۔

آدمی چیر کو طوفان نکل جاتا ہے
لاکھ ٹھوکر لگو انسان سنبھل جاتا ہے
پن علی صائب یہ کیا بات ہے پیسے کے لئے
اچھے اچھوں کا بھی ایمان پھسل جاتا ہے

اس قطعہ میں فطرت انسانی کا بے لاگ جائزہ لیا گیا ہے۔انسان عموماً مادی فوائد اور ظاہری لذتوں کو ترجیح دیتا ہے اور اس کے حصول کے لئے اپنا دین وایمان قربان کر دیتا ہے۔اسی فطرت کو ہدف بنا کر جھنجوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

علی صائب میاں نے طنز ومزاح کو ذاتی چشمک کے لئے کبھی استعمال نہیں کیا اور نہ ہی کسی فرد کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا بلکہ انھوں نے ہمیشہ معاشرتی خرابیوں اور سماجی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کی طرف اشارہ کر کے اصلاح کی جانب مائل کرنے کی کوشش کی ہے۔شہریار کاؤس جی علی صائب میاں کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''گو کلام میں مزاح ہے اور سننے والے ضرور ہنس پڑتے ہیں لیکن اس کلام کو بین السطور میں پڑھا جائے تو انسانوں کی حماقتیں اور حیات کی حقیقتیں نظر آئیں گی۔''(16)

ڈاکٹر نسیم الدین فریس علی صائب میاں کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> ''علی صائب میاں کی شاعری میں دکن کے باشندوں کی غربت و افلاس اور ان کے دکھ درد کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ان کی نظم ''لیو خطبہ'' سماج کی کمزوریوں اور ناہمواریوں کا جاندار خاکہ پیش کرتی ہے۔اس میں کسانوں اور مزدوروں کے استحصال اور سرکاری عہدیداروں کی بدعنوانیوں اور رشوت خوری کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔''(17)

علی صائب میاں ایک سنجیدہ مبصر' حساس شاعر' عمیق شاہد' لفظیات کے برمحل استعمال پر حاوی' دکنی کے لسانی شعور کے حامل وسیع انسانی تجربات کے امین نظر آتے ہیں۔ان کے کلام میں زندگی کی حقیقتیں' تفکر کا عنصر' ادبی شگفتگی جیسے عناصر موجود ہیں۔

علی صائب میاں کے کلام سے صحیح لطف اٹھانے کے لئے دکنی زبان کو اس کے لب ولہجہ کی مخصوص لفظیات کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ورنہ اس کی لفظیات سے ناواقفیت اس کے لہجے اور مزاج کا درک نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تفہیم میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ دکنی شعراء کا حلقہ تعارف دکن کے علاقے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

---000---

حوالہ جات

(1) سید مصطفیٰ کمال　"حرف تعارف"　مشمولہ "گھوکرو کے کانٹے"　ص 7 سنہ اشاعت 1968ء

(2) محمد یحییٰ صدیقی　"جامعہ عثمانیہ کے چند اداکار"　مشمولہ "پلاٹینم جوبلی نمبر "مجلّہ عثمانیہ" ص 160

(3) مرزا ظفر الحسن　"ذکر یار چلے"　ص 404 سنہ اشاعت 1979ء

(4) مرزا ظفر الحسن　"ذکر یار چلے"　ص 238

(5) سید مظفر الدین سعید　"شخصی انٹرویو"　بتاریخ 15 اپریل 2004ء

(6) سید مصطفیٰ کمال　"حرف تعارف"　مشمولہ "گھوکرو کے کانٹے" ص 8

(7) مرزا ظفر الحسن　"ذکر یار چلے"　ص 238

(8) سید مصطفیٰ کمال　"حرف تعارف"　مشمولہ "گھوکرو کے کانٹے" ص 8

(9) عزیز ابرار "شگوفہ کی ادبی خدمات"　ص 47

(10) ڈاکٹر مجیب الاسلام　دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی علمی وادبی خدمات　ص 11

(11) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال "حرف تعارف"　مشمولہ "گھوکرو کے کانٹے"　ص 9

(12) شائستہ رفعت　"دکنی شاعری کے فروغ میں علی صائب میاں کا حصہ"　ص 137 مقالہ برائے ایم فل غیر مطبوعہ مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو، سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد 1998

(13) رضا نقوی واہی　"پٹنہ سے حیدرآباد تک"　ماہنامہ 'پونم' 1968 خصوصی اشاعت "طنز ومزاح نمبر"

(14) سید داؤد اشرف　"پچاس سال قبل حیدرآباد میں اسٹوڈنٹ کنونش کا پہلا سیشن" مشمولہ "نقوش تاباں" ص 102

(15) یونس فہمی　"اردو ادب میں طنز ومزاح"　ص 243

(16) شہریار کاؤس جی　"علی صائب میاں" مطبوعہ ماہنامہ "پونم" خصوصی اشاعت 'طنز ومزاح نمبر 1968

(17) ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس "طنز ومزاح کے نالگو برادرس" مطبوعہ "قومی زبان" اکٹوبر 2006ء ص 68

مرزا شکور بیگ

مرزا شکور بیگ حیدرآباد کے محلّہ فتح دروازہ میں 15 ستمبر 1907ء کو مرزا غفور بیگ اور فیاضی بیگم کے گھر پیدا ہوئے۔شکور بیگ کے آباواجداد مغل تھے،زمانے قدیم میں دلی سے حیدرآباد آئے اور یہیں بس گئے۔ان کے دادا مرزا مغل بیگ آصف جاہی فوج میں اعلی عہدے پر فائز رہے۔شکور بیگ کے والد بھی فوج میں تحصیلدار کے عہدے پر خدمات انجام دیں۔انہیں شکار کا بے حد شوق تھا۔شکار کے دوران ہی گولی لگنے سے ان کا انتقال ہوا۔شکور بیگ کی ایک بہن بھی تھیں جو شادی کے چند ہی دنوں بعد پلیگ سے نارائین کھیڑ میں انتقال کر گئیں۔شکور بیگ کی والدہ کا جب انتقال ہوا تو ان کی عمر صرف چار سال تھی۔

مرزا شکور بیگ بچپن سے ہی کھیل کود کے شوقین اور شریر واقع ہوئے تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم دھرما ونت اسکول حیدرآباد میں ہوئی۔ساتویں کا امتحان شاہ گنج مڈل اسکول اور میٹرک سٹی ہائی اسکول حیدرآباد سے کامیاب کیا۔1930 میں گریجویشن کی تکمیل کی اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ایف اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔عثمانیہ یونیورسٹی سے ہی 1935ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی اور وکالت کرنے ورنگل چلے گئے۔

مرزا شکور بیگ نے دو شادیاں کیں۔پہلی بیوی کا نام امۃ البتول عرف معراج بیگم تھا ان کے بطن سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں (1) مظفر بیگ (2) منصور بیگ (3) مشرف (4) اشرف۔مرزا شکور بیگ نے اپنی پہلی بیوی کے انتقال کرنے کے چند دنوں بعد دوسری شادی کی ان کی دوسری بیوی کا نام قمر سلطانہ ہے۔ان کے بطن سے دو لڑکے مرزا سرور بیگ اور مرزا فیاض بیگ ہیں۔

ایل ایل بی کی تکمیل کے بعد مرزا شکور بیگ نے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا تہیہ کیا تھا لیکن ان کا سارا وقت دوست احباب کی محفلوں،گپ شپ اور شعروشاعری میں گذرتا تھا۔ان کے احباب نے سمجھایا کہ اس طرح زندگی کرنا ہے تو وکالت کا خیال ترک کر دیں کیونکہ ان مشغلوں کے ساتھ وکالت نہیں چلے گی۔ان نصیحتوں کا یہ اثر ہوا کہ مرزا ورنگل چلے گئے اور وہاں کے مشہور وکیل سید فضل سے ملاقات کی۔انہوں نے مرزا کو اپنا جونیر

بنانا بخوشی منظور کرلیا۔ مرزا نے ورنگل میں تقریباً 30 سال گذارے جس میں رکن اسمبلی کی رکنیت کے دس سال بھی شامل ہیں۔ [حلقہ حسن پرتی اور حلقہ ورنگل] یہ رکنیت 1952ء سے 1962ء تک رہی۔ ریاست حیدرآباد کی لسانی تقسیم بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ حالانکہ مرزا شکور بیگ کی طبیعت سیاست سے مناسبت نہیں رکھتی تھی لیکن حالات انہیں اس میدان میں لے آئے۔ اب وکالت اور سیاست میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ 1960 میں انہوں نے وکالت مکمل طور پر چھوڑ دی اور 1962ء کے بعد سیاست کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ مرزا شکور بیگ خود کہتے ہیں:

> ''حالات نے جب میری مرضی کے خلاف مجھے سیاست میں ڈھکیل دیا تو اس وقت میری وکالت خوب چل رہی تھی مگر سیاست اور وکالت ان دو گھوڑوں کی سواری زیادہ دن نہ چلی سکی۔ میرے اصولوں کو سیاست راس نہ آئی اور وکالت عدم توجہی کا شکار ہوگئی۔ 1960 میں میں نے وکالت چھوڑی اور 1962 میں سیاست نے مجھے چھوڑ دیا۔ زیادہ صحیح یہ ہیکہ جو لوگ سیاست میں مجھے ڈھکیل کر لے گئے تھے مجھ سے مایوس ہو کر انہوں نے ہی مجھے سیاست سے باہر ڈھکیل دیا''۔(1)

مرزا شکور بیگ کے دو مزاحیہ مجموعے ''ترانے'' اور ''سدا بہار'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی یہ تصانیف طنز ومزاح اور ظرافت سے بھرپور ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات سے سماج میں پھیلی ناہمواریوں اور خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ ان کی شاعری میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد رونما ہونے والے واقعات کی حقیقی عکاسی نظر آتی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

> ''پولیس ایکشن کے بہت پہلے پولیس ایکشن کے عین پہلے اور پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد حیدرآباد میں حصول آزادی سے پہلے اور حصول آزادی کے بعد جو کچھ ہوا میں نے طنز ومزاح کی عینک سے دیکھا وہی اوروں کو دکھایا۔''(2)

مرزا ظفر الحسن، مرزا شکور بیگ کو دکن کا سرفہرست شاعر قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''مرزا شکور بیگ جامعہ عثمانیہ ہی میں نہیں دکن میں صف اول کے شاعر تھے اور اس زمانے کے مزاحیہ شاعروں میں علی صائب (غلام علی) اعجاز حسین کھٹّا اور نذیر دہقانی وغیرہ میں ممتاز ترین تھے۔ ساتھیوں نے انھیں بجا طور پر دکن کے اکبرالہ آبادی کہا تھا۔'' (3)

شاہد صدیقی کی رائے بھی ظفرالحسن سے مختلف نہیں ہے وہ لکھتے ہیں۔

''حضرت اکبرالہ آبادی کے بعد ایک طویل مدت تک یہ تصور کارفرما رہا کہ طنز ومزاح کی شاعری ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اس کائنات میں کسی ایسے جوہر کا ختم ہو جانا آسان نہیں، جس کی ضرورت باقی ہو۔ چنانچہ مایوسی بن کے امید کی ایک کرن چمکی اور ظریف لکھنوی شاعری کے افق پر نمودار ہوئے۔ اکبرالہ آبادی کی طرح ان کا بھی ایک خاص طرز فکر تھا اور بیان کا ایک خاص انداز تھا۔ انھوں نے بڑی حد تک اس جگہ کو پُر کرنے کی کوشش کی جو اکبر کی موت سے خالی ہوئی تھی۔ لیکن قضا وقدر میں کسی کا اجارہ نہیں، چنانچہ ایک دن وہ خود بھی اپنی جگہ خالی کر کے چلے گئے۔ اور اس منزل پر پہنچ کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی جمہوریت آ گئی اور کئی ایسے شاعروں کی آوازیں سننے میں آئیں جو میدان کے شہہ سوار کہلائے جا سکتے ہیں۔ اس میں پاکستان کے سید محمد جعفر اور ظریف جبلپوری کے ساتھ ہندوستان کے دلاور فگار اور مرزا شکور بیگ شامل ہیں۔'' (4)

مرزا شکور بیگ نے زمانہ طالب علمی میں ہی شاعری کا آغاز کیا۔ ہاسٹل میں قیام کے دوران انہیں شاعری کا چسکہ لگا شرارت ان کی مزاج کا خاصہ تھا اسی شریر طبیعت نے ظریفانہ شاعری کی طرف راغب کیا۔ ہاسٹل کے واقعات کو مزاحیہ انداز میں نظم کرنے لگے۔ ایک مرتبہ مرزا شکور بیگ کے دوست احباب سیر وتفریح کے لئے باہر گئے تو ان کی نظر ایک گدھے پر پڑی۔ ایک کو یہ ترکیب سوجھی کہ اسے بنگلہ پر لیجانا چاہئے۔ سب متفق ہوئے اور گدھے کو

ہاسٹل کے مودب صاحب کے گھر لے گئے اور آن کی آن میں اسے اٹھا کر چھت پر پہنچا دیا۔اس کے بعد گدھے نے جب اپنا راگ الاپنا شروع کیا تو مودب مقیم صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو یہ سمجھا کہ خواب ہے لیکن پھر جب سنبھل کر اٹھے اور باہر گدھے کو پایا تو ملازمین کو آواز دیکر اسے نیچے اتارنے کو کہا۔ جب ملازمین اسے نیچے اتارنے لگے تو وہ سیڑھیوں تک آتا اور پھر بدک جاتا۔ بہر حال بڑی مشکل سے اسے نیچے اتارنے میں کامیاب ہوئے۔ دوسرے دن یہ واقعہ سب کی زبان پر تھا اور ہر کوئی ہنسنے لگا اور جب یہ خبر پرنسپل صاحب کے پاس پہنچی تو وہ غصے اور ہمدردی کے بجائے ہنسنے لگے اور فرمایا کہ یہ کیسے ہوا۔اس کے بعد ہر کوئی تفصیل معلوم کرنا چاہتا تھا۔مرزا کی ظریف طبیعت مچلی اور انہوں نے اس واقعہ کو نظم کردیا اور اپنی شاعری کی ابتداء کچھ اس طرح کی:

عجب نا گفتنی گو واقعہ ہے
مگر کیا کیجئے کہنا پڑا ہے

میں اک شب چین سے جب سو رہا تھا
تو خراٹوں سے ایک محشر بپا تھا

میں گھوڑے بیچ کر سوتا ہوں اکثر
عیاں ہے یہ حقیقت ہر کسی پر

مگر اس شب کا کچھ پوچھو نہ احوال
عجب منحوس تھا وہ دن مہہ وسال

سنی جب آواز جنور کی پیہم
یکایک اٹھ گیا گھبرا کے اس دم

کبھی دل میں خیالِ بھوت آتا
تو سر سے پاؤں تک میں کانپ جاتا

مجھے آخر کو جونہیں ہوش آیا
عجب قسمت نے میری گل کھلایا

مری جنت میں ایک جنور کھڑا تھا
خوشی سے باہر آپے سے ہوا تھا

اڑاتا شوق میں پیہم تھا تانیں
مسرت میں تھیں رقصاں اس کی ٹانگیں

صبح کو ہر طرف چرچا تھا اس کا
مری تضحیک کا اک مشغلہ تھا

ہنسی ہے مضحکہ ہے دل لگی ہے
مری تو جان پر اب آبنی ہے (5)

ہر اقامت خانہ (ہاسٹل) کی طرح مسرت منزل (جہاں مرزا شکور بیگ مقیم تھے) میں بھی دونوں وقت کھانے کے لئے دال ملا کرتی تھی۔ بعض طلباء روز روز کی دال سے تنگ آ گئے تھے اور چاہتے تھے کہ ان ہی پیسوں میں دال کے بجائے کوئی اور چیز پکائی جائے۔ کچھ طلباء نے چاول کی کڑی کی فرمائش کی تو دوسری طرف سے اس کی مخالفت ہونے لگی۔ دو گروپ بن گئے، کینویسنگ کا بازار گرم ہوگیا اسی وقت شکور بیگ نے دال کی تائید میں ایک مسدس لکھا۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

کالج میں ہوں یا بیٹھے ہوں آرام سے گھر میں
یا جاتے ہوئے ہوں کسی تفریحی سفر میں

بریانی اڑاتے ہوں یا ماہانہ ڈنر میں
ہے دال کا ہونٹوں پہ مزہ شکل نظر میں

ہم اور کسی شئے کا جارہ نہیں کرتے
پر دال کی فرقت کو گوارا نہیں کرتے (6)

اس بند میں مرزا کی ظرافت، زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی دیکھی جا سکتی ہے مرزا کی شہرت اب بورڈنگ کی چہار دیواری سے نکل کر رفتہ رفتہ جامعہ میں پھیلنے لگی بورڈنگ میں جو مباحثے ہوا کرتے اس میں بھی مرزا شکور بیگ حصہ لیتے اور مزاحیہ تقریر کرتے تھے۔ایک مرتبہ مرزا کو ''دنیا کی بہترین صنعت کونسی ہے'' موضوع پر تقریر کرنی تھی۔مرزا نے اپنی تقریر کا آغاز ''بنڈی'' کو موضوع بنا کر کیا۔اس کی ساخت اور چال کی ایسی تفصیل پر مزاح انداز میں بیان کی کہ سارا ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔انہوں نے اپنی مزاحیہ تقریر میں اپنے چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری کر رکھی تھی جیسے دنیا کی بہترین صنعت ''بنڈی'' ہی ہو۔

دھیرے دھیرے مرزا شکور بیگ کی شاعری بورڈنگ کی چہار دیواری سے نکل کر بڑے بڑے شاعروں میں رنگ دکھانے لگی۔اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ظرافت میں بھی نکھار آنے لگا ملاحظہ کیجئے چند نمونے۔

دیکھئے ترقی نے کیسے گل کھلائے ہیں
چور اپنی چوری کی جانچ کرنے آئے ہیں

قتل کرنے والے ہی قبر پر چڑھانے کو
دوسروں کے باغوں سے پھول توڑ لائے ہیں(7)

مرزا شکور بیگ ایمانداری کے تعلق سے کہتے ہیں۔

پیلو پاپڑ تو پیٹ پلتا ہے
لندے فندے سے کام چلتا ہے

ایسے دھندے کی یوں ضرورت ہے
ٹیڑھی انگلی سے گھی نکلتا ہے (8)

ہم مفلسوں کے غم میں مرمر کے جی رہے ہیں
نوک زباں سے دل کے زخموں کو سی رہے ہیں

صحت نے ساتھ چھوڑا پسینا مگر نہ چھوٹا
بستر پہ لیٹے لیٹے چمچے سے مچا رہے ہیں (9)

مرزا شکور بیگ موجودہ دور کے لڑکوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

تھے تو ناشاد دکھاوے کے لئے شاد بنے
رہے محکوم مگر نام کے آزاد بنے

مرے لڑکو حقارت سے نہ دیکھو صاحب
کیا عجب ہے کہ یہی آپ کا داماد بنے(10)

موجودہ دور کی سیاست اور سیاسی قائدین کو بھی وہ اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہیں نہ آخرت کی فکر ہے اور نہ ہی قوم کی فلاح کی بلکہ انہیں فکر ہے تو صرف اپنی جیب بھرنے کی لکھتے ہیں۔

اللہ کا خیال نہ بندے کی فکر ہے
ہر مبتلائے کو دھندے کی فکر ہے

حاضر ہے جان قوم کے لیڈر کے واسطے
لیڈر کو قوم کی نہیں چندے کی فکر ہے(11)

مرزا نے اپنی شاعری میں محاوروں کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔

محاورہ

دیکھے جس کو وہ بدحال نظر آتا ہے
ہر طرف موت کا اک جال نظر آتا ہے — موت کا جال

وہ گیا وقت کے کالے سے ڈرا کرتے تھے　　گیا وقت
اب انہیں دال میں کچھ لال نظر آتا ہے(12)　　دال میں کالا نظر آنا

محاورہ

پیلو پاپڑ تو پیٹ پلتا ہے　　پاپڑ بیلنا
لندے فندے سے کام چلتا ہے
ایسے دھندے کی یوں ضرورت ہے
ٹیڑھی انگلی سے گھی نکلتا ہے(13)　　ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا

مرزا شکور بیگ نے اپنے اس مجموعے کو اکتوبر 1985 میں حیدرآباد سے شائع کیا۔ مرزا شکور بیگ کا کہنا ہے کہ ان کی شاعری خود روشاعری ہے اس میں بعض اشعار میں ظرافت موجود ہے۔ ایک شعر دیکھئے۔

صحت نے ساتھ چھوڑا پینا مگر نہ چھوٹا
بستر پہ لیٹے لیٹے چمچے سے پی رہے ہیں

مرزا کے کلام میں سادگی اور انکساری کے ساتھ ساتھ طنز ومزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان میں ظرافت کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہ کہیں طنز سے کہیں ظرافت سے قاری کے جذبات کو جگاتے ہیں اور اپنے کلام سے قاری کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مری فطرت نہیں آشنائے درد و غم لیکن
جہاں دل چیخ اٹھتے ہیں وہاں بھی مسکراتا ہوں

اس طرح کے اشعار سے سماج میں پھیلی برائیوں پر بڑی شدت سے اپنے درد وغم کا اظہار کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے فن ظرافت سے مرزا نے جہیز کی لعنت اور سماج کی برائیوں کی طرف بھی نشاندہی کی ہے۔

نہ اعلان حکمت نہ اظہار فن

ظرافت کے پردہ میں دل کی جلن

موٹر ملے، مکان ملے، سیم و زر ملے
سب کچھ ملے خسر کی طرف سے مگر ملے (14)

مرزا شکور بیگ نے حالات حاضرہ کا کوئی گہرائی سے مشاہدہ کیا اور حالات کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے اشعار میں عشقیہ مضامین بھی موجود ہیں۔

ہم مر گئے تو آپ پہ آخر مرے گا کون
کہتے ہیں اس لئے ہمیں کوسا نہ کیجئے

قائم ہے تانک جھانک بھی پردہ کے ساتھ
اس سے یہی ہے ٹھیک کہ پردہ نہ کیجئے(15)

مرزا شکور بیگ نے مہنگائی اور اشیائے ضروریہ کی قلت اور محدود تنخواہ میں ضرورتوں کے پورا نہ ہونے کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے کھینچا ہے:

ہیں گودام غلے کے، غلّہ نہیں ہے
دکانیں ہیں کپڑے کی، کپڑا نہیں ہے

وہ سر سر نہیں، جس میں سودا نہیں ہے
وہ دورہ ہی کیا جس میں بھتہ نہیں ہے

کوئی اور صورت نکالیں نہ کیسے
کہ تنخواہ سے پیٹ بھرتا نہیں ہے (16)

مرزا شکور بیگ نے اپنے زمانے کے نوجوانوں کی بے راہ روی کا شکوہ بھی کیا ہے جس کی وجہ سے گھر برباد ہورہے ہیں۔ یہ باتیں اس زمانے کے والدین اور سرپرستوں کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے اس طرح انہوں نے

آج کے آزاد معاشرے کے ایک تاریک پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔

احکام شریعت سے ہے آزاد پسر آج
ہے اپنی حماقت پہ پشیمان پدر آج

کیا خوب مئے علم ہے چکراتا ہے سر آج
کچھ پاس ادب ہے نہ بزرگوں کا ہے ڈر آج

پردے نے خود اٹھ اٹھ کے بڑھادی یہ رونق
گلیوں میں چکا چوند ہے تاریک ہیں گھر آج (17)

مرزا شکور بیگ نے انسانی نفسیات کے چند کمزور پہلوں کی طرف بھی نشاندہی کی ہے اکثر لوگ باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو وہی پیچھے رہ جاتے ہیں۔شہر حیدرآباد کے آئے دن دنگے فساد کے تعلق سے بھی اپنے جذبات واحساسات کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔

یوں نکلے ہیں بگڑی ہوئی تقدیر بنانے　　　ہر شہر میں ہے فوج تو ہر بستی میں تھانے
رگ ان کی دلیری کی پھڑک جاتی ہے جس دم　　　آتے ہیں نہتوں کا ذرا خون بہانے
باہر تو بڑی شان کے کہتے ہیں برادر　　　گھر میں جو کوئی دیکھے تو کھاتے ہیں پُھٹانے
اکثر جو کرتے ہیں پرچار عمل کا　　　جب وقت عمل آئے کردیں گے بہانے (18)

مرزا کے بعض اشعار میں خاص حیدرآبادی انداز پایا جاتا ہے اور اس زبان کے استعمال میں ان کی والہانہ محبت نظر آتی ہے۔

سر چھپائیں کہاں نہیں معلوم　　　آشیاں واشیاں نہیں معلوم
ہر پرائی زبان کے ماہر ہیں　　　فقط اپنی زبان نہیں معلوم
ایک مجنوں تھا ایک تھی لیلیٰ　　　مابقی داستاں نہیں معلوم (19)

مرزا نئے زمانے کے نت نئے فیشن اور ماڈرن خواتین کے لباس وضع قطع چال ڈھال کی بھی مذمت کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہتے ہیں:

قلت پارچہ کا اب کتنا حسین اثر ہوا
ان کا لباس مختصر اور بھی مختصر ہوا
گھلتے رہے فراق میں عاشق زار زار زار
روز بہ بروز وصل صنم خوب سے خوب تر ہوا(20)

کچھ لوگ اپنی تعلیمی لیاقت کے مظاہرے کے لئے اپنی گفتگو میں غیر ضروری طور پر انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ مرزا نے ایسے لوگوں کا بڑے ہی ظریفانہ انداز میں مضحکہ اڑایا ہے اور ساتھ ہی ملازم پیشہ افراد کو نصیحت بھی کرتے ہیں:

کہا مجنوں کے گہرے دوست نے لیلیٰ کے فادر سے	نسب کو چھوڑو، عہدہ دیکھو، شادی کردو ڈالر سے
پلیز اور تھینک یو سے کام وہ لیتے ہیں ڈر سے	زبان میٹھی ہے اور دل ہے زیادہ سخت پتھر سے
ترقی اس کو کہتے ہیں سگار اپنا جلانے کو	طلب کرتا ہے اب شاگرد ماچس اپنے ٹیچر سے
غلامی کرکے ساری عمر یہ سیکھا ہے دفتر سے	خدا بگڑے بگاڑا اچھا نہیں ہے اپنے افسر سے(21)

مرزا ظفر الحسن، مرزا شکور بیگ کے فن اور ان کے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''مرزا شکور بیگ کی شاعری میں صرف مزاح کی مٹھاس اور طنز کی ترشی ہی نہیں بلکہ کوئی پیام بھی ہے۔ شکور کا شعر دوست کو جھنجھوڑتا ہے اور دشمن کو بھمبوڑتا ہے۔ سیاست، معیشت، معاشرت سب ہی پر شاعر نے وار کیا۔ نہ شکور نے کسی سے اکتساب کیا اور نہ کوئی ان کی تقلید کرسکا۔''(22)

مرزا شکور بیگ باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے کلام میں اپنے عہد کی عکاسی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شکور بیگ کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ عبدالغفور لکھتے ہیں۔

''طنزیہ چوٹیں چلانے میں ماہر اور زندہ دلی کی لہریں بکھیرتے ہیں۔'' (23)

مرزا شکور بیگ کی تخلیقات اپنے عہد کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ آخری زمانے میں وہ مزاحیہ شاعری ذرا کم کرنے لگے تھے۔ اور نعتیہ شاعری کی طرف راغب ہوگئے تھے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شکور بیگ کی شاعری طنز ومزاح کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔

مرزا شکور بیگ نے نظم اور نثر دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ نثر میں انھوں نے بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انھیں مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ اس میں مزاحیہ مضامین بھی شامل ہیں۔ ان کے ہر مضمون سے اخلاقی درس حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین شگفتگی اور کھلے ذہن کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔۔ ان کی دو نثری تصانیف 1۔منتخب مضامین 2۔مزاحیہ تقاریر و مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں۔

----OOO----

حوالہ جات

(1) مرزا شکور بیگ　''منتخب مضامین''　صفحہ 6-7　مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد 1986

(2) مرزا شکور بیگ　''ترانے'' صفحہ 3　مطبوعہ: اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد　1985

(3) مرزا ظفر الحسن　ذکر یار چلے　صفحہ 232

(4) شاہد صدیقی　مضمون مشمولہ ''ترانے''　صفحہ 9

(5) مرزا شکور بیگ　''بیتے دنوں کی یاد'' مشمولہ شگوفہ صفحہ 40 ستمبر 2000ء

(6) مرزا شکور بیگ　''منتخب مضامین''　صفحہ 13

(7) مرزا شکور بیگ　''ہماری مزاحیہ شاعری'' مضمون مشمولہ ''مزاحیہ تقاریر و مضامین'' صفحہ 130
مطبوعہ: اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد　1989

(8) مرزا شکور بیگ　''ہماری مزاحیہ شاعری'' مضمون مشمولہ ''مزاحیہ تقاریر و مضامین''　صفحہ 131

(9) مرزا شکور بیگ　''ہماری مزاحیہ شاعری'' مضمون مشمولہ ''مزاحیہ تقاریر و مضامین''　صفحہ 131

(10) مرزا شکور بیگ　''ترانے'' صفحہ 19

(11) مرزا شکور بیگ　''ترانے'' صفحہ 18

(12) مرزا شکور بیگ　''ترانے'' صفحہ 45

(13) مرزا شکور بیگ　''ہماری مزاحیہ شاعری''　مضمون مشمولہ مزاحیہ تقاریر و مضامین، صفحہ 130

(14) مرزا شکور بیگ　''سدابہار''　صفحہ 9-10　مطبوعہ: اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد　1989

(15) مرزا شکور بیگ　''سدابہار''　صفحہ 13

(16) مرزا شکور بیگ　''سدابہار''　صفحہ 29

(17) مرزا شکور بیگ　''سدابہار''　صفحہ 32

(18) مرزا شکور بیگ　''سدابہار''　صفحہ 35

(19) مرزا شکور بیگ　''سدابہار''　صفحہ 38

(20) مرزا شکور بیگ　''سدابہار''　صفحہ 40

(21) مرزا شکور بیگ　''سدابہار''　صفحہ 44

(22) مرزا ظفر الحسن　ذکر یار چلے　صفحہ 232

(23) خواجہ عبدالغفور　''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' ص 227 سنہ 1983ء

نذیر دہقانی

نذیر احمد نام، تخلص دہقانی اور قلمی نام نذیر دہقانی تھا۔ وہ 1908ء میں نلگنڈہ کے ایک ضلع جنگاؤں میں شیخ احمد صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بھونگیر مڈل اسکول میں ہوئی۔ آباو اجداد زرعی پیشے سے وابستہ تھے۔ اسی کو انھوں نے بھی اختیار کیا۔ لیکن جب وہ حیدرآباد منتقل ہوئے تو حیدرآباد دکن میں شعبہ نشر و اشاعت میں بحیثیت پروپگنڈہ افسر برسرکار رہے۔ سقوطِ حیدرآباد کے بعد نذیر دہقانی نے 1949 میں پاکستان ہجرت اختیار کی۔ اور 1984 میں پاکستان کے شہر لاہور میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

رحیم صائب میاں نے انیسویں صدی کے اوائل میں دیہاتی زبان کو اپنا کر اسی میں شاعری کرنے کی بنا ڈالی تھی۔ ان کے تتبع میں دیہاتی اور دہقانی زبان میں شاعری کرنا ایک جراءت مندانہ اقدام تھا۔ نذیر دہقانی نے رحیم صائب میاں کو سننے کے بعد ہی شعر کہنا شروع کیا۔ چنانچہ ایک انٹرویو میں انھوں نے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ رحیم صائب میاں سے متاثر ہو کر دہقانی زبان میں شاعری شروع کی تھی۔ (1)

نذیر دہقانی ایک عوامی شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی پیدائش گاؤں میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم بھی گاؤں میں ہی ہوئی اور انھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گاؤں ہی میں گذارا تھا۔ شاید اسی لیے انھوں نے ایک ایسی زبان کو اپنے جذبات کا وسیلہ اظہار بنایا جو دیہاتوں، قصبوں، میلوں اور ٹھیلوں میں بولی جاتی ہے۔ عوامی زبان ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

انھوں نے اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو بہت ہی ظریفانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے دہقانی زبان کو شاید اس لئے اختیار کیا چونکہ دیہات کا ایک بڑا طبقہ اُس زمانے میں اسی زبان کو بولتا اور سمجھتا تھا۔

نذیر دہقانی اپنی زندگی، اپنے ماحول پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میں دہقانی زبان میں صرف شعر ہی نہیں کہتا بلکہ میری پوری

زندگی دہقانی پیداوار ہے۔میرے تجربات زندگی بھی کسی کے لئے ظرافت کا سامان مہیا کرتے ہیں، تو سوچنے والوں کو ایک لمحہ فکر اور شاید کچھ آنسو، دہقانی زبان میں میں نے بڑی وسعت و بے تکلفی دیکھی اور اپنی فکر کے لئے واجب کرلیا۔معانی کو اختصار کے ساتھ جس طرح میری خاص زبان ادا کرسکتی ہے اس کو ہر پڑھنے والا آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔"(2)

سید بشیر احمد نذیر دہقانی کو دہقانی زبان کے اولین شعرا میں شمار کرتے ہیں۔ان کی شاعری کے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"نذیر دہقانی کو یہ بھی امتیاز حاصل ہے کہ ان کا دکنی اور دہقانی زبان کے اولین شعرا میں شمار ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی مزاحیہ اور طنزیہ شاعری سے سماج کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے گاؤں اور شہر کے رسم ورواج اور سماجی پہلوؤں کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ان کا کلام حقیقتوں کا اظہار کرتا ہے جو اپنے دور کے مستند دستاویز ہے۔"(3)

نذیر دہقانی کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم ان کی شاعری کو بآسانی تین ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں۔پہلا دوران کی شاعری کا ابتدائی دور ہے جہاں ان کے کلام میں دیہاتی ماحول، طرز معاشرت، دیہات کے معصوم اور سیدھے سادے لوگ اور ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔جیسے لمباڑن، موٹ کا گیت، دیہاتن، جیسی نظمیں اس کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

دوسرا دوران کی شہری زندگی کا ہے جب وہ شہر حیدرآباد منتقل ہوتے ہیں۔اور اسی دور میں وہ مجلس اتحاد المسلمین سے وابستہ ہوجاتے ہیں۔بہادر یار جنگ اور محمد علی جناح اور علامہ اقبال سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔یہاں انھوں نے دیہاتی موضوعات کے بجائے شہری زندگی، شہر کی نمود ونمائش، معاشرے کی اونچ نیچ، بے جا روایت پرستی، بے عملی، بے حسی اور تکلف جیسے موضوعات کو اپنے نوک قلم سے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ایسی نظموں میں روتی صورت، کب تلک، تھوتماری کی، غپ چپ، خالہ اماں اور "بدگمان بیوی کے خیالات" قابل ذکر ہیں۔حیدرآباد میں

نذیر دہقانی کی ادبی سرگرمیوں کا اندازہ 1943ء میں منعقدہ ''بزم اقبال'' کے سالانہ جلسہ کی روداد سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔

''ہفتہ اقبال کا یہ اجلاس انگریزی کے قادر الکلام ادیب' پروفیسر نکلسن کی وفات سے ہم نے ایک اچھا ادیب کھودیا جو مشرقی علوم کا عالم تھا......اس قرارداد کے بعد فیروز جی فیروز شاہ تاراپوروالا نے علامہ اقبال کی شاعری پر اپنا مقالہ پڑھا اس کے بعد دکنی زبان کے شاعر نذیر دہقانی نے اقبال پر نظم سنائی۔'' (4)

ان کی شاعری کا تیسرا اور آخری دور پاکستان ہجرت کے بعد کا ہے۔ تقسیم وطن کے بعد جب وہ پاکستان گئے تب انھوں نے سلیس اردو میں شاعری کرنی شروع کی۔ یہاں انھوں نے دکنی میں مزاحیہ شاعری بھی کی اور عام اردو میں سنجیدہ کلام بھی کہا۔ لیکن جتنا کلام انھوں نے پاکستان میں تخلیق کیا ان تمام کا موضوع دکن اور حیدرآباد کی یادوں کے گرد گھومتا ہے۔ اس دور میں بھی قائد ملت بہادر یار جنگ اور قائد اعظم محمد علی جناح ان کے ہیرو تھے۔ اس سلسلے میں 'اللہ دولت بہوت دے' قائد اعظم' جیسی نظمیں قابل ذکر ہیں۔

نذیر دہقانی کے سارے کلام میں موضوع سے ان کی محبت اور فن سے ان کا خلوص واضح طور پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا پورے اخلاص سے اور ''چاہ'' سے لکھا۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں۔

''دہقانی کی نظمیں اپنی صداقت' صاف گوئی کے لحاظ سے موثر ہوتی ہیں۔ ان میں وہی ہوتا ہے جو زندگی میں گذرتا یا پیش آتا ہے۔ تخیل کی بلندی' معانی کی وسعت' محاورات اور ضرب الامثال کی بندش ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔'' (5)

نذیر دہقانی کی دہقانی شاعری کے احیا کی بابت' اولیت اور ان کی شاعرانہ عظمت کا اظہار کرتے ہوئے مولانا معز الدین ملتانی لکھتے ہیں۔

> ''سماج کی کہنہ روایات پر تنقید اور نئے تقاضوں کی صورت گری سب سے پہلے دہقانی نے دیہاتی زبان میں کی۔ دہقانی کی شاعرانہ عظمت' اس کی اولیت کی وجہ سے بہت زیادہ بلند ہوجاتی ہے کہ اس کے گرد سے علی صائب اور کھٹا کی صورتیں اُبھر آئیں۔'' (6)

نذیر دہقانؔی انسانی اقدار کی وقعت کے نقیب رہے۔ شاعر شباب جوشؔ ملیح آبادی نے قوم کی بے عملی کی طرف توجہ دلائی تھی۔ نذیر دہقانؔی نے اپنی شاعری میں عمل اور حوصلہ کا پیغام دیا ہے۔ وہ پرامن زندگی گذارنے کے قائل تھے۔ ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کی ترغیب بھی دیتے ہے۔ اپنی نظم ''کب تلک'' میں انھوں نے زندگی کے عملی پہلو کا بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جاتے رہنگا پچھے پچھے بن کو ہاتاں کب تلک
سر پو پوٹلیاں کب تلک اُپر سے لاتاں کب تلک

بھیڑیے ڈوڈی میں گھس کو بکریاں پھاڑ رئیں
بیٹھنگا رکھ لے کو' ہاتاں پو ہاتاں کب تلک

ان سے مچھلیاں چڑاکو دیکھ تو بھی گھور کو
ڈھیلے ہاتاں چھوڑ کو اُچکینگا داتاں کب تلک

نذیر دہقانؔی نے اپنے کلام میں متوسط طبقے کی بدحالی اور معاشی ابتری کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ چونکہ وہ شہر اور گاؤں دونوں مقامات کے حالات سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ اسی لئے سماجی مسائل کا حل طنز و مزاح کے پیرائے میں ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ اپنی نظم ''نکو'' میں انھوں نے سماج کے مظلوم طبقے کو مخاطب کیا ہے اور زندگی کو عمل سے سنوارنے کا پیغام دیا ہے۔

اُتانے پڑکو جھوٹی شان میں بھٹکے مر نکو
یونچ رونے پلانے میں عمراں اپنے کھو نکو

جرا سیدھا چھاتا تنا کو یانچ ہے منجل
یہ دن بھر تیلی کے بیلاں پھرے سرکا پھرنکو

نذیر دہقانؔی حیدرآباد آنے کے بعد بہادر یار جنگ کی مجلس اتحاد المسلمین سے وابستہ ہوگئے تھے۔جب سردار پٹیل نے ہندوستان کی آزاد ریاستوں کو ہندوستان میں ضم کرنے کی پالیسی اختیار کی تو مملکت آصفیہ کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے بہادر یار جنگ اوران کے بعد قاسم رضوی نے حتیٰ المقدور سعی کی۔جلال الدین اشکؔ، معین الدین قریشی، محمد اکبروفا قانؔی کی طرح نذیر دہقانؔی نے بھی اس تحریک میں عملی طور پر حصہ لینے کے علاوہ اپنے کلام سے بھی کام لیا یہاں صرف ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔

نا اب ہمنا کو دولت کی نہ راحت کی جرورت ہے
دلاں میں اب وطن کی ایک محوبت کی جرورت ہے

دہقانؔی نے عدم مساوات کے خلاف بھی قلم اٹھایا۔خاص طور پر پولیس ایکشن کے بعد حالات بدل گئے تھے۔فرقہ وارانہ کشیدگی عروج پر تھی۔اقلیت اور اکثریت کی بنیاد پر کسی کو قابل اعتبار سمجھا گیا تو کوئی بے اعتبار ٹھہرا۔ان حالات میں مسلم طبقے کو جن پریشانیوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس کی جھلک دہقانی نے دکھائی ہے۔

یہ گھر میراچ ہے پن کی چوکھٹ انگلنا نئیں کتے
سب جنے کودیں تو کودیں ہم اچھلنا نئیں کتے

جاتے رہنگا پچھے پچھے بن کو ہاتاں کب تلک
سرپو پوٹلیاں کب تلک اُپرّ سے لاتاں کب تلک

پولیس ایکشن کے بعد جب مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جانے لگے تو شاعر، مظلوم کو اپنی طاقت کا احساس دلاتا ہے اور دوسری جانب ظالم کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

سمجھ کے بھیگی بارود ڈال کو توے پو کیوں بھون رئیں
اگر یہ بھک گئی تو صورت کا سب نقشہ بدل جانا

ایک اور غزل میں بھی ان کا یہی رنگ نظر آتا ہے یہ غزل انھوں نے 1941 میں مجلس اتحادالمسلمین کے جلسے میں سنائی تھی۔ فضل گلبرگوی نذیر دہقانی کے کلام اور اسکی مقبولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میں نے پہلی بار انہیں 41ء کے انجمن نوجوانان دکن کے سالانہ اجلاس میں سنا تھا پنڈال مجلس اتحادالمسلمین کا تھا جہاں آخری دن کی نشست دو بجے دن ختم ہوئی تھی تو سہ پہر چار بجے جناب حسام الدین غوری صدر انجمن مسلم نوجوان نے ایک جلسہ منعقد کیا تھا جس میں حضرت قائد ملت نے فن تقریر پر لب کشائی فرمائی تھی اور اپنی سحر انگیز خطابت سے سارے پنڈال کو دم بخود کر دیا تھا۔ ....اس شاندار تقریر کے بعد نذیر دہقانی کا نام ایسے وقت پکارا گیا جب کہ قائد کی تقریر کا سحر پورے پنڈال پر طاری تھا دہقانی کا نام سنتے ہی سامعین میں عجیب طرح کی ہلچل مچ گئی لوگ چاق و چوبند ہو کر شاعر کو سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میں نے پہلی بار انہیں اسٹیج پر آتے دیکھا ایک منحنی سا دبلا پتلا اوسط قد کا ایک سانولا سا نوجوان شیروانی میں ملبوس مائک کے سامنے آیا۔ ابھی ابھی قائد نے قوم کی بے حسی اور اپدی پن پر کافی جھنجھوڑا تھا ایسے میں دہقانی نے یہ غزل شروع کی۔

جرا گھورے تو کیوں داتاں اُچک رئیں، تھوتماری کی
بجائے لہو کے اب ناکاں چھینک رئیں، تھوتماری کی

بڑھاتے تھے قدم انگے تو اس گاڑ دیتے تھے
مگر اب پچھے کا پچھے کھسک رئیں، تھوتماری کی

زمانہ تھا کہ ترواراں کے چھاواں میں چمکتے تھے
تمیں نینداں میں اب اکدم چمک رئیں تھوتماری کی (7)

فضل گلبرگوی کے بقول قوم کو جھنجھوڑنے کا یہ طنزیہ انداز کم از کم دکن کے اس ماحول میں حضرت اکبرالہ آبادی

کے کلام سے زیادہ موثر ثابت ہو رہا تھا۔اس سلسلے میں نظر حیدرآبادی لکھتے ہیں۔

''نذیر دہقانی دکن کی مقامی بولی کے شاعر ہیں اور خاص و عام میں بہت مقبول' ان کی عام فہم شاعری نے ملت کی بیداری میں بڑا کام کیا ہے۔اقبال کا پیام بیداری ان ہی کی دکنی شاعری کے ذریعہ حیدرآباد کے ہر ضلع اور ہر گاؤں میں بلکہ پورے جنوبی ہند پہنچ گیا تھا۔ان کے شعر کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔

زمانہ تھا کہ ترواراں کے چھاواں میں چمکتے تھے
تمیں نینداں میں اب اکدم چمک رئیں تُھت تماری کی

دہقانی کے اس خیال کا محرک دراصل اقبال کا یہ مصرعہ ہے۔

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں۔''(8)

نذیر دہقانی نے نہ صرف اپنی شاعری میں روایتی مضامین کو برتا بلکہ منظر فطرت کے ساتھ سماجی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور زندگی کے نشیب و فراز اور سماج میں پھیلی برائیوں اور ناہمواریوں کی منظر کشی کی ہے۔دہقانی اپنی ایک نظم'' تمے کیا جی ٹٹولتے سو'' میں وہ قاری کو دعوت فکر دیتے نظر آتے ہیں۔

خودیچ پنتیاں بجالے کو تمے کیا جی ٹٹولتے سو
گئے چوراں چرالے کو تمے کیا جی ٹٹولتے سو

تمے کیوں بے گھر ہوتے تھے پاؤں سے لنگڑتے یوں
چدل گھر میں بسالے کو تمے کیا جی ٹٹولتے سو

نذیر دہقانی اپنی نظموں کو فلسفیانہ انداز میں ختم کرتے ہیں۔ان کی نظم کا اختتام اکثر و بیشتر زندگی کے کسی روشن پہلو کی نشاندہی پر ہوتا ہے۔نذیر دہقانی نے اپنے زمانے کے لسانی پس منظر میں دہقانی زبان میں شاعری کے

محرکات اور امکانات پر روشنی ڈالتے ہوئے خود لکھا ہے۔

''میرے عہد میں اس زبان میں شعر کہنا ایک جسارت تھی' بدمذاقی تھی' گنوار پن تھا' پھر آہستہ آہستہ یہ دل بہلائی کا مشغلہ یا ہنسنے ہنسانے کی بات بن گئی۔''(9)

نذیر دہقانی کو عموماً نظم گو شاعر سمجھا جاتا ہے۔حالانکہ انہوں نے مختلف اصناف سخن میں اپنا کلام موزوں کیا ہے۔انھوں نے نظم کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کے یہاں چند پیروڈیاں بھی ملتی ہیں۔دہقانی کی ابتدائی شاعری کا نمونہ غزلیں بھی رہی ہیں انکی بعض غزلوں کے موضوعات آفاقی ہیں۔ان کی شاعری کے ابتدائی عہد کی تخلیقات ہونے کے باوجود آج بھی زمانے کی آواز معلوم ہوتے ہیں اس سلسلے میں غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

ہم زمیں پو رہتے ہیں آسماں کے باتاں ہیں
داغاں دل کے روشن ہیں کہکشاں کے باتاں ہیں

زندگی کو رو دھو کے یوں گذارنے ہارے
خود ہی بے ٹھکانہ ہیں لامکاں کے باتاں ہیں

روز روز کے جلسے روز روز ہنگامے
کالجاں پو قفلاں ہیں امتحاں کے باتاں ہیں

ذکر کس کی جنت کا کر رہا ہے دہقانی
اپنے گھر کے باتاں کر یہ کہاں کے باتاں ہیں

اپنی غزلوں میں انھوں نے فن کے سارے لوازمات کی پابندی کی ہے۔لیکن اظہار بیان دہقانی زبان ہی میں کیا ہے۔

بیٹھے بیٹھے ظالم سے آنکھ لڑگئی ناجی　　　ہور بھی مصیبت میں جان پڑگئی ناجی

خالی باتاں باتاں میں بات بڑھ گئی ناجی　　　بات بنتے آئی یوں بگڑ گئی ناجی
وہ نقاب رخ پو کا اِک ادا سے سرکا تیچ　　　روشنی چراغاں کی ماند پڑ گئی ناجی

انھوں نے نہ صرف مناظر فطرت کو موضوع بنایا بلکہ سماجی موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔نذیر دہقانی کے اشعار میں دکنی روزمرہ اور محاوروں کا برجستہ استعمال واضح طور پر نظر آتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہو۔

محاورہ

یہ گھر میراچ ہے پن کی چوکھٹ انگلنا نئیں کتے
سب جنے کودیں تو کودیں ہم اچھلنا نئیں کتے　　　چوکھٹ انگلنا

تمہارے باغ میں بڑ باغلاں آ آکو رات کو　　　بڑ باغل آنا
پھلاں کو سارے کھاجاریں تجھے سب کیا کی غپ چپ ہے

میں دن کو دن کیا تو وہ کہتے ہیں رات دہقانؔی　　　دن کو رات کہنا
عجب سچے کو جھٹلاریں تجھے سب کیا غپ چپ ہے

ان کی ایک مشہور نظم ''بدگمان بیوی کے خیالات'' بھی قابل ذکر ہے۔جس میں انھوں نے نوکری کی وجہ سے شوہر کے راتوں کو گھر سے غائب رہنے پر بیوی کی بدگمانیوں کو نہایت خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔چالیس اشعار پر مشتمل اس نظم میں محاوروں کو بہت خوبصورتی کے ساتھ باندھا گیا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہو۔

محاورہ

نوکری پاڑ پڑو جان کو آفت ہوگئی
بچے رو رو کو اُناں کی بری حالت ہوگئی　　　جان آفت میں پڑنا

خط نئیں لکھنے کی ان میں بری عادت ہے
نیند لگتیچ نئیں ہر رات قیامت ہوگئی　　　رات قیامت لگنا

کیسے کیسے کی مجھے خاباں پڑتیں ناجی
طوطے ہاتاں کے مرے دیکھ کو اڑتیں ناجی　　ہاتھوں کے طوطے اڑنا

اردو شاعری کے ابتدائی دور میں غزل گو شعرا کا پسندیدہ موضوع محبوب کا سراپا قرار پایا تھا۔ چنانچہ ولؔی کے عہد تک دکنی غزل اسی محبوب کے سراپے کی اسیر معلوم ہوتی ہے۔ عام طور پر شعرا اپنے محبوب کا سراپا بیان کرنے میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ لیکن نذیر دہقانؔی کے یہاں محبوب کے سراپا کے بیان میں مبالغہ نظر نہیں آتا۔ یہاں تو گاؤں اور دیہات کے ماحول کی دل کو چھو لینے والی سادگی اور جگر میں تراز بن جانے والی سچائی نظر آتی ہے۔ بادی النظر میں سراپا کا خارجی پہلو دیہاتی ہونے کی وجہ سے گنوار نظر آتا ہے لیکن جب ہم بین السطور کے مفہوم پر غور کرتے ہیں تو یہی نذیر دہقانؔی کے کلام کی حقیقت بن جاتا ہے۔ نذیر دہقانؔی محبوب کا سراپا بھی دیہاتی روزمرہ اور تشبیہات کے سہارے بیان کرتے ہیں۔ ان کا محبوب دیہاتی زندگی اور دیہی ماحول کا پروردہ ہے۔ نظم ''سراپا'' کا ایک حصہ ملاحظہ ہو۔

جی کی مالک مری ایک گاؤں کی رہنے ہاری
چوڑا جبڑا ترا صورت تری پیاری پیاری

بال لمبے ہیں ترے جھاڑو کے کٹیاں کے ناد
پلکاں ہیں جیسے ترے گھانس کے ٹٹیاں کے ناد

کیا بھولاواں لمبے ہیں رخ پو ترے کمبل کیڑے
جان لینے کے لئے بیٹھے ہیں آڑے تیڑے

ایو صورت تری وہ چاند سی رِخلی جیسی
اس پو تھڈی ہے تری آم کی گٹھلی جیسی

نذیر دہقانؔی نے بعض فلمی گیتوں اور قوالیوں کی پیروڈیاں بھی لکھی ہیں۔ پیروڈی کے لئے دہقانؔی کے عہد میں راجہ مہدی علی خاں نے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ لیکن نذیر دہقانؔی کی پیروڈی اپنے دہقانی لب و لہجہ کی بنا پر نہ صرف منفرد ہوتی ہے بلکہ دہقان کی سہانی صبح کی طرح دلفریب اور ''چٹ پٹی'' بھی۔ فلمی دنیا کی مشہور قوالی جسکے بول ہیں۔

نگاہیں ملانے کو جی چاہتا ہے
دل وجاں لٹانے کو جی چاہتا ہے

اس قوالی کی پیروڈی نذیر دہقانی نے لکھی ہے اور اسکے موضوع کو اس طرح انفرادیت عطا کی ہے کہ اس میں ان کے گھر محبوب کی آمد کو بیان کیا گیا ہے۔

گھروندے بنانے کو جی چاہتا ہے
بنا کر مٹانے کو جی چاہتا ہے

یہ جی ہے اجی، جی کا کیا پوچھنا جی
یوں وچ جی چرانے کو جی چاہتا ہے

انو کب بی نئیں سو میرے گھر کو آرئیں
کلاٹیاں لگانے کو جی چاہتا ہے

میں تنگ آگیا ناز اٹھاتے اٹھاتے
جنازہ اٹھانے کو جی چاہتا ہے

شعراء نے محبوب کی آمد کو مختلف انداز میں رقم کیا ہے۔ غالبؔ اپنے محبوب کی آمد پر خدا کی قدرت کا ذکر کرتے ہیں اور عالم حیرت میں کبھی اپنے گھر کو اور کبھی اپنے محبوب کو دیکھتے ہیں۔ نذیر دہقانیؔ ایک نئے اسلوب میں اپنے محبوب کی آمد پر خوشی اور شادمانی کا اظہار کرتے ہیں جس سے ان کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے۔

نذیر دہقانیؔ کی شاعرانہ عظمت اور ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے یونس فہمی رقمطراز ہیں۔

''دہقانیؔ کا فن ان کی دکنی پر مکمل دلالت کرتا ہے۔ ستھرے انوکھے موضوعات کا انتخاب انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ تشبیہ، استعارہ، کنایہ جو شاعری کے خارجی حسن کو دوبالا کردیتے ہیں، نذیر دہقانیؔ ان پر قادر

ہیں۔ایسی زبان میں ان کا استعمال دشوار ہو جاتا ہے جو عام بول چال سے دور ہو۔لیکن نذیر دہقانی نے عوام کے مذاق کو اس قدر بلند کر دیا تھا کہ لوگ متروکات اور غیر فصیح الفاظ سے بھی لطف اٹھاتے تھے۔''(10)

حمایت علی شاعر نذیر دہقانی کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بظاہر یہ شعراء مزاح نگار ہیں مگر ان شاعروں نے زندگی کے سطحی مظاہر سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔انہوں نے اپنے ملک کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کا ایسے زاویوں سے مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے کہ انہیں حل کرنے کی کوششوں کا سارا کھوکھلا پن نمایاں ہو گیا۔ان شعراء کی نظموں میں ہم اپنا چہرہ بھی دیکھتے ہیں اور اپنے معاشرہ کا بھی اور جب ہر چہرہ ہمیں مضحکہ خیز نظر آتا ہے تو ہم بے اختیار ہنس پڑتے ہیں۔''(11)

سقوط حیدرآباد سے پہلے حیدرآباد سے جاری ہونے والے روز ناموں میں روز نامہ ''وقت'' موقر روز نامہ تھا جو عبدالرحمٰن رئیس کے زیر ادارت شائع ہوا کرتا تھا۔عبدالرحمٰن بے خوف اور بے باک صحافی تھے۔مقتدر اعلیٰ عہدہ دار بھی ان کی تنقید کا نشانہ بنتے تھے۔ان کی تنقید میں شدت کا عنصر داخل تھا جس کی وجہ سے اخبار کی اشاعت پر پابندی لگادی گئی۔عوام کی نمائندگی اور اصرار پر اخبار کی دوبارہ اشاعت کے احکامات جاری کئے گئے۔اس خصوص میں ایک تہنیتی جلسہ کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔حالات اور روز نامہ کے نام کی مناسبت سے نذیر دہقانی نے منظوم تہنیت پیش کی جو یہاں درج کی جاتی ہے۔

قدر کرو وقت کی انسان بنادیتا ہے
وقت سوئی ہوئی قسمت کو جگا دیتا ہے

وقت یہہ وہ نہیں دہقانی نہ آئے جاکو
لاکھ کوشش کرو آکو دکھا دیتا ہے

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نذیر دہقانی نے عام روش کے برخلاف دہقانی زبان کو وسیلہء اظہار بنایا اور یہی بات انہیں منفرد اور ممتاز بناتی ہے۔ان کا کلام خارجی حسن کے ساتھ ساتھ داخلی حسن سے بھی مالا مال نظر آتا ہے۔عزیز ابرار دکن میں مزاحیہ شاعری کے فروغ میں نذیر دہقانی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ’’حیدرآباد میں طنز ومزاح کی مقبولیت فرحت اللہ بیگ‘ آوارہ اور ناکارہ کے بعد نذیر دہقانی کی مرہون منت ہے۔نیز وہ دکنی شاعری کے احیاء کے بھی ذمہ دار ہیں......دہقانی نے تقریباً پچاس ہزار اشعار کہے۔فطرت کی شادابی‘ طنز وظرافت کا توازن اور لفظ ومعنی کی ہم آہنگی نذیر کی خصوصیات ہیں۔‘‘(12)

غرض دہقانی نے جہاں دکنی شاعری کے احیاء کا جراءت مندانہ قدم اٹھایا ساتھ ہی اس کو ارتقائی مدارج تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔اور یہ ثابت کیا کہ اس زبان میں اس قدر توانائی ہے کہ وہ صحت منداد ب کی حامل بن سکتی ہے۔دہقانی کے کلام میں رفعت تخیل‘ نادر تشبیہات‘ محاورے‘ ضرب الامثال کے ساتھ انسان دوستی خلوص اور محبت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔

دہقانی انداز میں شعر کہنے والا یہ منفرد دکنی شاعر پاکستان کی سرزمین پر 1984ء میں بمقام لاہور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ان کی اولاد نے اپنے والد کے کلام کو’صدائے دہقانی‘‘ کے نام سے 2004ء میں شائع کروایا اور منفرد لب ولہجہ کے اس شاعر کے کلام کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کردیا۔

----OOO----

حوالہ جات

(1) نذیرالدین احمد ''دکنی ادب کے چار مینار میں ایک اور اضافہ'' مضمون شائع شدہ روزنامہ ''سیاست'' 1992

(2) نذیراحمد دہقانی ''میں اور میری شاعری کے ثمرات'' مطبوعہ 'شگوفہ' جون 1974 ص 11

(3) سید بشیراحمد ''نذیر دہقانی'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' 12 اگست 2006

(4) عبدالرؤف عروج ''اقبال اور بزم اقبال'' 1978ء ص 137

(5) نصیرالدین ہاشمی ''دکن میں اردو'' ص 140 سنہ اشاعت

(6) مولانا معزالدین ملتانی ''مقدمہ' گھوکرو کے کانٹے'' ص 13

(7) فضل گلبرگوی ''نذیر دہقانی'' مطبوعہ 'شگوفہ' مئی 2002

(8) نظر حیدرآبادی ''اقبال اور حیدرآباد'' ص 110-109

(9) نذیراحمد دہقانی ''میں اور میری شاعری کے ثمرات'' مطبوعہ 'شگوفہ' جون 1974 ص 11

(10) یونس فہمی ''اردو شاعری میں طنز و مزاح'' ص 242

(11) حمایت علی مشمولہ: دکنی ادب کے چار مینار مرتبہ: رشید شکیب ص 18

(12) عزیز ابرار ''شگوفہ کی ادبی خدمات'' مقالہ برائے ایم فل' از عزیز ابرار غیر مطبوعہ' مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد' 1989ء ص 21

سلیمان خطیبؔ

سلیمان خطیبؔ 1919ء کو سابق ریاست حیدرآباد کے ضلع گلبرگہ کے ایک گاؤں معین آباد (چڑگوپہ) میں پیدا ہوئے۔ چھ ماہ کی عمر میں ہی ماں باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک ان کے چچا نے ان کی پرورش کی پھر وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم میدک ہائی اسکول اور مدرسہ فوقانیہ نامپلی سے میٹرک کامیاب کیا اور منشی فاضل کی تکمیل کی۔ کلکتہ میں واٹر ورکس ٹریننگ حاصل کی۔ گلبرگہ میں سپرنٹنڈنٹ فلٹر بیڈس کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔

خطیبؔ کو بچپن سے ہی شاعری سے شغف رہا۔ ابتداء میں محمد حسین صاحب ادیب اور مولوی عبدالرحیم صاحب صدیقی حسرتؔ سے اور بعد میں اپنے خسر مولانا حافظ محمد اسماعیل شریف صاحب ازلؔ سے مشورہ سخن کیا۔ وہ ایک خوش مزاج، خوش فکر اور باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ خطیبؔ کو ڈھولک کے گیت بہت پسند ہیں چار پانچ سال تک انہوں نے اسے جمع کیا ان کے مجموعے میں بھی کئی ڈھولک کے گیت شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں مزاح سے زیادہ طنز کا عنصر غالب رہتا ہے۔

خطیبؔ نے دکنی زبان کو وسیلہ اظہار بنایا اور بقول رشید شکیب سلیمان خطیبؔ کو حیدرآباد کے چار میناروں میں سے ایک مینار مانا جاتا ہے۔ ان کی شاعری ملک گیر شہرت کی حامل تھی۔ ان کے کلام میں کنڑا، تلگو کے علاوہ مراٹھی زبان کے بھی اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ سلیمان خطیب کو دکن کے مختلف مقامات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور انہوں نے اپنی محنت لگن سے دکنی محاورات اور تشبیہات جمع کیں جن کا انہوں نے اپنی شاعری میں برمحل استعمال کیا ہے۔ وہ ایک عوامی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں عوامی لہجہ اور عوامی جذبات نظر آتے ہیں۔ 1979ء میں مدیر روزنامہ "سیاست" عابد علی خاں ان کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> "دکھنی زبان میں ان کی شاعری ملک کے ہر گوشہ میں پسند کی جاتی ہے اور
> ان کی ہر نظم پر واہ یا آہ کی داد ادا ہوتی ہے۔ وہ اس لئے کہ مقامی الفاظ، محاورے

اور موضوع، عام مروجہ شاعری سے علٰحدہ رہتے ہیں اور آہ اس لئے کہ وہ جن سماجی اور عوامی مسائل پر لکھتے ہیں وہ بڑے دردناک اور تلخ حقائق ہیں۔ خطیب کی مقبولیت کی بڑی اور بنیادی وجہ دکھنی زبان کا استعمال اور اس میں عوامی مسائل کا اظہار ہے۔ وہ عوام کے مسائل کے ترجمان شاعر ہیں اور روزمرہ زبان میں ان کی عوام سے راست مخاطبت عوام پر گہرا اثر چھوڑتی ہے''۔(1)

نصرتیؔ، ابن نشاطیؔ، قلی قطبؔ شاہ اور ولیؔ نے دکنی زبان میں اردو شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اردو ادب کو اپنے جواہر پاروں سے مالا مال کیا۔ سلیمان خطیبؔ نے بھی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے لئے دکنی کا انتخاب کیا، کیوں کہ یہ عوامی زبان ہے۔ دکنی زبان کے مزاحیہ شعراء میں سلیمان خطیبؔ کو منفرد مقام حاصل ہے۔ رشید شکیب نے جامعیت کے ساتھ سلیمان خطیبؔ کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''خطیبؔ کی شاعری فطرت کی عکاس ہے۔ شاعر اپنے شاعرانہ اظہار کیلئے کسی کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ وہ جس معاشرہ، جس دیس اور رسم ورواج کے ماحول میں پل رہا ہے اسی سے استفادہ کرتا ہے اسی لئے خطیبؔ کی شاعری میں سچائی، حسن، معاشرتی مسائل اور سماجی الجھنوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں تشبیہات، استعارات جابجا ملتے ہیں۔ یہی شاعری شاعر کو بلند مقام عطا کرتی ہے''۔(2)

انہوں نے اُس دور میں دکنی کو وسیلہ اظہار بنایا جب شعراء طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی طرف مائل ہی نہ تھے۔ وہ خود کو عوامی شاعر قرار دیتے ہیں، عوامی زبان اور لہجہ میں عوام کی بات کرتے ہیں۔ انہیں اپنے وطن سے بے پناہ محبت ہے۔ ان کے کئی اشعار اس کی گواہی دیں گے۔ دکنی زبان اور اپنی دکنی شاعری کے بارے میں خود سلیمان خطیبؔ رقمطراز ہیں:

''میں نے دکن دیس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں آنکھیں کھولیں۔ میرا ماحول دکنی تھا، اس لئے میں نے دکنی زبان اپنائی۔ میری

شاعری کا مزاج دکنی ہے۔اس کی تشبیہات دکنی ہیں۔روزمرہ دکنی ہے، رسم و رواج دکنی ہیں، زبان کا بانکپن بھی دکنی ہے۔ میں نے ساکن لفظ کو دکنی کے انداز میں کبھی متحرک بھی باندھا ہے۔قوافی سے بغاوت کی ہے یا صوتی اعتبار سے الفاظ استعمال کئے ہیں۔تنخواہ کو تنخا، درد کو دَرَد، نشرُ کو نشَرُ یا سخت کا قافیہ فقط رکھ دیا ہے۔ یہ مجموعہ پڑھتے ہوئے قاری خصوصاً ''نقادِمحترم'' کو یہ بات پیش نظر رکھنی ہوگی کہ اس کا فنکار، نہ صرف ایک عوامی شاعر ہے، عوامی لہجہ میں عوامی زبان، عوامی جذبات اور معاشرہ کی نمائندگی کررہا ہے۔ بلکہ اپنے زمانے کو دستاویزی تحریر بھی دے رہا ہے۔حالات پر تبصرہ کررہا ہے، تاریخ بیان کررہا ہے۔''(3)

سلیمان خطیبؔ زندہ دلان حیدرآباد سے بھی وابستہ رہے اور اس کی جانب سے منعقد ہونے والے مشاعروں میں اپنے کلام سے لوگوں کو محظوظ کرتے رہے۔ان کا مشاہدہ کافی تیز تھا۔وہ عوامی مسائل پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔سلیمان خطیبؔ کی مقصدی شاعری محاورہ اور محاکات سے عبارت ہے۔ جوں جوں ہم ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عوامی مسائل کو ان ہی کی زبان میں کتنی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ان کا مجموعہ'' کیوڑے کا بن'' پہلی بار ڈسمبر 1975ء میں گلبرگہ میں منعقدہ ''جشنِ سلیمان خطیب'' کے موقع پر شائع ہوا۔ حالانکہ اس سے قبل بھی ایک مختصر مجموعہ ''دھنک'' نام سے بھی شائع ہوا تھا لیکن بقول عابد علی خاں اس کی حیثیت ایک انتخاب جیسی تھی۔ڈسمبر 1975ء شائع مجموعہ کی کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔لیکن دوسرے ایڈیشن کی اشاعت سے قبل ہی پبلیشر نے بلا اجازت اپنے طور پر شائع کرالیا جس میں بے شمار کتابت کی غلطیاں تھیں لیکن مدیر شگوفہ کی دلچسپی اور سلیمان خطیب کی محنت کی وجہ سے دوسرے ایڈیشن کی تیاری شروع ہوئی اس تعلق سے ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال لکھتے ہیں:

''سلیمان خطیبؔ، اس کی اشاعت پر بڑے آزردہ ہوگئے تھے ان کی صحت بھی ان دنوں خراب تھی۔تبھی یہ طئے کیا گیا کہ '' کیوڑے کا بن'' تازہ کلام کی شمولیت کے ساتھ شائع کیا جائے۔ اکتوبر 78ء کے دوسرے ہفتہ

> میں سلیمان خطیب دو تین دن مسلسل میرے پاس آتے رہے اور انہوں نے خود ساری کتاب شدہ کاپیاں دیکھیں اور ایک ہفتہ بعد طباعت کیلئے حیدرآباد آنے کا وعدہ کر کے گلبرگہ گئے لیکن سخت بیماری کے عالم میں 16 اکتوبر کو گلبرگہ سے دواخانہ عثمانیہ منتقل کئے گئے۔ 22 اکتوبر کی شب، دکن کے اس عظیم شاعر نے اس جہان فانی کو خیر باد کہا......تاخیر کے باوجود اتنی طمانیت کافی ہے کہ سلیمان خطیبؔ کی پہلی برسی کے موقع پر "کیوڑے کا بن" کا یہ مرمی ایڈیشن منظر عام آ رہا ہے۔ خطیب صاحب کے کلام کا یہ مکمل مجموعہ شعری ادب کے سرمایہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے"۔(4)

اس مجموعہ کی وجہ تسمیہ کے تعلق سے خود سلیمان خطیب لکھتے ہیں مجموعہ کا نام "کیوڑے کا بن" اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کے ساتھ کئی یادیں وابستہ ہیں، اور مجھے کیوڑہ مرغوب ہے۔

یاد بولے تو تکیہ میں گجرے کی باس
جیسے کیوڑے کا کانٹا کلیجہ کے پاس

یوں بھی دنیا ایک خوبصورت مہکتا ہوا کیوڑے کا بن ہے۔ جس میں بے پناہ خوشبو بھی ہے، نکیلے کانٹے بھی ہیں اور زہریلے سانپ بھی!

دنیا دیکھئے تو بن ہے کیوڑے کا
بن میں کیوڑے کا سانپ ہوتے ہیں (5)

اس مجموعہ میں کلام کو مختلف عنوانات کے ذریعہ درج کیا گیا ہے جیسے گھر گھر کی بات (عوامی مسائل) محبت کی چھاؤں (رومانی شاعری)، پھر ڈھولک اڑی (لوک گیت اور ڈھولک کے گیت)، پھولاں مرجھا گئے (شخصی مرثیے) وغیرہ۔

اردو ادب میں تقریباً ہر شاعر نے حسن وعشق، گل وبلبل کے موضوعات کے تحت اشعار باندھے ہیں سلیمان خطیبؔ دیہاتی ماحول کے پر وردہ ہیں اور عشق ومحبت کے جذبات کو دکنی زبان میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

ذیل کے اشعار میں ایک دہقانی نوجوان کے اپنی پڑوسن کو دیکھنے کے بعد جس قسم کے جذبات اور احساسات ہوتے ہیں خطیبؔ نے انہیں شاعرانہ لباس میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

توخاباں میں آئے تو میں ہڑبڑا کو		اندھیرے میں اٹھ اٹھ کو دھابا پو آتوں
میں بھرکا توں بنڈے میں سیٹیاں بجاتوں		سندوری کے سانداں سے آنکھیاں لگاتو
تو انکھیاں کو نئیں دستی کر کو روتوں		میں اپنچ رونے پو ہنس ہنس کو مرتوں
تو گمت ہے گمت ہماری پڑوسن

سلیمان خطیبؔ کا یہ دہقانی اپنی پڑوسن کے عشق میں گرفتار ہے۔اس کی معصوم محبت اور اس کی آرزو اور تمنا کی خطیبؔ کچھ اس طرح عکاسی کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

میں چھلے کا کنکر بنا کو رکھوں گا		میں انکھیاں پو اپنے بٹھا کو رکھوں گا
کلیجے کے اندر چھپا کو رکھوں گا		اندھارے کی چمنی بنا کو رکھوں گا

خطیبؔ کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت جسے ہم ان کا آرٹ بھی کہہ سکتے ہیں وہ اپنی نظم کا آغاز طنزیہ و مزاحیہ انداز میں کرتے ہیں وہ انسانوں کے مضحکہ خیز رویوں پر طنز کے تیر چلاتے ہیں لیکن جب نظم اختتام کو پہنچتی ہے تو قاری یا سامع کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ وہ طنز کی تلوار سے بے اعتدالیوں، ناہمواریوں اور معاشرتی خرابیوں پر نقاب اتار دیتے ہیں۔ اپنی ایک نظم ''ایک کلرک کی بیوہ'' میں کلرک کے گھر کے نامساعد حالات اور مہینے کی آخری تاریخوں میں اس کا انتقال، بیوہ کا شوہر کی قبر پر آہ و زاری کرنا، ان احساسات کا اظہار شاعر نے جس انداز میں کیا۔ اس سماجی حقیقت کو پڑھ کر کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔

ایسا مرنا بھی کئیکا مرناجی		پھول تک ادھار لائی ہوں
اِتّا احسان مجھ پو کرنا تھا		تنخواہ لینے کے بعد مرنا تھا

ہمیں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ خطیبؔ نے دکنی کے ساتھ ساتھ سلیس اردو میں بھی کلام موزوں کیا ہے۔ ان کی نظموں میں چھورا چھوری، میاں کے دوست، پہلی تاریخ محبوب صاحب محبوب بی میں مزاحیہ انداز میں معاشرہ کے افسوسناک پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ خطیبؔ کی شاعری کے بارے میں اختر حسین لکھتے ہیں:

''انسانوں کے مسرت اور استعجاب کے جذبہ کو بیدار کردینا بہت بڑی بات ہے اور فنِ شاعری کا سب سے بڑا منصب بلاشبہ یہی ہے کہ وہ ہمارے احساسات کو اس طرح چونکا دے اور ہمارے جذبات میں حیرت وشادمانی کی ایسی لہر دوڑا دے کہ ہمارا قلب وذہن مسحور ومسخر ہو کر رہ جائے اور سلیمان خطیب کا فن کارانہ شعور ادبی جادوگری کے ان رموز پر خوب حاوی ہے''۔(6)

خطیبؔ کی شاعری میں پند ونصائح، پیغامِ عمل، زندگی کے آرائش وآرام کے علاوہ حسن وعشق کی حکایتیں بھی ملتی ہیں۔انہوں نے نازک سے نازک خیال کو دکنی زبان میں پیش کر کے یہ ثابت کردیا کہ دکنی زبان ان کو سمولینے کی اہل ہے۔معاشی مسائل پر ان کی متعدد نظمیں مثلاً ساس بہو، چھورا چھوری، پہلی تاریخ، ایک کلرک کی بیوہ، سانپ، یادِ حکیم، ہراج کا پلنگ اور چپچے قابل ذکر ہیں۔رومانی شاعری میں محبوب صاحب، محبوب بی، پڑوسن، دکنی عورت کا انتظار، ہمالہ کی چاندی، موٹ کا پانی، دل کی تبدیلی، کنگی، چینی گڑیا، سن ری گوری، رستے، جھاڑ وتارا قابل ذکر ہیں۔ سلیمان خطیب نے اپنی نظم ''موٹ کا پانی'' میں کسان کی محنت، امید اس کی جدوجہد اور اس کے مسائل کو کس عمدگی سے پیش کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

مٹھا مٹھا موٹ کا پانی		سیتا سر کی پاک جوانی
چمپا، چمبیلی، دونا، مروا		دن کا راجہ رات کی رانی
مٹھا مٹھا موٹ کا پانی		موٹ چلاتوں ہلو ہلو
پانی نھاٹے میں بھی نھاٹوں		مڑی مڑی کو امرت باٹوں
چاند کے سر کی کھرپی لے کر		دھان کی بالی ہلو کاتوں

سلیمان خطیب نے اپنے عصر کے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔سلیمان خطیب کی نظم ''دل کی تبدیلی'' قاری کو دعوت فکر دیتی ہے۔جس میں انہوں نے سیاہ کاروں اور منافقوں پر طنز کا بھرپور وار کیا ہے۔دو شعر ملاحظہ ہو:

میری حالت کو دیکھنے والو!
جتّے پاپی ہیں دل کے کالے ہیں
ان کے دل کو بدل ڈالو
منہ پو کرتے ہیں بات پھولوں کی

بھوک اور روٹی وہ اہم موضوعات ہیں جن پر مختلف شعراء نے اپنے اپنے انداز میں خامہ فرسائی کی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے جس کھیت سے کسان کو روٹی میسر نہ ہو اس کے ہر خوشہ گندم کو جلا دینے کی بات کہی تھی لیکن سلیمان خطیبؔ صرف کوشش اور لگن پر زور دیتے ہیں۔

کاٹو کاٹو کھیتاں کاٹو رے گھر گھر روٹی باٹو رے
خون پسینہ پیرو رے چان ستارے کاٹو رے
کاٹو کھیتاں کاٹو رے کاٹو کھیتاں کاٹو رے
گھر گھر روٹی باٹو رے گھر گھر روٹی باٹو رے
خون پسینہ پیر ننگے ندی نالے موڑیں گے
پیاسی پیاسی کھیتی کھیت میں پانی چھوڑیں گے

جہیز اور گھوڑے جوڑے کی رسم ہمارے معاشرے میں ایک رستا ہوا ناسور ہے۔ خطیب نے ان معاشرتی خرابیوں کو موضوع کلام بنایا ہے اور لاجواب نظمیں لکھی ہیں۔ ''چھورا چھوری''، ''آخری جمعگی'' میں ایک دردمند و بے کس باپ کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ''آخری جمعگی'' میں نام نہاد مدعیان اسلام سے جو ذاتی مفاد کے لئے شریعت اور سنت رسولؐ کا حوالہ دینے لگتے ہیں۔ سوال کرتے ہیں۔:

کیا دیا تھا نبیؐ نے بیٹی کو
کچھ تو ہوگا بتول سے رشتہ
ایک چکی تھی اور مشکیزہ
صرف لفظ قبول سے رشتہ

گھر نبیؐ کا نبیؐ کی بیٹی
اور علیؓ کے اصول سے رشتہ

خطیبؔ کے ہاں عورت کا ہر روپ قابل احترام ہے۔ بیٹی کا تصور ان کے ہاں بہت اونچا، اعلیٰ و ارفع ہے۔ مادہ پرست سماج اور غیر شرعی رسم رواج نے آج بیٹی کے باپ کیلئے جو مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان پر خطیبؔ کا دل کڑھتا ہے اور درد وغم سے لبریز ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ایک نظم ''سانپ'' کا اختتام نصیحت آمیز انداز میں کرتے ہیں۔

خوب سونچ سمجھ کے بچی دیو		کاٹ کھانے کو سانپ آتے ہیں
روپ بھر کر کبھی فرشتوں کا		گھر بسانے کو سانپ آتے ہیں
ہم نے ممبر پہ سانپ دیکھے ہیں		ہم نے مندر کے سانپ دیکھے ہیں
کیا بتائیں کہ اونچی کرسی پر		کتے زہریلے سانپ دیکھے ہے

آج کے معاشرے میں لڑکوں کے سرپرستوں کے لڑکی کے سرپرستوں سے مطالبات، ان پر اصرار اور خود کی فرمائشوں کا اظہار ملاحظہ ہو۔:

بھار والے تو بھوت پوچھیں گے		گھر کا بچہ ہے گھر کا زیور دیو
بھوت چیزاں نکو جی تھوڑے بس		ایک بنگلہ ہزار جوڑے بس

اس قدر فرمائشوں اور مطالبات کے بعد اپنے بچاؤ کی ترکیبیں دیکھئے کہ لڑکے والے کیا کیا حیلے بہانے کرتے ہیں۔

جوڑے لاناں بھی راس نئیں ہمنا		نتھ چڑھانا بھی راس نئیں ہمنا
ہم ولیمہ تو کب بی دیتے نئیں		کھانا دانا بھی راس نئیں ہمنا
مہر وتاج جتی سنت ہے		بھوت بننا تو سب حماقت ہے

اس نظم کے آخری بند بڑے ہی عبرت انگیز اور نصیحت سے پر ہیں ملاحظہ ہو:

جس کی بچی جوان ہوتی ہے | اس کی آفت میں جان ہوتی ہے
بوڑھے ماں باپ کے کلیجے پر | ایک بھاری چٹان ہوتی ہے
جی میں آتا ہے اپنی بچی کو | اپنے ہاتھوں سے خود ہی دفنا دیں
لال جوڑا تو دے نہیں سکتے | لال چادر میں کیوں نا دفنا دیں

معاشرتی زندگی پر خطیب کی نظر بڑی گہری ہیں۔ نظم ''ساس بہو'' میں ہمارے معاشرتی وخاندانی مسائل کا باریک بینی سے جو تجزیہ کیا ہے اس میں ان کا فہم وادراک بھی شامل ہے۔ وہ اس مسئلہ کی نزاکت اور حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں تا کہ ہمارے معاشرے کی اصلاح اور گھریلو زندگی میں سدھار ہوسکے۔ اس میں ان کی ایک اور خصوصیت واضح ہوتی ہے یعنی دکنی کے ساتھ عام اردو زبان میں شعر بھی لکھے ہیں۔ بعض جگہ موقع کے لحاظ سے استاذ شعراء کے شعر بھی استعمال کیے ہیں۔ ساس دہقانی ہے اور بہو تعلیم یافتہ خاتون، ساس کہتی ہے،

مَرد آنے دے پیٹھ پھوڑوں گی | تیری تربت بنا کے چھوڑوں گی
کتے جاتے ہیں تو بھی جانا گے | آکے قے دس تجھے لیجانا گی

اب بہو کا صبر آزما جواب سنئے:

ہم گھرانے کی شان رکھتے ہیں | بند مٹھی کی آن رکھتے ہیں
گھر کی عزت کا پاس ہے ورنہ | ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

سلیمان خطیبؔ کے پاس عصری حسیت کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے کلام تمام شعری لوازمات کی پابندی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے نادر تشبیہات واستعارات کا انوکھا استعمال کیا ہے۔ ان کی نظم کی دو شعر ملاحظہ ہو۔

چمچے کی کوئی قید نہیں چھوٹا کہ بڑا ہو
ہر کام ڈبونے کا کرتے ہیں چمچے
کفگیر تو کردیتی دیگوں کا صفایا
مشقاب کٹوروں میں گھوما کرتے ہیں چمچے

سلیمان خطیبؔ کے مجموعہ کلام میں غزلوں کے علاوہ نظمیں، لوک گیت بھی ہیں اور ڈھولک کے گیت بھی۔ ''کیوڑے کا بن'' میں کئی مسائل کی نشاندہی کی گئی اور معاشرے میں پائی جانے والی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں پر طنز بھی ملتا ہے۔ اس مجموعہ میں ''پشکولہ'' کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے۔ اس نظم میں ایسے لوگوں پر طنز کیا گیا جو خود اپنا پیشاب پیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مرارجی دیسائی بھی مبینہ طور پر اس طرح کا عمل کیا کرتے تھے خطیبؔ نے ان ہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ارباب اقتدار کی اردو زبان سے دشمنی کو بھی آشکار کیا ہے۔

اس سے ناسور کیور ہوتا ہے　　تازہ ٹانک ہے پیور ہوتا ہے
ویسے گھٹیا بھی لوگ ہوتے ہیں　　اور گھٹیا بھی دور ہوتا ہے
جو بھی حاکم حضور ہوتا ہے　　کچھ نہ کچھ تو فتور ہوتا ہے
واں پہ اردو زبان بھی آئی تھی　　اور شکایت تھی ابنِ آدم سے
سر چڑھایا ہے موت کو تم نے　　میں تو مرجاؤں گی اسی غم سے
شری پیشاب چیخ کر بولے　　ہاتھ دھوکر پڑی ہے کیوں پیچھے
تو تو رینگی نہ کان کے اوپر　　میں تو پہنچا حلق سے بھی نیچے

سلیمان خطیبؔ ایک حساس اور درد مند شخصیت کے مالک اور ایک یار باش انسان تھے۔ مخدومؔ، سرور ڈنڈا جیسے لوگوں پر وہ جان چھڑکتے تھے۔ ''کیوڑے کا بن'' میں مخدوم کی نظم ''چارہ گر'' پر لکھی پیروڈی اور ایک ڈھولک کا گیت بھی شامل ہے۔ جب مخدومؔ کا انتقال ہوا تو انہوں نے ایک مرثیہ لکھا جس کا عنوان ہے ''لوک دوانہ''۔ یہ مرثیہ بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔ خطیبؔ لکھتے ہیں:

جاکو میدک　　گھر گھر پوچھا　　بانکی ترچھی　　ٹوپی والا
من کا موجی　　پیت کا سارا　　پاپ بچارا　　کاں ہے جی
دل میں چھالے　　آنکھ میں آنسو　　پاؤں میں کانٹے　　ہاتھ میں پھولاں
مسجد مندر　　انگے پیچھے　　لوک دِوانہ　　کاں ہے جی
بھیگے پلکاں　　دے کے ساجن　　نرم کلیجہ　　چھنی چھنی

بُھکے بیٹھے حال اٹھایا لوک دوانہ کاں ہے جی

ان شخصی مرثیوں میں ڈاکٹر زورؔ اور سرور ڈنڈاؔ کی بے وقت موت پر لکھے گئے مرثیے بھی شامل ہیں۔ آخری دیدار عنوان کے تحت لکھے مرثیے میں سرور ڈنڈاؔ کے بارے میں خطیبؔ لکھتے ہیں:

کون تُمنا بلانے آیا تھا		کس کے سنگات ہوگئے سرور
کس سے ملنے کی آرزو لے کر		کس کی رحمت میں سو گئے سرور
دیکھو پھولاں میں پھول سویا ہے		کتنا بانکا سجیلا ہے ہمدم
ایسے سونے پو آنکھ روتی ہے		جیسی گرتی ہے پھول پو شبنم

خطیبؔ اپنی شاعری سے اصلاح معاشرہ کا کام لینا چاہتے تھے۔ عوامی موضوعات اور مسائل کی وجہ سے خطیبؔ کا کلام خواص اور عوام دونوں میں مقبول رہا۔ خطیبؔ کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رحمت یوسف زئی لکھتے ہیں:

''خطیبؔ نے نہ صرف دکنی شاعری کو ایک نئی روح دی بلکہ مزاح کو طنز کی طرف موڑ کر وہی کام انجام دیا جو ایک عمدہ قسم کا سرجن یا جراح کرتا ہے۔ انہوں نے ماحول میں بکھرے ہوئے زہر کو بوند بوند میں بند کیا اور اس زہر پر مزاح کی شکر لپیٹ دی۔ آہستہ آہستہ شکر گھل جاتی ہے اور زہر کی تلخی روح کے اندر ایک کرب پیدا کر دیتی ہے۔ سلیمان خطیبؔ کے ہاں مزاح میں پھکڑ پن نہیں۔ ایک نرم آہنگ ہے جو دلوں میں انبساط بھر دیتا ہے اور پھر طنز کی تلخیاں اس انبساط کو درد میں بدل دیتی ہیں''۔ (7)

سلیمان خطیبؔ کے کلام میں روانی سلاست آمد ہے آورد کا پتہ نہیں چلتا۔ انھوں نے تشبیہات نادر استعارات سے اپنے کلام کو مزین کیا۔ ان کی نظم ''ندی'' کے چند شعر دیکھئے:

چڑھتے چڑھتے چڑھ گئی تو جیسے تیوری چڑھ گئی		بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی تو بات جیسے بڑھ گئی

گھٹتے گھٹتے گھٹ گئی تو چاند آخری رات کا		ہورڈنگی ہوگئی تو بھید عورت ذات کا
سُک گئی تو جیب خالی جیسے ایک کنگال کا		پیٹھ سے جالگیا ہے پیٹ جیسے کنگال کا

سلیمان خطیبؔ کے فن پر اپنی رائے دیتے ہوئے نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''سلیمان خطیبؔ دکنی مزاحیہ شاعری کے سب سے کامیاب اور جاندار شاعر ہیں۔ وہ مزاح پیدا کرنے کے سارے ہی حربوں سے واقف ہیں۔ سلیمان خطیبؔ انوکھی و اچھوتی تشبیہات اور پر اثر امیجری کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں طنز ومزاح دونوں کا بڑا حسین امتزاج ہے''۔(8)

خطیبؔ نے شاعری کے موضوعات یا تو دیہی زندگی سے لئے ہیں یا پھر شہر میں رہنے بسنے والے نچلے اور درمیانی طبقوں کی الجھنوں اور ان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ کسی بھی موضوع کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ ان کے معاشرتی شعور کی پختگی اور فنکارانہ مہارت کی عکاسی کرتا ہے۔ اختر حسین لکھتے ہیں:

''سلیمان خطیبؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک جانب ادبی شادمانی اور ذہنی شگفتگی کے اسباب فراہم کردیئے ہیں اور دوسری طرف ارباب ادب کو شاعرانہ لطافت وظرافت کی ایک متاع دلنواز بھی عطا فرمائی ہے''۔(9)

اس سلسلے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر کی رائے بڑی نپی تلی اور جامع ہے۔

''انھوں نے روزمرہ زندگی کے تلخ وشیریں تجربات سے اپنے فن کی آبیاری کی۔''(10)

سلیمان خطیب نے دکنی شاعری کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ سلیمان خطیب کی شاعری کے موضوعات اور ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے عزیز ابرار لکھتے ہیں۔

''سلیمان خطیب نے دکنی نظموں میں نام پیدا کیا......سلیمان خطیب موضوعات کے انتخاب میں رضا نقوی واہی سے بہتر نظم نگار ہیں۔ شگوفہ میں 1972ء تک ان کی ابتدائی نظمیں مثلاً کابلی والا' جشن غالب میں' اپالو

نمبر 12' اور جدید مصور' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں۔ جن میں طنز ومزاح کے ساتھ فکر کی گہرائیاں ہیں۔ انہوں نے اپنی بیشتر نظموں میں طنز سے زیادہ کام لیا ہے۔''(11)

دکنی شاعری کی اہم خصوصیت یہ رہی ہے کہ اپنی زمین سے اس کا رشتہ برقرار رہتا ہے۔ دکن کے شعراء مواد کی تلاش میں علائم وتلمیحات کی تلاش میں ایران وتوران کی طرف نہیں دیکھتے۔ خطیبؔ نے اسی خصوصیت کو برقرار رکھا ہے۔ انہوں نے یہاں کی سرزمین یہاں کے موسم بہار وخزاں، یہاں کی تاریخ اور اساطیری ودیومالائی روایتوں سے مواد، علائم وتلمیحات اور اپنی شاعری کا مواد اکٹھا کیا ہے اور اس مواد کو فنکارانہ انداز میں اس طرح سے پیش کیا ہے کہ اس میں ایک جانب نشتریت ہے تو دوسری جانب مزاح بھی موجود ہے۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1)　عابد علی خاں　''پیش لفظ، مشمولہ ''کیوڑے کا بن'' صفحہ 7　1979ء
(2)　رشید شکیب　''دکنی ادب کے چار مینار'' صفحہ 63 ' 1994ء کراچی پاکستان۔
(3)　سلیمان خطیبؔ　''پہلی بات''، مضمون مشمولہ: کیوڑے کا بن''، صفحہ 9
(4)　ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال　''باردوم''، مضمون مشمولہ ''کیوڑے کا بن'' صفحہ 11
(5)　سلیمان خطیبؔ　''پہلی بات''، مضمون مشمولہ ''کیوڑے کا بن'' صفحہ 9
(6)　اختر حسین　''سلیمان خطیبؔ، دکنی اردو کا ایک عوامی شاعر''، مضمون مشمولہ ''کیوڑے کا بن''، صفحہ 111-110
(7)　ڈاکٹر رحمت یوسف زئی　''دکن کا بانکا سلیمان خطیبؔ مرحوم''، مشمولہ بین السطور صفحہ 109
(8)　مجتبیٰ حسین　''اردو طنز ومزاح کے پچیس سال''، مضمون مشمولہ ''طنز ومزاح، تاریخ وتنقید'' مرتب۔ صفحہ 119
(9)　اختر حسین　''سلیمان خطیبؔ دکنی اردو کا عوامی شاعر''، مضمون مشمولہ ''کیوڑے کا بن''، صفحہ 9
(10)　ڈاکٹر سیدہ جعفر　''سلیمان خطیب کی شاعری''　مطبوعہ ماہنامہ ''شگوفہ'' نومبر 1978ء ص 23
(11)　عزیز ابرار ''شگوفہ کی ادبی خدمات'' مقالہ برائے ایم فل از عزیز ابرار غیر مطبوعہ مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد 1989ء ص 179

اعجاز حسین کھٹا

اعجاز حسین کھٹا 22 مارچ 1922ء کو شاد نگر، حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد کے ضلع نظام آباد میں ہوئی۔میٹرک تک تعلیم پائی اور بعد میں ادیب فاضل کا امتحان بھی کامیاب کیا۔انہوں نے ابتدائی ملازمت کے دوران محکمہ مال اور محکمہ رسد میں بطور ٹائپسٹ خدمات انجام دی۔طالب علمی کے زمانے سے ہی ادبی ذوق رکھنے والے اس نوجوان کو دیہی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔انہوں نے نشرگاہ حیدرآباد میں بچوں کے پروگرام میں نگران کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔یہاں وہ بچوں کا پروگرام پیش کرتے تھے اور بچوں کے ماموں جان کہلاتے تھے۔سقوط حیدرآباد کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر گئے ان کو شاعری کا ذوق اپنے نانا قاضی احمد علی شاہ سے ورثے میں ملا تھا۔

اعجاز حسین کھٹا ایک بذلہ سنج اور حاضر جواب شخصیت کے مالک تھے۔شیروانی، حیدرآبادی پتلون نما پاجامہ جناح کیپ اور ایک تھیلے میں بیاض ان کی شخصیت کا لازمی حصہ تھے۔انھوں نے دو شادیاں کیں۔پہلی بیوی کا نام بلقیس بیگم تھا اور دوسری بیوی کا نام اقبال بیگم تھا۔اس سلسلے میں محمد عظمت اللہ لکھتے ہیں۔

> ''دنیا جانتی ہے کہ اعجاز حسین کھٹا کی دو بیویاں ہیں لیکن حقیقت میں شرکاء حیات کی تعداد چار ہے۔نمبر ایک بلقیس بیگم، نمبر دو اقبال بیگم، نمبر تین ریڈیو اسٹیشن، نمبر چار ٹی وی اسٹیشن، ان چار شرکاء حیات میں رابطہ کا کام ایک سائیکل کیا کرتی تھی۔'' (1)

اعجاز حسین کھٹا حیدرآباد دکن میں بے حد مقبول تھے۔نمائش اور ریڈیو کے پروگراموں میں کھٹا اپنے منفرد لب ولہجہ اور اپنی مخصوص کھانسی کے ساتھ مکالمے ادا کرتے تھے۔اور لوگوں کو ہنسا ہنسا کر ان کے دل لوٹ لیا کرتے تھے۔محمد عظمت اللہ مرزا ظفر الحسن کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''دکن ریڈیو کے مرزا ظفر الحسن صاحب نے ایک مرتبہ ریڈیو کے پروگرام میں استاد سے کہا کہ ''استاد اس کھانسی کا علاج کیوں نہیں کروالیتے۔'' استاد نے فوراً جواب دیا ''ورثے میں جائیداد نہیں صرف کھانسی ملی ہے' کیا اس کو بھی ختم کردوں۔'' (2)

اعجاز حسین کھٹا ابتداء میں سنجیدہ شاعری کیا کرتے تھے' بعد میں طنز ومزاح کی طرف راغب ہوئے۔ کھٹا نے دکنی اور دہقانی زبان کو اپنے شاعری کا وسیلہ بنایا اور دکنی شاعری کے اُفق پر وہ نذیر دہقانی، سلیمان خطیب اور سرور ڈنڈا کی طرح روشن ستارے کی مانند جگمگا رہے ہیں۔ کھٹا تخلص اختیار کرنے کے تعلق سے راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

''عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک حادثہ ہوا کسی شمالی ہند سے متعلق استاد نے 'حیدرآبادی' زبان پر چوٹ چل دی۔ ''کھٹا کھانے والے زبان کیا جانیں'' بس یہ ''دکھنی کے شہر'' حیدرآباد میں احیاء کیلئے ایک شوشہ تھا۔ اعجاز حسین نے اپنا تخلص ہی ''کھٹا'' رکھ لیا اور اسی زبان میں شعر کہنا شروع کردیا''۔ (3)

اعجاز حسین کھٹا کی شاعری میں املی کا درخت ایک امتیازی نشان کی طرح نظر آتا ہے۔ املی کا درخت دکن کی سرزمین اور کھٹا دکنی پکوان اور دسترخوان کی علامت ہے۔ اعجاز حسین کھٹا اپنی شاعری میں دکن کی ترقی اور دکنی عوام کو بنیادی مسائل کو موضوع بناتے ہیں۔ ان کی زبان و بیان پر بھی دکن کی مقامی بولی کا گہرا اثر تھا۔ املی کا درخت سے وابستگی گویا ارض دکن سے وابستگی کا مظہر تھی' ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔

قبر پو کھٹے کی ہوگل کی جگہ تازہ چگر
حشر تک یارب رہے سایہ فگن املی کا بن

اعجاز حسین کھٹا کم گو شاعر تھے ان کا شعری ذخیرہ بہت کم ہے لیکن انہوں نے اپنے کلام میں معاشرہ کی بھرپور عکاسی کی ہے اور جو بھی ان کا شعری سرمایہ ہے وہ ان کی شہرت دوام کیلئے کافی ہے۔ کھٹا کے کلام میں معاشرتی مسائل کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ کلام میں سلاست روانی اور زور ہے۔ ان کے کلام کے بارے میں عظیم الدین محبت کی رائے ہے کہ:

''کلام میں محمد قلی قطب شاہ کا رنگ جھلکتا ہے'' (4)

کھٹا کی نظمیں ''قلی قطب شاہ''، ''سلطان العلوم'' اور ''بہادر یار جنگ'' سے عظیم الدین محبت کی رائے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ان نظموں میں قدیم دکنی رنگِ سخن، لہجہ اور لفظیات بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فقیراں صفت تو مرا تاجور | اٹھا تیرا دھن بہر علم و ہنر
اتھا علم غیری زباناں میں قید | نکلنے کو باہر پھڑکتا تھا صید
بھرگ بھر کو آزاد اس کو کریا | جہاں میں تو آباد اس کو کریا
تو سلطان علم کا تھا سب جانتیئیں | ارے دوس کیا دشمناں مانتیئیں
جو بھوکے منواں میں نوالے دیا | گیتج تیئیں تھے کملاں دوشالے دیا
تراجد دیا وہ امن کا درس | کہ نادر شا ظالم بھی کھایا ترس

یہ اشعار کھٹا کی نظم ''سلطان العلوم'' کے ہیں۔ جس میں انہوں نے آصفیہ سلطنت کے آخری حکمراں کی فیاضی، دریا دلی، انسان دوستی، غریب پروری کا بیان کیا ہے۔ آخری شعر میں کھٹا نے آصف جاہ اول کی اس عظیم صفت کو بیان کیا ہے جو انہوں نے تن تنہا نادر شاہ کے قتل عام کے موقع پر سامنا کرتے ہوئے حاصل کی تھی۔ جس کے صلہ میں عوام کا قتل عام روک دیا گیا تھا۔ دہلی میں امن و امان عام ہوا تھا۔

کھٹا کو قائد ملت بہادر یار جنگ، جو اپنے وقت کے بے بدل خطیب تھے ان سے والہانہ عقیدت تھی۔ ''بہادر یار جنگ'' کے عنوان سے لکھی اس نظم میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے۔

وہ مومن وہ حُر میرا صاحب نظر | کریا تھا خدا نے جسے باخبر
خطابت کبھی اس کی شعلہ لگے | کبھی بن کو شبنم کلیجہ لگے
جو ہر سانس جلتا رہا وہ دیا | اجالا جو مجھ کو دیا وہ دیا

ان کے کلام پر رشید شکیب کا یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:

''کھٹا واقعات نگاری میں کمال کے جوہر دکھاتے ہیں۔ روزمرہ کی دکنی

زبان میں معاشرتی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی مسائل پر اس طرح نشتر زنی کرتے ہیں کہ زخم لگنے کے باوجود اسے زخم پر مرہم رکھا محسوس ہوتا ہے۔ کھٹا کی پوری شاعری پر نظر دوڑائیں تو یہ محسوس ہوگا کہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو مزاح کا روپ دے کر زندگی کا سلیقہ اور جینے کا ڈھب سکھایا اور گھریلو مسائل اور الجھنوں کے کرب کو محسوس کر کے شعری حقیقت کا روپ دیا۔''(5)

کھٹاؔ کے کلام میں طنز ومزاح کے ساتھ مقصدیت نمایاں ہے۔ انسانی کوتاہیوں پر وہ طنز کرتے ہیں انسانوں کو خود اعتمادی اور خودداری کا درس دیتے ہیں۔ کورانہ تقلید سے ان کو سخت نفرت ہے۔ سیاسی غلامی اور رسم ورواج کے بندھنوں میں جکڑا انسان اپنے حقوق کے حصول سے غفلت برتتا ہے۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ مقدر کر دیا گیا ہے اس کو بھگتنا ہے۔ اس طرز فکر وعمل نے انسان کو کاہل بنا دیا ہے۔ کھٹاؔ نے اپنی نظم ''گناہ'' میں اس طرز فکر اور طرز عمل پر بڑی سخت تنقید کی ہے۔ یہ حقیقت ہمارے ذہن میں رہنی چاہیے کہ اعجاز حسین کھٹاؔ نے عملی طور پر بہادر یار جنگ کی لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ وہ دکنی عوام کو ہر طرح کی غلامی سے خود کو آزاد کرنے کا پیام دینے میں' قائد ملت کے ہم روش رہے ہیں۔ اشعار دیکھئے:

دلاں سے قفس کو بھلانا گنا ہے　　　　رہائی کا تک دھیان لانا گنا ہے
ہے بستی بھی اپنچ گاواں بھی اپنے　　　　یہ سب کچھ پن حق جتانا گنا ہے
گھراں سب سترول ہوگئے تو ہوگئے　　　　چھتاں پوسے باندر بھگانا گنا ہے
انوکھی ہے یاں پیت کی ریت لوگو　　　　دکھیا دل تو پلکاں بھگانا گنا ہے

کھٹاؔ کا دور تہذیبوں کے تصادم کا دور تھا۔ مغربی تہذیب وثقافت کی مقبولیت کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ لوگ معمولی شئے کیلئے یورپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے لگتے تھے۔ امپورٹیڈ اشیاء کے استعمال کے شوق میں دیسی اشیاء کو حقارت سے دیکھنے لگتے تھے۔ کھٹا نے اس صورتحال کو اپنے اشعار میں پیش کیا اور ساتھ ہی لوگوں کو خود کفیل بننے کی دعوت دیتے ہیں۔

صفرا ہوا تو دمڑی کی ادرک مجھے ہے بس　　　　نکو میاں فرنگی کا جنجر نکوچ نکو

مٹھے کو جی منگے تو ذرا گڑ کتر کو کھا کڑوی رہتی پڑوسی کی شکر نکو چ نکو

ایک اور شعر دیکھئے جس سے مشرقی اور مغربی تہذیب کی کشمکش اور بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار کا کس عمدگی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مشرقی ہرنیاں چھوڑ دیا، حق ڈبایا ان کا تو راج تیرے گھر کریں مغرب کی گھوڑیاں کب تلک؟

کھٹؔا نے اپنے کلام میں سماجی، سیاسی و معاشرتی مسائل کا صرف بیان ہی نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے ان کے حل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ''سائیں کی صدا'' جس میں وہ غیر ملکی حکومت سے آزادی کے حصول کیلئے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اہل وطن کو سامراجی استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔

جاگ رے بابا جاگ رے بابا گھر کو لگی ہے آگ رے بابا
لخت جگر سب تک رئیں منہ کو دودھ کو پی ریں ناگ رے بابا
بھیک نہیں آزادی حق ہے
سجنا نہیں بیراگ رے بابا

معاشرے میں پائی جانے والی ناہمواریوں، حق تلفی اور ظلم کے خلاف انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنی فکر کو عوام تک پہنچایا۔ یہی ان کی شاعری کا محور ہے۔

سر پوتڑ تڑ کب تلک؟ ادھڑیں گے چمڑیاں کب تلک؟
لہو کے دھاراں کب تلک کوڑیاں، کلہاڑیاں کب تلک

اعجاز حسین کھٹؔا خوددار طبیعت کے مالک تھے انکی طبیعت میں قناعت پسندی اور عزت نفس کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ محنت شاقہ سے جو بھی ملتا اس پر وہ قانع رہتے تھے۔ اور یہی درس انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ قوم کو دیا۔ شعر ملاحظہ ہوں۔

املی کے جھاڑ کے مجھے بس بس ہے چھاؤں یہ　　　غیروں کے اُنچے محل یہ چیمبر نکوچ نکو
کھٹّے کی لاش گور میں ننگا ئچ گاڑدیو　　　اس کے کفن کو غیر کی چدّر نکوچ نکو

کھٹّا اپنے کلام میں نوجوانوں کو زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ زندہ رہنے کیلئے زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بات کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم ''سوال'' میں بڑی خوبصورتی سے کامیاب زندگی کیلئے عمل کو کامیابی کی کنجی قرار دیا ہے۔ یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

پرہیز کرے نئیں دوائیاں پیئے کیوں　　　مسیحا کو ناحق الزام دیئے کیوں
لباں پوری، پیٹھ گھوڑے کی خالی　　　یہ کیسا تماشا تھا ایسا کئے کیوں

وہ عمل پیہم کی تلقین کرتے ہیں۔ شاعر مشرق نے قوم کو اپنے بلند آہنگ لہجہ میں عمل کی ترغیب دی اور کھٹّا نے اسی درس کو دھیمے اور مزاحیہ انداز میں دہرایا۔

ہے یہ ہتھکڑیاں تو ہاتھ کو حرکت تو دے　　　ہاتھ میں پہنے چوڑیاں کھلیں گا پھگڑیاں کب تلک

کھٹا نے ہمیشہ اپنی شاعری میں دکنی عوام اور مسائل کو جگہ دی اور بارہا عمل کی تلقین کی۔

جو ماٹھی میں مل جاتا پھل پھول آئیں　　　تیرے ہاتھ میں یہ ہنر ہے کی نئیں کی

اعجاز حسین کھٹّا کو واقعات نگاری میں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے دکنی زبان میں معاشرتی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ انہوں نے ان مسائل پر نشتر زنی اس انداز سے کی ہے کہ نشتر لگنے کے بعد زخم کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی بلکہ زخموں پر مرہم رکھنے کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے زندگی کے تلخ حقائق، گھریلو مسائل اور معاشی کرب کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ مغرب کی کورانہ تقلید سے انہیں سخت نفرت تھی اس کا انہوں نے بارہا اظہار کیا ہے۔ مغرب زدہ ماحول پر وہ بھرپور طنز کرتے ہیں۔

میرا بچہ اُجلے ملک میں مٹھّیاں بھر بھر تنخوا ہے
ہر ہر عید پر خطاں بھی آئیں انگریزی میں لکھتا ہے

☆☆☆

گرل فرینڈ ہے یہ تو اپنی ایسی ویسی مت سمجھو
ابھی تو ہم آپس میں پرکھ رئیں سوچیں گے پھر شادی کو

انہوں نے اپنی نظموں میں، قلی قطب شاہ، سلطان العلوم، مردقلندر، اور برکت قادری پر اپنے تاثرات اور احساسات کا اظہار کیا ہے۔ آصف سابع کی جانب سے جامعہ عثمانیہ کا قیام کے نتیجہ میں اردو زبان تیزی سے ترقی طئے کررہی تھی۔ طب اور انجینئرنگ جیسے علوم کا ذریعہ تعلیم اردو ہو چکا تھا اور ان علوم کی کتابوں کی ضرورت کو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ پوری کررہا تھا۔ میر عثمان علی خاں کے اس کارہائے نمایاں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ترے راج اردو ہوئی سرخرو		ترا دور تہذیب کی آبرو
بلاشبہ ان کا تو سلطان تھا		ستارے تھے عالم تو اسمان تھا
گیا رب کنے لے فقیرانہ شان		ہوا دفن شاہاں کے نئیں درمیاں

اعجاز حسین کھٹا اپنے عہد کے کئی علماء' قائدین' اور شعراء سے متاثر تھے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کی شخصیت نے بھی ان پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کی کئی نظموں میں علامہ اقبال کا پیغام عمل نظر آتا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کی وفات پر ان کے جذبات واحساسات ملاحظہ ہوں:

کلیجہ مشرق کا پھڑپھڑایا کہ اس کا اقبال سوگیا ہے
جلی ہے اردو کی کوکھ کیا کوں غریب کا لال کھوگیا ہے

تقسیم ہند کے بعد دکن کے حالات کچھ اچھے نہیں رہے۔ سیاسی اتھل پتھل کے بیچ اعجاز حسین کھٹا نے پاکستان ہجرت کی۔ وطن مالوف سے ہجرت کرجانے کے بعد ان کا دل اپنے وطن کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہا۔ ان کو سقوط حیدرآباد کا غم اور والئی دکن آصف سابع کی مجبوریاں یاد آتی تھیں اور وہ قطب شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قطب شاہ دلاسا دے عثمان کو
زخم کھائے گھبرائے سو، جان کو

وہ پوچھے ہے کیسا ہے میرا دکن
وہ میرا وطن

وہ مہ لقا، ولی، صفی اور حضرت امجد کی عرفانی شاعری کو دردانگیز انداز میں یاد کرتے ہیں:

مری مہ لقا بائی چندہ ولی
وہ رند خوش اوقات اپنا صفی
خدا مست امجد وہ عرفاں سخن
وہ میرا وطن

سقوط حیدرآباد کے بعد اردو زبان کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا جانے لگا۔اور کئی جیالے اپنے حق کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔حکومت کے جانبدارانہ رویے کی وجہ سے اردو زبوں حالی کا شکار ہونے لگی۔ان باتوں کا کھٹا کو شدید صدمہ تھا۔جس کا اظہار انہوں نے کچھ اس طرح کیا:

وہ اردو کا اب زور بازو ہے کاں
زمیں کھا گئی رے میرا آسماں
جسے روئنگا حشر لگ تک دکن
وہ میرا وطن

پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد ان کی شاعری کے مزاج میں تبدیلی آ گئی۔اس دور کے کلام میں طنز کی نشتریت نمایاں نظر آتی ہے۔محمد عظمت اللہ لکھتے ہیں۔

''اعجاز حسین کھٹا کی پہلی شادی کے بعد ان کی حاضر جوابی اور طنز ومزاح میں اور بھی نکھار آ گیا تھا مگر سقوط حیدرآباد اور دوسری شادی کے بعد مزاح کی شمع مدھم ہوتی چلی گئی۔اور پاکستان آ کر بجھ گئی۔مگر زمانے کی ستم ظریفی سے متاثر ہو کر شاعری میں طنز کے نشتر مزید تیز ہوتے چلے گئے۔''(6)

سقوط حیدرآباد کے بعد جب وہ پاکستان پہنچے تو وہاں رشوت خوری اور اقرباء پروری عام تھی۔حکمرانوں کی

عوام دشمن پالیسیوں اور رشوت خور نوکر شاہی کی وجہ سے ملک خسارے میں جا رہا تھا۔اس المیہ کو دیکھ کر کھٹا کا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔وہ ان موقع پرست سیاست دانوں کو کچھ اس طرح جھنجھوڑتے ہیں۔

کیا کیا تج کو ماٹھی پھک کو　　پودے کو کئیں جھاڑ کرے
پھلاں سارے باندر کھارئیں　　کیسا بغیچہ ہاڑ کرے

☆☆☆

اپنے نگر کے یہ رکھوالے　　اپنے سہارے کیا ہورئیں
انکھیاں کھولو کرتا دھرتا　　کیا کیا کھوئے' کیا کھورئیں

کھٹا اپنی نظم ''نکّو'' میں قوم کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اتحاد کا درس دیتے ہیں اس نظم میں وہ ایک ایسے معاشرے کی تمنا کرتے ہیں جہاں ایک طبقہ دوسرے کا حریف نہ ہو۔جہاں خلوص،مہر ووفا کے پھول کھلیں۔جہاں امن وامان کا دور دورہ ہو۔کھٹا کے ہاں حب الوطنی کے عناصر موجود ہیں۔دکن کی گنگا جمنی تہذیب سیکولر روایات کی حامل رہی ہے۔کھٹا اس تہذیب کے علمبردار تھے۔اس نظم میں وہ ہندو مسلم بھائی چارے اور اتحاد واتفاق کی ضرورت اور فرنگی سامراج سے نفرت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

اپن لوگاں کا رنگ اچ تو پھر یہ چھیڑ خانیاں کیوں　　پنپنے کے کرو چالاں بھلا کیچڑ کرو نکّو
وہ آئے اُجلے رکا ساس بدل کو روپ دیوتا کا　　یہ پھر کھڈے میں ڈھکلیں گے انوں کی پچ کرو نکّو
آپس کی بات پو تکرار کیا ہے مل کو طئے کرلیو　　ہڑپ کر جائیں گا باندر اسے منصف کرو نکّو
غضب ہے دونوں باز ولڑ کو کٹ جانا قیامت ہے　　وقت ہے مل کو لڑنے کا ارے لڑکو مرو نکّو
کوئی دیکھے بچارے کا کلیجہ ہائے چھنی ہے　　سنو ٹک بوم کھٹے کی ارے تھٹّا کرو نکّو

کھٹا نے انسانی زندگی کے تمام مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ان کے ہاں گہرا تفکر اور عمیق مشاہدہ ہے۔وہ اپنے مخصوص طرز اظہار کو استعمال کر کے لوگوں کو دعوت غور وفکر بھی دیتے ہیں۔البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دکنی کا وہ مخصوص رنگ وآہنگ جو''سلطان العلوم میر عثمان علی خان''''بہادر یار جنگ''اور''قلی قطب شاہ''میں ہے ہر جگہ برقرار نہ رکھ سکے۔

اعجاز حسین کھٹا کی پوری شاعری دکنی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔کھٹا کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کرتے

ہوئے محمد عظمت اللہ رقمطراز ہیں:

''اعجاز حسین کھٹا دکنی اور دکن کی دیہاتی زبان کے صاحب طرز شاعر تھے۔ان کے ساتھیوں اور ہم عصروں میں کسی نے ان کے اور نذیر دہقانی کے برابر شہرت حاصل نہیں کی۔اعجاز حسین کھٹا دکنی لباس اور روایات کا نمونہ دکنی شائستگی، شرافت و تہذیب کے علمبردار تھے۔''(7)

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس اعجاز حسین کھٹا کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''کھٹا اپنی شاعری میں دکن کی ترقی اور دکنی عوام کے مسائل کو موضوع بناتے۔ان کی زبان و بیان پر بھی دکن کی مقامی بولی کا گہرا اثر تھا......دکنی زبان دکنی ماحول اور دکنی عناصر کے ساتھ کھٹا کی شاعری میں ملک کو درپیش سیاسی مسائل کی نمود اور انگریزی سامراج سے بیزاری کی جھلک نظر آتی ہے۔''(8)

دکنی شاعری میں اپنی منفرد شناخت رکھنے والے اس شاعر نے 11 جون بروز جمعہ 1993ء کو اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رشتہ توڑ لیا۔ان کی تدفین کراچی، پاکستان میں عمل میں آئی۔ان کے آخری وقت میں ان کی کوئی اولاد ان کے پاس نہیں تھی ملازمت کے سلسلے میں بیٹے بیٹیاں بیرون ملک مقیم تھے۔کھٹا نے شاید ایسے ہی وقت کے لئے کہا تھا۔

سانساں میرے پورے ہورئیں، نس نس میرا ہے ماندا
کس کے کھاندے ہاتھ رکھوں میں، کون مجھے دے اب کھاندا

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) محمد عظمت اللہ " اعجاز حسین کھٹا...... مسیحا کو سوگوار چھوڑ گیا" مطبوعہ "سب رس" کراچی اگست 1993 ص 18

(2) محمد عظمت اللہ " اعجاز حسین کھٹا...... مسیحا کو سوگوار چھوڑ گیا" مطبوعہ "سب رس" کراچی ص 18

(3) راج بہادر گوڑ بحوالہ "دکنی ادب کے چار مینار" 1994ء ص 135

(4) عظیم الدین محبت "مملکت آصفیہ" جلد اول ص 505

(5) رشید شکیب "دکنی ادب کے چار مینار" ص 136

(6) محمد عظمت اللہ " اعجاز حسین کھٹا...... مسیحا سو کو گوار چھوڑ گیا" مطبوعہ "سب رس" کراچی ص 18

(7) محمد عظمت اللہ " اعجاز حسین کھٹا...... مسیحا سو کو گوار چھوڑ گیا" مطبوعہ "سب رس" کراچی ص 19

(8) ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس "طنز و مزاح کے نالگو برادرس" مطبوعہ "قومی زبان" اکٹوبر 2006ء ص 67

سرور ڈنڈا

غلام سرور خاں نام اور تخلص ڈنڈا تھا۔ ادبی دنیا میں سرور ڈنڈا کے نام سے معروف ہوئے۔ غلام سرور خاں (سرور ڈنڈا) عبدالقادر اور صفیہ بیگم کے گھر 1925ء کو گوشہ محل، حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انوار العلوم ہائی اسکول اور چادر گھاٹ ہائی اسکول میں ہوئی۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول سے ہی 1937 میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے بعد کالج آف فائن آرٹس سے کمرشیل آرٹس میں ڈپلوما کیا۔ شاعری اور مصوری دونوں کا تعلق فنون لطیفہ سے ہے۔ ایک عرصہ تک پینٹنگ ان کا ذریعہ معاش رہا۔ 1957ء میں تعمیراتی کاموں کے گتہ دار بن گئے۔

سرور ڈنڈا کی شادی ان کی ماموں زاد بہن ڈاکٹر مہر النساء سے 1951ء میں ہوئی۔ جن سے انھیں دو اولادیں ہوئیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ فیروز سرور اور فردوس سرور۔

شاعری کی ابتداء کے بارے میں وہ خود بتاتے ہیں کہ (1) حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی گنبد (جو گلبرگہ میں واقع ہے) کے اندر موجود نقش و نگار اور آیتوں میں رنگ آمیزی کا فرض انجام دے رہے تھے۔ سعید بن محمد نقش کے ہمراہ وہ بحیثیت شاگرد کام کر رہے تھے کہ اچانک کچھ گنگنانے لگے۔ سعید بن محمد نے کہا 'ارے تو تو شاعری کرنے لگا یہ خواجہ کا فیضان ہے'۔ اس طرح ڈنڈا کی شاعری کا آغاز ہوا۔ ڈنڈا نے اپنی پہلی نظم 1952ء میں رائچور کے آل انڈیا مشاعرہ میں سنائی تھی۔ اس مشاعرے کی صدارت معروف رباعی گو شاعر امجد حیدرآبادی کر رہے تھے۔ امجد حیدرآبادی نے ڈنڈا کی نظم سن کر بڑی ہمت افزائی کی۔

1948ء کے بعد دکنی شاعری کے مزاج میں فرق آیا اور یہی دور سرور ڈنڈا کی شاعری کے عروج کا ہے۔ پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کی ادبی محفلیں درہم برہم ہو گئیں۔ دہقانی اور کھٹا پاکستان ہجرت کر گئے۔ 1949ء میں ممنوعہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبران قید و بند کی زندگی گذار رہے تھے اور کچھ روپوش تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا عدم اور وجود برابر ہو گیا۔ چند باہمت اور جرات مند نوجوانوں نے اس انجمن کی تجدید و احیا کا کام کیا اور انجمن کی نشستیں منعقد ہونے لگیں۔ ایسی ہی ایک نشست میں ڈنڈا نے اپنی مشہور نظم ''نیلم پری'' سنائی۔ جس پر دستور کے

مطابق گرما گرم مباحث ہوئے۔ اس نظم کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ نظم سیاسی ہے اور اس میں حکومت وقت کی لسانی پالیسی پر طنز کیا گیا لیکن عزیز قیسی کے مطابق ڈنڈا نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے یہ نظم اسکول آف آرٹس کی طالبہ کے نک چڑھے پن اور انگریزی لہجہ میں تن کر بات کرنے کے انداز پر طنز کرتے ہوئے لکھی تھی۔(2)

سرور ڈنڈا کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ ان کی والدہ کو دکنی زبان کے محاوروں پر بڑا عبور حاصل تھا۔ وہ گھریلو خاتون تھیں اور تلنگانہ کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ سرور ڈنڈا اپنی ماں کے لب ولہجہ کو غور سے سنتے اور بسا اوقات محاوروں اور روزمرّہ کو نوٹ بھی کرلیا کرتے تھے۔ محمد لطیف الدین لکھتے ہیں۔

''سرور ڈنڈا کے کلام میں جہاں کہیں بھی دکنی لفظ ملے گا وہ ان کی والدہ محترمہ کی دین تھی۔ ان کی والدہ محترمہ روزآنہ گھریلو بات چیت میں جو الفاظ یا جملے استعمال کرتی تھیں، اس زمانے اور ماحول کی زبان تھی۔ وہ اپنی ماں کے ان الفاظ کو جمع کر کے پھر اسے کلام میں بھی استعمال کرتے تھے۔''(3)

سعادت علی خاں سرور ڈنڈا کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ وہ بھی ڈنڈا کی ماں کا تعارف کچھ اس طرح کراتے ہیں۔

''دانشمندوں کا خیال ہے کہ بچے کی تربیت گاہ اس کی ماں کی گود ہوتی ہے۔ اور سرور ڈنڈا نے بھی اپنی ماں کی گود سے خوب دکنی الفاظ کا اکتساب کیا۔ ان کی والدہ دکنی محاوروں کا سمندر تھیں اُس دور کی ساری خواتین سے کچھ زیادہ ہی اس سلسلے میں سرمایہ دار تھیں۔''(4)

ڈاکٹر امیر عارفی سرور ڈنڈا کی ابتدائی مشق سخن اور ان کے استاد کے تعلق سے رقمطراز ہیں۔

''اپنی ابتدائی نظمیں انھوں نے اعجاز حسین کھٹا کو دکھائی تھیں۔ جس کو دیکھ کر کھٹا نے کہا تھا کہ 'سرور تیرے میں شاعری کے بڑے جوہر چھپے ہوئے

ہیں۔تو ریاض کرایک تیرا بھی نام چمک جائے گا' اس لئے وہ مرتے دم تک
کھٹا کو معنوی اُستاد مانتے رہے۔'' (5)

اعجاز حسین کھٹا کی ہمت افزائی سے سرور ڈنڈا کے اعتماد میں اضافہ ہوا۔اور وہ کھٹا کو آخری سانس تک اپنا استاد مانتے رہے۔سرور ڈنڈا نے اپنے استاد کے برخلاف خالص دکنی کو چھوڑ کر حیدرآباد کے گلیوں میں بولی جانے والی شہری دکنی کو وسیلہ اظہار بنایا۔چنانچہ انیسہ سلطانہ لکھتی ہیں:

''سرور ڈنڈا نے دکنی شاعری کی لیکن یہ قدیم دکنی سے اور نذیر احمد
دہقانی، اعجاز حسین کھٹا، علی صائب میاں کی دکنی زبان سے مختلف ہے۔
انہوں نے دیہاتی زبان استعمال نہیں کی بلکہ حیدرآباد کے عوام کی زبان جو
اس شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے استعمال کی''۔(6)

انیسہ سلطانہ نے جو کچھ لکھا ہے ڈنڈا کے کلام کے مطالعے کے بعد ان کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے لیکن پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''ڈنڈا کی عظمت اس میں ہے کہ ان کی شاعری غیر معمولی حد تک دکنی ہے
ان کی دکنی میں موجودہ اردو کا امتزاج نہیں یا ہے تو بے حد کم۔انہوں نے طنز و
ظرافت سے بھی کام لیا ہے اور ہنستے ہنساتے دکھتی رگوں کو چھیڑا ہے''۔(7)

ڈنڈا کی زبان غیر معمولی حد تک تو کجا دہقانی، علی صائب میاں، کھٹا حتیٰ کہ سلیمان خطیب کی دکنی بھی نہیں۔ ان کی مشہور نظم ''جنتا کی عرضی'' ملاحظہ ہو:

جنتا کی ہے یہ عرضی
مانگے تمہاری مرضی
اوہ آندھرا کے گاما
سنجیوا ریڈی ماما
بے کاری بے روزگاری

یہ عام ہے بیماری
روزگار سے لگانا
سنجیوا ریڈی ماما
تعلیم نئیں سو بچے
نکلیں گے کاں سے اچھے
تعلیم فری دلانا
سنجیوا ریڈی ماما
قسمت کے پھولاں کھل گئیں
بچھڑے سو بھاگاں مل گئیں
آندھرا اور تلنگانہ
سنجیوا ریڈی ماما
پولیس کی ڈائری میں
ڈنڈے کی شاعری میں
نہ فُل اسٹاپ نہ کاما
سنجیوا ریڈی ماما

یہ نظم انیسہ سلطانہ کی رائے کی تو تائید کرتی ہے لیکن اسی کے ساتھ سلیمان اطہر جاوید کی پرعظمت رائے کی نفی کرتی ہے۔ اس لئے کہ یہ زبان جو کہ ان کے سارے کلام کی نمائندگی کرتی ہے۔ پولیس ایکشن کے بعد والے حیدرآباد کی شہری بولی کی اچھی مثال ہے۔ جسے ہم خالص دکنی یا قدیم دکنی ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

سرور ڈنڈا نے اپنے عصر کے حالات کو بڑی ایمانداری سے شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ ان کی بعض نظمیں واقعاتی زمرے میں شمار کی جائیں گی۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے اپنے عہد اور اپنے عصر کی نبض کو قید کرلیا ہے۔ ان کی نظمیں مثلاً لیاقت نہرو معاہدہ، سمٹے تو ہم ہمالہ وغیرہ عصری حسیت کا عمدہ نمونہ ہیں۔

لیاقت نہرو معاہدہ برصغیر کی تاریخ کے تاریک ترین مرحلے کے بعد روشنی کی کرن لایا تھا۔ ہندوستانیوں کی جانوں اور ملک کے بڑے حصے کے خون سے سرخ ہونے کے بعد یہ روشنی کی کرن پیدا ہوئی تھی۔ اس معاہدے کی برصغیر کی سیاست میں بڑی اہمیت تھی۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ڈنڈا نے یہ نظم لکھی تھی۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہو۔

ہر کام اِک نوائچ کریں گے اپن تپن | مل کو جئیں گے مل کو مریں گے اپن تپن
بے کیفوں میں رنگ بھریں گے اپن تپن | دنیا کو ساری دنگ کریں گے اپن تپن
جلنے کو لوگاں بھوت جلیں جلا کریں | وعدہ کریں، کبھی نہ پھریں گے اپن تپن

رہنماؤں کو وعدے سے پیچھے نہ ہٹنے اور مستقل مزاجی کی تاکید کرنے کے بعد دشمن ممالک کو مخاطب کرتے ہوئے ڈنڈا کہتے ہیں۔

دیکھا اگر کوئی ذرا بھی بد نگاہ سے | بجلیاں کے نا دُس پو گریں گے اپن تپن
تارے بھی دشمناں کو نظر آئیں گے دن میں | مل جل کو ایسا ڈھول ڈھریں گے اپن تپن
ناخن کے ساتھ جُگالہ لگا رہے | مل جل کو ایسا ساتھ رہیں گے اپن تپن
سینہ بڑھانے والوں کا سر توڑنے کو اب | ڈنڈے کو ساتھ ساتھ رکھیں اپن تپن

''ناخن کے ساتھ جگالہ لگا رہے'' ڈنڈا نے کیسا بولتا مصرعہ کہا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے دن میں تارے نظر آنا، ڈھول ڈھرنا، بجلی بن کو گرنا، سر توڑنا جیسے محاوروں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے جذبے حب الوطنی کا اظہار کیا ہے، جس میں خلوص واضح طور پر نظر آتا ہے۔

سرور ڈنڈا نے علاقائی سیاست کو موضوع بنا کر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ جنتا کی عرضی، شاہ پور واڑی، گتہ داروں کی عرضی، ڈنڈا کتھا، بوڑا کتھا، بھوک لگی ہے بھوک رے دادا وغیرہ۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر سرور ڈنڈا کی شاعری کے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''آج ان کی نظمیں جنتا کی عرضی، لیاقت نہرو معاہدہ، اور سمٹے تو ہم ہمالہ، تاریخی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ لیکن ان نظموں میں کچھ

ایسے تجربات کی ترجمانی ملتی ہے جو ہر دور میں انسان کو غور وفکر کی دعوت دیتے رہے ہیں۔انسانی اقدار کی پامالی' سماجی استحصال' مقتدر طبقے کی لوٹ کھسوٹ اور معاشرت میں عدم توازن کا احساس ان نظموں کی تہہ میں جاری وساری کی مظہر ہیں۔اپنی مشہور ومقبول نظم 'شاہ پور واری' میں انھوں نے سماج کے مختلف شعبوں کی کوتاہیوں' ان کی ناقص کارکردگی' ان کی بدعنوانیوں اور کھوکھلے پن کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔''(8)

معروف مزاح نگار مجتبیٰ حسین سرور ڈنڈا کی شاعری کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی اہمیت پر اظہار خیال کیا ہے۔

''ڈنڈا کی شاعری کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ انہوں نے کہیں بھی تصنع یا مروت سے کام نہیں لیا۔ بلکہ انہوں نے نہایت بے دردی اور سنگدلی سے ہمارے سماج کی برائیوں کے چہرے سے نقاب الٹ دیا۔ڈنڈا کی شاعری مظلوموں کی حمایت میں ظالم کے خلاف دفتروں کی حمایت میں سرمایہ داروں کے خلاف' سچائی کی حمایت میں جھوٹ کے خلاف' پاکیزگی کی حمایت میں گندگی کے خلاف ایک بھرپور وار تھی۔''(9)

سرور ڈنڈا نے اپنی تخلیقات میں تلگو الفاظ کا بھی موقع محل کی مناسب سے استعمال کیا ہے۔تلگو لفظیات کے استعمال سے ان کے کلام میں ایک ندرت ودلکشی پیدا ہوگئی ہے۔عزیز قیسی لکھتے ہیں:

''سرور ڈنڈا کی زبان میں تلگو کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ بلکہ ان کی نظموں میں ''ایم سوستا نوکوٹو'' اور بتکماں'' تو مقامی تلگو سے ایسے ہی اخذ کئے ہوئے الفاظ پر مشتمل ہے شائد اسی سبب سے سننے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیدرآباد شہر کی عوامی بولی ہے''۔(10)

سرور ڈنڈا کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہیکہ انہوں نے عوام کو پہلی بار لوک گیتوں کے مختلف

سانچوں ''بورّا'' سے روشناس کروایا۔ ''بورّا کتھا''، ڈنڈاا کتھا'' بھی لوک گیتوں کا ایک سانچہ ہے۔اس میں نظم اور نثر کی آمیزش سے کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ''بورّا کتھا'' میں تین آدمیوں پر مشتمل ایک دلّم یا اسکواڈ ہوتا ہے۔ دو آدمی سوالات کرتے جاتے ہیں اور ایک جواب دیتا ہوا کہانی آگے بڑھاتا جاتا ہے۔ڈنڈؔا نے ہولی پر گائے جانے والے گیت کے انداز میں بھی ''شانتی بتکماں'' کے نام سے نظم لکھی۔کئی لوک گیت بھی انہوں نے لکھے ہیں۔اس طرح سرور ڈنڈا نے تلگو عوامی شاعری سے آگہی کا ثبوت دیا ہے۔

سرور ڈنڈؔا ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی شاعری اسی متوسط طبقے کے گرد گھومتی ہے۔ڈنڈؔا کا عہد پرآشوب عہد تھا۔کسان اور مزدور طبقہ کا مقدر استحصال کا شکار ہوتا تھا۔آزادی حاصل ہونے کے باوجود ابھی اس کے ثمرات عام آدمی کے حصول سے باہر تھے۔ہنوز دور غلامی کی کیفیات باقی تھیں۔ڈنڈؔا بچشم خود ان حالات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ ''اِدے نا ما دیشم'' میں ڈنڈا نے طنزیہ انداز میں معاشرتی اور سیاسی جبر کے خلاف آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔اس نظم میں شہری اور دیہاتی زندگی اور ماحول کے ساتھ عوامی احساسات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

سدا میرے گاواں پو غربت کا موسم
نہ فاقوں سے فرصت نہ دمیچ ہے دم
یاں لنگی بھی گت نئیں واں ان کو ہے ریشم
اِدے نا ما دیشم، اِدے نا ما دیشم

جاں جینے پو ٹیکساں جاں مرنے پو ٹیکساں
جاں جنور سے بدتر ہیں بے چارے انساں
جاں ملنا بھی مشکل ہے بیڑی کے دو دم
اِدے نا ما دیشم، اِدے نا ما دیشم

ڈنڈؔا کی یہ نظم طنز کا عمدہ نمونہ ہے۔وہ بڑے فنکارانہ انداز میں حالات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔وہ ذات پات، رنگ و نسل اور مذہب کی بنیاد پر انسانیت کی تقسیم کے خلاف تھے۔وہ روزمرہ زندگی کے مشاہدے اور مطالعہ

سے شعری مواد اکٹھا کرتے ہیں اور اس کو سیدھے سادے اور بول چال کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ پولیس ایکشن کے بعد کا نقشہ ایک شعر میں وہ اس طرح کھینچتے ہیں۔:

کیا ہم پو گذر گئی اے باشا تو نکّو پوچھ
پاپڑ کے ناد بیل دیائے ہم کو زمانہ

ان کی تخلیقات میں دیہی معاشرت کے خوبصورت مرقعے نظر آتے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں سرور ڈنڈا نے دیہاتی منظر میں مہاجن کے کردار کی تصویر کشی کی ہے۔ مہاجن کم قیمت پر کسانوں سے اناج خریدتا ہے اور زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے۔ اس طرح جو منافع کسان کو مل سکتا ہے وہ مہاجن کی تجوری میں چلا جاتا ہے۔

رنگ لائیں گا مہاجن تیرا یہ سر اٹھانا　　کبھی بھاؤ کو گرانا، کبھی بھاؤ کو چڑھانا
تو جتنا چاہے منجھے دل کھول کر ستائے　　ایک دن پڑنگا ظالم اللہ کو منہ دکھانا

سرور ڈنڈا فطرتاً رجائیت پسند تھے ان کو اپنی کامیابی کا یقین تھا کہتے ہیں:

جب بھی چاہیں گے رنگ بدلیں گے　　ہم میں اتا کمال ہے سو ہے
گھمنڈ کتا بھی سر اٹھنے دیجئے　　ایک دن اس کو زوال ہے سو ہے

سرور ڈنڈا نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ معاشرے میں پائی جانے والی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اور سماج میں مجبور بے کس انسانوں کے مسائل کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔

میرے چمن میں پھولاں کم ہور دھتورے اُبل پڑئیں
جگاں جگاں ہے کانٹی بھرانٹی جنگلی بیلاں منڈے چڑئیں
امیداں کی کونپل سوکھیں ارمانوں کی کلیاں اجڑئیں
ارمانوں کا حال کیا بولوں بن پتوں کے پیڑ کھڑئیں

سرور ڈنڈا مشرقی تہذیب کے پاسدار ہیں۔ اس کے ساتھ وہ مغربی تہذیب کے مخالف بھی نہیں۔ لیکن موجودہ دور میں مغرب تہذیب کی کورانہ تقلید سے ہمارے اقدار بری طرح متاثر ہوئے۔ مغربی معاشرے کی اندھی

تقلید سے جو ثقافتی اور سماجی تلاطم برپا ہو رہا ہے اس کو انہوں نے اپنی نظم میں اجاگر کیا ہے۔

بلاؤز کے کپڑے کا بشرٹ سلارئیں ناجی　　تنگ موریوں کا وہ اب پتلون سلارئیں ناجی
بناؤ سنگار سے اب نینا ملارئیں ناجی　　بھائی اور بھان میں پہچان بڑی مشکل ہے
کس کو میں بولوں جی بھئی جان بڑی مشکل ہے

سرور ڈنڈا معاشرتی مسائل کو پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اپنی نظم ''شاہ پورواڑی'' میں سرکاری دفاتر میں اجرائی کار کے تعلق سے بھرپور طنز کیا ہے۔ اس نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں: (ابلی بن دیکھنا ہے)

یہ ہے سکریٹریٹ　　یہاں پو کاروائیاں بہت
یاں پواد مانوں کی بھینٹ　　بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر
پاشا ہو جانا فٹ پاتھ پر　　یہ ہے محکمہ برقی
جنت بولے یہ ہے سرقی　　اس کے کاماں سب سرقی
بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر　　راجا ہو جانا فٹ پاتھ پر

سرور ڈنڈا نے صرف معاشرے کی خرابیوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ وہ نام نہاد سیاسی قائدین کی چالبازیوں، جھوٹے وعدوں اور اردو کے تعلق سے ان کی سرد مہری پر سے بھی پردہ ہٹایا ہے۔ اور اردو کی اہمیت اور شان کی قصیدہ گوئی کی ہے۔

سداں لڑا کو پنڈت ملاں موہبت پو جب آتیں
غٹر غٹر کو نوی اداں سے اردو کے گن گاتیں
ایک گھٹ ہو کر دونوں جنے اردو میں یہ بولے
پورب اردو بولے سارا پچھّم اردو بولے

آندھرا کی ملما ہو یا منجولا مرا ٹھن
کرناٹک کی ناگ منی یا گلشن بی کی سوکن

چاروں سہیلیاں پوتی نامہ اردو میچ کھولے
پورب اردو بولے سارا پچھّم اردو بولے

☆☆☆

الف سے انسان ایک ہے سارے سندر اور کریم
رے سے راز یہ ہم کو کھلیا ایک ہیں رام رحیم
دال سے دنیا ساری کرے اردو کو تسلیم
واو سے وحدت اس کی مانیں غالبؔ و نسیمؔ

لفظ اردو چار حروف کا مرکب ہے سرور ڈنڈؔا اس کی یوں تشریح اور توضیح کرتے ہیں۔

سرور ڈنڈؔا نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ جیسے گیت، غزل، رباعی اور نظم وغیرہ میں بھی اپنے فن کا جادو جگایا چند شعر ملاحظہ ہوں:

یہ رنگین مناظر، یہ دلکش نظارے		کلاٹیاں لگارئیں نا ارماں ہمارے
غریباں کی ہمت لگی رنگ لانے		اترنے لگئیں اچھے اچھوں کے پارے

نینوں کو بہوت پیاس لگی ہے		پیا درشن کی آس لگی ہے
جنگل جنگل کیوں میں جاؤں		گھر پو مورے گھاس لگی ہے

ذیل کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جس میں انفرادی رنگ پایا جاتا ہے۔

انوں لالوں کے لال ہے سو ہے		طبیعت ان کی نڈھال ہے سو ہے
ان کی ہَوندی وہ چال ہے سو ہے		جینا اپنا محال ہے سو ہے
ہوکے برباد ان کے باتاں سے		اب بھی ان کا خیال ہے سو ہے

سرور ڈنڈا نے صنف رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو

دن بہ دن شوخ و چنچل ہورئیں　　ایک ایک پل کو وہ بے کل ہورئیں
نوی تہذیب کی ہوا جو لگی　　ہر اک ادا سے اُنوں سوشیل ہورئیں

سرور ڈنڈا نے حضورؐ کی شانِ اقدس میں نعت لکھنے کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ ان کی ایک نعت کا مطلع ہے:

مجھ پہ کر دیو نا احسان رسولؐ عربی　　ہند میں، میں ہوں پریشاں رسولؐ عربی

سرور ڈنڈا کے یہاں اپنے پیش روشعراء کی طرح متنوع موضوعات ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے موضوعات میں بین الاقوامی سیاست پر بھی طنز کیا ہے۔ اور حملہ آور چین کو بھی للکارا ہے۔ اشارے کنایہ میں انہوں نے کانگریس حکومت پر بھی طنز کے تیر چلائے ہیں سیاست سے متعلق ان کا یہاں ایک شعر درج کیا جاتا ہے جو سیاست دانوں کی مفاد پرستی اور موقع پرستی کی قلعی کھولتا ہے۔

تعریف سیاست کی فقط اتنی ہے یارو
جس کو ملیا موقع اِنے ڈھول جمایا

1961ء میں جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تو سرور ڈنڈا کا محبّ وطن دل تڑپ اٹھا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک طویل نظم لکھی لیکن انکا یہ مصرعہ کہ ''پھیلے تو گھوکرو سمٹے تو ہمالہ'' اپنے ہم وطنوں سے وطن دوستی کی داد چاہتا ہے۔ خصوصاً ''سمٹے تو ہمالہ کا ٹکڑا، ہندوستانی قوم کی ایک رنگی کو ظاہر کرتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے۔ ڈنڈا کی شاعری میں کھٹا کی روایت کی بھرپور پاسداری ملتی ہے۔

محاورے جب شعر میں استعمال ہوتے ہیں تو شعر کے مفہوم کو نہ صرف دوبالا کرتے ہیں بلکہ پُرتاثیر بنادیتے ہیں۔ اچھا شاعر موضوع کی مناسبت سے جب کوئی محاورہ شعر میں باندھتا ہے تو یہ عمل فن پر شاعر کے عبور کی دلیل بھی پیش کرتا ہے۔ سرور ڈنڈا نے اپنے کلام میں موضوع کی مناسبت سے محاوروں کا استعمال کرتے ہوئے اپنی تخلیقات میں میں برجستگی پیدا کی ہے۔ وہ حسبِ ضرورت دکنی روزمرّہ اور محاوروں کا استعمال کرتے ہیں۔ بارہ بجنا، منہ کالا ہونا، ناک میں دم کرنا، قیامت پہ قیامت ڈھانا، ہرن کی چال، ڈھول پیٹنا، گھر کے نہ گھاٹ کے حال

اٹھانا' رام کرنا' سر پیٹنا' آنکھیں دکھانا' دن میں تارے دکھانا' بیل منڈوے چڑھنا' آنکھ سے کاجل چرانا' پاپڑ بیلنا جیسے محاورے اپنی غزلوں میں استعمال کئے ہیں۔

ڈنڈا نے اکثر محاوروں کو ''دکنالیا'' ہے چنانچہ انہوں نے ''قیامت پہ قیامت'' محاورے کو ''قیامت کو قیامت'' باندھا ہے۔ ''گھر کے نہ گھاٹ کے'' کو ''گھراں کے نہ گھاٹاں کے'' کردیا ہے۔ بعض اشعار میں تو ایک زائد محاورے بھی باندھے ہیں۔

سولہ سنگھا کر کو سو طرح کی مٹھی پھک کو
سرتا پا اُنوں دِس رئیں ارمانوں کا اُجلا

اس شعر میں ڈنڈا نے تین محاورے باندھے ہیں۔ سولہ سنگھار' مٹھی پھکنا' اور سرتاپا۔ مٹھی پھکنا خالص دکنی محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں جس طرح ممکن ہوا اپنے مطلب یا مقصد کو حاصل کرنا چاہیے۔ اس کے لئے چاہے کتنی ہی رسوائی اور بے عزتی کیوں نہ ہو۔ مزید چند اشعار ملاحظہ ہو جس محاورے باندھے گئے ہیں۔

دل میں جب آیا اپنے کچھ نام کمانا
ہم سیکھ لئیں آنکھوں سے کاجل چرانا (آنکھوں سے کاجل چرانا)

آزادی کی خوشی میں ڈنڈے حضت کو یارو
اب دن میں تارے دکھارئیں نارے تم مانو نکو مانو (دن میں تارے دکھانا)

ہم پو گذر گئی ارے باشا نکّو پوچھو
پاپڑ کے ناد بیل دیا ہم کو زمانہ (پاپڑ بیلنا)

تپلاں پڑکو بیل منڈوا چڑھی اماں گے
کیسی آئی یہ نہوست کی گھڑی اماں گے (بیل منڈوے چڑھنا)

ڈاکٹر سیدہ جعفر ڈنڈا کے طنز ومزاح کو ان کوان کی شاعری کا بنیادی وصف قرار دیتی ہیں۔

''سرور ڈنڈا کی شاعری کا بنیادی وصف اس کا بھرپور اور جامع طنز ہے۔
ڈنڈا کے کلام میں مزاح کا اثر ہلکا اور طنز کی نشتریت اور معنویت کا نقش خاصہ
نمایاں ہوگیا ہے۔گلبرٹ ہیگرٹ اپنی کتاب ''اناٹومی آف سٹائر'' میں لکھتا
ہے کہ طنز نگار کے فن ایک بامقصد آرٹ ہوتا ہے، جو ذہن کو بیداری اور قلب
کو جذبے کی گرمی عطا کرتا ہے۔''(11)

سرور ڈنڈؔا نے بھی اپنے کلام میں طنز ومزاح کا استعمال اس سلیقے سے کیا ہے کہ ان کا فن انسانی ذہن کو دعوت فکر دیتا ہے۔

سرور ڈنڈؔا نے مسائل کو بیان کرتے ہوئے اپنے کلام میں مزاح پیدا کیا ہے اور معاشرے میں پھیلے بے ڈھنگے پن پر طنز کے بھرپور وار کئے۔ چاہے وہ ''شاہ پور واڑی ہو'' کہ ''جنتا کی عرضی'' ان نظموں کے موضوع کی ترسیل انہوں نے دکنی زبان میں اس کامیابی سے کی ہے کہ قلم خود بخود داد دیتا ہے۔سرور ڈنڈا کی زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں۔

''سرور ڈنڈؔا دکنی کو دکنی صورت میں استعمال کیا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ
ان کے ہاں اردو کے چند الفاظ آچکے ہوں لیکن اپنی بیشتر منفرد لسانی
خصوصیات کے ساتھ ڈنڈؔا کے کلام میں دکنی موجود ہے۔سرور ڈنڈؔا نے اردو
سے دکنی کا سودا نہیں کیا۔انہوں نے دکنی کو دکنی ہی رہنے دیا یہی ان کا کمال
ہے۔ یہاں میں دکنی کی لسانی خصوصیات کا شمار کرنا نہیں چاہتا۔لیکن ڈنڈا
کے یہاں اسم کی جمع بنانے کے لئے واحد کے آخر میں 'ان' کا استعمال جمع
بنانے والے الفاظ کی بھی جمع 'میں' کی جگہ 'ہمن' مصدر کی علامت 'ایان' ہائے
مخلوطی کا حذف کردینا جیسے ہاتھ کی جگہ 'ہات' اور 'کچھ' کی بجائے 'کچ' اور
بعض الفاظ میں درمیان حرف صحیح کو مشدد بنا دینا عام ہے جس سے دکنی کا خمیر
بنتا ہے۔ڈنڈؔا کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن پر شبہ ہوتا ہے کہ آیا یہ سرور

ڈنڈا کے ہیں یا قطب شاہی دور کے کسی شاعر کے۔ مثلاً

جو بھی تم چاہا گیا کھاٹ پو اُن
مری جان! بچھوؤں میں سٹکتے سٹکتے

سورج بن کے جگ پو پوچھا جا
چان کے جیسا گھٹ نکّو رے

دکنی زبان کے تقریباً تمام لسانی وسماجی خصوصیات کو اپنی شاعری کے دامن میں اس شیرینی اور حالات کے ساتھ سمیٹ لینے کی وجہ سے ڈنڈا کی شاعری کے تانے بانے قطب شاہی دور کے شاعروں سے جا ملتے ہیں۔"(12)

سرور ڈنڈا اپنے ہم عصر شاعروں کو بھی متاثر کیا اور بعد کے نسل کو بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعراء ان کی پیروی کو روا رکھے ہوئے ہیں۔ گلی نلگنڈوی تو ان سے اس قدر عقیدت رکھتے ہیں کہ ڈنڈا کے بغیر اپنا کلام ادھورا سمجھتے ہیں اپنی ہر غزل کے مقطع میں ڈنڈا کو یاد کرتے ہیں۔ ایک مقطع ملاحظہ ہو:

ڈنڈے کے بنا گلی میدان میں کاں اُڑری
گلی پو جو بھاری تھا وہ ڈنڈا کدھر ہے کی

دکنی طنز و مزاح کو سرور ڈنڈا کی دین کا ذکر کرتے ہوئے عاتق شاہ لکھتے ہیں۔

"ڈنڈا کی یاد ایک دور کی یاد ہے۔ شہر حیدرآباد اور تلنگانہ کا ہر نفس ڈنڈا کو بھلا نہیں سکتا کیونکہ آخری سانس تک ڈنڈا نے ان کے گیت گائے۔ ڈنڈا حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب کی منہ بولتی، چلتی پھرتی تصویر ہے۔ جس نے مزاح اور طنز کو وقار بخشا۔ ڈنڈا نے دوستوں کو چاہا بھی اور نظریاتی بنیادوں پر لڑائیاں لڑیں۔ لیکن شائستگی کے دامن کو کبھی نہیں چھوڑا......سرور ڈنڈا نے اپنی انسان دوست شاعری اور عوامی مسائل کی ترجمانی کے ذریعہ

عوام کے دلوں میں جگہ بنائی تھی یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کے عوام خصوصاً ان کو
اوران کے کلام کو آج بھی بُھلا نہیں پاتے ہیں۔ سرور ڈنڈا دکنی طنز و مزاح کے
عظیم مزاح نگار تھے ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کوئی ان ہی کے ہم رتبہ مزاح
نگار ہی کرسکتا ہے۔'' (13)

سرور ڈنڈا کا شعری مجموعہ ''املی بن'' فبروری 1990ء میں ان کے انتقال کے کافی عرصہ بعد شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ جسے ان کے بیٹا بیٹی فیروز سرور خاں اور بیٹی فردوس سرور نے شائع کروایا۔ ''املی بن'' میں 31 نظمیں 8 دوہے اور دو رباعیات ملتی ہیں۔ انتقال سے دو برس پہلے وہ حج کی سعادت سے بھی مشرف ہوئے۔ اس کے بعد ان کی شاعری کا رنگ بدل گیا اور وہ نعت گوئی کی طرف زیادہ مائل ہوگئے۔ مکہ معظّمہ میں ان کو ملازمت مل گئی تھی مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ حیدرآباد واپس آ گئے اور نعت کا یہ شعر لکھا۔

جب سے مدینہ چھوٹا ماں　　　دل ہے کنورا کنورا ماں

حیدرآباد میں یرقان، درد گردہ اور جگر کا ورم جیسے مہلک امراض میں مبتلا ہوگئے اور بالآخر 11 نومبر 1962ء کو انتقال کر گئے۔ ان کی تدفین درگاہ یوسفین کے روبرو واقع قبرستان میں عمل میں آئی۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) پروفیسر امیر عارفی　''سرور ڈنڈا''　مطبوعہ: ماہنامہ ''شگوفہ'' جون 1997ء صفحہ 29

(2) عزیز قیسی　''سرور ڈنڈا کی یاد میں'' مطبوعہ: ماہنامہ شگوفہ 1992ء صفحہ 53

(3) محمد لطیف الدین　بحوالہ ''دکنی طنز و مزاح کے فروغ میں سرور ڈنڈا کا حصہ'' مقالہ برائے ایم فل' از آمنہ نصرت غیر مطبوعہ' مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو' سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد' 2005ء

(4) محمد سعادت علی خاں　''سرور ڈنڈا...... یادوں کے جھروکے سے'' مطبوعہ' روزنامہ ''منصف'' 25 اپریل 1998ء

(5) پروفیسر امیر عارفی　''سرور ڈنڈا'' مطبوعہ ماہنامہ ''شگوفہ'' جون 1997ء ص 21

(6) انیسہ سلطانہ　''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشونما''　صفحہ 90

(7) سلیمان اطہر جاوید　''عصر حاضر میں دکنی شاعری''　مضمون مشمولہ ''تنقیدی افکار 1977ء صفحہ 155

(8) ڈاکٹر سیدہ جعفر　''سرور ڈنڈا کی شاعری''　مطبوعہ روزنامہ سیاست'' مورخہ 7 ڈسمبر 1980ء

(9) مجتبیٰ حسین　''سرور ڈنڈا''　مطبوعہ ماہنامہ ''شگوفہ سالنامہ جنوری 1986ء ص 27

(10) عزیم قیسی　''سرور ڈنڈا کی یاد میں''　مطبوعہ ماہنامہ ''شگوفہ'' 1992ء، صفحہ 94

(11) ڈاکٹر سیدہ جعفر　''سرور ڈنڈا کی شاعری''　مطبوعہ ''سیاست'' مورخہ 7 ڈسمبر 1980ء

(12) سلیمان اطہر جاوید　''سرور ڈنڈا کی شاعرانہ عظمت''، مضمون مشمولہ ''تنقید شعر'' 1971ء ص 146-145

(13) عاتق شاہ　''ڈنڈا کے کلام کی اہمیت''　مطبوعہ ماہنامہ ''شگوفہ'' ڈسمبر 1980ء ص 41

غوث خواہ مخواہ

غوث خواہ مخواہ 17 اپریل 1930 کو حیدرآباد کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام غوث محی الدین احمد ہے اور تخلص خواہ مخواہ۔ادبی دنیا میں غوث خواہ مخواہ کے قلمی نام سے معروف ہیں۔دارالعلوم کالج میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔1948 میں سقوط حیدرآباد (پولیس ایکشن) کے بعد نامساعد حالات نے ترک تعلیم کے ساتھ ترک وطن پر مجبور ہوئے۔1949 سے 1955 تک بمبئی میں مختلف ذرائع روزگار سے وابستہ رہے۔1956 میں حیدرآباد کے محکمہ تعمیرات میں ڈرافٹسمین کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔اس کے فوری بعد ہی حیدرآباد کی لسانی بنیاد پر تقسیم عمل آئی جس کی وجہ سے ان کا تبادلہ بمبئی کر دیا گیا۔جہاں 1991 تک محکمہ زراعت و برقی میں چیف ڈرافٹسمین کے عہدے پر کارگذار رہے اور اسی عہدے سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

غوث خواہ مخواہ ایک عرصہ تک روزنامہ ''انقلاب'' میں مزاحیہ کالم ''خالی پیلی'' لکھتے رہے۔1991ء سے 2003ء تک مشاعروں میں شرکت کی غرض سے ملک و بیرون ملک مختلف مقامات کے دورے کرتے رہے۔بڑھتی عمر اور گرتی صحت کی وجہ سے انھوں نے ایک بار پھر مئی 2003 کو ممبئی کو خیرباد کہا اور ہمیشہ کے لئے اپنے وطن مالوف حیدرآباد منتقل ہو گئے۔

ان کے تین شعری مجموعے 'بہ فرضِ محال 1992' 'حرفِ مکرر 1998' اور 'کاغذ کے تیشئے 2004' منظر عام پر آ چکے ہیں۔یہ تینوں شعری مجموعے مزاحیہ اور طنزیہ کلام پر مشتمل ہیں۔ان کی مزاحیہ اور طنزیہ شاعری کی ابتدا 1954 سے ہوئی۔وہ خود اپنی مزاحیہ شاعری کی ابتداء کے تعلق سے رقمطراز ہیں۔

> ''طنز و مزاح کا شوق ایک عجیب و غریب مرض ہے۔اس مرض میں مبتلا ہونے کے بعد، مریض ہنسنے ہنسانے کے کسی لمحے کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔مجھ پر اس مرض کا پہلا حملہ 1954 میں ہوا۔ابتداء میں طبیعت سنجیدہ شاعری کی طرف راغب رہی اور پھر مرض میں دوسرے آثار یوں ظاہر ہونے لگے کہ اوقات فرصت میں جب مزاحیہ مضامین، انشائیے یا اشعار

پڑھتا تو ذہن کی زرخیز زمین میں ظرافت کی ننھی ننھی کونپلیں پھوٹتیں پھر کلیاں
نکل آتیں اور دیکھتے دیکھتے سارا ذہن خوشبوئے ظرافت سے مہک اٹھتا
۔پھر یوں ہوا کہ

دعا کی نہ کسی سے التجا کی	نہ اک تعویذ لی ردّ بلا کی
یہ شاید ابتدا تھی انتہا کی	مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی (1)

خواہ مخواہ نے شاعری میں کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ان کا کہنا ہے کہ ظرافت دو دھاری تلوار ہے۔اور اس فن کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کرنا پڑتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ سنجیدہ شعر کہنا آسان ہے لیکن مزاحیہ شعر کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

"کسی استاد شاعر کے آگے زانوے تلمذ تہہ نہیں کیا ہوں۔اس لئے ممکن ہے اشعار میں کہیں کجی یا سقم محسوس ہو صرف اپنی ذہنی استطاعت کو بروئے کار لاتے ہوئے آپ سبھوں کے اعلیٰ معیار سخن فہمی کا بھی خیال رکھا ہوں اس لئے کہ ظرافت میں بھی معاشرے کے اصلاح کے پیش نظر اعلیٰ اقدار کی حفاظت ملحوظ رکھنی ہی چاہیے۔

دراصل ظرافت کو میں ایسی دو دھاری تلوار سمجھتا ہوں جس کی ایک دھار طنز اور دوسری مزاح اور جس کی نوک سنجیدگی پر مشتمل ہے اس قبضہ سلاست و بلاغت بے ساختگی اس کی کاٹ، اور اخلاقی اقدار کی نیام اس کے حدود ثلاثہ ہیں۔یہ فن شاعری کی ایسی نازک صنف ہے جس میں شاعر کو کافی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔" (2)

انہوں نے مختلف اصنافِ شاعری جیسے حمد، نعت، غزل اور قطعات میں طبع آزمائی کی ہے۔خداوند تعالیٰ کی دین کے تعلق سے مختلف شعرا نے مختلف انداز میں اپنے اشعار میں مضامین باندھے ہیں۔چنانچہ خواجہ شوق کہتے ہیں کہ خداوند کریم کی دین کسی آئین کی پابند نہیں ہوتی۔

کسی آئین کی پابند نہیں دین ان کی　　　　چاہتے ہیں تو خطاؤں پہ عطا کرتے ہیں

خواہ مخواہ اسی مضمون کو کچھ اس طرح باندھتے ہیں۔

اُس کی دین کا یہ عالم ہے　　　　بن مانگے اکثر دیتا ہے

نبی کریمؐ کی شان اقدس میں بہت سارے اردو شعرا نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔صحابہ اکرام کے ساتھ حضورؐ نے بھی اپنے شکم مبارک پر پتھر باندھا تھا۔اس تعلق سے کسی شاعر نے کہا ہے۔

سب تھے لرزاں پیٹ پر آقاؐ کے پتھر دیکھ کر　　　　اور وہ پتھر تھا خوش اپنا مقدر دیکھ کر

خواہ مخواہ کہتے ہیں۔

غریبی میں بھرم رکھنے کو اپنی فاقہ مستی کا　　　　بندھے تھے پیٹ پر اُنؐ کے وہ پتھر دیکھ سکتا ہوں

خواہ مخواہ کی غزلوں میں سلاست اور شگفتگی نمایاں نظر آتی ہے۔آئینہ اور محبوب پر بہت سے شعرا نے شعر کہے ہیں۔خواہ مخواہ نے محبوب اور آئینہ کے تعلق سے غزل کے ایک شعر میں یوں مضمون باندھا ہے۔

نظر اُن کو انہیں کی لگ نہ جائے　　　　اک آئینہ اب ان کے روبہ رو ہے

انھوں نے زیادہ تر غزلیں کہی ہیں۔ان کی سیاسی غزلوں میں سیاسی قائدین پر بھرپور طنز ملتا ہے۔ان غزلوں میں حب الوطنی اور ظاہری سیاست کو آشکار کیا گیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ پہلے سیاسی قائدین کے نزدیک قوم کی خدمت مقدم تھی لیکن آج مذہب کے نام پر قتل وغارت گری کا بازار گرم کر دیا گیا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں۔

غُلامانہ ہے ذہنیت مگر سرکار کہلائیں　　　　ضمیر اپنا جو بیچیں صاحب کردار کہلائیں
محبان وطن کو دیکھتے ہیں شک کی نظروں سے　　　　وہی ایذا بھی پہنچائیں وہی غمخوار کہلائیں
عبادت گاہ جو ڈھائیں وہی بس دیش پریمی ہیں　　　　اٹھائیں ہم اگر آواز تو غدار کہلائیں
قیادت کا ہنر ہی ہے نہ رہبر کی صفت ان میں　　　　مگر یہ چاہتے ہیں قافلہء سالار کہلائیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ چند مفاد پرست سیاست داں ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کرواتے ہیں اور ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو مکدر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔سنہ 2001 میں گجرات میں بھیانک فرقہ وارنہ فسادات رونما

ہوئے۔ان فسادات میں مبینہ طور پر مسلمانوں کو چن چن کر نشانہ بنایا گیا۔کئی لوگ بے گھر ہوئے کئی مائیں اپنے چشم و چراغ سے محروم ہوئیں۔لیکن اس کے باوجود لوگوں کو ملک کے قانون اور عدلیہ پر پورا بھروسہ ہے اس صورتحال کو خواہ مخواہ نے اپنی نظم ''گجرات کے فسادیوں سے'' میں پیش کیا ہے۔اس نظم میں طنز کا پہلو نمایاں ہے۔

یہ موقعہ تو نہیں ہے دوستو ہنسنے ہنسانے کا		نہ اپنے دشمنوں کی دشمنی بھول جانے کا
یہی ہیں امن کے دشمن یہی قاتل ہیں گاندھی کے		جو آئے دن بہانہ ڈھونڈتے ہیں خوں بہانے کا
تشدد کے پجاری، عقل ہے تو دھیان سے سن لیں		ڈریں اللہ سے مالک ہے جو سارے زمانے کا
نہتوں پر ستم ڈھا کر بہت خوش ہو رہے تھے تم		عدالت میں مزہ چکھو گے بازی ہار جانے کا
یہ نازک وقت ہے ہم متحد ہونگے نہیں جب تک		زمانہ ڈھونڈھ ہی لے گا بہانہ پھر ستانے کا
دلوں میں اتفاق باہمی ہی جب نہیں باقی		بتائیں فائیدہ کیا خواہ مخواہ رونے پلانے کا

خواہ مخواہ فی البدیہہ شعر کہنے میں ماہر ہیں۔وہ عام طور پر سلیس اردو میں کلام کہتے ہیں لیکن ان کی تخلیقات میں دکنی لفظیات، دکنی روزمرہ اور دکنی محاورے بھی اپنی جلوہ گری دکھاتے نظر آتے ہیں۔انھوں نے دکنی زبان میں بھی کلام موزوں کیا ہے۔دکنی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہو۔

بچھڑ کوُ خوب ستانے کے بعد، آئے نا!		ستا ستا کو رُلانے کے بعد، آئے نا!
وقت جو آنے کا تھا اس وقت تو نئیں آئے		مری جوانی کے جانے کے بعد آئے نا!
جو گئی سو عید کو نھائے تھے تم، صحیح بولو		اب آئی سو عید کو نھانے کے بعد آئے نا!
تماری یاد میں میں خواہ مخواہ روتی رہی		زمانے بھر کو ہنسانے کے بعد آئے نا!

غزل کے مقطع میں ریختی کا رنگ آیا ہے۔

خواہ مخواہ عصری مسائل کو اپنی تخلیقات میں ہمیشہ سے پیش کرتے رہے ہیں۔چاہے وہ تعلیم کا مسئلہ ہو، چاہے وہ جہیز کا مسئلہ ہو، چاہے وہ بیروزگاری کا مسئلہ ہو انھوں نے عوامی مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ان کے پاس مزاح کی بہ نسبت طنز کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ ''جاہل طالب علم کی فریاد'' میں انھوں نے ایک حساس موضوع کو نظم کیا ہے۔مسلمانوں کے تعلیم سے دوری اور نوجوان نسل کی بے راہ روی کو بڑی خوبصورتی سے مزاحیہ رنگ میں

پیش کیا ہے۔

مرے باوا ہتھیلی میں مجھے جنّت دِکھا ڈالے | مرے ارمان دل کے سارے مٹھی میں ملا ڈالے
شروع سے بہت چڑ آتی تھی مجھ کو پڑھنے لکھنے سے | میں نئیں بولا بھی تو اسکول کو پڑھنے بھجا ڈالے
مجھے اسکول جانے اچھے کپڑے نئیں ہے بولا تو | فقط دو دن میں یونیفارم تک میرا سلا ڈالے
بہت بیزارگی سے کیا کروں اسکول کو جاتوں | زبردستی مجھے تعلیم کی گھٹّی پلا ڈالے
برابر میں پڑھا بھی نئیں کی، سر پو امتحان آیا | دیا اِگزام تو ایسا مجھے ہَولا بنا ڈالے
ہوا میں پاس تو بولے تھے ٹو وہیلر دلائینگے | میں فیل ہوتئ اُنوں مجھ کو تھری وہیلر دِلا ڈالے
مرے بھیجے میں کوئی بات جب گھُس تیچ نئیں پھر بھی | یہ استاداں بھی میرا خواہ مخواہ بھیجہ ہلا ڈالے

خواہ مخواہ اپنے موضوعات اپنے آس پاس ہی تلاش کرتے ہیں۔ وہ روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ گرتی ہوئی اخلاقی قدروں اور سماجی خرابیوں کو انھوں نے اپنی متعدد غزلوں اور نظموں میں پیش کیا ہے۔ اپنی نظم ''دعوت کے مناظر'' میں انہوں نے موجودہ دعوتوں اور اس میں پیش ہونے والے اخلاق سوز حرکات و واقعات کو نظم کیا۔ اس نظم میں انھوں نے گرتی ہوئی اخلاقی اقدار پر بھرپور طنز کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

عمر بھر محنت سے بچ کر یوں نکل جاتے ہیں لوگ | زندگی بھر دعوتیں کھا کھا کے پل جاتے ہیں لوگ
شوق دعوت میں تو آ جاتے ہیں نقلی چال سے | ''آیئے'' سنتے ہی اصلی چال چل جاتے ہیں لوگ
کر کے جلد از جلد پہلی کا صفایہ میز پر | دوسری مشقاب آنے تک سنبھل جاتے ہیں لوگ
اور کچھ غیرت کے مارے میرے جیسے دعوتی | خواہ مخواہ گھر کی طرف چُپ چاپ ٹل جاتے ہیں لوگ

غوث خواہ مخواہ سیاسی قائدین کی چالبازیوں اور مفاد پرستانہ سیاست پر طنز کے تیر و نشتر خوب چلاتے ہیں۔ وہ علامہ اقبال کی طرح نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سیاسی قائدین عوامی خدمت گار ہیں۔ ان کا عمل صرف عوام کی خدمت ہونا چاہیے۔ ان کی نظم ''لیڈر سے خطاب'' کے چند شعر ملاحظہ ہو:

اگر نہیں ہے کوئی کام، کام پیدا کر | کہیں سے ڈھونڈ کے مینا و جام پیدا کر
دلوں میں تیر کی مانند جو اتر جائے | تلاش کر کے کچھ ایسا کلام پیدا کر

کسی طرح سے سیاست میں نام پیدا کر　　　زمانہ آ کے ترے در پہ سر جھکائے گا (3)

حسن و عشق کے تعلق سے ان کا اپنا ایک نظریہ ہے۔ وہ محبوب کے عشق میں خود کو مٹا دینے پر یقین رکھتے ہیں۔ عشق ایثار و قربانی کا نام ہے۔ لیکن موجودہ نسل اس جذبے سے عاری نظر آتی ہے۔ خواہ مخوٓاہ فلسفہ عشق کو مزاحیہ انداز میں کچھ اس طرح نظم کرتے ہیں۔ یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

عشق میں خواہ مخوٓاہ مرتے ہیں کوئی شکوہ گلہ نہیں ہوتا
زندہ رہنے کا اب جوانوں میں جانے کیوں حوصلہ نہیں ہوتا
جھوٹ کہتے ہیں سب کہ بوڑھوں میں عشق کا ولولہ نہیں ہوتا
آم تب تک مزہ نہیں دیتا جب تلک پلپلا نہیں ہوتا

انہوں نے سیاسی قطعات بھی لکھے ہیں۔ جس میں اقتدار پر قابض لوگوں اور ان کی جانب سے عوام کے استحصال کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان قطعات میں طنز کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔

جو کرسی پر بیٹھے گا وہ سب کے سکھ لے جائے گا
بدلے میں وہ سب کو اپنے سارے دکھ دے جائے گا
آج حکومت اور سیاست دونوں کا دستور ہے یہ
جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہوگی بھینس وہی لے جائے گا

ایک اور قطعہ دیکھئے جس میں عصر حاضر کے سیاسی قائدین پر طنز کیا گیا ہے۔

مفت کی کمائی میں خوب جی لگایا ہے
ملک میں قیادت کی بھی ہنسی اُڑایا ہے
کیوں نہ افسر و نیتا مبتلا ہوں پیچش میں
جب انہیں کروڑوں کا ''تیل گھی'' پلایا ہے

غوث خواہ مخوٓاہ کے موضوعات میں تنوع ہے۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران بھی لکھتے رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کے قلم کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ وہ اب بھی لکھ رہے ہیں لیکن صحت کے پیش نظر مشاعروں

میں شرکت کچھ حد تک کم ہوگئی ہے۔غوث خواہ مخواہ کا ادبی سفر ہنوز جاری ہے۔

----OOO----

حوالہ جات

(1) غوث خواہ مخواہ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' مضمون مشمولہ: کاغذ کے تیشے 2004ء ص4

(2) غوث خواہ مخواہ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' مضمون مشمولہ: کاغذ کے تیشے ص8-7

(3) غوث خواہ مخواہ ''لیڈر سے خطاب'' مطبوعہ ''ماہنامہ ''شگوفہ'' خلیج نمبر'' ص190 سنہ 2004ء

اشرفؔ خوندمیری

اشرف خوندمیری کے اجداد کا تعلق راجستھان کے ایک قصبہ رسول پورہ سے ہے۔ اشرف خوندمیری کے دادا سید حسین میراں، رسول پورہ کے ایک زمیندار تھے۔ وہ تقریباً ایک صدی قبل حیدرآباد آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ سید میراں کی کل پانچ اولادیں تھیں، تین لڑکے اور لڑکیاں۔ بڑے صاحبزادے سید اشرف خوندمیری اور دوسرے سید محمود خوندمیری، دونوں کا انتقال بچپن میں ہی ہوا۔ ان کے بعد ایک لڑکا سید عبدالکریم (اشرف خوندمیری) کی پیدائش حیدرآباد کے علاقہ چنچل گوڑہ میں ہوئی۔

سید عبدالکریم کو چودہ (14) اولادیں ہوئیں۔ پہلے لڑکے کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد (2) اختر بانو (3) سید حسین میراں (4) سید اشرف خوندمیری (5) سید محمود خوندمیری (**طالب خوندمیری**) (6) سید نعمت اللہ (7) سید نجم الدین (8) سید عبدالقادر (9) سید محمد (10) سید عثمان ان کے بعد تین لڑکیاں (11) سیدہ احمدی (12) سیدہ آمنہ اور (13) تیسری لڑکی کا بچپن میں انتقال ہو گیا جس کا نام نہیں رکھا گیا تھا اور آخر میں (14) سید علی بجنو خوندمیری۔

اشرف خوندمیری 6 اکتوبر 1935ء کو حیدرآباد کے قدیم محلہ چنچل گوڑہ میں سید عبدالکریم اور ہدایت بانو کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وسطانیہ اسکول زمستان پور، مشیرآباد میں ہوئی۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی اسکول سکندرآباد سے کامیاب کیا۔ میٹرک پاس ہوتے ہی بہادر خاں کالج آف انجینئرنگ سے 1957 میں اپر سب آرڈینٹ کا امتحان کامیاب کیا۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی شاعری کرنے لگے تھے۔

اشرف خوندمیری کے علاوہ ان کے دو بھائی، طالب خوندمیری اور سید محمد علی خوندمیری بجنوؔ نے بھی ظریفانہ شاعری میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید بشیر احمد رقمطراز ہیں۔

> ''حیدرآباد کے تین بھائی ابراہیم جلیس، محبوب حسین جگر، اور مجتبیٰ حسین نے اردو ادبی دنیا میں اپنی ادبی کاوشوں پر خوب نام کمایا۔ دوسری مثال

اشرف خوندمیری، طالب خوندمیری، اور سید محمد علی خوندمیری بیخود کی ہے، ان
تینوں نے اردو شاعری میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ڈنکے بجادئے۔"(1)

اشرف خوندمیری حیدرآباد کے ایسے مزاحیہ شاعر ہیں جنھوں نے سلیمان خطیب اور سرور ڈنڈا کی طرح خالص دکنی لب و لہجہ میں شاعری کی، اور بے حد مقبول ہوئے۔ انہوں نے بہت کم لکھا ہے، لیکن جتنا بھی کلام منظر عام پر آیا ہے وہ انھیں شاعری میں ایک بلند مقام عطا کرتا ہے۔ اُس دور کے ادبی رسائل خصوصاً ماہنامہ "شگوفہ" میں ان کی تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان نظموں میں "جھمک جھکا" "اٹھا چمّاں" "دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگا کو چھوڑیں" "ہلّو کی سلّو کی دوئی دم بتّی بُتّہ" وغیرہ بہت مشہور ہوئیں۔

اشرف خوندمیری مشرقی تہذیب کے پروردہ ہیں۔ دکن کی تاریخ اور اس کی تہذیب سے انہیں بے حد لگاؤ ہے۔ ان کی تخلیقات اس کا بین ثبوت ہیں۔ اردو شاعری کے تقریباً ہر شاعر نے اپنی تخلیقات میں حسن و عشق کے مضامین باندھے ہیں۔ اشرف خوندمیری بھی حسن و عشق اور گل و بلبل کے موضوعات کو اپنے منفرد لب و لہجہ میں پیش کرتے ہیں۔ ٹھیٹ دکنی لب لہجہ میں کہی گئی ان کی نظم "جھمک جھکا" کا یہ بند ملاحظہ ہو:

اللہ میاں کس پو بھی ایسے گھڑیاں نہ لائے　　　گلثم کے ہاتھاں چُھٹ گئے ہم دونوں دھکیاں کھائے
ڈھکلی کھا کو دور گری پاواں میں موچاں آئے　　　گرتے گرتے میرے انکھیاں لڑ گئے ان سے ہائے
چندا سا مکھڑا دیکھی تو رہ گئی ہکّا بکّا
ہائے اللہ میں کئیکو کھیلی ایسا جھمک جھکّا

اشرف خوندمیری کی شاعری دکنی تہذیب اور حیدرآبادی ماحول کی پروردہ ہے۔ وہ مقامی الفاظ، روزمرّہ اور محاوروں کو نہایت خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں مقامی رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

چدر گھاٹ کے محورم کے ہر میلے پو ہم ملتے تھے　　　محودین صاب کے چاکنے کے ٹھیلے پو ہم ملتے
عبدلاّ ری سالے کے طبیلے پو ہم ملتے　　　عنبر پیٹھ کے گایاں کے کمیلے پو ہم ملتے
ہم بی چھائیں چچّہ چچّہ پیار کی ہر سڑک کا
ہائے اللہ میں کئیکو کھیلی ایسا جھمک جھکّا

ایک اور بند ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے محبوب کی بے وفائی کی عکاسی بڑے ہی دلفریب انداز میں کی ہے۔

ماٹھی مِلے طوفاناں نہ جانے کاں سے آئے		گوداں میں بھر کو غم کے شیطانوں کو بی لائے
خالی پیلی رُس کو سیّاں پیت مری ٹھکرائے		رامی دھوبن کے زُلفاں میں دل اپنا لگائے
منجے نئیں مالوم تھا میرے دل کو لگیں گا دھکّا
ہائے اللہ میں کئیکو کھیلی ایسا جھمّک جھکّا (2)

اشرف خوندمیری کے کلام میں اپنے عصر کے حالات کا بیان ملتا ہے۔انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ بعض تلخ حقائق کو بے نقاب کیا ہے۔وہ اپنے کلام کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح کا فریضہ انجام دینا چاہتے تھے۔وہ قومی یکجہتی اور اتحاد کا درس دیتے ہیں۔پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو انگریز سامراج کی پالیسی تھی اور آزادی کے بعد بعض مفاد پرست سیاسی قائدین اسی ہتھکنڈے کا استعمال کرتے ہوئے سماج میں انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔اس حساس نکتہ کو اپنی نظم ''دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگا کو چھوڑیں'' میں نہایت شگفتگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

گھس گھس کو ایلوے کا چمچہ چٹا کو چھوڑیں		تالو سَلا سَلا کو ڈِبّہ گھما کو چھوڑئیں
اُپّر سے ہلّو ہلّو ڈوبّہ پِنا کو چھوڑیں		نچّے سے ہلّو ہلّو گنگا بہا کو چھوڑئیں
بیٹھے بٹھائے سب کا کونپہ ڈُبا کو چھوڑئیں
دو گرگٹوں کے منہ کو چُنّا لگا کو چھوڑئیں

بس ہولے شولے کاماں ان کا ہے کارنامہ		''ایونا کِشنا کِشنا ' ایونا راما راما''
باتاں بنابنا کو ہاتاں نچانچا کو		ڈئیلاگ بی گھما کو کرنے لگئیں ڈرامہ
ہولوں پو ایکٹنگ کا سکہ جما کو چھوڑئیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگالو چھوڑئیں
جِتّا انو بی ڈُل رئیں اُتّا اُنوں بی ڈل رئیں		مکھناہتّی کے بھایاں بن بن کو دونوں جُھل رئیں
گھایاں دکھا دکھا کو باڑاں انو دلارئیں		باڑوں میں ان کے آ کو دونوں بی خوب پُھل رئیں
دونوں کو پمپ مارئیں پُھگّا بنا کو چھوڑئیں

دو گرگٹوں کے موں کو چتّا لگالو چھوڑئیں (3)

اشرف خوندمیری کی تخلیقات میں اُس آصفیہ دور کے حیدرآباد کے مرقع نظر آتے ہیں۔انہوں نے دکنی لفظیات اور محاوروں سے اپنی شاعری کوایک آہنگ عطا کیا۔دن عیداں تھےاور راتاں ہوتے تھے شب براتاں (ہر دن عید ہر رات شب برات)' آنکھ مچانی (آنکھ مچولی)' تالوسلانا (تالوسہلانا)' گنگا بہنا (دولت کی فراوانی)' ڈوپا پنانا (ٹوپی پہنانا)' بغل میں چھری منہ پہ رام رام' باڑوں میں لانا (بیوقوف بنانا)' گھایاں دکھانا (بمعنی مگر مچھ کے آنسو) اوراس طرح کئی الفاظ ان کی شاعری کی انفرادیت عطا کرتے ہیں۔

اشرف خوندمیری نے سماج کے سلگتے ہوئے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔جہیز کی لعنت ہمارے معاشرے کا ایک ناسور بنتا جارہا ہے جس کی وجہ سے کئی لڑکیاں بن بیاہی گھر پر بیٹھی ہوئی ہیں۔اشرف خوندمیری جہیز کے لالچی لوگوں کو ہدف طنز بناتے ہوئے کہتے ہیں۔

دولہے والے کچھ بھی منگتیں نئیں کرنا فریاد کتے
دولہن والے جہیز میں ان کو دینا حیدرآباد کتے

پرویز یداللہ مہدی ارضِ دکن کے ایک مایہ ناز ظرافت نگار ہیں۔ان کی تصنیف ''چھیڑ چھاڑ'' کی اشاعت کے موقع پراشرف خوندمیری نے ایک نظم بعنوان ''املی کا جھاڑ'' کہی تھی۔خالص دکنی لب ولہجہ میں انہوں نے پرویز یداللہ مہدی کی شخصیت اورفن پر جامع انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہو:

یہ گھر میں سب سے اُنچا جو املی کا جھاڑ ہے — پرویز تیرا ہاڑ بھی ویساچ ہاڑ ہے
اُنچان میں تو چان مِنارے سری کا ہے — چوڑان میں تو سچی بی نوبت پہاڑ ہے
ترے قلم کی چال میں دھوبی پچھاڑ ہے — سب کے سنگات کئیکو تیری چھیڑ چھاڑ ہے

اشرف خوندمیری کےفن پر تبصرہ کرتے ہوئے عزیز ابرار لکھتے ہیں۔

''اشرف خوندمیری خالص دکنی لب ولہجہ کے شاعر ہیں۔ان کی نظم 'ہلّو کی سلّو کی دوئی دم بتّی بُتہ' ان کے مخصوص لہجہ کی اچھی مثال ہے......ان کی

نظموں میں دکنی عناصر کی مبالغہ آمیزی محسوس ہوتی ہے۔‘‘(4)

اشرف خوندمیری کی شاعری کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بلاشبہ عصر حاضر کے ایک اہم شاعر ہیں۔ جن کا مخصوص لب ولہجہ، زبان وبیان اُن کی انفرادیت ہے۔

---000---

حوالہ جات

(1) ڈاکٹر سید بشیر احمد ’’مزاح نگارانِ حیدرآباد‘‘ 2007ء ص77

(2) اشرف خوندمیری ’’جھمک جھکا‘‘ مطبوعہ ’’شگوفہ‘‘ نومبر ڈسمبر 1973ء ص56

(3) اشرف خوندمیری ’’دوگرگٹوں کے موں کو چٹّا لگا کو چھوڑیں‘‘ نومبر 1987 ص45

(4) عزیز ابرار ’’شگوفہ کی ادبی خدمات‘‘ مقالہ برائے ایم فل، غیر مطبوعہ، مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد، 1989ء ص95

اسمٰعیل ظریفؔ

محمد اسمٰعیل نام ہے اور ظریفؔ تخلص‘ ادبی دنیا میں اسمٰعیل ظریف سے معروف ہوئے۔ اسمٰعیل ظریفؔ کی پیدائش ناندیڑ‘ مہاراشٹر کے ایک متمول تاجر گھرانے میں ہوئی۔ زمانہ طالب علمی سے ہی مزاحیہ شعر و سخن کی طرف طبیعت مائل رہی۔ قدرؔ عریضی سے تلمذ تھا۔ (1) تعلیمی سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد تجارت کو اپنایا۔ کچھ عرصہ بعد حیدرآباد میں سکونت اختیار کی۔ اسمٰعیل ظریفؔ مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ انہوں نے مختلف اصناف شاعری میں اپنی تخلیقات پیش کیں۔ غزلیات‘ اور قطعات زیادہ لکھے ہیں‘ جبکہ رباعی اور نظموں کی تعداد کم ہے۔ ان کا کلام مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔

اسمٰعیل ظریفؔ نے ابتداء میں ہلکے پھلکے موضوعات کو اپنی شعری تخلیقات میں پیش کیا۔ ان کی ابتدائی کاوشوں میں شگفتگی اور خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہے۔ مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کی زیریں لہر بھی کلام میں رواں دواں نظر آتی ہے۔ انہوں نے سلیس اردو کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہو۔

یہ ہم پر جو مصیبت آپڑی ہے — یہ سب اعمال کی اپنے تڑی ہے
نہ چوڑی ہے نہ مسّی کی دھڑی ہے — لپ اسٹک ہے کلائی پر گھڑی ہے
بنا ہے سادھنا کٹ جبکہ فیشن — یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے
یہی تلوار بن جاتی ہے اکثر — یہ چوتھی میں جو پھولوں کی چھڑی ہے
کسی سے وعدہ کرکے بھول جانا — یہ چھوٹی بات بھی کتنی بڑی ہے
تمہاری شاعری بھی کیا غضب ہے — ظریف ہر شعر گویا پھلجھڑی ہے (2)

غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں تقریباً ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔ مزاحیہ شعراء نے بھی غزل کے حسن کو نکھارنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ انہوں نے اس صنف کو حسن و عشق کے بجائے عوامی موضوعات کے لئے ذریعہ اظہار بنایا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

رہتے ہوئے پرانے شہر میں ظریفؔ نے
حسنِ غزل کو خوب نکھارا ہے دوستو(3)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ طنز و مزاح نگاروں نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ تقسیم وطن کے بعد حیدرآبادی مزاحیہ شعراء نے اردو کی نئی بستیاں بسانے میں بھی اہم رول ادا کیا۔ زندہ دلان حیدرآباد کی طرز پر دوسرے ممالک میں بھی ادبی انجمنیں قائم ہوئیں۔ اردو کے روشن مستقبل کی تمنا کرتے ہوئے ظریف کہتے ہیں۔

اب عنقریب چاند میں ہوگا مشاعرہ
اردو کا اک وہاں بھی ادارہ ہے دوستو

اردو شاعری میں سب سے پہلے ہم کو ظرافت کا پرتو واعظ اور محتسب پر طنز کی صورت میں اُس وقت سے ملتا ہے جب یہ زبان اپنے ارتقاء کے ابتدائی دور میں تھی۔ قلی قطب شاہ سے لیکر آج تک بیشتر شعراء نے واعظ' زاہد' شیخ' ناصح اور علماء سو کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ غالبؔ کہتے ہیں۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

اسمٰعیل ظریف کے اشعار ملاحظہ ہو:

ناصح جو پارسا نظر آتا ہے آج کل
دادا گری میں عمر گذارا دوستو

میں ان کی شان میں گستاخی کر نہیں سکتا
جناب شیخ سے رشتہ ہے کیا کیا جائے

دوزخ سے جنھیں آپ ڈرا لیتے ہو واعظ

جنت بھی ہتھیلی میں بتا کیوں نہیں دیتے

اسمٰعیل ظریف کی شاعری کا ایک نمایاں وصف اس کی مقصدیت ہے۔ وہ معاشرے کی اصلاح پر نظر رکھ کر شعر لکھتے ہیں۔ ظریف معاشرے میں پھیلی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور ایک ہمدرد کی طرح ان مسائل کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا طنز نگار کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''طنز ایک باشعور حساس اور دردمند انسان کے ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے۔ جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختہ مشق بنالیا ہو۔ اور جس میں اتنی قابلیت ہو کہ وہ کونین کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرے۔'' (4)

اس نکتہ کو پیش نظر رکھئے اور اسمٰعیل ظریف کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

یہ ٹی وی آیا ہے جس روز سے مرے گھر میں
عجیب گھر میں تماشا ہے کیا کیا جائے (5)

گلی میں پھرتے ہیں بے خوف و بے جھجھک لیکن
بس اپنے لوگوں سے پردا ہے کیا کیا جائے

پتنگ کے واسطے آتا ہے جو مری چھت پر
وہ بازو والی کا لڑکا ہے کیا کیا جائے

جہیز ایک ایسی لعنت ہے جو ہمارے سماج کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ بیشتر تعلیم یافتہ گھرانے بھی اس لعنت میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ جہیز مانگنے کے لئے مختلف طریقے اور حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر ظریفؔ کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔

یہ لین دین کی خواہش نہیں ہے بیٹے کی
بڑے حضت کی تمنا ہے کیا کیا جائے

اور جس گھر میں رشتے سیرت کے بجائے مال و دولت اور جہیز دیکھ کر طئے کئے جاتے ہیں وہاں لڑائی جھگڑے ہونا لازمی ہے۔اور ایسے معاملات میں فریقین کے علاوہ ان کے متعلقین آگ میں گھی ڈالنے کا کام کرتے ہیں۔ یہ صورتحال ظریفؔ کے انداز میں ملاحظہ ہو۔

بہو سے ساس کی بنتی نہیں کسی عنواں
کئی گھروں کا یہ نقشہ ہے کیا کیا جائے

جو آکے بہن کو پٹّی پڑھا کے جاتی ہے
ہمارے بیٹے کی خالہ ہے کیا کیا جائے

آزادی کے بعد عوام کی خوشحالی کے بلند بانگ دعوے کئے گئے' پنج سالہ منصوبوں کے ذریعہ ملک کی ترقی کے سبز باغ دکھائے گئےلیکن آج تک عام آدمی گرانی اور مہنگائی کی مار سے نہیں بچ پایا ہے۔اور ہر گذرتے دن کے ساتھ گرانی میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ظریفؔ نے سماج کے ان ہی مسائل کو ذیل کے اشعار میں پیش کیا ہے۔

مرنا خوشی سے کس کو گوارا ہے دوستو
بے موت اس گرانی نے مارا ہے دوستو

فیصد پچاس گھر میں بگھارا ہے دوستو
پھر بھی بجٹ میں اپنے خسارہ ہے دوستو

آبادی میں اضافہ ایک عالمی مسئلہ ہے اور ہندوستان میں بھی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لئے کئی اقدامات کئے جارہے ہیں۔اس کے باوجود ہمارے ملک کی آبادی سو کروڑ سے متجاوز ہوچکی ہے۔ظریفؔ بڑے دلچسپ انداز میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جو گھر میں گیارھویں لختِ جگر کی ہے آمد
نئے برس کا یہ تحفہ ہے کیا کیا جائے

خوردنی اشیاء میں ملاوٹ عام بات ہوگئی ہے حتیٰ کہ یہ لعنت دواؤں میں ملاوٹ کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ ظریفؔ اس سماجی برائی کی طرف انگشت نمائی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کرتا ہے غذا اور دوا میں جو ملاوٹ
پھانسی کی اُسے آپ سزا کیوں نہیں دیتے

ہندوستان کثرت میں وحدت کا عمدہ نمونہ ہے' جہاں کئی زبانوں کے بولنے اور کئی مذاہب کے ماننے والے رہتے بستے ہیں۔۔اور ہمارے ملک کی سلامتی اور ترقی کا دارومدار یکجہتی اور اتحاد میں مضمر ہے۔اسی لئے مخلص سیکولر قائدین نے قومی یکجہتی کا نظریہ پیش کیا۔علامہ اقبال نے''ترانہ ہندی'' کے ذریعہ یہی پیغام دینے کی کوشش کی۔ لیکن موجودہ دور میں شخصی مفادات اور سیاسی قائدین کی چالبازیوں اور عاقبت نااندیشی کے سبب ہمارا اتحاد پارہ پارہ ہوتا رہا ہے۔اسی مضمون کو ظریفؔ بڑے دلچسپ انداز میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ویسے نہ اِدھر ہے نہ اُدھر یک جہتی　　　میں ڈھونڈ رہا ہوں' ہے کدھر یک جہتی
بس ایک جگہ دیکھا ہے منظر میں نے　　　میخانے میں آتی ہے نظر یک جہتی (6)

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ شاعر مال وزر کا نہیں بلکہ داد وتحسین کا بھوکا ہوتا ہے۔اس سلسلے میں کئی لطیفے بھی مشہور ہیں۔ظریفؔ بھی ان سے اچھوتے نہیں ہیں۔لکھتے ہیں۔

جہاں بھی جاؤ گے محفل میں پاؤ گے اس کو
ظریف داد کا بھوکا ہے کیا کیا جائے

محفل میں ظریفؔ آپ کو جو داد ملی ہے
سب لوگوں کو وہ راز بتا کیوں نہیں دیتے

ظریفؔ مشاعروں کے معیار اور متشاعروں کی بڑھتی تعداد پر بھی تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔

اساتذہ کے بھی چربے غزل میں ڈھلتے ہیں

یہ شاعری کا تقاضہ ہے کیا کیا جائے

شعر لکھوا کے پڑھ رہے ہو ظریفؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اسمٰعیل ظریفؔ نے صنف رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے جس میں انہوں نے عصری مسائل کا بیان کیا ہے۔مغرب کی اندھی تقلید اور فیشن پرستی نے اخلاقی اقدار کو بھی متاثر کیا ہے۔نوجوان تو نوجوان عمر رسیدہ لوگ بھی تہذیب و ترقی کے نام پر فیشن زدہ نظر آنے لگے ہیں۔

پتلون میں بش شرٹ میں رہا کرتے ہیں　　کترائی ہوئی چال چلا کرتے ہیں
فیشن کی ہوا ایسی چلی ہے ہر جا　　تقلید بھتیجے کی چچا کرتے ہیں (7)

ظریفؔ نے نظم ٔ غزل اور قطعات کے علاوہ پیروڈی میں بھی اپنے فن کا جادو جگایا ہے۔ایک پیروڈی کے چند شعر ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے ایک مصرعہ اپنا اور دوسرا مصرعہ غالبؔ کا استعمال کیا ہے۔

بیوی جب تک گھر نہیں آتی
کوئی اُمید بر نہیں آتی

سب کی خبریں ریڈیو سے آتی ہیں
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میکدہ سے قریب رہتا ہوں
پر طبیعت اُدھر نہیں آتی

پہلے لڑنے پڑوسن آتی تھی
اب کسی بات پر نہیں آتی (8)

ظریفؔ نے روزمرّہ کی زبان میں اپنے فنکارانہ جوہر دکھائے ہیں۔وہ سلیس اردو میں شعر کہتے ہیں لیکن

دکنی لفظیات‘ محاورے اور روزمرّہ کا بھی وہ بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ یہاں چند شعر درج کئے جاتے ہیں جن میں دکنی الفاظ‘ مقامی الفاظ و تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔

دکنی/مقامی الفاظ

فیصد پچاس گھر میں بگھارا ہے دوستو
پھر بھی بجٹ میں اپنے خسارہ ہے دوستو

بگھارا......بغیر گوشت کا پکوان

قسمت کی بات ہے جو اڑاتے ہیں وہ ڈنر
اپنے نصیب میں تو بگھارا ہے دوستو

بگھارا......بغیر گوشت کا پکوان

ہوجائے تاج پوشی نہ کالج کی گیٹ پر
ہیرو کے واسطے یہ اشارہ ہے دوستو

تاج پوشی......پٹائی

بگڑ کے باپ نے بیٹے کو کہہ دیا یارو میں
تو ایک اُلّو کا پٹھا ہے کیا کیا جائے

اُلّو کا پٹھا......بے وقوف

یہ لین دین کی خواہش نہیں ہے بیٹے کی
بڑے حضت کی تمنا ہے کیا کیا جائے

حضت......حضرت

یہ ہم پر جو مصیبت آپڑی ہے
یہ سب اعمال کی ا پنے تڑی ہے

تڑی......نتیجہ

نہ چوڑی ہے نہ مسّی کی دھڑی ہے
لپ اسٹک ہے کلائی پر گھڑی ہے

مسّی......عورتوں کی آرائش کا سامان

کب تک ہے ابھی اور تپانے کا ارادہ — تپانا......انتظار
اب چائے کے وقفے کی صدا کیوں نہیں دیتے

چالو اولاد کے سُدھرنے کی — چالو......چالاک
کوئی صورت نظر نہیں آتی

سوچتا ہوں کہ بعض ہَولوں کو — ہولوں......بے وقوف
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

ظریف نے اپنے اشعار میں محاورے بھی باندھے ہیں۔

خلائی دورہ ہے یہ شیخ صاحب

یہ غصہ آپ کا باسی کڑی ہے — باسی کڑی

اسمٰعیل ظریفؔ نے کئی قطعات بھی کہیں ہیں جن میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ایک قطعہ دیکھئے جس میں انھوں نے ''گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے'' والا محاورہ باندھا ہے۔

انگور تھوڑے چپکے سے آیا کو دے دیا
کل ہی اُتر کے آئے تھے جو اپنے باغ سے
مُنّے نے اپنی امی کو سب کچھ بتا دیا
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے (9)

ایک رباعی ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے بیل منڈوے چڑھنا والے محاورے کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔اور مضمون کے حسن میں معنویت بھی پیدا کر دی ہے۔

اک بیٹا کلکٹری پر معمور ہوا — اک غنڈوں کے سرغنوں میں مشہور ہوا
ہے ایک ہی بیل ایک منڈوا لیکن — میٹھا کوئی کھٹّا کوئی انگور ہوا (10)

اسمٰعیل ظریفؔ اپنے اطراف رونما ہونے والے واقعات کا عمیق مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو شعری پیکر میں بڑی خوبصورتی سے ڈھالتے ہیں۔ وہ شاعری کے تمام لوازم کی پابندی کرتے ہوئے اپنی بات کو عام فہم اور روزمرہ کی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ ظریفؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے عزیز ابرار لکھتے ہیں۔

> ''اسمٰعیل ظریفؔ نے سماج اور سیاسی طنز پر توجہ دی ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اہم عنصر مقصدیت ہے۔ اسمٰعیل ظریفؔ کی نظر سماج سدھار پر ہے۔''(11)

صاحب حیدرآبادی اپنی کتاب ''جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔ تذکرۂ شعراء'' میں اسمٰعیل ظریفؔ کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''ظریفؔ جو کچھ اپنے اطراف و جوانب دیکھتے ہیں اس طنز ومزاح کے پیرائے میں نظم کر دیتے ہیں۔ مشاعروں میں شرکت کرنے دہلی، ہبلی، بنگلور، دھاڑواڑ ہر جگہ جا چکے ہیں۔ شاعری ذریعہ عزت بنی ہوئی ہے۔''(12)

اس سلسلے میں وسیم بیگم لکھتی ہیں۔

> حیدرآباد میں معدودے چند شاعر ایسے بھی گذرے ہیں جنھوں نے روزمّرہ کی زبان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ان میں مرزا شکور بیگ، مسافر نلگنڈوی، اسمٰعیل ظریفؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔''(13)

اسمٰعیل ظریف مشاعروں کے کامیاب شاعر بھی تھے۔ ظریفؔ نے اپنی تخلیقات کو صرف ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس میں مقصدیت پیدا کی۔ بعض سطحی مضامین سے قطع نظر مجموعی طور پر وہ معاشرے کے سنگین مسائل کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ دکن کی طنز و مزاحیہ شاعری کے ارتقاء میں ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

---000---

حوالہ جات

(1) صاحب حیدرآبادی ''جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔تذکرۂ شعراء'' 1984ء ص288

(2) اسمٰعیل ظریفؔ ''غزل'' مطبوعہ ''شگوفہ'' اپریل 1975ء ص104

(3) اسمٰعیل ظریفؔ ''غزل'' مطبوعہ ''شگوفہ'' فروری 1974ء ص84

(4) ڈاکٹر وزیر آغا ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' ص52

(5) اسمٰعیل ظریف ''کیا کیا جائے'' مطبوعہ ''شگوفہ'' سالنامہ جنوری فروری 1991ء ص44

(6) اسمٰعیل ظریف ''قطعہ'' مطبوعہ ''شگوفہ'' فروری 1996ء ص55

(7) صاحب حیدرآبادی ''جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔تذکرۂ شعراء'' 1984ء ص289

(8) اسمٰعیل ظریف ''غزل'' مطبوعہ ''شگوفہ پیروڈی نمبر'' ص84

(9) اسمٰعیل ظریف ''قطعہ'' مطبوعہ ''شگوفہ'' جنوری 69ء ص77

(10) صاحب حیدرآبادی ''جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔تذکرۂ شعراء'' ص289

(11) عزیز ابرار ''شگوفہ کی ادبی خدمات'' مقالہ برائے ایم فل' غیر مطبوعہ' مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد' 1989ء ص 28

(12) صاحب حیدرآبادی ''جنوبی ہند میں رباعی گوئی۔تذکرۂ شعراء'' ص176

(13) وسیم بیگم ''گلی نلگنڈوی بحیثیت طنز و مزاح نگار'' مقالہ برائے ایم فل' غیر مطبوعہ مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد 2009ء ص90

گلی نلگنڈوی

نام معین الدین خاں، گلیؔ تخلص تھا۔ چونکہ سکونت نلگنڈہ کی تھی۔ اسی مناسبت سے گلی نلگنڈوی کے نام سے موسوم ہوئے۔ گلی نلگنڈوی کے اجداد کا تعلق نلگنڈہ سے تھا ان کے دادا عبدالرحیم خاں محکمہ پولیس میں کانسٹبل کے عہدہ پر فائز تھے۔ عبدالرحیم خاں کے بڑے بیٹے منور خاں، تعلیم سے فراغت کے بعد محکمہ بلدیہ میں UDC کے عہدے پر مامور ہوئے۔ منور خاں کی شادی غوثیہ بیگم سے ہوئی۔ جن سے تین اولادیں ہوئیں۔ (1) خواجہ معین الدین خاں (گلی نلگنڈوی) (2) زہرہ بانو (3) عبدالباری خاں۔

گلی نلگنڈوی کی تاریخ پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یوسف غوری لکھتے ہیں۔

''گلی کا جنم 1940ء میں ہوا''(1)

انیسہ سلطانہ لکھتی ہیں:

''خواجہ معین الدین نام اور گلی تخلص کرتے تھے۔ 2 جون 1936ء میں پیدا ہوئے۔''(2)

ڈاکٹر سید بشیر احمد کے مطابق:

''گلی نلگنڈوی کا اصلی نام خواجہ معین الدین خاں تھا۔ وہ 1940ء میں نلگنڈہ میں پیدا ہوئے۔''(3)

خواجہ فریدالدین معتمد انجمن ترقی اردو نلگنڈہ کا کہنا ہے۔

''گلی نلگنڈوی کا نام سید خواجہ معین الدین تھا۔ وہ 14 اکتوبر 1939ء کو نلگنڈہ کے ایک معزز خاندان میں جناب منور خاں صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔''(4)

ضیا مجاہد نے رسالہ شگوفہ میں ''گلی نلگنڈوی'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ یہ مضمون گلی نلگنڈوی کی حیات میں ہی شائع ہوا تھا۔ جس میں انھوں نے تاریخ پیدائش کچھ اس طرح تحریر کی ہے۔

> ''آج سے چالیس سال قبل 20 جون 1936ء میں دنیا نے پہلی بار ان کو ماں کی آغوش میں روتا دیکھا۔ اس کا نام خواجہ معین الدین خاں رکھا گیا۔''(5)

چونکہ ضیا مجاہد کا مضمون گلی نلگنڈوی کی حیات میں شائع ہوا ہے اور اس ضمون کے مندرجات پر گلی نلگنڈوی نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی انھوں نے کسی واقعہ کی تردید کی ہے اسی لئے 20 جون 1936ء ہی ان کی صحیح تاریخ پیدائش قرار دی جاتی ہے۔

گلی نلگنڈوی کی ابتدائی تعلیم مرکزی اسکول نلگنڈہ میں ہوئی۔ پانچویں تا ساتویں تک بشیر مڈل اسکول میں زیر تعلیم رہے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ نلگنڈہ سے 1957 میں میٹرک کا امتحان امتیازی نشانات کے ساتھ کامیاب کیا۔ گلی کی تمام زندگی نامساعد حالات سے عبارت رہی۔ گلی کی عمر جب آٹھ برس کی ہوئی تو ماں کے سایہ سے محروم ہوگئے۔ ماں کے انتقال کے بعد ان کے والد نے محمودہ بیگم سے دوسری شادی کرلی' جس کی وجہ سے گلی نلگنڈوی کی پرورش کا فرض ان کی دادی نے انجام دیا۔ ان کی تربیت میں دادی کا اہم رول رہا۔

1960ء میں گلی نے محکمہ PWD میں بحثیت کلرک ملازم ہوئے۔ اس زمانے میں کم از کم میٹرک میں کامیابی حاصل کرنے والوں کو سرکاری ملازمت مل جایا کرتی تھی۔ گلی اس محکمہ کو پکوڑی' وڈا' دوسہ ڈپارٹمنٹ کہتے تھے۔ انھوں نے PWD پر ایک نظم بھی لکھی ہے جس کا حصہ درج ذیل ہے۔

P W D کی مایا
اچھا برج بنایا
اندر مورم کا کیول
اوپر سیمنٹ چٹایا

انھوں نے ناگرجنا ساگر ڈیم کی تعمیر کے سلسلے میں بھی بحثیت کلرک خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ

الامین کالج بنگلور میں بھی برسر کار رہے۔گلی نلگنڈوی کی شادی 1968ء میں مفتی مصلح الدین اور عظیم النساء بیگم کی صاحبزادی ملکہ بیگم سے ہوئی۔ان سے ایک بیٹا خواجہ فہیم الدین عارف عرف اعجاز 12 اپریل 1970ء کو پیدا ہوئے۔شادی کے کچھ دنوں بعد ہی گلی نلگنڈوی اور ان کی اہلیہ میں اختلاف پیدا ہوگئے اور بالآخر دونوں میں علٰحدگی ہوگئی۔

گلی نلگنڈوی بچپن ہی سے شاعری سے شغف رکھتے تھے' طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنے دوستوں میں بلبل ترنگ کی سنگت پر اپنا کلام سنایا کرتے اور داد وتحسین حاصل کرتے تھے۔اس سلسلے میں ضیا مجاہد تحریر کرتے ہیں۔

''ابتداء سے ہی شاعری کا فطری ذوق رکھتا تھا۔وہ جب سات آٹھ سال کا ہوا تو مہمل سی شاعری کرنے لگا۔تک بندی پر مشق حاصل کرلی۔بچوں میں شعر کہتے کہتے یہ بزرگوں میں ٹھیرا مسجد میں کلام سنانے لگا۔''(6)

یہ وہ زمانہ تھا جب سعید شہیدی' نظیر علی عدیلؔ' عظیم حیدرآبادی اور دیگر نامور شعرا ملازمت کے سلسلے میں نلگنڈہ میں مقیم تھے۔اور مخدوم محی الدین بھی کمیونسٹ قائد کی حیثیت سے اکثر نلگنڈہ کا دورہ کیا کرتے تھے۔ان شعراء کی موجودگی کی وجہ سے نلگنڈہ میں شاعرانہ فضا قائم ہو چلی تھی۔اسی ماحول میں گلی نلگنڈوی کے شعری ذوق نے جلا پائی اور وہ سنجیدہ شاعری کرنے لگے۔پہلے سعیدؔ اور پھر امرؔ تخلص اختیار کیا۔سنجیدہ کلام پر سعید شہیدی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ان کی ابتدائی شاعری کے دو اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

حسرت دید نکل جائے بہت مشکل ہے
طُور اک پھر کہیں جل جائے بہت مشکل ہے
آج ایک برق بدن ہے میرے پہلو میں امؔر
اب نشیمن میرا جل جائے بہت مشکل ہے

جس مشاعرے میں یہ غزل سنائی گئی اس میں مخدوم محی الدین بھی موجود تھے۔برقِ بدن کی ترکیب کو انہوں نے بہت سراہا اور گلی نلگنڈوی کے تابناک مستقبل کی پیش قیاسی کی تھی۔

نذیر دہقانیؔ بھی ارض نلگنڈہ سے تعلق رکھتے تھے۔اور مشاعروں کے سلسلے میں نلگنڈہ آیا کرتے تھے۔

گلی نلگنڈوی نے جب دہقانی کا کلام سنا تو خود بھی دہقانی زبان میں شعر موزوں کرنا شروع کردیا۔اس سلسلے میں خود گلی نلگنڈوی لکھتے ہیں۔

''میں نے شاعری کا آغاز کیا' لیکن میری مادری زبان دہقانی دکنی سے کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔اوراس زمانے میں مشہور شاعر نذیر دہقانی نے بھی نلگنڈہ ضلع کے تعلقہ جنگاؤں کے رہنے والے تھے جواب ضلع ورنگل میں چلا گیا ہے۔نذیر دہقانی اکثر نلگنڈہ مشاعروں میں آیا کرتے تھے اوراپنی مخصوص دہقانی زبان شاعری سے مشاعروں کو زعفرانِ زار کرتے تھے۔'' (7)

گلی نلگنڈوی نذیر دہقانی کو سننے کے بعد خود بھی مزاح میں طبع آزمائی کرنے لگے تھے لیکن وہ نذیر دہقانی سے زیادہ سرور ڈنڈا کے کلام سے متاثر ہوئے چنانچہ جب انہوں نے سرور ڈنڈا کا کلام سنا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے آپ کو ڈنڈا کا تابع بنالیا اوراپنا تخلص امر سے تبدیل کرتے ہوئے ڈنڈا کی مناسبت سے گلی رکھ لیا۔اپنے کلام کے تقریباً ہر مقطع میں اپنے تخلص گلی کی رعایت سے ڈنڈا کا ذکر ضرور کرتے۔محمد یونس فہمی لکھتے ہیں:

''سرور ڈنڈا سے متاثر ہوکر خود کو گلی بنالیا۔لیکن جیسا کہ ڈنڈے کو گلی پر فوقیت حاصل رہتی ہے اسی طرح سرور ڈنڈا کے اتباع کے باوجود گلی ان کی بلندی کو چھو نہ سکے لیکن سرور ڈنڈا کے اس قدر معتقد ہیں کہ مقطع میں اپنے تخلص کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بڑی شرافت سے خود کو سرور ڈنڈا کے مقابلے میں معمولی سمجھتے ہیں۔'' (8)

دکنی شاعری کی جانب رغبت اور سرور ڈنڈا سے متاثر ہونے کا حال خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

''غزلوں کے بعد میرا رجحان دکنی شاعری کی طرف ہوا۔میں نذیر دہقانی سے متاثر ہوکر دکنی میں شعر کہنے لگا۔پہلے دوستوں میں سنا کر داد حاصل کی' پھر محفلوں اور مشاعروں میں شعرا شامل تھے۔زندہ دلان حیدرآباد کے مشہور شاعر سرور ڈنڈا کی شاعری نے طنز ومزاح میں خوب شہرت پائی تھی

جن کی مشہور نظم ہے

پولیس کی ڈائری میں ڈنڈے کی شاعری میں
نافل اسٹاپ نہ کاما' سنجیوا ریڈی ماما (9)

گلی نلگنڈوی اپنے طنزیہ ومزاحیہ شاعری پر مولوی عبدالخالق مسافر نلگنڈوی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ بہت قلیل عرصہ میں ان کی شہرت نلگنڈہ سے حیدرآباد اور پھر ملک بھر میں پھیل گئی۔ زندہ دلان حیدرآباد کے مشاعرے ان کی مزاحیہ شاعری کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ ان کی پہلی نظم ''چان خاں کی شادی'' کافی مشہور ہوئی۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو:

نوّی دولن دیکھئیں، جھمکا کنگن دیکھئیں
لٹکن بیگن دیکھئیں، پھولوں کا بن دیکھئیں
دل کا چمن دیکھئیں
چان خاں بیگم پو لٹھو ہورئیں دیکھو

گلی نلگنڈوی اپنے استاد مسافر نلگنڈوی کے ساتھ زندہ دلان حیدرآباد کے مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے 1966ء میں پہلی بار کل ہند مشاعرہ میں شرکت کی۔ چونکہ وہ پہلی بار زندہ دلان حیدرآباد کے کل ہند مشاعرے میں شرکت کررہے تھے اسی لئے انھیں کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ لیکن جب انھوں نے غزل سنانا شروع کیا تو محفل زعفرانِ زار بن گئی اور انھوں نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ اس مشاعرے میں سنائی گئی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہو:

بن بریک مہمان آرئیں رات دن پکوان ہے
میرے گھر میں چھلہ چھٹی رہئی تو کیا نئیں رہئی تو کیا

آبرو والے تو چندیوں میں بھی تن کو ڈھانپتیں
بے حیا کو پھٹّی چڈّی رہئی تو کیا نئیں رہئی تو کیا

چل گئیں گلی کی غزلیں خوب چرچا ہوگیا
پیٹ میں گلی کے روٹی رہئی تو کیا نئیں رہئی تو کیا

اس مشاعرے نے گلی نلگنڈوی کو راتوں رات شہرت و عظمت کی بلندی پر پہچادیا۔گلی ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی شہرت پانے لگے۔انیسہ سلطانہ پہلے کل ہند مشاعرے کے بارے میں کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

"پہلی بار انھوں نے زندہ دلان حیدرآباد کے جس مشاعرے میں
شرکت کی اس کی صدارت آئی۔ایس جوہر کررہے تھے۔گلی نے جوہر کی
تعریف میں کچھ اشعار سنائے جو بہت پسند کئے گئے۔"(10)

گلی نلگنڈوی کی تخلیقات ماہنامہ "شگوفہ" رسالہ "پونم" روزنامہ "سیاست" اور روزنامہ "منصف" میں شائع ہوتی رہیں۔ان کا کوئی مجموعہ کلام ان کی حیات میں شائع نہ ہوسکا۔لیکن انجمن ترقی اردو نلگنڈہ کی جانب سے ان کا مجموعہ کلام "تاڑبن" کے نام سے جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔انھوں نے غزل، نظم، قطعات، سہرا، مرثیہ وغیرہ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔سنجیدہ کلام میں حمد، نعت، قصیدے اور مرثیے بھی کہے ہیں۔

گلی نلگنڈوی نے مزاحیہ شاعری کے ذریعہ آسمان کمندیں ڈالیں تھی انہوں نے اپنے مزاحیہ کلام کے ذریعہ اپنے سامع وقاری کے دل کو سرور سے بھر دیا تھا لیکن خود ان کی پوری زندگی حزن و یاس، ناامیدی و ناکامی، اور نامساعد حالات کا شکار رہی۔شاید یہی وجہ تھی کہ ان کی تخلیقات میں طنز کا عنصر غالب ہوتا چلا گیا ہے۔معاشی تنگدستی اور ازدواجی زندگی کی ناکامی نے انھیں شراب کا سہارا لینے پر مجبور کیا اور وہ اسی کے Addict ہو گئے۔وہ خود کہتے ہیں کہ:

اماں کدھر کی باوا کدھر کی　　　جورو کدھر کی بچے کدھر کی
تنخواہ مئے خانہ کو جارئی　　　شیشوں سے شیشے ٹکرارئیں

تنگدستی اور ناموافق حالات کے باوجود ان کے کلام میں مزاح کی چاشنی اور شگفتگی برقرار رہی۔

گلی نلگنڈوی منفرد لب ولہجہ کے دکنی شاعر ہیں۔گلی کی تخلیقات میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج ملتا ہے وہ اپنے موضوعات سماج میں پھیلی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں میں تلاش کرتے ہیں۔ان کے پاس روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ عصری حسیت کا بیان بھی ملتا ہے۔گلی کی تخلیقات میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ طنز کی کاٹ نمایاں نظر آتی ہے۔ہمارے ملک کے سیاسی نظام پر بیشتر طنزیہ ومزاحیہ شعرا نے اشعار موزوں کئے ہیں۔گلی بھی

موجودہ سیاسی قائدین اور سماج کے نام نہاد ٹھیکیداروں پر طنز کے تیر چلاتے ہوئے کہتے ہیں۔

جس جھنڈے پہ اس طرح بھی اک چھاؤں پڑی ہے
اس جھنڈے کے اطراف مصیبت بھی کھڑی ہے

☆☆☆

پیدائشی منحوس ہے، منحوس بچارہ
موجودہ سیاست کا ہے دمدار ستارہ

☆☆☆

لیڈراں تو ڈِنّروں پو ڈِنّراں دے رئیں تڑی
میں فتح میدان کی ٹھنڈی ہوا کھانا کتے

☆☆☆

آپ ہم سب بکریاں بن گئے عجب اتفاق ہے
لیڈراں سب دھنگراں بن گئے عجب اتفاق ہے

1969ء میں علٰحدہ تلنگانہ تحریک کی شروعات ہوئی۔لیکن سیاسی قائدین کی مفاد پرستی اور ابن الوقتی کی وجہ سے آج تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو پایا ہے۔آندھرا پردیش کے سیاسی لیڈروں نے ہمیشہ اس مسئلہ پر عوامی جذبات کا استحصال کیا اور انھیں بے وقوف بنایا۔اور اسی لئے آج تک تلنگانہ کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔گلی کے کلام میں بھی مسئلہ تلنگانہ کی گونج سنائی دیتی ہے۔سرور ڈنڈا اور حمایت اللہ کے پاس بھی اس موضوع پر کلام موجود ہے۔حمایت اللہ نے ''تلنگانہ'' کے عنوان سے نظم لکھی جبکہ ''جنتا کی عرضی'' میں سرور ڈنڈا نے عوامی جذبات کی نمائندگی کی ہے۔''جنتا کی عرضی'' نظم کی ردیف ''سنجیوا ریڈی ماما'' کے وزن پر گلی نے ''چنا ریڈی ماما'' موزوں کی۔اس نظم کے کچھ بند درج کیے جاتے ہیں جو ان کے بے باکانہ اظہار پر دال ہیں۔

گورنر بن کو دکھائے تم ''سی ایم'' بن کو بتائے تم
اچھا ملیا ٹھکانہ اچھا ملیا ٹھکانہ
او چنا ریڈی ماما ویرایز تلنگانہ یاڑوندی تلنگانہ

تم سب کو کھپائیں جی گلے بھی کٹائیں جی
پبلک کو مت گھمانا پبلک کو مت گھمانا
او چنا ریڈی ماما ویرا یز تلنگانہ یاڑوندی تلنگانہ

گلی ہوں میں شاعر ہوں بے باکی میں ماہر ہوں
تُمیں ڈنڈا مت بجانا تُمیں ڈنڈا مت بجانا
او چنا ریڈی ماما ویر ایز تلنگانہ
یاڑوندی تلنگانہ کاں ہے جی تلنگانہ

گلی نلگنڈوی نے عصر حاضر کی سیاست کو موضوع بنا کر کئی نظمیں اور قطعات لکھے ہیں۔ ''منسٹر کی موت پر چمچوں کا مرثیہ'' ایک اچھی نظم کہی جاسکتی ہے۔ جس میں انھوں نے سیاسی لیڈروں کی چالبازیوں اور ان کے حامیوں کی کرم فرمائیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔

باوارے داتا رے کاں کی جاتا رے جاتا رے

تیرے دم سے زندہ تھے سارے، سارے مر گئے ہائے رے
اماں باوا جورو بچے زندہ گڑ گئے ہائے رے
تیری ڈش میں کھاتے تھے اب کس کی ڈش میں کھانا رے
باوارے داتا رے کاں کی جاتا رے جاتا رے

اسمگلنگ اور بلاک مارکٹ یکدم سے بند ہو جائیں گے
تیرے ٹیبل کے پھر چمچے بول بتا کیا کھائیں گے
سونے کا انڈا دیتا تھا، تھا تو اصلی مرغا رے
باوارے داتا رے کاں کی جاتا رے جاتا رے

غالبؔ سے لیکر موجودہ عہد کے بیشتر شعرا واعظ اور ملّا کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔ گلی بھی ایسے نام

نہاد مذہبی رہنماؤں کی خوب خبر لیتے ہیں جو بھولے بھالے لوگوں کو مذہب کی آڑ میں بے وقوف بناتے ہیں۔

میں جو لیتا ہوں سو رشوت کتے
مرشداں لے رئیں سو تحفہ اور نذرانہ کتے

☆☆☆

باوا ہے ملّہ رِٹن تو بیٹے ہیں لندن رِٹن
بیٹے کو شریعت کی گُرڑگی رہئی تو کیا نئیں رہئی تو کیا

اخلاقی پستی عصر حاضر کا ایک تہذیبی المیہ ہے۔ بزرگوں کا احترام اور رشتوں کا پاس ولحاظ کتابی باتیں لگنے لگی ہیں۔ رشتے ناطے کی جگہ مطلب پرستی نے لے لی ہے۔ رشتوں کی ڈور اس قدر کمزور ہوگئی ہے کہ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی لوگوں کے دلوں میں ایک خلیج پیدا ہوگئی ہے۔ اور لوگ صرف خود غرضی اور مطلب پرستی کی لعنت کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ گلی معاشرے کی اس بگڑتی صورتحال پر کہتے ہیں:

دنیاچ بدل گئی ہے کاں کاں کو نکل گئی ہے
مسکے کو پھسل گئی ہے ایمان سے ٹل گئی ہے

☆☆☆

دودھ میں ممتا کے بھی پانی ہے کتے
بیسویں صدی کی نشانی ہے کتے

بڑھتی ہوئی مہنگائی ترقی پذیر ممالک کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ جس کی وجہ سے عام آدمی کی زندگی اجیرن ہوتی جارہی ہے۔ اور ہماری طرز معاشرت پر اس کے سنگین اثرات مرتب ہونے لگے ہیں۔ ایک دَور تھا جب مہمان کو اللہ کی رحمت سمجھا جاتا تھا لیکن اب صورتحال اس کے برعکس ہے۔ گلی ایسے مہمانوں پر بھی طنز کرتے ہیں جو میزبان کی معاشی ابتری سے واقفیت کے باوجود اسے مہمان نوازی پر مجبور کرتے ہیں۔

مہمانوں کو میں کب سے جھولے میں جھلاتا تھا
تُٹ نے کو ہے رسی، جاتے کی نہیں جاتے کی

میرے زخم دل کا مرہم لاتے کی نئیں لاتے کی
انوں جلدی آنا بول کو ایک رکشہ بھجوایا تھا
رکشہ ہے ذرا چھوٹا، ماتے کی نئیں ماتے کی
میرے زخم دل کا مرہم لاتے کی نئیں لاتے کی

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں شادی بیاہ اور دیگر تقاریب میں محض دنیاداری اور دکھاوے کی خاطر قرض لے کر بے جا رسومات نبھاتے ہیں۔گلی جھوٹی شان کی خاطر کی جانے والی ضیافتوں، بے جا رسومات اور فضول خرچی کرنے والوں پر طنز کے تیر برساتے ہوئے کہتے ہیں۔

ٹائٹ گرانی کا ہے زمانہ اُنچے اڑناں نکّو نا
قرضہ لے کو چھلاّ چھٹّی ،ہوندے کا جاں نکّو نا
سونٹی سُک ری نوبت میں پانچ جما گیاں نکّو نا
نکّو نارے نکّو نا ، نکّو یہ لاڑاں نکّو نا

ان اشعار میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ طنز کی کاٹ واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔گلی نلگنڈوی نے بعض بہت اہم معاشرتی مسائل کو اپنی نوک قلم سے بڑے ہی دلآویز انداز میں بیان کیا ہے۔ان کی بعض اشعار دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔وہ آپ بیتی نہیں جگ بیتی نظر آتے ہیں۔گلی نلگنڈوی نے مفلسی اور غربت اور موجودہ طرز زندگی میں بیوی کی فرمائشوں کو بھی اپنے اشعار میں باندھا ہے۔مندرجہ ذیل اشعار میں کسی قدر پھکڑ پن بھی نظر آتا ہے۔

زندگی زندہ دلی ہے دل کو بہلانا کتے
آٹھ دن سے فاقہ رہ کو شعر فرمانا کتے
میری لنگی ایر کنڈیشن ہے بیگم کو میرے
کم سے کم مہینے میں بارہ ساڑیاں لانا کتے

گلی نلگنڈوی نے مشاعروں کی گرتے معیار اور متشاعروں کی بڑھتی تعداد پر بھی توجہ دی ہے۔وہ ایسے شعراء

کونشانہ بناتے ہیں جو شہرت کے لئے دوسرے شعراء کا کلام اپنے نام سے پیش کرتے ہیں۔

میر کا ہے کی' داغ کا ہے کی' اٹھتا سوڈولا کس کا ہے کی
کندھا لگنے کو میں لگا روں' ڈولے میں مردہ کس کا ہے کی

نیچے کا مصرعہ میرا نچ ہونگا' اُپّر کا مصرعہ کس کا ہے کی
کڑوا کریلا میرا ہے پن' لال ٹماٹہ کس کا ہے کی

غالب کے سگّوں کی قسم ہے' سچا شاعر ہوں میں بھائی
میرے ہر اک شعر پو لیکن' لمبا سایہ کس کا ہے کی

دلاور فگار گلی نلگنڈوی کے پسندیدہ شاعر تھے۔ فگار نے تعلیمی نظام کے خلفشار اور طلبا کی عدم دلچسپی اور غفلت پر ایک نظم ''عشق کا پرچہ'' میں طنز کیا ہے۔ گلی نے اس نظم میں اٹھائے گئے سوالات کے جواب مزاحیہ انداز میں نظم کئے ہیں۔ یہ اشعار ان کی ذہانت کا پتہ دیتے ہیں۔ دلاور فگار کا سوال اور گلی نلگنڈوی کا جواب ملاحظہ ہو:

سوال: کچھ مثالیں دے کے سمجھاؤ یہ قول مستند
عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود

جواب: ایک دھواں اٹھتا ہے پہلے آگ لگ جاتی ہے جب
دیکھنے والوں میں رسوا ہوجاتی ہے تب
درحقیقت جانِ من آن چہ نہ چہ شو کند
عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود

سوال: چھوٹے چھوٹے نوٹس لکھو ذیل کے ٹاپکس پر
شامِ غم' شامِ جدائی' دردِ دل' دردِ جگر

جواب: شامِ غم، شامِ جدائی بہنیں ہیں چھوٹی بڑی
ایک چنگاری ہے تو ہے دوسری آتش پری
دردِدل، دردِجگر کا ذکر کرنا پاپ ہے
ایک ایٹم بام ہے اور ایک اس کا باپ ہے

گلی نلگنڈوی نے قطعات، گیت، سہرا،نظم اور غزل جیسی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کی نظموں کی طرح غزلوں میں بھی طنزومزاح کا حسین امتزاج ہے۔ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہو۔

گھر کی باتیں میں کیوں کہوں تم سے　　میری بیگم نے مجھ کو مارا ہے
پیٹھ پھٹتی اگر تو سہہ لیتے ہیں　　پیٹ پر دوستوں نے مارا ہے
خوب گلی نے یہ کیا کیا تو نے　　شال میں لپٹ کے مارا ہے

معشوق کا سراپا شعرا کا محبوب موضوع رہا ہے۔گلی بھی اپنی ایک غزل میں محبوب کی آنکھوں کے بارے میں کہتے ہیں:

آنکھ رکھ کو بھی میں اندھا اور دیوانہ کتے
ان کی ترپٹ انکھیاں نرگس اور پیمانہ کتے

اردوادب میں حسن وعشق، گل وبلبل کے عنوانات پر اشعار موزوں کرنے کی روایت رہی ہے۔گلی نلگنڈوی نے اس میں بھی ندرت پیدا کی اور مرد کی مدح سرائی کی ہے۔فلم ''چودھویں کا چاند'' کے ٹائٹل گیت میں شکیل بدایونی نے عورت کے حسن وادا کی تعریف کے پل باندھے ہیں جبکہ گلی نے اسی بحر میں ایک گیت لکھا ہے جس میں صنف قوی کی تعریف کی ہے۔

تو گر کوئی کلی ہے تو میں بھی گلاب ہوں
یوسف ہوں میں بھی عشق زلیخا کا خواب ہوں
دراصل میں عشق کی دنیا پہ چھا گیا
فرہاد بن کے قصۂ الفت بڑھا گیا

عنوانِ عشق تو، تو میں کامل کتاب ہوں
تو گر کوئی کلی ہے تو میں بھی گلاب ہوں

گلی نلگنڈوی نے اپنے کلام میں تمام شعری لوازمات کی پابندی کی ہے۔محاورے اور ضرب الامثال کے استعمال سے کلام میں حسن پیدا کیا جاتا ہے۔اردو شاعری میں محاوروں کے استعمال کی ایک روایت رہی ہے۔سنجیدہ شاعری میں بعض شعراء نے اپنے شعر کی بنیاد ہی محاوروں پر رکھی ہے۔گلی نلگنڈوی نے اردو اور دکنی محاوروں کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں۔

محاورہ

کار بولے تو کار دلایا بنگلہ بولے تو بنگلہ دیا
تمہارے خاطر، مرغا بن کو سونے کا انڈہ بھی دیا　　(سونے کا انڈہ دینے والی مرغی)
تن کے اُجلے من کے کالے برٹش کے نکلے گھوڑے　　(تن کے اُجلے من کے کالے)

لیڈراں تو ڈِرّوں پو ڈِرّاں دے رئیں تڑی
میں فتح میدان کی ٹھنڈی ہوا کھانا کتے　　ٹھنڈی ہوا کھانا

گلی کے اشعار میں دکنی محاوروں کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مسکا ماریا کیسے، کس کس کو مٹھاریا سہرا　　(مسکا مارنا / مٹھارنا / تپلاں پڑنا
تپلاں پڑکو بڑا کام نکالیا سہرا
اب جبار بھائی اِتّا کھاندے چڑھاؤ نکّو
ایک سے دو کی بلا کھاندے پو لایا سہرا　　(کھاندے چڑھانا)

گلی کے کلام کی ایک خصوصیت دیگر زبانوں کے الفاظ کا استعمال ہے۔وہ عربی و فارسی کے علاوہ تلگو اور انگریزی الفاظ کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔نظم ''فیشن ایبل وائف'' کا بند ملاحظہ ہو، جس کا ایک مصرعہ تلگو کا اور ایک مصرعہ اردو کا ہے۔

تیرا کلب کو جانا، غیروں میں مسکرانا
خود ناچنا نچانا، خود ناچنا نچانا
اِگا گیلسی ناوے بھاما، اِگا گیلسی ناوے بھاما

کبھی ہم بھی نوجواں تھے مشہور پہلواں تھے
اب تو بنی ہے گاما، اب تو بنی ہے گاما
اِگا گیلسی ناوے بھاما، اِگا گیلسی ناوے بھاما

طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں انگریزی الفاظ سے بھی حسن پیدا کیا جاتا رہا ہے۔ سب سے پہلے اکبرالہ آبادی نے انگریزی الفاظ کا استعمال شروع کیا تھا۔ گلی نلگنڈوی نے اس روایت سے کماحقہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

باسی منہ اٹھ کو پیتا سو بیڈ ٹی کتے
اس کے باوا کو بولوں میں ڈیڈی کتے

چیف منسٹر بننے کے ترے بھوتیچ چرچے ہورہے تھے
کِتّے کی اڈوانس میں منسٹر، تیرے چمچے ہورہے تھے

اُنیں کرتا سو باتاں گٹ پٹ
باتوں باتوں میں بولیا اَن فٹ اَن فٹ

فوڈ کا منسٹر تھا تو پیارے جنگ بھی دیش میں چھڑ گئی تھی
تیرے بنگلے کے پچھواڑے سے سونے کی کان نکل رئی تھی

چیف منسٹر بننے کے تیرے بھوتیچ چرچے ہورہے تھے
کِتّے کے اڈوانس میں منسٹر، تیرے چمچے ہورہے تھے

گولڈن چانس مِس کریارے پاگل رے ارے توہولا رے

باوارے داتارے کاں کی جاتا رے جاتا رے

گلی نلگنڈوی کا کلام دکنی تہذیب کی عکاسی بھی کرتا ہے۔سماجی اور معاشرتی مسائل کو اپنے کلام کا موضوع بنانا ان کا خاص وصف ہے۔طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے فروغ میں سلیمان خطیبؔ کو ایک عوامی شاعر کی حیثیت حاصل تھی۔اسی طرح گلی نلگنڈوی بھی عوام میں اپنے منفرد لب ولہجہ کی وجہ سے مقبول تھے۔اس کے علاوہ ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنا کلام ترنم سے سنایا کرتے تھے۔ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کے مطابق:

''گلی کا کلام منفرد تھا۔وہ ترنم سے کلام سناتے تھے۔ایک آدھ مرتبہ سلیمان خطیب سے بھی آگے چلے گئے۔''(11)

گلی نلگنڈوی کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے۔یوسف غوری لکھتے ہیں۔

''شاعر مرجاتا ہے لیکن اس کی شاعری اس کو زندہ جاوید بنادیتی ہے۔گلی دنیا میں نہیں رہے مگر گلی کی شاعری باقی ہے۔زندہ دلان حیدرآباد کے اسٹیج سے گلی اپنی دکنی شاعری کے ذریعہ متعارف ہوئے اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچ کر عالم شباب میں دارفانی سے کوچ کر گئے......ان کی شاعری میں مشاہدات، حادثات اور تجربات زمانہ کے ساتھ ساتھ پینے پلانے کا تذکرہ گلی کی شاعری میں کوٹ کوٹ کر شامل ہے۔''(12)

اپنے آپ کو طنز کا نشانہ بنانا اور اپنے آپ پر ہنسنا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔گلی نہ صرف خود کو نشانہ بنایا بلکہ اپنی مسکراہٹ میں اپنے غم کو بھلانے کی کوشش کی۔انجمن ترقی اردو نلگنڈہ کے خواجہ فریدالدین کے مطابق:

''اپنی ہرناکامی پر قہقہہ لگا کر خود بھی ہنستے رہے اور ان کے کلام کی نرم اور خوشگوار بوچھاروں سے سرشار ہو کر سارا زمانہ ہنستا رہا ان کے کلام میں اپنے آپ پر اپنے ماحول پر اور اپنے سماج کے ٹھکیداروں پر، ملک کی بدنام سیاست پر اور سیاسی نیتاؤں کی مکارانہ زندگی پر، مذہبی ٹھیکیداروں کی باطنی

کیفیات پر کھلا اور بھر پور طنز موجود ہے۔''(13)

گلی کی زندگی نا کامیوں اور محرومیوں کا شکار رہی۔شاید یہی وجہ ہے ان کے بعض اشعار میں مایوسی کا عنصر نظر آتا ہے۔حالانکہ طنز نگار کے لئے اپنے آپ کو چھپائے رکھنا پہلی شرط ہے۔اس سلسلے میں محمد یونس فہمی رقمطراز ہیں:

''کہیں کہیں گلی کے کلام میں قنوطیت اور مایوسی کا عنصر نظر آجاتا ہے ۔جو طنز نگاری کے مغائر ہے' کیونکہ طنز نگار نقاب پوش ہوتا ہے۔اپنے آپ کو چھپا کے رکھنا طنز نگاری کی پہلی شرط ہے لیکن گلی کو زندگی کی ناکامی نے شاید یہ کہنے پر مجبور کر دیا:

چل گئیں گلی کی غزلیں خوب چرچا ہوگیا
پیٹ میں گلی کے روٹی رہئی تو کیا نئیں رہئی تو کیا

اس ستم کے قطع نظر گلی کے جذبے میں تڑپ اور نظر میں عقابیت ہے ۔مضحک اور بھونڈے 'لنگڑے اور لولے سماج پر بھر پور طنز کرتے ہیں۔لیڈروں کی بے راہ روی کو نہایت خوبصورت انداز میں طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔نئے اچھوتے خیالات جن میں طنز کے ساتھ ساتھ مزاح کا عنصر بھی نمایاں رہتا ہے' گلی کی انفرادیت کی دلیل ہے۔''(14)

انیسہ سلطانہ کی رائے بھی یونس فہمی سے مختلف نہیں ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''گلی کی شاعری مزاحیہ ہے لیکن اس میں مایوسی اور قنوطیت بھی ہے۔یہ خصوصیت مزاح سے میل نہیں کھاتی' لیکن گلی اپنے حالات سے مجبور تھے۔زندگی نے انھیں سوائے رنج و غم کے کچھ نہیں دیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں حزن و یاس زیادہ نظر آتا ہے اور کلام میں طنز کا عنصر جلوہ گر ہے۔اس میں شک نہیں کہ انہوں نے غم جاناں کے علاوہ غم دوراں کو بھی اپنی

> شاعری میں جگہ دی۔ حالاتِ حاضرہ اور سیاست پر ان کی اچھی نظمیں مل جاتی ہیں۔ ''منسٹر کی موت پر چمچوں کا مرثیہ'' ان کی مشہور طنزیہ نظم ہے۔ جس میں انھوں نے ان منسٹروں پر طنز کیا ہے جو اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھ کر عوام کو طرح طرح سے ستاتے ہیں۔ اپنی شہرت کے لئے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہیں اور بے معنی دھوکہ دہی ان کا شیوہ ہے۔'' (15)

گلی نلگنڈوی نے دکنی زبان کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا۔ موضوعات کا تنوع، منفرد لب و لہجہ اور مترنم کلام کی وجہ سے عوام میں بے حد مقبول ہوئے اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سلیمان خطیب کے بعد گلی نلگنڈوی ہی مقبول عوامی شاعر تھے۔ قدیم ریاست حیدرآباد یعنی مہاراشٹر اور کرناٹک میں بھی ان کا شہرہ تھا۔ گلی نلگنڈوی، نذیر دہقانؔی، اعجاز حسین کھٹاؔ، علی صائب میاںؔ، سرور ڈنڈاؔ اور سلیمان خطیب کے سلسلے کی کڑی ہیں۔

ناکام ازدواجی زندگی، حزن و ملال سے بھرے حالات نے انھیں شراب نوشی کا عادی بنادیا جس کی وجہ سے وہ متعدد بیماریوں کا شکار ہوگئے۔ ڈسمبر 1979 میں جگر کے عارضہ کی وجہ سے دواخانہ عثمانیہ میں شریک کرائے گئے۔ بالآخر 29 ڈسمبر 1979ء مطابق 9 صفر المظفر 1400ھ بعمر چالیس سال اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اور نلگنڈہ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ جدید افسانہ نگار انور رشید اور گلی نلگنڈوی حیدرآباد کے دو فنکار ہیں جنہوں نے مجازؔ کی طرح خود کو اور اپنے فن کو بنت عنب کی نظر کر دیا۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) یوسف غوری　”دکنی زبان کا نمائندہ شاعر' گلی نلگنڈوی“ مطبوعہ روزنامہ ”منصف“ 17 ستمبر 2000ء

(2) انیسہ سلطانہ　”حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشونما“ ص 97

(3) ڈاکٹر سید بشیر احمد　”مزاح نگاران حیدرآباد“ ص 69

(4) خواجہ فرید الدین　”مقدمہ“ مشمولہ ”تاڑ بن“ (زیر اشاعت) بحوالہ: ”گلی نلگنڈوی بحیثیت طنز و مزاح نگار“ از وسیم بیگم' مقالہ برائے ایم فل' (غیر مطبوعہ) مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو' یونیورسٹی آف حیدرآباد 2009 ص

(5) ضیا مجاہد　”گلی نلگنڈوی“　مطبوعہ ”شگوفہ“　جون 1974 ص 27

(6) ضیا مجاہد　”گلی نلگنڈوی“　مطبوعہ ”شگوفہ“　جون 1974 ص 28

(7) یوسف غوری　”دکنی زبان کا نمائندہ شاعر' گلی نلگنڈوی“ مطبوعہ روزنامہ ”منصف“ 17 ستمبر 2000ء

(8) محمد یونس فہمی　”اردو شاعری میں طنز و مزاح“ ص 55　1979ء

(9) یوسف غوری　”دکنی زبان کا نمائندہ شاعر' گلی نلگنڈوی“ مطبوعہ روزنامہ ”منصف“ 17 ستمبر 2000ء

(10) انیسہ سلطانہ　”حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشونما“ ص 98

(11) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال　”شخصی انٹرویو“　5 جون 2009

(12) یوسف غوری　”دکنی زبان کا نمائندہ شاعر' گلی نلگنڈوی“ مطبوعہ روزنامہ ”منصف“ 17 ستمبر 2000ء

(13) خواجہ فرید الدین　مقدمہ' مشمولہ ”تاڑ بن“ (زیر اشاعت) بحوالہ ”گلی نلگنڈوی بحیثیت طنز و مزاح نگار“ ص 160

(14) محمد یونس فہمی　”اردو شاعری میں طنز و مزاح' آزادی ہند 1947 کے بعد“ ص 258

(15) انیسہ سلطانہ　”حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشونما“ ص 98

مصطفیٰ علی بیگ

مرزا مصطفیٰ علی بیگ 11 اکٹوبر 1936 کو حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے 1958 میں بی ایس سی کرنے کے بعد سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوگئے۔ اے پی اسٹیٹ ہاؤزنگ کارپوریشن میں جنرل منیجر (میٹریل وکوالٹی کنٹرولر) کے عہدہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ ابتداء ہی سے طبیعت کا میلان طنز ومزاح کی طرف رہا۔ زندہ دلان حیدرآباد اور فائن آرٹس اکیڈیمی سے وابستگی نے اس ذوق میں کمال پیدا کیا۔ انہوں نے شاعری میں اپنا ایک منفرد اسلوب اختیار کیا۔ ان کی شاعری جس کو ''اینگلو اردو شاعری'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنا کلام اپنے مخصوص ترنم میں سناتے ہیں جس کو ''اینگلو اردو'' ترنم کہہ سکتے ہیں۔ یہ اینگلو اردو شاعر نہ صرف ملک بھر میں بلکہ ساری دنیا میں اپنے منفرد اسلوب اور ترنم کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا ہے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ''آئی ایم سوری'' منظر عام پر آچکا ہے۔ ایک اور مجموعہ ''آئی ڈونٹ نو'' زیر اشاعت ہے۔

ان کی ابتدائی شاعری اور فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال لکھتے ہیں۔

> ''مرزا مصطفیٰ علی بیگ جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ ہی سے مختلف ثقافتی وفود میں شامل رہے۔ کالج کے علاوہ فائن آرٹس اکیڈیمی سے وابستہ ہوکر حیدرآباد کے دوسرے کلچرل پروگراموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور مزاحیہ خاکہ نگاری کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کرلی۔ ریڈیو پروگراموں میں حصہ لیا کرتے ہیں۔ ''اینگلو اردو'' کے شاعر ہیں، مزاحیہ مضامین بھی لکھتے ہیں۔'' (1)

مصطفیٰ علی بیگ خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''فائن آرٹس اکیڈیمی اور زندہ دلان حیدرآباد سے وابستہ ہوں۔ بلکہ زندہ دلان حیدرآباد کا فاؤنڈر ممبر کہلاتا ہوں۔ طنز ومزاح کی اینگلو اردو شاعری

’مزاحیہ خاکے اور ٹی وی سیریئل لکھنا میری مصروفیت ہے۔‘‘(2)

اردو شاعری میں اکبرالہ آبادی نے انگریزی الفاظ کا استعمال سب سے پہلے کیا تھا۔مصطفیٰ علی بیگ کی شاعری اسی شاعری کا تسلسل ہی نہیں بلکہ نئی نئی جدتوں کی حامل ہے۔آزادی سے پہلے تک اردو زبان برصغیر میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔آزادی کے بعد سیاسی حالات میں کافی تبدیلی آئی ہے۔رفتہ رفتہ اب وہ تدریسی زبان کا درجہ کھوتی جارہی ہے۔اردو بیزاری عام ہوگئی ہے۔بچے انگلش ماڈل اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ان حالات میں موجودہ نسل اردو سے نابلد ہوگئی ہے۔موجودہ نسل اردو ادب سے اتنی فیضیاب نہیں ہوسکی جیسا کہ سابق میں ہوا کرتی تھی اسی لئے مصطفیٰ علی بیگ نے اپنی شاعری میں انگریزی الفاظ استعمال کرکے اینگلو اردو شاعری شروع کی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ ان کے اس مخصوص اسلوب سے اردو سے کم واقف لوگ بھی لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ان کی پہلی شعری تخلیق کے دو اشعار درج ذیل ہیں۔

ان سے میری جو فائٹ ہوتی ہے　　　دشمنوں کی ڈیلائٹ ہوتی ہے
دل میں ہر ایک کے گھر بناتے ہیں　　　ٹاک جن کی پولائٹ ہوتی ہے

کچھ برس پہلے شہر حیدرآباد فرقہ وارانہ فساد کی وجہ سے کرفیو کا شہر بن گیا تھا۔ظاہر ہے کرفیو میں آمد و رفت پر امتناع رہتا ہے۔بوائے فرینڈ اپنی گرل فرینڈ سے ملنے کے لئے بارگاہ یزدی میں دست بہ دعا ہوتا ہے۔اس خیال کو مصطفیٰ علی بیگ نے اپنی نظم ’’کرفیو میں ہے‘‘ کے اشعار میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

درد دل کی ہر دوا کرفیو میں ہے　　　آج کل دار شفاء کرفیو میں ہے
ایک ہیلی کاپٹر دلادے اے خدا　　　ان کے گھر کا راستہ کرفیو میں ہے(3)

روایتی اردو شاعری میں رقیب کا تصور بہت قدیم ہے۔مصطفیٰ علی بیگ اپنے رقیبوں سے خائف نہ رہنے کی وجہ بیان کرتے ہیں۔

اب رقیبوں سے مجھے خدشہ نہیں　　　کیوں کہ میری دلربا کرفیو میں ہے

انسان پریشان حالی میں دوستی اور دشمنی کا خیال کئے بغیر ایک دوسرے کا ساتھ دیتا ہے۔اسی خیال کو انہوں

نے شعری سانچے میں ڈھالا ہے۔

کھا رہے ہیں بانٹ کر رام و رحیم   بھائی چارہ کی فضاء کرفیو میں ہے

چند برسوں سے ملک میں ہر طرف پانی کی قلت پیدا ہوگئی ہے۔ ناکافی بارش کی وجہ سے حیدرآباد میں بھی پانی کی بڑی قلت رہنے لگی ہے۔ اس قلت کو کس عمدگی سے مصطفیٰ علی بیگ نے منظوم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو

میں جو پوچھا کہ کیا پلاؤ گے   اُن کی آنکھوں میں آ گیا پانی

باطل پرستوں نے کربلا میں امام عالی مقام اور ان کے متعلقین پر پانی بند کر دیا تھا۔ اس المناک صورتحال کو بیشتر شعراء نے نظم کیا ہے۔ ایسے المناک موضوع پر مزاح نگار مشکل ہی سے قلم اٹھاتے ہیں۔ لیکن مصطفیٰ علی بیگ نے بڑی احتیاط اور عمدگی سے اپنے احساسات کو پیش کیا ہے۔

میرے پیاسے امامؓ کے صدقے   اہمیت کتنا پا گیا پانی

سیاست داں ہر ملک کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ یہاں مخلص سیاست دانوں کی ہمیشہ کمی رہی ہے۔ دور حاضر کے مفاد پرست سیاسی قائدین پر وہ بھرپور طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہے لیڈر کو فقط دولت کی چاہت   کہاں کی کنٹری اور کیسی نیشن

اردو ادب کے ارتقاء میں مزاحیہ شعرا نے غیر معمولی خدمات انجام دیں ہیں۔ نقادوں کا نقطۂ نظر ہے کہ سنجیدہ شعر کہنا آسان ہے لیکن مزاحیہ شعر کہنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ مصطفیٰ علی بیگ مزاحیہ شاعری کے تعلق سے کہتے ہیں۔

سنجیدہ شعر کہنا تو مشکل نہیں مگر   طنز و مزاح اس میں ملانا ہے پرابلم

اس ملک کا المیہ یہ ہے کہ یہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ اور سینکڑوں معصوم افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ بعض دفعہ فسادات کے دوران شناخت نہ ہونے پر نام دریافت کر کے نقصان پہچایا جاتا ہے۔ اس تعلق سے انہوں نے ایک قطعہ منظوم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

لائف انڈ ڈیتھ بھی ہوگیا گیم   ریلّی اِٹ اِز اے میٹر آف شیم
رام کہوں یا کہوں رحیم   قاتل پوچھ رہا ہے نیم

آصف جاہی دور میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہا۔لیکن آج صورتحال یکسر مختلف ہے۔اردو کو روزی روٹی سے دور کر دیا گیا ہے۔اردو مدارس کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔اردو کے نام پر روٹی کھانے والے خود اردو کا استحصال کررہے ہیں۔اس صورتحال کو وہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

سچی فیلینگ نہیں میرے من میں		اردو اردو پکاروں میں بن میں
رکھا اردو کو میں نے کفن میں		اپنے بچوں کو انگلش پڑھا کر

مختلف شعراء نے اپنے محبوب سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے محبوب کے استعمال میں آنے والی مختلف اشیاء کو حسرت سے دیکھتے ہیں۔اوران کی ایک انجانی خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ ان اشیا میں سے ایک ہوتے اور اس طرح وہ محبوب کی قربت سے استفادہ کرتے۔مصطفیٰ علی بیگ کی آرزو نرالی ہے وہ کہتے ہیں۔

پٹرول کی طرح سے جلوان کی کار میں		یہ آرزو عجب ہے دل بے قرار میں

زندگی بھر محبوب سے فاصلہ رہنے کا شکوہ کرتے ہوئے موت کے بعد ایک ہی مزار میں دفن رہنے کی خواہش کو انہوں نے اپنے شعر میں پیش کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

مرنے کے بعد کیوں نہ رہیں ایک مزار میں		مجھ سے رہیں آپ سیپریٹ عمر بھر

ہمارے ملک میں خانقاہی نظام کی ایک روایت رہی ہے۔اعراس کے موقعوں پر سجادہ نشین حضرات تقاریب کے انعقاد کے سلسلے میں ارادت مندوں اور عقیدت مندوں سے ان کے حسب استطاعت مالی اعانت حاصل کرتے ہیں لیکن اس جمع شدہ رقم کا مصرف اگر صحیح نہ ہو تو اس تعلق سے ان کا منفرد خیال ملاحظہ ہو۔

مرشد تڑپ کے رہ گئے اپنی مزار میں		چندہ جو عرس کا تھا وہ سجادے کھا گئے

آندھرا پردیش میں سرکاری ملازمین کی سبکدوشی کی عمر 58 برس ہے۔لیکن سیاسی قائدین جو ملک کی اہم وزارتوں پر فائز رہتے ہیں ان کے لئے عمر کی ایسی کوئی شرط نہیں۔اس تعلق سے وہ کہتے ہیں۔

ہم کو اٹھاون میں پنشن آل رائٹ		ہیں منسٹرس اسی اسی سال کے

''ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار'' بچوں کے لئے لکھی گئی ایک معروف نظم ہے۔اسی وزن پر مصطفیٰ علی بیگ کی ایک غزل ملاحظہ ہو جس میں شگفتگی کے ساتھ طنز کی زیریں لہر بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔

او ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار	الّو بنوں گا میں کتنی بار
ان کی گلی میں الون پٹا ہوں	بھاگ گئے سب میرے یار
اپنی تو لک ہے پیدل پیدل	ان کی لک ہے موٹر کار
سر پھوٹا اور جگ بھی ٹوٹا	سیدھی سادی ہے گھر کی وار
مجھ کو ہوٹ کرے گا جو بھی	اس پر ہوگی خدا کی مار (4)

جہیز ہمارے معاشرے کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ مزاحیہ ادباء وشعرا نے بارہا اپنی تخلیقات میں اس موضوع کو پیش کیا ہے۔ آج کل لڑکے والے اپنے مطالبات کی فہرست طویل کرتے جارہے ہیں۔ جو معاشرہ کے لئے ایک ناسور ہے۔ اس تعلق سے وہ اپنے ایک قطعہ میں کہتے ہیں۔

مجھ کو ڈوری میں فریج اور ڈنرسٹ دے دو	ساتھ بنگلہ کے سوا لاکھ روپئے نٹ دے دو
آپ دلوائیں گے بے شک نئی اسکوٹر بھی	وُ ڈبی پپا مجھے ایڈوانس میں ہلمٹ دے دو(5)

مصطفیٰ علی بیگ نے ایک طویل تخلیقی سفر طئے کیا ہے۔ وہ عمر کے ایسے پڑاؤ میں جہاں صحت کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ صحت اور محبت کے مضمون کو وہ اپنے منفرد انداز میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

وہ مجھے نیگلیکٹ کئے یہ ایک صدمہ ہوگیا
مجھ کو ڈیابٹس ہوئی آہوں سے دمہ ہوگیا
عاشقی کا جب بخار اترا ہے پکّی ایج میں
دردِ دل نیچے اتر کر درد گھٹنہ ہوگیا(6)

غوث ارسلان ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"مصطفیٰ علی بیگ نے مزاحیہ شاعری میں نئی طرز قائم کی ہے۔ انگریزی کا خوبصورتی سے استعمال کیا۔ وہ اینگلو اردو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔"(7)

ان کا دوسرا شعری مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ایک انٹرویو میں انھوں نے بتایا کہ اس مجموعہ کے ایک صفحہ پر ان کا کلام اردو رسم الخط میں ہوگا اور دوسرے صفحہ پر رومن انگلش میں۔اس طرح غیر اردو داں قارئین بھی اردو مزاحیہ شاعری سے لطف اندوز ہوسکیں گے۔رحیم صائب میاں کو دہقانی زبان کی شاعری کا نقش اول تصور کیا جاتا ہے۔وہ اپنے وقت کے منفرد صوتی شاعر تھے۔ہوائی جہاز کی گونج' ریل کی بھک بھک' مشین کی گڑگڑاہٹ' پرندوں کی بولیاں' جانوروں کی مخصوص آوازیں' چچوندر کی چخ چخ' مینڈک کی ٹرٹر اور مختلف پٹاخوں کی خاص پھٹا پھٹ وغیرہ کو وہ بڑی عمدگی سے اپنے اشعار میں اس طرح سموتے تھے کہ دلکشی بھی برقرار رہے اور شعر کا وزن بھی گرنے نہ پائے۔ان کے بعد اب تک یہ رنگ سخن گوئی ان کے علاوہ کسی اور کے پاس نظر نہیں آتا۔مصطفیٰ علی بیگ اپنی تخلیقات میں صوتی آہنگ کو بھی فروغ دینا چاہتے ہیں۔اگر ایسا ہوتا ہے تو رحیم صائب میاں کے بعد اس مخصوص رنگ سخن کا پھر سے احیاء ہوسکتا ہے۔

----OOO----

حوالہ جات

(1)　ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال　سووینیئر ''زندہ دلان حیدرآباد (دوسرا کل ہند مزاحیہ مشاعرہ) مئی 1967 ص 47

(2)　مصطفیٰ علی بیگ　''تعارف'' مطبوعہ ''شگوفہ خلیج نمبر'' ص 195 جون 2004ء

(3)　مصطفیٰ علی بیگ　''کرفیو میں ہے'' مطبوعہ ''شگوفہ'' سالنامہ جنوری فبروری 1991ء

(4)　مصطفیٰ علی بیگ　غزل مطبوعہ سووینیئر ''زندہ دلان حیدرآباد (دوسرا کل ہند مزاحیہ مشاعرہ) مئی 1967

(5)　مصطفیٰ علی بیگ　قطعہ مطبوعہ ''شگوفہ'' نومبر 1986ء ص 25

(6)　مصطفیٰ علی بیگ　قطعہ مطبوعہ ''شگوفہ خلیج نمبر'' ص 196

(7)　غوث ارسلان　''دکن میں طنز و مزاح'' مطبوعہ ''شگوفہ خلیج نمبر'' ص 162

محمد حمایت اللہ

محمد حمایت اللہ کا تعلق حیدرآباد دکن کے ایک باعزت فوجی گھرانے سے ہے۔ان کے اجداد پیشہ سپہ گری سے وابستہ تھے۔حمایت اللہ کے دادا کو دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑے لڑکے محمد غلام مرتضٰی نے بھی اپنے اجداد کے پیشے کو اپنایا اور فوجی ملازمت اختیار کی۔ترقی کرتے ہوئے میجر کے عہدے پر فائز ہوئے۔محمد غلام مرتضٰی کی شادی افضل النساء بیگم سے ہوئی۔محمد حمایت اللہ نے محمد غلام مرتضٰی اور افضل النساء بیگم کے گھر 25 ڈسمبر 1932ء کو سکنڈ لانسر فوجی ایریا' حیدرآباد میں آنکھ کھولی۔غلام مرتضٰی کے سات اولادیں تھیں۔چار لڑکے اور تین لڑکیاں۔1) محمد غلام مصطفٰی 2) محمد عبدالباسط 3) محمد عبدالہادی 4) محمد حمایت اللہ اور لڑکیوں میں 1) جہاں آراء بیگم 2) عائشہ بیگم 3) آسیہ بیگم۔

حمایت اللہ کی ابتدائی تعلیم سینٹ پیٹرک ہائی اسکول سکندرآباد میں ہوئی۔چونکہ حیدرآباد سے سکندرآباد کے سفر میں کافی وقت لگ جاتا تھا اور حمایت اللہ کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے ان کے والدین نے انھیں ہاسٹل میں داخل کروادیا۔1949ء میں جب حمایت اللہ پانچویں جماعت میں زیر تعلیم تھے ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔والد کے اچانک انتقال کی وجہ سے ان کے گھر کے معاشی حالات خراب ہونے لگے جس کی وجہ سے انھیں ہاسٹل میں قیام کو ترک کرنا پڑا۔تعلیم کے حصول کے لئے انھوں نے بس کے ذریعہ اسکول جانا شروع کیا۔کئی مرتبہ ان کے ٹکٹ کے پیسے بھی کھو گئے لیکن حمایت اللہ نے ہمت نہیں ہاری بلکہ پیدل اسکول تک کا سفر طئے کیا۔ان ہی دشواریوں کے سبب انھیں اسکول بھی تبدیل کرنا پڑا۔انھوں نے سینٹ پیٹرک اسکول کے بعد آل سینٹس گرامر اسکول عابڈس میں داخلہ لیا۔سینئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اپنے تعلیمی سفر کو خیر باد کہہ دیا۔کیونکہ ان کے معاشی حالات اعلیٰ تعلیم کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

سلسلہ تعلیم منقطع ہونے کے بعد حمایت اللہ نے ملازمت کے بجائے تجارت کرنا مناسب سمجھا۔زمانہ طالب علمی کے دوران وہ اپنے بھائیوں کی کلرنگ اور سیکل ریپیرنگ کی دُکان پر بیٹھا کرتے تھے جس سے انھیں کاروبار کا تھوڑا بہت اندازہ ہونے لگا تھا۔تعلیم کو خیر باد کہنے کے بعد انھوں نے اپنا الگ کاروبار پی ڈبلیو ڈی کنٹراکٹر

کی حیثیت سے شروع کیا۔اس کاروبار میں ان کی محنت رنگ لائی۔ 1974ء تک انھوں نے اپنی سخت محنت کی وجہ سے A کلاس گورنمنٹ کنٹراکٹر کی حیثیت سے شناخت بنالی۔اس کے علاوہ روڈ رولر اور کریشر مشین وغیرہ کرایے پر دینے کا کام کرنے لگے۔حمایت اللہ نے اب کنٹراکٹر کے عہدے سے ریٹائرمنٹ لے لیا ہے۔

محمد حمایت اللہ کی شادی 22 مئی 1974ء کو ڈاکٹر رشید موسوی سے ہوئی۔حمایت اللہ اور رشید موسوی شادی سے قبل ہی سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔حمایت اللہ سے رشید موسوی کی پہلی ملاقات بیچلر کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ میں واقع فائن آرٹس اکیڈیمی کے دفتر میں ہوئی۔اس وقت رشید موسوی انٹرمیڈیٹ کی طالبہ تھیں اور اپنے پرنسپل کے ہمراہ فائن آرٹس اکیڈیمی کے فنکاروں کو کالج کے ایک کلچرل پروگرام کے لئے مدعو کرنے کے لئے آئی تھیں۔رشید موسوی نے بی اے کے دوران ڈاکٹر زینت ساجدہ اور جہاں بانو نقوی کی سرپرستی میں فائن آرٹس اکیڈیمی کے فنکاروں کے ساتھ کئی کامیاب کلچرل پروگرام منعقد کروائے۔چونکہ ہر پروگرام میں سرور ڈنڈا اور حمایت اللہ ہمیشہ کامیاب رہتے اس لئے ان کی شرکت لازمی رہتی۔حمایت اللہ اور دوسرے فنکار نہ صرف پروگرام پیش کرتے بلکہ طالبات کو بھی ان جلسوں میں اپنا فن پیش کرنے کا موقع فراہم کرتے تھے۔طالبات عموماً قوالی اور غزل وغیرہ پیش کرتیں۔ویمنس کالج کے ان ہی پروگراموں میں حمایت اللہ اور رشید موسوی نے ایک دوسرے کو قریب سے جانا اور پھر یہ پہچان دوستی میں بدل گئی۔رشید موسوی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ان کی شادی حمایت اللہ سے ہوگی۔وہ کہتی ہیں کہ

> ''وہ شادی سے پہلے حمایت اللہ کے متعلق اپنے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں رکھتی تھیں۔'' (1)

رشید موسوی ایک کٹر شیعہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔رشید موسوی کے گھر منعقد ہونے والی ادبی محفلوں کی وجہ سے ان کے گھر والے حمایت اللہ سے متعارف تھے اور ان سے متاثر بھی۔شاید یہی وجہ تھی کہ جب حمایت اللہ کے بزرگوں نے رشید موسوی کا رشتہ مانگا تو ان کے گھر والوں نے عقیدے کے بجائے حمایت اللہ کی شریف النفسی اور انسانیت دوستی کو ترجیح دی اور ان کا رشتہ رشید موسوی کے لئے قبول کیا۔اور اس طرح حمایت اللہ کی شادی رشید موسوی سے انجام پائی۔اشفاق حسین نے رشید موسوی اور حمایت اللہ کی شادی کے موقع پر کہا تھا۔

''مجتبیٰ میں اسے حمایت اللہ اور رشید موسوی کی شادی نہیں سمجھتا بلکہ
اسے مرثیے اور مزاح کا ملاپ تصور کرتا ہوں۔'' (2)

اس جملے پر تبصرہ کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین کہتے ہیں۔

''اس بلیغ تبصرے میں حیدرآبادی مزاح کا یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ اچھا اور سچا مزاح وہی ہوتا ہے جو غموں اور مصائب کو اپنی ذات میں انگیز کر لینے کے بعد پیدا ہوتا ہے ایک ایسا مزاح جس سے پیدا ہونے والے قہقہے کی پرتوں کو آپ کھولنے لگیں تو آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسوں ٹپک پڑیں۔ بعد میں مرثیہ اور مزاح کے ملاپ کا یہ تجربہ اتنا کامیاب ہوا کہ آج حمایت اللہ نہ صرف ایک فرماں بردار مزاح نگار اور مزاح کار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں بلکہ ایک فرماں بردار شوہر کی حیثیت سے بھی ان کا رتبہ بہت بلند ہے۔ خدا مرثیے اور مزاح کے اس ملاپ کو برسوں قائم و دائم رکھے۔''(3)

حمایت اللہ کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ انھوں نے رشید موسوی کے بڑے بھائی ابوالقاسم کی سب سے چھوٹی لڑکی فاطمہ موسوی کو گود لیا ہے۔ اب فاطمہ موسوی ہی حمایت اللہ اور رشید موسوی کی کل کائنات ہے۔ فاطمہ موسوی نے بی کام کیا ہے۔ ان کی شادی ایک معزز گھرانے میں مشہور شاعر عامر موسوی کے فرزند سید مجیب حسین موسوی سے ہوئی۔ اس گھرانے نے لندن میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔

حمایت اللہ سچے، مخلص، ہمدرد اور محبت کرنے والے زندہ دل انسان کا نام ہے۔ ان کی نس نس میں بزلہ سنجی، لطافت اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بحیثیت انسان اور بحیثیت شاعر حمایت اللہ کے پاس فطری پن نظر آتا ہے۔ حمایت اللہ بچپن سے ہی ظریف اور مزاحیہ طبیعت کے مالک رہے ہیں۔ معروف کالم نگار مجتبیٰ حسین ان کی پر مزاح شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حمایت اللہ ایک ایسے چلبلے شخص کا نام ہے جس نے کبھی نچلا بیٹھنا
سیکھا ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ خدانخواستہ اگر کسی جنازے میں شرکت کرنا

پڑ جائے تو میں میت اور حمایت دونوں سے حتیٰ الامکان دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔تاہم ایک بار ایسا ہوا کہ میت کو قبر میں اتارنے کے بعد آخری دیدار کے لئے جب کفن سرکایا گیا تو مرحوم کے کسی بہی خواہ نے کہا' ذرا چہرہ تو دیکھئے' لگتا ہے مرحوم کسی بات پر مسکرا رہے ہیں' مجھے پتہ نہیں تھا کہ عین اسی وقت حمایت اللہ بھی میرے پیچھے کھڑے ژراف کی طرح اپنی گردن نکالے میت کا آخری دیدار کرنے میں مصروف ہیں جو ان کے بیان کے مطابق ان کے لئے تو یہ پہلا دیدار ہی تھا۔فوراً سرگوشی کے انداز میں بولے' جی ہاں! یقیناً مسکرا رہے ہیں۔ بلکہ اس بات پر خوش ہیں کہ آپ جیسے اوباشوں سے نجات مل گئی' اور مسکراہٹ جو ابھی کچھ دیر پہلے تک میت کے ہونٹوں پر سجی ہوئی تھی وہ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔''(4)

حمایت اللہ نے اپنی شاعری کی ابتداء اس دور میں کی جب حیدرآباد میں مسلمان پولیس ایکشن کے بعد سہم سے گئے تھے۔پولیس ایکشن کے دوران پیش آنے والے واقعات نے ان کے دلوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ایسے نازک دور میں PDF پیوپلز ڈیموکریٹک فرنٹ قائم ہوا۔حمایت اللہ اور سرور ڈنڈا اس پارٹی کی کلچرل ونگ میں شامل ہوگئے۔کلچرل ونگ کی جانب سے بھوئی گوڑہ (آغا پورہ) میں ایک عوامی پروگرام (بھاگواتم) منعقد کیا جاتا تھا۔جس میں شعرو شاعری ہوتی تھی۔ اور خاکے پیش کیے جاتے تھے اور سماجی اور سیاسی حالات پر نظمیں پیش کی جاتی تھیں۔حمایت اللہ نے بھاگواتم پروگرام ہی کے ذریعہ اپنی شاعری کی ابتدا کی۔ان کی پہلی نظم' زولسانی' تھی۔

تندانا　تانا　تانا　واہ　واہ　رے　تلنگانہ
منشی　پوچھے　منشی　ایدی　ایم　رارے　ماٹا

1948 کے پرآشوب دور کا نظارہ کرنے والے چند نوجوانوں نے حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کو زندگی کرنے کا سلیقہ دینے کے لئے 1950 میں ''فائن آرٹس اکیڈیمی'' کی بنیاد ڈالی۔ان نوجوانوں میں نمایاں نام محمد حمایت اللہ کا تھا۔ڈاکٹر زینت ساجدہ فائن آرٹس اکیڈیمی کے بانیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''فائن آرٹس اکیڈیمی کی بنیاد رکھنے والوں میں اقبال قریشی، ممتاز احمد، محمد یوسف اور حمایت اللہ ہیں۔'' (5)

فائن آرٹس اکیڈیمی کے ارکان عاملہ نے اپنے پروگراموں کو عوامی سطح پر پیش کرنے کے لئے رگھوپتی نرمل کی نگرانی میں 1961 میں ایک علٰحدہ شعبہ قائم کیا۔ تاکہ طنز و مزاح کو فروغ دیا جاسکے۔ ابتداء میں اکیڈیمی کے اس ادبی شعبہ کا کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا۔ اسی دوران ایاز انصاری، ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو نے ایک مشاعرہ ''زندہ دلان حیدرآباد'' کے عنوان سے منعقد کیا۔ ایاز انصاری نے ''زندہ دلان پنجاب'' کی طرز پر ''زندہ دلان حیدرآباد'' رکھا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔

''زندہ دلان پنجاب کا نام خواجہ حسن نظامی نے دیا تھا جس سے استفادہ کرکے ''زندہ دلان حیدرآباد'' کا نام رکھا گیا۔'' (6)

''زندہ دلان حیدرآباد'' مشاعرے کی کامیابی کے بعد ایاز انصاری کے مشورے پر اکیڈیمی کے اس ادبی شعبہ کا نام ''زندہ دلان حیدرآباد'' قرار دیا گیا۔ اس طرح ''زندہ دلان حیدرآباد'' کا باضابطہ قیام 1962 میں عمل میں آیا۔ ''زندہ دلان حیدرآباد'' کے قیام سے متعلق ڈاکٹر مصطفٰی کمال لکھتے ہیں۔

''حیدرآباد کے زندہ دلوں کو بجا طور پر یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے پنجاب کے زندہ دلوں کی روایت کو مٹنے نہیں دیا اور فائن آرٹس اکیڈیمی نے زندہ دلان حیدرآباد کے نام سے ایک ادبی شعبہ کی بنا ڈالی۔'' (7)

ڈاکٹر سید مصطفٰی کمال حمایت اللہ کو دکنی کا مستند شاعر قرار دیتے ہیں۔ حمایت اللہ کو ان کی دکنی شاعری نے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے کئی قومی اور بین الاقوامی مشاعروں میں اپنے کلام کے ذریعہ مایوس انسانیت کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کا فرض نبھایا ہے۔ حمایت اللہ نے سنجیدہ شاعری نہیں کی، ہمیشہ اپنے خیالات اور موضوعات کو مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا مشاہدہ قوی ہے اور اسی لئے ان کے قلم سے جو شعر نکلتا ہے وہ پر تاثیر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید بشیر احمد لکھتے ہیں۔

''حیدرآباد میں مزاحیہ اور دہقانی زبان کی شاعری رحیم صائب میاں نقش اول کی حیثیت کے حامل ہیں۔ان کے بعد نذیر دہقانی' اعجاز حسین کھٹا' سرور ڈنڈا اور سلیمان خطیب وغیرہ طنز ومزاح کی شاعری کو فروغ دینے والوں میں اہم نام ہیں۔اس قافلہ کے حمایت اللہ بھی ایک اہم راہ رو ہیں۔'' (8)

حمایت اللہ کی شاعری کے موضوعات بڑے ہی متنوع ہیں۔انھوں نے کائنات کے ہر موضوع کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ان کے یہاں عشقیہ کلام بھی موجود ہے اور پند ونصیحت کا بیان بھی پایا جاتا ہے۔ان کے پاس چھوت چھات کے مسائل کے ساتھ ساتھ سیاسی گفتگو بھی نظر آتی ہے۔انسان دوستی تو ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔حمایت اللہ کے پاس حمد' نعت' منقبت' پیروڈی کے ساتھ ساتھ نظمیں' غزلیں' رباعیات اور قطعات ملتے ہیں۔حمایت اللہ قطعات کو چوؤں کا نام دیتے ہیں اور انہی چوؤں میں حمایت اللہ کا فن اور بھی نکھر جاتا ہے۔

حمایت اللہ نے اپنی شاعری کی ابتداء 1950 میں کی لیکن اب تک ان کا صرف ایک ہی مجموعہ شائع ہوا ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔وہ سگریٹ کی خالی ڈبیوں' بس کے استعمال شدہ ٹکٹوں اور کاغذ کے پرزوں پر اپنی تخلیقات لکھ لیا کرتے تھے۔ان کی شریک حیات رشید موسوی کی کوششوں سے تھوڑا بہت کلام محفوظ ہوسکا ہے جسے ہم ''دھنمڑی'' کی شکل میں دیکھ سکتے ہیں۔

مزاحیہ مجموعہ ''دھنمڑی'' ڈسمبر 2001 میں شائع ہوا۔جس میں دو حمد ایک نعت (صرف ایک شعر) 24 نظمیں اور 17 غزلیں شامل ہیں۔اس کے علاوہ مجموعہ کے آخر میں متفرق اشعار اور چوے اور چھکے شامل ہیں۔

شاعر جس زمانے میں سانس لیتا ہے اس زمانے کی ہر چھوٹی بڑی بات پر اس کی نظر ہوتی ہے۔فنکار کی آنکھیں ہر واقعہ اور ہر منظر کے ساتھ اس کے مستقبل کی تصویر بھی دیکھ لیتی ہیں اور اس کو شاعر کا گداز قلب شعری پیکر میں ڈھال دیتا ہے۔انتخابات کا دور انتہائی نازک اور پر خطر دور ہوتا ہے۔حمایت اللہ نے اس موضوع کو دکنی لوک گیت کی طرز پر ''نانی ماں'' کے عنوان سے لکھی ایک نظم میں بیان کیا ہے۔

الیکشن میں آنے پلاناں بنارئیں
پلاناں بناکو فساداں کرارئیں

فساداں کراکو کمیٹیاں بنارئیں
کمیٹیاں بٹھاکو دلوں کو ملارئیں
مررئیں سو مُردوں کے کررئیں علاجاں
جی نانی ماں کیا ہے کی کیا نئیں کی

حیدرآباد میں رونما ہونے والے فسادات کے تناظر میں تحریر کیا گیا یہ بند بھی دل کو چھو جاتا ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ فسادات سیاسی سازشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور پھر سیاسی لیڈر ہی امن کمیٹی بنا کر امن کا ڈھونگ رچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

وزن غم کا دل سے ہمارے اتارو
یہ کیسی امن کی کمیٹی ہے پیارو
اُنے بھی ہے ممبر کمیٹی کا یارو
کلچ رات کو جو قتل کرکو آیا
نیا سال آیا ' نیا سال آیا

ہندوستانی سیاست کا یہ المیہ ہے کہ آزادی کے بعد قومی یکجہتی کی علمبردار اور ہندوستانی الاصل زبان اردو کو بھی تنازعہ کا شکار بنا دیا گیا۔ حالانکہ اردو پورے ہندوستان میں بولی' پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ لیکن اسے صرف سیاسی مفاد کی خاطر ایک مخصوص طبقے یعنی مسلمانوں سے جوڑ دیا گیا۔ انقلاب زندہ باد جیسا نعرہ دینے والی اس زبان کے ارتقاء میں ہر مذہب اور طبقے کے لوگوں کا برابر حصہ رہا ہے۔ اس اہم نکتے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے حمایت اللہ اپنی نظم 'اردو کی کہانی' میں کہتے ہیں۔

میں اردو ہوں' میری کہانی کو' پھر دہراؤں کیسا میں
زباں پو مَیچ تھی' جب تم لڑے تھے جنگ آزادی
جو آزادی ملی پھر کیا ہوا بتلاؤں کیسا میں
میں اردو ہوں' مجھے ہندی کی لیپی اوڑھ لیو بولئیں

میں بلبل ہوں، بیا کے گھونسلے میں جاؤں کیسا میں
مسلماناں، عیسائی، ہندواں، سکھ سب جنے مل کو
مجھے امرت پلائے تھے تو پھر مرجاؤں کیسا میں

موجودہ دور کے چند نام نہاد دانشوروں کا خیال ہے کہ اردو زبان دم توڑ رہی ہے اور اگر اسے بچانا ہے تو اس کا رسم الخط تبدیل کرنا ہوگا یعنی اردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا جانا چاہیے۔ایسے لوگوں کو حمایت اللہ طنزیہ انداز میں کہتے ہیں۔

سخت دم ہو، میری بھی چاند کی بُڈی کی عمر ہے
میں نئیں مرتی رے کم بختوں کُو، اب سمجھاؤں کیسا میں

ہندوستان کی آزادی کے بعد لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔لیکن آندھرا پردیش میں 1950 سے علٰحدہ تلنگانہ کے لئے جدوجہد شروع ہوگئی۔اور آج بھی اس مسئلے پر سیاسی بیان بازیوں کا سلسلہ جاری ہے۔تلنگانہ کے عوام کے جذبات کو حمایت اللہ نے اپنی نظم 'تلنگانہ' میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

خود آپ کی بیوی بھی چاہتی ہے تلنگانہ
اجی آپ سے عقلمند ہے آپ کا زنانہ
اب چیف منسٹر کو دو کام رہ گئے ہیں
دے دینا تلنگانہ، گنٹور چلے جانا
بارہ برس چل گئی اب نئیں چلینگا انڈی
اب جاگ گئے دیکھو سب ویر تلنگانہ
معصوم شہیدوں کے خوں کی قسم ہے تم کو
یا جان سے مرجانا یا لینا تلنگانہ

دہلی اور لکھنؤ کی تہذیب، نفاست اور رکھ رکھاؤ کے سلسلے میں مثال مانی جاتی ہے۔بعض لوگوں نے اس موضوع پر لطیفے بھی لکھے ہیں۔ان شہروں کی تہذیب اور رکھ رکھاؤ کا یہ عالم تھا کہ بزرگوں کی کہی ہوئی باتوں کے خلاف

جانا بہت ہی معیوب سمجھا جاتا تھا۔اسی تہذیب کا حسن سلوک یہ بھی تھا کہ شوہر اپنی بیوی کو نام سے مخاطب کرنے میں عیب تصور کرتا اور یہی کیفیت بیوی کی ہوتی۔تہذیب کی اس روایت کا بیان مزاحیہ انداز میں حمایت اللہ نے اپنی نظم ''دکنی شوہر لکھنوی بیوی'' میں کیا ہے۔اس نظم میں ان کی اولاد سے محرومی کا درد بھی جھلکتا ہے۔

میں مرجاؤں گا مگر لینا تُمارا نام مشکل ہے
ہمارے باپ دادا نئیں کرے سو کام مشکل ہے
تُمارا نام سونچا بھی تو دل میں کلبلی ہورئی
تُمارا نام لینا سوچ روں تو گدگُلی ہورئی
تُمارے کو کوئی بچہ بھی نئیں ہے وہ اگر ہوتا
اجی بچے کی ماں بول کو تُمارے کو بلاتا تھا

اس نظم کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اسے مکالمہ کے انداز میں لکھا گیا ہے۔حمایت اللہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ عام موضوعات کو بھی بڑے دلچسپ اور مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

کسی بھی ملک کی ترقی کا دارومدار اس ملک کے طالب علموں پر ہوتا ہے۔اور طلبا کی اچھی تعلیم و تربیت اسکولوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔آزادی کے بعد تعلیم کو پیسے کمانے کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔دوسری طرف طلبا فرمانبرداری کے بجائے ہٹ دھرمی اور غنڈہ گردی پر اتر آئے ہیں۔اس صورتحال کو حمایت اللہ اپنی نظم ''نانی ماں'' میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

سنو پڑھنے والوں کے قصے ہمارے
بتاتے ہیں ٹیچر کو چاقو کے دھارے
ہورئیں پاس داداگری کے سہارے
بناتے ہیں ہوٹل کو اڈا بچارے
اسکولاں چالو ہیں خالی کلاساں
جی نانی ماں کیا ہے کی کیا نئیں کی

تعلیمی اداروں کی طرح ہاسپٹل اور دواخانے بھی تجارت کا ذریعہ بن گئے ہیں۔اور جہاں صلاحیتوں کے بجائے دولت معیار بن جائے تو ان اداروں سے فارغ ہونے والے طلبا کی قابلیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔' آپریشن' کے عنوان سے لکھی گئی ان کی نظم میں ایک ایسے مریض کا ذکر ہے جو آپریشن کا انتظار کررہا ہے۔لیکن وہ اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ جو بھی مریض آپریشن تھیٹر میں لیجایا جاتا ہے وہ زندہ واپس نہیں آتا۔اس تعلق سے جب مریض ڈاکٹر سے سوال کرتا ہے تو اس کا جواب کچھ اس طرح ملتا ہے۔

آپریشن بھوت محنت سے کرے اس کا ہمیں
آپریشن کامیابچ تھا مگر اُن مرگیا
کل تُمارا آپریشن ہے تُمیں تیار رہّو
اِتّا سنا تھا کی پیشنٹ سانس لینا بُھل گیا

سرجن کے ہاتھوں آپریشن ٹیبل پر مریض کا ختم ہوجانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تعلیم صحیح طریقے سے نہیں ہوئی ہے بلکہ حصول علم کے دوران کہیں نہ کہیں غلط راستے کو اپنایا گیا ہے۔

حمایت اللہ نے مختلف شعرا کے کلام کی پیروڈی بھی لکھی ہے۔سیمابؔ اکبرآبادی کے ایک شعر کی پیروڈی کو''شاخِ گل'' کا نام دیا گیا ہے۔سیمابؔ اکبرآبادی کا شعر ہے۔

یہ کس نے شاخِ گل لاکر قریبِ آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

حمایت اللہ اس شعر کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔چند شعر ملاحظہ ہو۔

مگر ایک بات رہ رہ کو میرے دل میں کھٹک رہیئے
سنا ہوں جب سے یہ شعراں میری عقل بھٹک رہیئے
نہ کانوں کوئی دیکھا' نہ آنکھوں سے کوئی سنتا
یہ گل بوسی میں بوسہ ہے تو بوسہ ہونٹ سے ہوتا
اُنے تو شوخ گل بوسی میں کانٹوں پو زباں رکھ رائے

کیا اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے جو کانٹوں پو زباں رکھ رائے
یہ کس نے شاخ گل لاکر قریب آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گل چاٹی میں کانٹوں پرزباں رکھ دی

ان کی یہ پیرڈی عملی تنقید کا عمدہ نمونہ کہی جاسکتی ہے۔ڈاکٹر زینت ساجدہ اس پیروڈی پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے ایک نئ صنف قرار دیتی ہیں۔

''مجھے خاص طور پر ان کی نظم ''شاخ گل'' پسند آتی ہے۔جتنی بار سنوں اس کا رنگ چوکھا ہی ہوتا ہے۔یہ نظم پیروڈی نہیں ہے بلکہ حمایت کی تخلیق کردہ ایک نئ صنف ہے جس میں انھوں نے اپنے انداز میں ایک مشہور شعر کی تشریح اور تصحیح کی ہے۔ایک بلند پایہ شاعر کے شعر کو اس طرح بیان کرنا بڑے دل والے کی بات ہوتی ہے۔مگر وہ اس طرح قائل کرتے ہیں کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔'' (9)

حمایت اللہ کے مجموعہ کلام ''دھنمڑی'' میں 17 غزلیں بھی شامل ہیں۔ان میں عشقیہ مضامین کے علاوہ سیاسی اور سماجی مسائل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔حمایت اللہ کے بعض اشعار دوسرے شعرا کے مقبول کلام سے متاثر نظر آتے ہیں۔حسرت موہانی کی مشہور غزل ''چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے'' کو ذہن میں رکھ کر حمایت اللہ کی ایک غزل کے ان اشعار پر غور کریں۔دکنی لب لہجہ میں یہی مضامین کتنے شگفتہ نظر آتے ہیں۔

ہنسی روکنے اور غصہ بتانے
وہ پلّو کو دانتوں سے کھِچ کو پکڑنا
میں بھرپور نظروں سے دیکھا تو ان کو
پریشان ہوکو شرم سے سکڑنا
ہمیں کھیل چھپنے کا جب کھیلتے تھے
تو چپ کا پچ آکو ان کا سپڑنا

حسن وعشق غزل گو شعرا کا محبوب موضوع رہا ہے۔حمایت اللہ کی غزلوں میں عشق ایک اہم موضوع ہے۔انھوں نے محبوب سے ملاقات کا اشتیاق اور ہجر میں عاشق کی تڑپ کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔اور دکنی لب ولہجہ کی وجہ سے اشعار اور بھی پُر تاثیر ہوجاتے ہیں۔

ان سے ملتیچ میرے دل میں گُد گُلی ہورئی
آنکھ اور نیند میں اب آنکھ مچولی ہورئی

ویدہ کرے ہیں خواب میں آئیں گے سکو انوں
خوشیاں ہماری نیند اڑائے تو میں کیا کروں

ویدہ تو کررئیں پن کی آتیٔں کی نئیں آتیٔں کی
مھاڑیوں کو میرے دل کے ڈھاتیٔں کی نئیں ڈھاتیٔں کی

انوں جلدی آنا کرکو رکشا تو بھجایا ہوں
رکشہ ہے ذرا چھوٹا ' ماتیٔں کی نئیں ماتیٔں کی

حمایت اللہ نے اپنی غزلوں میں بعض ایسے حقائق سے بھی پردہ اٹھایا ہے جو ایک عام آدمی کا درد ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اچھے اور سکھی وقت میں ہمارے آس پاس دوستوں اور چاہنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے لیکن جب برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔

میرے دل میں بس کو نکل کو چلے گئے
خوشی لوٹ کو غم انڈل کو چلے گئے
میرے دوستاں میرے چہلم میں آکو
پلائے نہ روئے نگل کو چلے گئے
زبانی تو ہمدردیاں بھوت تھے پن
میں گنڈوں کو پوچھا نکل کو چلے گئے

جب لگ تھے برے وقتاں اپنے تو دوست بھی دشمن بن گئے تھے
اب جیب گرم ہوگئی اپنی تو دشمن آڑی باڑی ہے

علامہ اقبال نے اپنے کلام کے ذریعہ فکر و عمل کا پیغام دیا تھا۔حمایت اللہ بھی نو جوانوں کو عمل کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھی اس کی مدد کرتا ہے جو محنت کرتا ہے۔صرف خیالی باتیں بنانے سے کچھ نہیں ہوتا۔

کرے محنت تو اللہ میاں نعمت بھی دیتے ہیں
وقت کائیکو کھپارئے رے میاں رونے پلانے میں
تو کیسا کھیلتا رے گولیاں جب ٹمپورا نئیں ہے
تیرا سارا وقت جارئے صرف باتاں بنانے میں

حیدر آباد دکن میں بچے گولیاں (کنچے) کھیلتے ہیں جو گولی سب سے بڑی ہوتی ہے اسے ٹمپا یا ٹمپورا کہتے ہیں۔اور اسی ٹمپورے سے دوسری گولیوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔حمایت اللہ نے گولیوں کے کھیل کو تلازمہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔اس شعر میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ کھیل کھیلنے والا اسکے تمام اوزار سے واقف ہے اور نہ ان سے لیس ہے گویا وہ فنکار نہیں ہے۔اپنی ناپختگی چھپانے کی غرض سے وہ باتیں بنا رہا ہے۔

حمایت اللہ موضوعات اپنے اردگرد تلاش کرتے ہیں۔ایک حساس فنکار کی طرح وہ سماج میں ہونے والے واقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔اور ایسے طنز کے تیر چلاتے ہیں کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔موجودہ دور میں جہیز کا لین دین کافی بڑھ گیا ہے اور جہیز مانگنے کے نت نئے طریقے ڈھونڈے جارہے ہیں۔حمایت اللہ اس لعنت میں مبتلا لوگوں پر طنز کرتے ہوئے سنگین نتائج کا انتباہ دیتے ہیں۔چند شعر ملاحظہ ہو۔

سسرال سے موٹر،ٹی وی،فرج جب دے رئیں بچارے ہم کو پھر
اللہ کی مرضی کیا کرتیئں اب رھن دیؤ دلھن کانڑی ہے

عجب قانون ہے ڈوری کا جورو شیر بن گئی ہے
مرد کو ساس سسرے کو بٹھا دیتی ہے تھانے میں

ہمارے ملک کی ایک بڑی آبادی ناخواندہ ہے۔یہی سبب ہے کہ لوگ توہم پرستی میں مبتلا ہیں۔لوگ اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے حکمت و عمل کے بجائے عاملوں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔اور نام نہاد مولانا اور عامل بھولے بھالے اور معصوم لوگوں کے مسائل کو حل کرنے کا یقین دلاتے ہوئے انھیں ٹھگ لیتے ہیں۔توہم پرستی عوام کی زندگی میں اس حد تک جگہ پا گئی ہے کہ بیشتر توہمات کو مذہبی جز بنا لیا گیا ہے۔حمایت اللہ نے اپنی تخلیقات میں اس موضوع کو اشارتاً بیان کیا ہے۔

غصہ اترنے ان کا عامل کے پاس جاکو
بیڑا پڑاکو بھیجا، کھاتیں کی نئیں کھاتیں کی

پینے پُھکٹ میں مل ری مرشد کو میرے گھر میں
اڈا بنالئے ہیں میرا دیوان خانہ

آج مرشد دئے سو نمبر پو
کھیل کو میں اُلال ہوکو ہوں

ہوندے چتے چالوں میں تو کیڑ جوانی پار ہوئی
بڈے پن میں پڑکو نمازاں اپنی کرک کو ڈھول رئیں

نیاز پکایوں مرشد میرے فاتیاں دینے آئے ہیں
آنکھیا بچیوں کے اوپر ہے، تسبیح کو بھی رول رئیں

میرے میں کیا کمی تھی جو لایا اسے
لایا ڈم پوٹلی کو، بسایا اسے

ہوکو جاؤ شیخ سِدّو کا سایہ اسے
دل پو آرے چلایا جی ماٹھی مِلا

حمایت اللہ نے نظموں اور غزلوں کے علاوہ بے شمار چوے بھی کہے ہیں اور ان چوؤں میں ان کا فن اور بھی نکھر جاتا ہے۔حمایت اللہ نے فیشن کے نام پر گرتی ہوئی اقدار کو بھی اپنے اشعار میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔مغرب پرستی اور فیشن کے نام پر لوگ کس طرح سماجی پستی کی طرف جارہے ہیں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بلوزوں کا جو کپڑا ہے اسے بشرٹ کرلیتیں
اگر چھوٹا پڑا بشرٹ تو اِن شرٹ کرلیتیں
ارے فیشن تو ماڈرن عاشقوں کی رکھ لیا عزت
پھٹا دامن تو کیا پتلون ہے، اِن شرٹ کرلیتیں

ہمارے ملک میں سیاسی پارٹیاں عوام کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کبھی علاقہ کی بنیاد، کبھی زبان کی بنیاد پرتو کبھی ترقی کے نام پر عوام سے ہمہ اقسام کے وعدے کرتی ہیں۔آزادی کے بعد بارہا اردو کی ترقی کے دعوے کیے جاتے رہے۔ ہندوستانی سیاست کے اس مفاد پرستانہ پہلو کو حمایت اللہ نے اپنے ایک قطعہ میں بیان کیا ہے۔

الٰہی یہ لیڈر سمجھ پا گئے کیا
شرافت کے راستے انھیں بھا گئے کیا
جدھر دیکھئے حق میں اردو کے لیکچر
الیکشن کے دن پھر قریب آ گئے کیا

حمایت اللہ نے اپنے عہد کی عصری حسیت کا بیان کرتے ہوئے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔اور یہ صرف سیاست تک محدود نہیں بلکہ دوسرے موضوعات پر بھی انھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔چھوت چھات کو مٹانے کے لئے ہمارے رہنماؤں نے کئی کوششیں کیں۔حالانکہ نچلی ذات کے لوگوں کو چند مراعات دی گئیں ہیں لیکن یہ مسئلہ آج بھی جوں کا توں برقرار ہے۔ یہ بڑی عجیب صورتحال ہے کہ جو مزدور بھگوان کے گھر کو اپنے ہاتھوں سے تعمیر کرتا ہے اُسے ہی

اس کے اندر آنے کی اجازت نہیں اور نہ پوجا کرنے کی۔ حمایت اللہ لکھتے ہیں۔

میں بڑے لوگوں کے گھر کو کب بھی نئیں جانا کتے
میں ہریجن ہوں میں دیول میں بھی نئیں جانا کتے
کل صُبوں کو دو پجاری آکو یہ بولے مجھے
ایک نوی دیول بنانے پھر کو میں آنا کتے

حمایت اللہ نے ایک قطعہ علامہ اقبال کے شعر کی پیروڈی کے انداز میں لکھا ہے

برا ہوں میں نہ اچھا ہوں سزا کیا ہے جزا کیا ہے
اگر منگ کو لیا دعوت تو پھر اس میں مزا کیا ہے
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقریب سے پہلے
یہ پوچھے میزبان تجھ سے بتا تیری غذا کیا ہے

حمایت اللہ نے اپنے کلام میں ضرورت شعری کے تحت محاورے بھی باندھے ہیں روز مرہ کو بھی برتا ہے اور بعض کھیلوں کے تلازمہ بھی استعمال کیے ہیں۔ چند شعر دیکھئے۔

بین بجارئیں جم کو ایسی بھینساں ڈول رئیں
موڈ میں آکو ہم بھی پورا پوتی نامہ کھول رئیں　　(بھینس کے آگے بین بجانا)

ہے ہونٹ بھی ہمارے اور دانتاں بھی ہمارے ہیں
ہے کشتی تو بھنور میں پن کی نظروں میں کنارے ہیں　　(ہونٹ بھی اپنے دانت بھی اپنے)

اچھوں کی گرد میں رہنا پن لچوں کی سرحد میں نئیں رہنا
میں تاڑ کی چھاؤں میں دودھ پیا سب لوگ سمجھ رئیں تاڑی ہے　(اچھوں کی صحبت میں رہنا)

میں نئیں آیا تو ساری رات آنکھوں میں سرا ڈالے
ہوئی کٹیف تو تکیوں کو آنسو سے بھر ڈالے　　(رات آنکھوں میں کاٹنا)

میں تر پٹ ہور اُنوں کالے کلوٹے میل اچھا تھا
یو ایچ منڈوے پو چڑجاتی ہماری بیل اچھا تھا (بیل منڈوے چڑنا)

وہ دل میں غموں کی چبھن اس سے پوچھو
زخم پو نمک کی جلن اس سے پوچھو (زخموں پر نمک چھڑکنا)

گھیٹیاں دل میں بندئیں سو تمیں جلدی کھولو
کونسا تاج محل ہونا ہے بیگی بولو (گانٹھ باندھنا)

میرے دل کو پُھگا سمجھ کو تو کھیلے
دوا بھی کرو دل کے پُھٹ رئیں پھپھولے (دل کے چھالے پھوٹنا)

کرے محنت تو پھر اللہ میاں نعمت بھی دیتے ہیں
وقت کائیکو کھپارئے رے میاں رونے پلانے میں (کرمحنت کھانعمت)

حمایت اللہ نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے دکنی کو وسیلہء اظہار بنایا۔ان کے یہاں دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ ملتا ہے۔حمایت اللہ نے نہ صرف تلگو بلکہ بعض جگہ انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے حمایت اللہ نے چھوٹے چھوٹے واقعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ان کے کلام میں دکنی محاورے، روزمرہ اور ضرب الامثال کا استعمال جا بجا نظر آتا ہے۔ڈاکٹر سید بشیر احمد لکھتے ہیں۔

> ”ان کو دکنی زبان سے والہانہ محبت ہے اور ان کا پورا کلام دکنی لب و لہجہ کا نقیب ہے۔ان کی شاعری میں شگفتگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔انہوں نے زندگی کے عام مشاہدات اور تجربات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔انہوں نے اپنے کلام میں زندگی کی ناہمواریوں، ناقدریوں، تصنع اور انسانیت کی توہین کرنے والی باتوں پر بھرپور طنز کیا ہے۔“(10)

حمایت اللہ کی شاعری دکنی سے موسوم ہے۔انھوں نے ابتداء ہی سے دکنی کو ذریعہ اظہار بنایا اور آج جب

دکنی سمجھنے اور پڑھنے والے مفقود ہو گئے ہیں حمایت اللہ اسی زبان میں شعر کہہ رہے ہیں۔ جب وہ شعر پڑھتے ہیں تو خالص دکنی لہجہ میں۔ ان کے اس مختصر مجموعہ میں دکنی الفاظ (اصطلاحات) روزمرہ اور محاوروں کا خوبصورت استعمال نظر آتا ہے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ پورے مجموعہ میں صرف ایک بار انھوں نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔ اس شعر میں بھی ان کا دکنی لب لہجہ اور اسلوب موجود ہے

اربے ہولے حمایتؔ آس پو بیٹھا ہے دنیا کی
تو پہلے مرتو پھر ہویں گی تیری عزت زمانے میں

کہتے ہیں کہ ادب انسانی جذبات و احساسات کا اظہار ہے۔ اور ہر فنکار کی تخلیق میں اس کی شخصیت کا پرتَو نظر آتا ہے۔ حمایت اللہ کے کلام میں بھی ان کے گداز قلب کے احساسات نظر آتے ہیں۔ چاہے وہ سیاسی مسائل ہوں یا سماجی برائیاں، دلی احساسات ہوں یا پھر عوامی جذبات، ان کی ہر نظم اور ہر قطعہ میں ایک حساس دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔

آج کے اس ماڈرن دور میں چار سو سالہ قدیم زبان میں شاعری کی صبح سے شام کرنا حقیقتاً جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور اس تناظر میں حمایت اللہ کے مجموعہ کلام ''دھنمڑی'' کو طنز و مزاح کا ایک گرانقدر سرمایہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

----OOO----

حوالہ جات

(1) رشید موسوی بحوالہ 'دکنی میں طنز ومزاح' حمایت اللہ کے حوالے سے' از رفعت النساء ص 57
مقالہ برائے ایم فل غیر مطبوعہ مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو' سنٹرل یونیوسٹی آف حیدرآباد 2002 ء

(2) مجتبیٰ حسین ''ح سے حیدرآباد' حمایت اللہ اور حس مزاح'' مشمولہ ''دھنمڑی'' ص 21 مطبوعہ 2001

(3) مجتبیٰ حسین ''ح سے حیدرآباد' حمایت اللہ اور حس مزاح'' مشمولہ ''دھنمڑی'' ص 21

(4) مجتبیٰ حسین ''ح سے حیدرآباد' حمایت اللہ اور حس مزاح'' مشمولہ ''دھنمڑی'' ص 19

(5) ڈاکٹر زینت ساجدہ ''تو دکنی ہے پیارے تو دکنی بول'' مشمولہ ''دھنمڑی'' ص 27

(6) ڈاکٹر گیان چند جین بحوالہ ''شگوفہ کی ادبی خدمات'' از عزیز ابرار ص 41
مقالہ برائے ایم فل غیر مطبوعہ مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو' سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

(7) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ''تعارف' شگوفہ ڈیڑھ سالہ نمبر ص 15

(8) ڈاکٹر سید بشیر احمد ''مزاح نگاران حیدرآباد'' ص 52

(9) ڈاکٹر زینت ساجدہ ''تو دکنی ہے پیارے تو دکنی بول'' مشمولہ ''دھنمڑی'' ص 29

(10) ڈاکٹر سید بشیر احمد ''مزاح نگاران حیدرآباد'' ص 53

طالب خوندمیری

طالب خوندمیری کا اصلی نام سید محمود خوندمیری ہے۔ تخلص طالبؔ اور قلمی نام طالب خوندمیری ہے۔ ان کے والد کا نام سید عبدالکریم ہے۔ طالبؔ خوندمیری 14 فروری 1936ء کو کندیگل میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم زمستان پور ہائی اسکول' مشیرآباد میں ہوئی۔ وہیں سے انھوں نے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ سکندرآباد سائنس کالج سے 1958ء میں پی یوسی میں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے 1964ء میں آرکیٹیکٹ میں گریجویشن کیا۔ 1963ء میں BHEL میں بحیثیت آرکیٹیکٹ تقرر عمل میں آیا۔ 1976ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنا ایک دفتر قائم کر کے طلباء کو تربیت دینی شروع کی۔ انہوں نے کئی مساجد کے ڈیزائن تیار کئے ہیں' جس میں مکہ مکرمہ کی مسجد الجمیز ہ لاتور کی جامع مسجد اور بھٹکل کی مسجد طور اور مسجد عثمانیہ قابل ذکر ہیں۔ طالب خوندمیری مصر کے مشہور آرکیٹیکٹ حسن فاتح سے بے حد متاثر ہیں۔ اس سلسلے میں شاہد لطیف رقمطراز ہیں۔

> ''طالب خوندمیری کامیاب مزاح گو شاعر ہی نہیں بہترین آرکیٹیکٹ بھی ہیں اب تک لگ بھگ 300 مسجدوں کا نقشہ تیار کر چکے ہیں۔ مشاعروں کے سلسلے میں جہاں انہوں نے امریکہ' لندن' پاکستان' اور متعدد خلیجی ملکوں کا دورہ کیا ہے وہیں لاتور اور بھٹکل سے لے کر مکہ معظّمہ تک کی مساجد کا نقشہ تیار کرنے کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔'' (1)

طالب خوندمیری کی شادی 25 ڈسمبر 1965ء کو سید علی کی دختر عائشہ بانو سے ہوئی۔ جن سے ان کی چھ اولادیں ہیں۔ (1) سیدہ سلمیٰ شائستہ نفیس (2) سید سیف السلام ذیشان خوندمیری (3) سید سیف الانام عرفان خوندمیری (4) سید سیف الانام فیضان خوندمیری (5) سیدہ آفرین سرور (6) سیدہ شعور مہدویہ یاسمین۔

وہ زندہ دلان حیدرآباد، حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہیں۔ ان کی طنزیہ ومزاحیہ شعری کے دو مجموعے ''سخن کے پردے میں'' 1994ء اور '' کانٹوں پہ زباں رکھ دی'' (2005) شائع

ہو چکے ہیں۔ انہوں نے شاعری کی ابتداء سنجیدہ شاعری سے کی لیکن دھیرے دھیرے وہ مزاحیہ شاعری کی طرف راغب ہوتے چلے گئے۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں۔

''مزاحیہ شاعری چونکہ سننے والے کو فوری طور پر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس میں بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ اور میری طبیعت میں بھی چونکہ بے ساختہ پن ہے اس لئے میں مزاح نگاری کی طرف مائل ہوا۔ میں نے عمداً طنز و مزاح کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ مزاح نگاری کا سلسلہ غیر ارادی طور پر شروع ہوا۔''(2)

طالب خوندمیری کو بچپن سے ہی شاعری کا شغف رہا۔ انھوں نے بزم کہکشاں کے سالانہ مشاعرے میں اپنی نظموں ''آرکیٹیکٹ غالب'' اور ''پسند اپنی اپنی'' سنا کر طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی ابتداء کی۔ تقریباً ہر صنف شاعری میں انہوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی شاعری عام آدمی کے مسائل اور عصری حسیت سے تعبیر ہے۔ ڈاکٹر سید بشیر احمد لکھتے ہیں:

''12 برس کی عمر سے انہوں نے شعر گوئی شروع کی۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف سخن نعت غزل اور نظم میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ پاکستان، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، قطر، لندن اور امریکہ میں بھی مشاعرے پڑھے ہیں''۔(3)

''سخن کے پردے میں'' 52 نظمیں 7 غزلیں 6 منظوم خاکے' 25 قطعات اور ایک شعر کے عنوان سے ایک شعر درج ہے۔ جبکہ'' کانٹوں پہ زباں رکھ دی'' نظموں' غزلوں' قطعات' رباعیات' دوہے اور منظوم خاکوں پر مشتمل ہے اس علاوہ ''شگفتہ دکن کے عنوان سے 2004ء میں منعقدہ ایک مشاعرے کی منظور رپورٹ بھی شامل ہے۔

وہ نہ صرف مشاعرے پڑھتے ہیں بلکہ مشاعروں کی نظامت بھی کرتے ہیں اور اپنی باغ و بہار شخصیت سے مشاعرے کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ان کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ ان کے مزاح سے جہاں ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے وہیں ان کے طنز کے تیروں سے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے ہیں۔ ان کی شاعری مقصدیت

لئے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ مزاح سے اصلاح معاشرہ کا کام لینا چاہتے ہیں۔ معاشرے میں پائی جانے والی بے اعتدالیوں، ناہمواریوں کو دور کرنے کیلئے وہ اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے طنزیہ کلام سے ایسا کام لیتے ہیں جیسے ڈاکٹر کسی ناسور کو مریض کے بدن سے دور کرنے کیلئے نشتر سے کام لیتا ہے اوران کی ظریفانہ طرز کڑوی گولی پر شکر کی تہہ چڑھا دیتی ہے۔ تاکہ مریض کڑوی دوا کو بھی منہ بنائے بغیر استعمال کر سکے۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کہتے ہیں۔

> ''اردو کے طنز ومزاحیہ شاعروں میں طالب خوندمیری کو صف اول کا شاعر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ آزادی کے بعد دو شاعروں نے بہت شہرت حاصل کی طنز ومزاح میں ایک رضا نقوی واہی اور دوسرے دِلاورفگار۔ رضا نقوی واہی مشاعرہ کے شاعر نہیں تھے۔لیکن ان کے یہاں طنز کی جو سطح تھی اس سے آگے کوئی نہیں جاسکا۔اس کے علاوہ آزادی کے بعد اگر شاعروں کی صف بنائیں جنھوں نے طنز ومزاح میں ایک ادبی شان پیدا کی تو ان شعراء میں طالب خوندمیری کا نام صف اول میں ہوگا۔''(4)

طالب خوندمیری بنیادی طور پر ظریف واقع ہوئے ہیں۔مختلف شعراء کے کلام پر انہوں نے ظریفانہ پیروڈی لکھی ہے۔مضطر مجاز جو حیدرآباد کے معروف شاعر ہیں اور جنہوں نے اقبال کے فارسی کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ان کے ایک شعر پر طالب کی پیروڈی ملاحظہ کیجئے۔مضطر مجاز کہتے ہیں:

مانا کہ زادِ راہِ محبت قلیل تھا		لیکن کسی کا درد ہمارا کفیل تھا

پیروڈی

مانا کہ زادِ راہِ محبت قلیل تھا		لیکن کسی کا ''پرس'' ہمارا کفیل تھا

صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے طالبؔ نے کس طرح مزاحیہ رنگ دیدیا۔اسی طرح انہوں نے مالیگاؤں کے مشہور شاعر اشفاق انجم کے ایک مقطع کی پیروڈی صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے کی ہے۔ملاحظہ ہو:

اشفاق انجم

ابھی شعور کو پہنچا نہیں ہے دل انجم		کھلونے دیکھ کے اکثر مچلنے لگتا ہے

پیروڈی:

سنِ شعور کو پہنچا نہیں ابھی انجم		کھلونے دیکھ کے اکثر مچلنے لگتا ہے

طالب خوندمیری کی شاعری کی ایک خصوصیت تحریف نگاری Parody ہے۔انھوں نے نہ صرف غالب کے اشعار کی تحریف کی ہے بلکہ اقبال، جگر، فیض اور حسرت وغیرہ کے اشعار میں بھی معمولی سی تبدیلی کر کے مزاح پیدا کرنے کوشش کی ہے۔مجتبیٰ حسین طالب کی پیروڈیوں کو اردو ادب کی کامیاب پیروڈیوں میں شمار کرتے ہیں۔

''طالب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ پیروڈی کہنے میں بے پناہ مہارت رکھتے ہیں۔پیروڈی نہایت مشکل فن ہے اور اس کے لئے ایک ایسی ذہانت درکار ہے جو تقابلی جائزہ کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔طالب کی پیروڈی ہمارے ادب کی نہایت کامیاب پیروڈیاں ہیں۔''(5)

معروف مزاح نگار یوسف ناظم ان کی مزاحیہ شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''مجھے یہ ہندوستان کے راغب مرادآبادی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جب مزاحیہ مشاعروں کی نظامت کرتے ہیں تو اس وقت بھی کسی شاعر کا کلام سنتے سنتے اسی ردیف وقافیہ میں فی البدیہہ شعر بھی کہہ دیتے ہیں'' (6)

یوسف ناظم کے مطابق ایک مشاعرے میں مضطر مجاز نے غزل سنائی جس کا قافیہ وردیف ''مثالی ہی کیوں نہ ہو'' سوالی ہی کیوں نہ ہو'' تھے اس پر طالب نے مقطع سنتے ہی فی البدیہہ یہ شعر سنایا

اس کے بدن میں آگ ملے گی تمہیں مجازؔ		دلبر مقیم قطب شمالی ہی کیوں نہ ہو

طالبؔ خوندمیری نے غالبؔ کو موضوع بنا کر کئی نظمیں لکھی ہیں، ان نظموں کے عنوانات ''پامسٹ غالبؔ''

آرکیٹکٹ غالبؔ، غالبؔ حسینوں کے جھرمٹ میں، طبیب غالبؔ، بڑے دلچسپ ہیں جس سے فنِ شاعری پر ان کے مکمل عبور اور دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ طالب خوندمیری نے غالبؔ کے کئی مصرعوں کو اپنی نظموں میں نہایت فنکارانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ طالبؔ خوندمیری کی نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو جو غالبؔ کی زبانی کہا گیا ہے۔

میں نے یہ کب کہا ہے کہ اچھا کہیں مجھے　　　یہ بھی تو نہ روا ہے کہ بوڑھا کہیں مجھے
تم سی پری نژاد بھی چاچا کہیں مجھے　　　میرا تو مشورہ ہے کہ ''نوشہ'' کہیں مجھے

آرکیٹکٹ غالب میں ایک اجنبی اور غالبؔ کے بیچ جو بات چیت اور مکالمہ ہوتا ہے اسے طالبؔ خوندمیری نے نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ آرکیٹکٹ غالبؔ اپنے موکلوں کو مشورہ دیتے ہیں:

میں جو کہتا ہوں ڈیکوریشن وہی کروائیے　　　سبزہ شاداب کی شطرنجیاں بچھوائیے
چوبِ صندل کی بنی سب کھڑکیاں لگوائیے　　　گیسوئے پر پیچ وخم کی چلمنیں ڈلوائیے

ان تمام مشوروں کے بعد بلڈنگ کی نگہداشت کے تعلق سے غالبؔ کی زبانی وہ کہتے ہیں

مین ٹیننس میں کبھی غفلت یہاں کوئی نہ ہو　　　ورنہ پھر ایسی جگہ رہیے جہاں کوئی نہ ہو

پیشہ کے اعتبار سے طالبؔ خوندمیری چونکہ ایک آرکیٹکٹ ہیں اسی لئے ان کی شاعری میں ایسی لفظیات اور اصطلاحات بھی مل جاتی ہیں جو اس پیشے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی اس منفرد خصوصیت اور مزاحیہ شاعری کے بارے میں یوسف ناظم کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''ان کی شاعری میں زاویے ہی زاویے ہیں۔ مزاح کی کمانیں اور طنز کے جھروکے اور مستزاد کا ایک روف گارڈن'' (7)

طالب خوندمیری نے نہ صرف عوامی موضوعات کو برتا ہے بلکہ سیاسی قائدین کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اپنی نظم ''کھٹملوں کی فریاد'' میں وہ کہتے ہیں کہ عوام مختلف مصائب کا شکار ہو کر کمزور و ناتواں اور نحیف ہو گئے ہیں اور دوسری طرف سیاسی قائدین اور نام نہاد رہنما فربہ اور توانا ہو رہے ہیں۔ اس نظم میں نوجوان نسل کی تصویر کشی کرتے

ہوئے کھٹمل جونک سے مشورہ مانگتے ہیں اس پر جونک کا دلچسپ جواب دیکھئے۔

آج تک تم نے پیا ہے صرف جنتا کا لہو　　　اب ذرا پی کر تو دیکھو ایک نیتا کا لہو
اب تو میرا بھی گذاراہ ہے انہیں کے خون پر　　　مے کشی ہے شغل ان کا، ''خوں کشی' میرا ہنر
سیر ہو کر روز پیتی ہوں کسی نیتا کا خوں　　　کیا مزے ہیں آج کل کام ودہن کے کیا کہوں
ان کی ہر شریان ہوتی ہے خزانہ خون کا　　　اک اک نیتا ہے گویا کارخانہ خون کا
ایک بھی قطرہ کسی نیتا کا جو پاجائے گا　　　اس کو جنتا کے لہو کا بھی مزہ آجائے گا

اپنی نظم ''شکوہ'' میں انہوں نے اردو زبان کا اپنے وطن سے شکوہ بھر پور طنزیہ انداز میں لکھا ہے۔ یہ ''شکوہ'' انہوں نے مسدس کی ہئیت میں لکھا ہے:

محفل خوردو کلاں میں صفت جام پھری　　　لے کے آسان قوائد سحر و شام پھری
لکھنؤ ، دلی و پنجاب تا آسام پھری　　　کیا کبھی کام سے اپنے کہیں ناکام پھری
شہر تو شہر ہیں قریے بھی نہ چھوڑے میں نے
دور دیہات میں دوڑادئے گھوڑے میں نے

ایک اور بند ملاحظہ ہو۔

میں تو پیدا ہوئی بھارت میں محبت کے لئے　　　سب برتتے ہیں مگر اپنی ضرورت کے لئے
مہرۂ خاص ہوں ارباب سیاست کے لئے　　　نعرۂ زود اثر ہوں میں حکومت کے لئے
جب بھی آتا ہے الیکشن تو میں یاد آتی ہوں
ورنہ پھر سب کے دماغوں سے نکل جاتی ہوں

انہوں نے اپنی ایک نظم ''ایک نیتا اور لڑکا'' علامہ اقبال کی نظم ''مکھی اور مکڑا'' کی آزاد پیروڈی کے طور پر لکھی ہے۔ جس میں ایک لڑکے اور نیتا کی نوک جھونک ظریفانہ انداز میں نظم کی گئی ہے۔ لڑکا نیتا سے مخاطب ہے:

کیا آپ کی تعریف کروں اپنی زباں سے　　　دیکھا ہی نہیں میں نے کبھی آپ سا نیتا

مکاری، ہوس، جھوٹ ، حسد اور خوشامد　　　ہیں جمع کئی آپ میں اوصاف حمیدا
ہر اک کی رکتی ہے نظر آپ پہ آ کر　　　ہوتا ہے کسی شہر میں جب بھی کوئی دنگا
ہیں آپ کے ممنون کئی شہر یہاں کے　　　سورت ہو کہ دلی کہ علی گڑھ کہ ایودھیا
ہے سب سے الگ آپ کا انداز نوازش　　　بچوں کو غریبوں کے یتیمی سے نوازا

آج کل مشاعروں میں متشاعروں کی آمد کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے اور وہ بیشتر مشاعروں کی اولین صف میں بیٹھے دکھائی دینے لگے ہیں۔ طالب اپنے طنزیہ نشتر سے اس ناسور کو بھی اپنی نظم ''ایک شاعر کا سیلف پورٹریٹ'' میں کریدا ہے۔

بہت بیزار ہوں اب اپنے گھر سے　　　وہاں رہتا ہوں کم بیگم کے ڈر سے
بفیض شاعری یہ وقت آیا　　　کہ خود اپنے ہی بچوں کی نظر سے

میں وزن شعر کی صورت گرا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

طالب خوندمیری نے ادبی' سیاسی اور سماجی مسائل پر کئی نظمیں کہی ہیں۔ ان کی نظم ''ہمارے شہر میں'' ملاحظہ ہو جو اپنے عصری طرز فکر کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔

ایک نئی تاریخ تھوپی جارہی ہے باربار　　　من گھڑت قصے بھی داغے جارہے ہیں بے شمار
عصرِ نو کے منہ پہ کالِک پوت کر کچھ ناسمجھ　　　کررہے ہیں اپنے مستقبل پہ ماضی کو سوار

آمدِ فصل قیامت ہے ہمارے شہر میں
کیا کوئی تازہ شرارت ہے ہمارے شہر میں

طالبؔ خوندمیری نے نظموں کے علاوہ صنف غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور غزل کے تمام فنی لوازمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے مخصوص ظریفانہ اسلوب میں اصلاحی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ایک شخص نے اپنی کوٹ کی جیب میں اپنی محبوبہ کی تصویر کو چھپائے رکھا۔ شائد وہ شخص شادی شدہ ہے اور گھر میں اس کی کوٹ کے جیب سے اس کی محبوبہ کی تصویر اچانک گر جاتی ہے اور اس کا راز فاش ہوجاتا ہے۔ اس منظر کو طالب خوندمیری نے اپنی غزل

کے ایک شعر میں بیان کیا ہے:

ہمارے کوٹ سے تصویر جاناں گر پڑی گھر میں
یہ ہم نے کیا کیا کیسی مصیبت جیب میں رکھ لی

طالبؔ خوندمیری نے غزل اور نظم کے علاوہ قطعات بھی لکھے ہیں جن میں ظریفانہ انداز میں بھرپور طنز کیا ہے۔ اپنے ایک قطعہ میں انہوں نے اہل سیاست کے سیاسی وعدوں اوراس کی حقیقت کی عکاسی کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

اِک یہی اہل سیاست میں کمال اچھا ہے
ہر الیکشن میں نئے وعدوں کا جال اچھا ہے
اُن سے آ جاتی ہے اردو کے بھی منہ پر رونق
ہم سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

سیاسی قائدین کے چہروں پر مختلف نقاب ہوتے ہیں۔ برسر اقتدار ہونے سے پہلے ان کے منکسر المزاجی دیدنی ہوتی ہے اور اقتدار پر آ جانے پر ان کا رنگ دگرگوں ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

کبھی غصہ میں وہ دیکھا نہ جائے
غرور اس میں ذرا پایا نہ جائے
بہت ہی منکسر ہوتا ہے نیتا
کسی کرسی پہ جب تک آ نہ جائے

طالب خوندمیری نے کئی لوگوں کے منظوم خاکے بھی لکھے ہیں یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ یہ خاکے انہوں نے شگوفہ کے پرویز یداللہ مہدی نمبر کی اشاعت کے موقع پر لکھا تھا۔ جس کا عنوان ہے ''مسجع شخصیت'' ملاحظہ ہو:

سر سے پا تک شخصیت یہ کتنی دلآویز ہے
گل فشاں، گل فام، گلگلوں، گل قلم، گل ریز ہے
کیا مسجع نثر ہے اور کیا مقفّٰی طرز ہے
یہ نگارش صرف وقف خامۂ پرویز ہے
لحنِ داؤدی سا فن ہے قد مگر جالوت کا
ہے قلم گو پھن کے جیسا جو قیامت خیز ہے
پڑھ کے دیکھا تو ہوا محسوس اس کی ہر کتاب
ایسا ساغر ہے جو ''لافنگ گیس'' سے لبریز ہے
اس کی تحریروں سے لگتا ہے کہ اب اردو ادب
شرکتِ صنف مزاح و طنز سے زرخیز ہے

طالب خوندمیری پھکڑ پن اور ناشائستہ زبان کے استعمال سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ وہ تصنع اور لفظی بازی

گری سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ان کا مزاج شستہ اور شائستہ ہے انہوں نے دکنی کے بجائے سلیس اردو کو اپنا وسیلہء اظہار بنایا۔خورشید خضر اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''طالب خوندمیری دکنی زبان کے استعمال سے گریز کرتے ہیں لیکن صرف ایک بار سلیمان خطیب کی وفات پر انہوں نے دکنی زبان میں ہی نظم لکھی تھی۔باوجود حیدرآبادی ہونے کے طالب خوندمیری عام اردو میں شعر سناتے ہوئے دیکھنا غیر حیدرآبادیوں کے لئے نہ صرف تعجب انگیز بلکہ خاصہ خوشگوار تجربہ تھا۔حیدرآباد کے مزاحیہ شاعروں کی روایت سے انحراف بھی حیدرآبادی شاعروں میں طالب خوندمیری کو منفرد و ممتاز کرتا ہے۔''(8)

طالب خوندمیری نے اپنی تخلیقات میں عصر حاضر کے اہم اور بنیادی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔سیاسی' سماجی 'سیاسی' معاشی و تہذیبی غرض کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔عصری موضوعات پر ان کی گرفت اور ان کی طنزیہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین رقمطراز ہیں۔

''میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا کہ مشاعروں میں طالب خوندمیری کے کلام پر لوگ جب داد دے رہے ہوتے ہیں تو میں چپ سادھے بیٹھا رہتا ہوں۔اس لئے کہ اکثر لوگوں کو طالب کا ہمکتا' کھنکتا اور مچلتا ہوا دل تو دکھائی دیتا ہے۔لیکن ان کی نظر طالب کے لہولہان کلیجے کی طرف نہیں جاتی ۔طالب جس سطح پر جاکر طنزیہ شعر کہتے ہیں اس شعر کو اس کے اصل سیاق و سباق کے ساتھ صحیح طور پر محسوس کرنے کے لئے کم از کم سامع کو بھی طالب کی سطح تک جانے کی سعی کرنی چاہیے۔تبھی طالب کی شاعری کے اسرار و رموز آپ پر کھلنے لگتے ہیں۔''(9)

طالب خوندمیری حیدرآبادی تہذیب کے ایک نمائندہ شاعر ہے۔ان کی طنزیہ شاعری پر غیاث متین لکھتے ہیں۔

''طالب کی شاعری کی ایک خصوصیت طنز کی کاٹ یا نشتریت ہے جو ان کی نظموں'غزلوں اور قطعات کے پیکروں میں خون کی طرح رواں دواں ہے۔''(10)

ادب میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ ظرافت کا ایک مقصد ہونا چاہیے۔ اگر اس نکتہ کو ذہن میں رکھ کر طالب کی شاعری کا جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے کہ ان کی تمام تخلیقات مقصدیت کی حامل ہیں۔ اردو طنز ومزاح کے مشہور ادیب مسیح انجم نے ان کے طنز کا مقصد بیان کیا ہے۔ اور زندہ دلان حیدرآباد کے نمائندہ شاعر مانتے ہوئے اردو ادب میں ان کی مقام ومرتبہ کا تعین کرتے ہوئے اپنے منفرد انداز میں لکھتے ہیں۔

> ''اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ زندہ دلان حیدرآباد نے ادب کو کیا دیا؟ تو بے دھڑک طالب خوندمیری کو پیش کر کے ان کے تعارف میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ لیجئے صاحب طالب حاضر ہیں۔ طنز ومزاح کے ہینڈسم شاعر! لیکن ان سے ڈریئے نہیں یہ کسی کو ڈنک نہیں مارتے اور اگر مارتے بھی ہیں تو اس صفائی سے کہ ان کا ڈسا ہوا سوتے میں بھی مسکراتا ہے اور یہی انداز طالب کی شاعری میں رواں ملے گا۔''(11)

شاعر اپنے عہد کا نقیب ہوتا ہے اور اپنے ماحول سے متاثر بھی۔ طالب خوندمیری کی شاعری میں عوامی مسائل اور عوامی موضوعات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ امید کی جانی چاہئے کہ ان کا یہ مزاحیہ شعری سفر یوں ہی جاری رہے گا۔ طالب خوندمیری کی بیشتر نظموں کا اختتام بڑا منطقی ہوتا ہے۔ سنجیدہ شاعری میں مخدوم محی الدین اور دکنی مزاحیہ شاعری میں سلیمان خطیبؔ نے اپنی نظموں کے لئے یہ وصف خاص برتا ہے کہ نظم کا موضوع عوام یا معاشرے سے ہوتا ہے۔ موضوع کا پھیلاؤ بڑے اچھے حسین اور مزاحیہ پیرائے میں ہوتا ہے۔ لیکن جب نظم ختم ہوتی ہے تو سامع یا قاری پر سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ مخدومؔ کی نظم ''چارہ گر'' اور سلیمان خطیبؔ کی نظم ''پہلی تاریخ'' اس کی بہترین مثالیں ہیں یہ انداز طالبؔ خوندمیری نے اپنی نظموں میں اپنایا ہے۔ ان کی نظموں کا اختتام سامع وقاری پر سکتہ ہی طاری نہیں کرتا' ایک پیام بھی دیتا ہے۔ جیسے ''غلام دستگیر'' یا 'اسکرو' 'دیمک' یا شیطان۔ طالب خوندمیری کے فن کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا یہ پیام الفاظ میں بیان نہیں ہوتا۔ نظم کے اختتام پر سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے۔ اب جس کی جتنی فراست اتنا ہی وہ پیام اخذ کرے گا۔ اسی لئے انھیں اردو مزاح کا فلسفی شاعر کہا گیا ہے۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) شاہد لطیف ''طالب خوندمیری'' مطبوعہ انقلاب ممبئی مورخہ 27 اپریل 1997ء ص 3

(2) طالب خوندمیری (انٹرویو نگار فیضان عارف) The Daily Jung London 16 Nov 1995

(3) ڈاکٹر سید بشیر احمد ''طالب خوندمیری'' مضمون مشمولہ ''مزاح نگاران حیدرآباد'' صفحہ 57

(4) مصطفیٰ کمال شخصی انٹرویو 10 مئی 2006

(5) مجتبیٰ حسین ''طالب خوندمیری ایک تاثر'' مطبوعہ ''شگوفہ'' اکتوبر 1996 ص 18

(6) یوسف ناظم مضمون مشمولہ ''سخن کے پردے میں'' صفحہ 11 1990ء

(7) یوسف ناظم مضمون مشمولہ ''سخن کے پردے میں'' صفحہ 16

(8) خورشید خضر ''طالب خوندمیری'' مطبوعہ روزنامہ منصف'' مورخہ 18 ڈسمبر 2005ء

(9) مجتبیٰ حسین ''طالب خوندمیری ایک تاثر'' مطبوعہ ''شگوفہ'' اکتوبر 1996 ص 19

(10) غیاث متین طالب خوندمیری مطبوعہ ''شگوفہ'' اکتوبر 1994ء ص 43

(11) مسیح انجم طالب خوندمیری مطبوعہ ''شگوفہ'' اکتوبر 1994ء ص 39

بوگسؔ حیدرآبادی

سید خواجہ نصیر الدین احمد قادری نام، بوگسؔ تخلص تھا۔ادبی دنیا میں بوگسؔ حیدرآبادی کے نام سے معروف ہوئے۔بوگسؔ حیدرآبادی 10 اکتوبر 1940ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے(1)۔1968ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میٹرک کامیاب کیا۔1974ء میں بی اے 1976ء میں ایم اے اور پھر بعد میں بی ایڈ کیا۔1964ء میں مڈل ٹرینڈ ٹیچر کی حیثیت سے سرکاری اسکول میں تقرر رہوا۔

بوگسؔ ایک ہمدرد انسان اور زندہ دل شخصیت کے حامل تھے۔بذلہ سنج اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، لیکن وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔سنجیدہ محفلوں کو بھی اپنے برجستہ جملوں سے زعفرانِ زار بنادیتے تھے۔محمد علی رفعت لکھتے ہیں:

> ''ایک نشست میں ہمارے ایک ساتھی (جو کافی سن رسیدہ ہیں) بوگسؔ کی شہہ پر مزاحیہ شاعری کی مشق کر رہے تھے۔کسی شعر میں ایک مصرعہ تھا'' گھر کے اندر ملگیاں کائی کو کتے''سبھی احباب کی رائے تھی کہ مصرعہ مہمل ہے اور حذف کردیا جانا چاہیئے ۔ بوگسؔ سے جب پوچھا گیا تو اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا'' رہنے دو کم از کم کرایہ آجائے گا۔''(2)

بوگسؔ ہائی اسکول کے زمانے ہی سے سنجیدہ شاعری کرنے لگے۔مجاہدؔ عجمی تخلص کرتے تھے۔1960ء میں مزاحیہ شاعری کی شروعات ہوئی۔ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ پاکستان اور خلیجی ممالک میں بھی مشاعرے پڑھے۔اور شائقین نے انھیں بے حد پسند کیا۔

بوگسؔ نے سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری کے ساتھ ساتھ علمی اور تحقیقی مضامین لکھ کر ادبی دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔اس کے باوجود اخلاص انکساری تواضع ان کی شخصیت کا خاصہ رہی۔بوگسؔ ایک دردمند دل کے حامل

تھے۔اقبال علی جاوید روزنامہ ''منصف'' کے جوائنٹ ایڈیٹر عطا محمد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''عطا محمد صاحب نے اپنے مضمون''وہ بوگسؔ نہ تھے'' (روزنامہ ''منصف''19 مئی 1991) میں بوگسؔ کے ایک سینئر ساتھی ٹیچر جناب واحد علی مرحوم کا ذکر کیا ہے جن کے دنوں پاؤں مفلوج تھے۔بوگسؔ کئی برس تک انھیں اپنی سائیکل پر بٹھا کر اسکول لاتے اور لیجاتے' خود پیدل چلتے تھے۔مستعد پورہ اسکول کے ایک حافظ قرآن ساتھی ٹیچر کے لئے شخصی طور پر کوشش کر کے بوگسؔ نے انھیں آل انڈیا ریڈیو پر قرات قرآن مجید کے لئے نامزد کروایا۔''(3)

بوگسؔ کو بہ حیثیت مزاحیہ شاعر سبھی جانتے ہیں۔وہ ساتھ ہی ایک بہترین مضمون نگار' محقق' سنجیدہ شاعر' مبصر اور Interviewer بھی تھے۔

''زندہ دلان حیدرآباد کے ممتاز مزاحیہ شعراء'' اور ''یادرفتگان'' کے عنوان کے تحت انھوں نے 1981ء میں حیدرآباد کے ممتاز مزاحیہ شعرا کا تعارف' سوانح' شخصیت اور فن پر مسلسل مضامین لکھے۔جو روزنامہ ''منصف'' کے سنڈے ایڈیشن کو زینت بخشتے رہے۔بوگسؔ نے تقریباً 25 مزاحیہ شعراء کی سوانح اور فن پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔اس کے علاوہ انھوں نے ہندی کے اولین شاعر کبیر داس اور پاکستان میں حیدرآباد کی اہم ادبی شخصیت خواجہ حمید الدین شاہد کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا ہے۔انھوں نے اپنے مضامین میں سلیس اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ادبی شگفتگی ان مضامین کی انفرادی خصوصیت ہے۔

اردو اخبارات کے طنزیہ اور مزاحیہ کالم نگار'' کے عنوان کے تحت بوگسؔ نے اردو صحافت میں کالم نگاری کے ذریعہ اردو کی خدمت کرنے والوں کا جائزہ لیا ہے۔اردو طنز و مزاح کے فروغ وارتقاء میں کالم نگاروں کی خدمات اوران کی اہمیت پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔''شعرائے عثمانیہ'' کے موضوع پر انھوں نے قدیم عثمانین شعراء کا تعارف کرایا تھا۔

انھوں نے تاریخی موضوعات کو بھی اپنی نوک قلم سے مزین کیا ہے۔جن میں ''جامع مسجد حیدرآباد'' ''دنیا کا ایک قدیم پل۔پرانا پل'' ''تلاش آثار دکن'' قابل ذکر ہیں۔ان میں سب سے دقیق اور تحقیقی مضمون موئے مبارک

اور آثار مبارک پر ہے۔جس میں انہوں نے ان آثار کا سعودی عرب سے دکن پہنچنے تک کے طویل سفر کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ان مضامین کے مطالعہ سے حیدرآباد میں موجود تمام آثار مبارک کی تفصیلات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

بوگسؔ حیدرآبادی نے مختلف سرکاری سماجی سیاسی اور ادبی شخصیات کے انٹرویو بھی لیے جو روزنامہ ''منصف'' میں شائع ہوتے رہے۔روزنامہ ''منصف'' کی جانب سے منعقدہ پہلے ''مزاحیہ ادبی مقابلے'' کے وہ کنوینر بھی تھے۔ یہ مقابلہ ریاست بھر میں مقبول رہا۔

بوگسؔ حیدرآبادی نے جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کیا اور چوتھے سیمسٹر میں انہوں نے ''فکر تونسوی شخصیت اور طنز نگاری'' کے موضوع پر مقالہ سپرد قلم کیا۔اس مقالے کے مطالعہ سے بوگسؔ کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔جس میں انہوں نے طنز ومزاح کی تعریف' اس کا تاریخی پس منظر فارسی اور اردو میں طنز ومزاح کے اہم رجحانات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔طنز نگاری کے باب میں شاعری' ڈرامہ نگاری' ناول نگاری' روزنامچہ نگاری' تنقید نگاری' کالم نگاری وغیرہ کا بھی تفصیلی احاطہ کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے ممتاز مزاح نگاروں اور فکر تونسوی کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔

انھوں نے ملک و بیرون ملک متعدد مشاعرے پڑھے۔ان کی تخلیقات مختلف اخبارات اور رسائل کی زینت بنتے رہے۔لیکن انھوں نے کبھی اپنی تخلیقات کو مجموعے کی شکل میں شائع کرنے کی جانب سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔رشید الدین اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

> ''جب 1980ء میں میرے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''خواہ مخواہ'' شائع ہوا تو اس کی ایک جلد میں نے انھیں بھی دی۔بہت خوش ہوئے اور بولے رشید! تم نے یہ کام بہت اچھا کیا۔میں نے کہا ''اب تمہارا بھی کوئی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ شائع ہوجانا چاہیے۔اس پر بولے ''میں بھی اسی فکر میں ہوں لیکن یہ دنیا کے جھنجھٹ ایسے ہیں جو وقت ہی نہیں دیتے۔میں نے کہا ''اسے بھی دنیا کا جھنجھٹ سمجھ کر کر ڈالو' بڑے اعتماد کے ساتھ بولے ''انشاءاللہ''۔(4)

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ بوگسؔ نے ابتداء میں سنجیدہ شاعری کی اور مجاہد عجمی تخلص اختیار کیا۔اس زمانے میں اپنے ماموں سید محبوب علی سے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے بعد میں علامہ حیرتؔ بدایونی کو اپنا کلام دکھانے لگے اور ان ہی کی مشورے پر مزاحیہ شاعری کی طرف راغب ہوئے اور خوب نام کمایا۔سنجیدہ شاعری کے چند نمونے پیش ہیں۔

ہے معراجِ محبت اپنی ہستی کو مٹا دینا
یہی تو درس دیتا ہے ہمیں جل جل کے پروانہ
فلک اس کاز میں اس کی جہاں چاہے چلا جائے
مجاہد کا وطن کوئی، نہ کوئی اس کا کاشانہ

گم ہو گئے اس کے تصور میں اس قدر
اپنی خبر نہیں تو اس کی خبر کہاں
یہ سوچ کر ہی پھینک دیے جام ارغوانی
ساقی کی چشم مست کا اس میں اثر کہاں
میری نگاہ شوق سے آئینہ دیکھ تو
تجھ کو تیرے جمال کی اپنے خبر کہاں
ہندوستان میں یوں تو سخنور ہزار ہیں
لیکن مراد آباد کا ہائے جگر کہاں

بوگسؔ نے مزاحیہ شاعری کا رخ کیا تو بہت کھل کر معاشرتی برائیوں کو بے نقاب کیا۔ان کا کلام عصری حسیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ان کی وفات سے صرف دو دن قبل دوردرشن کے انجمن پروگرام میں ان کا کلام ٹیلی کاسٹ کیا گیا جس میں انہوں نے موجودہ سیاست پر خوب طنز کیا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہو:

منتخب کرتے ہیں اپنے ووٹ سے مجھ کو جو لوگ
کونسل میں جاکے ان پر ٹیکس بڑھواتا ہوں میں
ان کے وعدے بھی غلط میری وفاداری بھی جھوٹ
مجھ کو بہلاتے ہیں وہ اور ان کو بہلاتا ہوں میں

اپنے جیسے لیڈروں کا ساتھ دینا تھا مجھے
کوئی موزوں نام جز بوگسؔ نہ تھا میرے لیے

ہوا ہے سامنا لیڈر سے اپنے ہی محلے میں
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

آج کل ہے کلرک ایم اے پاس
ساتویں تک پڑھا یہ لیڈر ہے
کِتنا چالاک ہے یہ بوگسؔ بھی
شب میں شاعر ہے دن میں ٹیچر ہے

ان اشعار میں بوگسؔ حیدرآبادی نے اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ طرز اظہار غالبؔ سے مخصوص ہے اور اردو شاعری میں اپنی ذات کو ہدف طنز بنانے کا سلسلہ انہوں نے ہی شروع کیا۔ حیدرآباد میں مخدومؔ نے اس طرز کی شاعری بڑے اچھے انداز میں کی ہے۔ اسی کی پاسداری بوگسؔ کے یہاں ملتی ہے۔

مخدومؔ محی الدین نے ایک نظم ''چارہ گر'' کہی تھی جس کے دو مصرعے ہیں:

دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
ایک چنبیلی کے منڈوے تلے

اسی مضمون کو بوگسؔ کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں۔

اس دن کی خوشی یاد ہے جب مجھ سے ملے تھے
اک روز چنبیلی کے وہ منڈوے تلے آ کے

بوگسؔ حیدرآبادی کی شاعری میں ایک اور انفرادیت نمایاں ہے۔ اور وہ ہے آدھی غزل۔ وہ پہلا مصرعہ اپنا اور دوسرا غالبؔ کا استعمال کرتے تھے۔ یہی آدھی غزل ان کی ہندو پاک میں شہرت کا باعث بنی۔ رشید الدین اس

سلسلے میں رقمطراز ہیں:

چنانچہ وہ مزاحیہ میدان میں آگئے اور خوب شہرت پائی وہ ایک مصرعہ غالبؔ کا رکھتے اور دوسرا مصرعہ خود کہتے تھے۔اس لئے دوست احباب انھیں ازراہ مذاق ایک مصرعہ کا شاعر بھی کہا کرتے تھے۔لیکن ان کا یہی رنگ خوب چلا اور اسی میں انھوں نے خوب شہرت پائی۔پھر کمال یہ کہ ان کا کلام رسالوں کے ذریعہ عام نہیں ہوا بلکہ مشاعروں کے ذریعہ۔ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں انھوں نے مشاعرہ میں اپنا مزاحیہ کلام نہ سنایا ہو۔''(5)

غالبؔ جیسے سنجیدہ شاعر کے پہلے مصرعہ کی جگہ اپنا طنزیہ مصرعہ لگا کر بوگسؔ نے جو تیر اور نشتر تیار کیے ہیں وہ معاشرے کے ناسور کا خوب علاج کرتے ہیں۔چند شعر ملاحظہ ہو:

یہ بعدِ عقد کُھلے گا کہ میری خُو کیا ہے　　ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
کوئی ذلیل کوئی بے وقوف، کوئی گدھا　　تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
کتر کے لے ہی گیا بس میں کوئی ساری جیب　　ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے
نہ کوری کوری ہیں ٹھلیاں نہ چکنے چکنے گھڑے　　یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سُبو کیا ہے
بنا ہے مسخرہ شاعر پھرے ہے اِتراتا　　وگر نہ شہر میں بوگسؔ کی آبرو کیا ہے

ایک اور غزل کے چند شعر ملاحظہ ہو:

روز دارُو دیا کرے کوئی　　میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
بنت مریم کی ہے مجھے تلاش　　ابن مریم ہوا کرے کوئی
ووٹ لیتے ہیں چوٹ دیتے ہیں　　اب کسے رہنما کرے کوئی
میرے خط دے دیئے رقیبوں کو　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

بوگسؔ حیدرآبادی نے اپنے ایک شعر میں تعلّی کرتے ہوئے خود کو غالبؔ سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔لیکن

بین السطور پر غور کیا جائے اور شعر کے ڈکشن پر توجہ دجائے تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس شعر میں دراصل غالبؔ کی عظمت کا بیان کیا ہے اور اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

یہ طئے ہے کہ غالبؔ سے کہیں پار ہے بوگسؔ
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

بوگسؔ نے زیادہ تر غزلوں کے ذریعہ اپنے فن کا جادو بکھیرا۔اس کے علاوہ ان کے پاس قطعات اور پیروڈیاں بھی ملتی ہیں۔1964ء میں ایک فلم آئی تھی ''غزل'' جس میں ساحرلدھیانوی کی ایک غزل کو نغمہ کی شکل میں پیش کیا گیا جو بے حد مقبول ہوا۔جس کا مطلع ہے:

رنگ اور نور کی بارات کسے پیش کروں
یہ مرادوں کی حسیں رات کسے پیش کروں

اس طرز پر بوگسؔ حیدرآبادی نے غزل کہی ہے جو ''شگوفہ'' کے مارچ اپریل 1973ء کے شمارے میں ''فلم غزل' کی غزل پر غزل'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔یہ پیروڈی ''شگوفہ'' کے 25 سالہ شعری انتخاب میں بھی شامل ہے۔اس کے چند شعر ملاحظہ ہو:

کون سا وقت ملاقات کسے پیش کروں
دن کسے پیش کروں رات کسے پیش کروں

گھر میں بیگم ہے تو دفتر میں ہے افسر برہم
میں پریشاں ہوں کہ خدمات کسے پیش کروں

کوئی سنتا نہیں دیوان لیے پھرتا ہوں
اپنی بکواس خرافات کسے پیش کروں

ہر حسیں ہے مرضِ ہجر کا بیمار یہاں
دل ہے اک زندہ طلسمات کسے پیش کروں

ڈال دوں گا کسی ہرّاج میں بوگسؔ دل کو
کوئی لیتا نہیں سوغات کسے پیش کروں

شاعر یا فنکار اپنے عصر کا ترجمان ہوتا ہے اور فن میں اپنے دور کے مرقعے پیش کرتا ہے۔بوگسؔ حیدرآبادی نے اپنے عصر اور سماج کے سلگتے ہوئے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ان کے کلام میں عصری حسیت کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ادب میں یہ بات مانی جاتی ہے کہ ظرافت کا کوئی مقصد ہونا چاہیے۔بوگسؔ اپنے کلام کے ذریعہ اصلاح

معاشرہ کا کام لینا چاہتے ہیں۔ان کی تخلیقات میں طنز کی کاٹ واضح طور پر نظر آتی ہے۔وہ سماج میں راہ پاتی ہوئی بے حیائیوں کے طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے تیرونشتر کچھ اس طرح چلاتے ہیں۔

ہوگئیں اللہ کو پیاری وہ جب اماں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
کر رہی تھیں کل کلب میں رقص چند اک لڑکیاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

مزاح کا مقصد صحت مند تفریح فراہم کرنا ہوتا ہے جبکہ طنز کے ذریعہ مزاح نگار سماج کی اصلاح کا کام لیتا ہے۔بوگسؔ حیدرآبادی سنجیدہ مسائل کو مزاح کے پیرائے میں بیان کرنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔

چاپلوسی مگر نہیں آتی ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ان کو بچپن میں آتی تھی غیرت اب کسی بات پر نہیں آتی
نہ خدا ہی ملا نہ وصلِ صنم کوئی امید بر نہیں آتی
داڑھی رکھ کر بھی بوگسؔ شرم تم کو مگر نہیں آتی

بوگسؔ حیدرآبادی اپنے موضوعات اپنے آس پاس تلاش کرتے ہیں۔وہ عام آدمی کے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناتے ہیں۔مہنگائی اور بیروزگاری کے تعلق سے کہتے ہیں:

ہمیں کوئی غم نہیں ہے،نہیں مانتے ہم اس کو
غمِ دل اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ملاوٹ بھی گرانی بھی ہے اور بے روزگاری بھی
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

جب مجھے بیروزگاری نے پھٹیچر کردیا
یار لوگوں نے لگا کر زور ٹیچر کردیا
چند دن کے بعد ہی آخر وہ دن بھی آ گیا
پارٹی والوں نے بوگسؔ کو منسٹر کردیا

غزلوں کے علاوہ بوگسؔ نے کئی قطعات بھی کہے ہیں۔وہ مشاعروں کے کامیاب شاعر سمجھے جاتے تھے۔انھیں مشاعروں کے ذریعہ ہی شہرت حاصل ہوئی۔لیکن وہ مشاعروں کے گرتے معیار پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے شاعر اور سامع پر طنز کا بھرپور وار کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ شاعر کے تخیل میں بلندی اور کلام میں گہرائی کے ساتھ کلام میں کوئی نہ کوئی اخلاقی اور اصلاحی پہلو ہونا چاہیئے۔لیکن عہد حاضر میں شعراء غنائیت اور ترنم پر زیادہ دھیان دے رہے ہیں جبکہ انھیں کلام پر خاطر خواہ توجہ دینی چاہیے۔وہ کہتے ہیں۔

بکواس کو راگنی میں گا لیتا ہوں
بوگسؔ ہوں مگر رنگ جمالیتا ہوں
جمہور کو اللہ سلامت رکھے
جمہور کو دیوانہ بنا لیتا ہوں

وہ مشاعروں میں متشاعروں کی بڑھتی تعداد پر بھی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اس دور میں ہے ہر کس و ناکس شاعر
اس قحط میں ہیں ٹکے کے دس دس شاعر
مالی، دھوبی، کلال، درزی، حجّام
مجھ جیسے ہیں بے شمار بوگسؔ شاعر

بوگسؔ حیدرآبادی، مومن خاں مومن اور عشق اورنگ آبادی کے طرح اپنے تخلص کو موضوع کا حصہ بنا کر پیش کرنے مہارت رکھتے ہیں۔موجودہ اشعار میں اس کی سند موجود ہے۔

بوگسؔ کی شاعری میں طنز کے ساتھ ساتھ اصلاح اور اخلاقیات کا پہلو بھی بہت عمدہ نظر آتا ہے۔ وہ دولت اور شہرت کی حرص کے بجائے' قناعت کا درس دیتے ہیں۔ اہل حیدرآباد نے کئی اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ کبھی وہ صاحب اقتدار تھے لیکن موجودہ دور میں حکمرانوں کی متعصّبانہ پالیسیوں اور اقربا پروری کے سبب وہ تعلیمی اور معاشی اعتبار سے پسماندگی کا شکار ہوتے چلے گئے۔ اس کے باوجود اہل حیدرآباد نہ صرف خوش رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

چٹنی میں کوئی مست کوئی دال میں مست
رہتا ہے کوئی بخشی ہوئی کھال میں مست
ہم زندہ دلان حیدرآبادی ہیں
ہر رنگ میں ہم مست ہیں ہر حال میں مست

گرتی ہوئی انسانی اقدار اور اخلاقی پستی پر بھی بوگسؔ کے تیر و نشتر خوب چلتے ہیں۔ ہر مذہب میں والدین کی فرمانبرداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ ساتھ ہی والدین کو بھی اپنی اولاد سے محبت اور شفقت سے پیش آنے کی تلقین کی گئی ہے۔ لیکن موجودہ معاشرے کا المیہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آنے کے بجائے بے تکلفی کے نام پر ناشائستہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ جس سے بچوں کی شخصیت پر منفی اثر پڑ رہا ہے۔ اس اخلاقی نکتہ پر توجہ دلاتے ہوئے بوگسؔ اپنے ایک قطعہ میں کہتے ہیں۔

ایک لڑکے نے یہ جُھنجھلا کے کہا ابّا سے
اُلّو اُلّو مجھے ہر وقت نہ ابّا کہیئے
آٹھ نو سال کا بچہ نہیں ہوتا اُلّو
میں تو بچہ ہوں مجھے اُلّو کا پٹّھا کہیئے

بوگسؔ نے 7 مئی 1991ء کو شولا پور میں مشاعرہ پڑھا 8 مئی کی شب حیدرآباد آئے اور سینے میں شدید درد کی شکایت کی اور اسی سہ پہر نظام انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس میں انھیں شریک کروایا گیا۔ دو دن تک فریش رہے اور دس اور گیارہ تاریخ کی شب اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ قبرستان عبداللہ خان' حیدرآباد میں ان کی تدفین

عمل میں آئی۔

---000---

حوالہ جات

(1) مالک رام "تذکرۂ ماہ و سال" ص189 سنہ 1991ء

(2) محمد علی رفعت "باتیں بوگس کی" مطبوعۂ ماہنامہ شگوفہ' جولائی 1991ء ص47

(3) اقبال علی جاوید "بوگس حیدرآبادی...... چند یادیں چند باتیں" مطبوعہ ماہنامہ شگوفہ' جولائی 1991ء ص42

(4) رشیدالدین "بوگس حیدرآبادی" مطبوعۂ ماہنامہ شگوفہ' جولائی 1991ء ص50

(5) رشیدالدین "بوگس حیدرآبادی" مطبوعۂ ماہنامہ شگوفہ' جولائی 1991ء ص49

فرید انجم

محمد فریدالدین نام اور انجم تخلص اور قلمی نام فرید انجم اختیار کیا اور اسی نام سے معروف ہوئے۔محمد فریدالدین 10 اکتوبر 1940ء کو محمد شریف الدین اور زیب النساء کے گھر عادل آباد میں پیدا ہوئے۔محمد شریف الدین کا تعلق ایک علمی وادبی گھرانے سے تھا۔محمد شریف الدین کا آبائی وطن کریم نگر تھا لیکن تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد وہ کریم نگر سے عادل آباد منتقل ہوئے۔محمد شریف الدین کو شعروادب سے بھی خاصی دلچسپی تھی اور ایک شاعر کی حیثیت سے وہ اپنے زمانے میں شہرت رکھتے تھے۔

محمد شریف الدین کے کل سات لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔سب سے بڑے محمد ظہیرالدین جاوید دوسرے محمد نصیرالدین، تیسرے محمد رشیدالدین، چوتھے محمد فریدالدین (فرید انجم)، پانچویں محمد شہاب الدین چھٹے غیاث الدین اور ساتویں اور آخری لڑکے محمد ضمیرالدین لڑکی کنیز فاطمہ تھیں جو تین سال کی عمر میں ہی انتقال کر گئیں۔

محمد فریدالدین (فرید انجم) نے میٹرک تک بذریعہ اردو میڈیم عادل آباد گورنمنٹ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد بی اے اور بی ایڈ 1963ء میں عثمانیہ یونیورسٹی' حیدرآباد سے کامیاب کیا۔

بی ایڈ کی تکمیل کے فوری بعد فرید انجم کا عادل آباد کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں بحیثیت انگریزی ٹیچر تقرر عمل میں آیا۔اس اسامی پر خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ وہ جونیر کالج میں بھی تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔حالانکہ وہ انگریزی کے ٹیچر تھے لیکن چونکہ انہیں اُردو سے خاص دلچسپی تھی، اس لئے جونیر کالج میں وہ اُردو پڑھایا کرتے تھے۔فرید انجم کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا اس سلسلے میں رؤف رحیم لکھتے ہیں:

> ''پیشہ تدریس سے وابستہ رہے انگریزی پڑھاتے تھے اور اُردو پڑھتے تھے''(1)

فرید انجم کی شادی 1968ء میں خورشید محی الدین صاحب کی صاحبزادی عائشہ جمیل سے ہوئی۔فرید انجم کو

دولڑکے اور دولڑکیاں ہے۔ بڑے فرزند کا نام نوشیر عمران انجم ہے دوسری لڑکی جن کا اسم گرامی تحسین انجم ہے چھوٹے صاحبزادے رضوان انجم ہیں سب سے چھوٹی صاحبزادی افشاں تزئین انجم ہیں۔فرید انجم نے اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم کے زیور آراستہ کیا اور اپنی زندگی میں ہی تمام اولادوں کی شادیوں کے فرض سے بخوبی سبکدوش ہوئے۔

کہکشاں ادب کے اس انجم کو کھیل کود میں دلچسپی تھی اور شعروشاعری ان کے خاص مشاغل میں شامل تھے۔ فرید انجم کو چائے اور سگریٹ نوشی کا شوق تھا۔ غالباً سگریٹ نوشی نے انہیں کینسر کے مرض میں مبتلا کیا۔اور آخرکار 21 اگست 2006ء کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اُردو طنز و مزاح کا یہ درخشاں انجم خاموش ہوگیا۔ان کے جسد خاکی کو عادل آباد میں عیدگاہ سے متصل قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

فرید انجم طنز و مزاحیہ شاعری میں ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں ان کا شمار حیدرآباد میں طنز و مزاح کے مقبول عام شعراء میں ہوتا ہے۔انہوں نے مزاحیہ شاعری کے علاوہ سنجیدہ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی مزاحیہ شاعری نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔وہ بذلہ سنج اور حاضر جواب واقع ہوئے تھے۔شوخی اور ظرافت ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

فرید انجم نے اپنی شاعری کی ابتداء زمانہ طالب علمی ہی میں کردی انہوں نے دسویں جماعت ہی میں اپنے لئے انجم تخلص اختیار کیا۔حالانکہ ابتداء میں انہیں ڈراموں سے دلچسپی تھی۔کئی ڈرامے لکھے اس کے ساتھ کئی مضامین بھی لکھے لیکن اپنی لااُبالی طبیعت کی وجہ سے ابتدائی تخلیقات کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔وہ خود اپنی ابتدائی تخلیقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’لکھنے لکھانے کی صلاحیت تو طالب علمی کے زمانے سے تھی لیکن اس صلاحیت کو تسلسل اور پابندی کے ساتھ استعمال نہیں کیا بس گاہے ماہے کسی موقع یا ضرورت کے تحت ہی لکھا اور ضائع کرتا تھا۔اس لئے ابتدائی تخلیقات جیسے غزلیں، نظمیں، ڈرامے اور مضامین محفوظ نہیں رہے‘‘۔(2)

فرید انجم کی تخلیقات مختلف اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہے۔جن میں روزنامہ ’’سیاست‘‘ ’’منصف‘‘ اور ماہنامہ ’’شگوفہ‘‘ قابل ذکر ہیں۔طنزیہ و مزاحیہ کلام پر مشتمل ان کا ایک مجموعہ ’’چغلیات‘‘ 2004ء میں منظر عام پر

آچکا ہے۔اس مجموعہ میں 26 غزلیں‘10 طویل نظمیں‘ایک ہندی گیت اور پانچ قطعات شامل ہیں۔

فرید انجم نے اپنی تخلیقات میں نہ صرف سماج کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں پر طنز کیا ہے بلکہ بعض جگہوں پرانہوں نے خود کو بھی طنز کا نشانہ بنایا۔وہ اپنی جسمانی ساخت اور دبلے پن کے بارے میں لکھتے ہیں:

کچھ بھی انجم سلامت نہیں
ہڈیاں، بوٹیاں، پسلیاں (3)

فرید انجم سگریٹ پینے کے عادی تھے افراد خاندان اور احباب کے سمجھانے کے باوجود وہ اس عادت کو ترک نہ کر سکے۔زندگی کے آخری ایام میں لکھے اُن کے اِس شعر سے ان کی سگریٹ نوشی کی عِلّت کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

شعر سننا اگر ہو انجم سے
ایک بیڑی پلائے صاحب

حسن وعشق کا بیان شاعری کا بنیادی موضوع رہا ہے۔فرید انجم اپنی تخلیقات میں حسن وعشق کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

میں صدقے اور میں واری نکونا
محبت کی اداکاری نکونا

دختر پہلوان ہوگر محبوب
دور ہی سے سلام کہئے گا

ان اشعار میں موجودہ دور کے عاشقوں اور دکھاوے کی عاشقی کا بڑا خوبصورت منظر پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ مزاح کی چاشنی بھی نظر آتی ہے۔فرید انجم کے پاس مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے تیر بھی نظر آتے ہیں۔انہوں نے اپنے کلام میں کئی سماجی برائیوں اور عصری موضوعات پر کھل کر طنز کیا ہے۔فرید انجم نے اپنی غزلوں میں رشوت خور عہدیداروں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔جو عیش وعشرت کی زندگی کی خاطر ایمانداری سے ملنے والے تنخواہ کے

بجائے رشوت خوری پر اتر آتے ہیں۔

اب تو رشوت کروڑوں میں کھارئیں
بن گیا منہ مہراب اچھا نئیں

رشوت کھائیں سارے افسر
بس نئیں ہوری تنخواہ بابو

فرید انجم نے جہیز کے لالچی لوگوں پر بھرپور طنز کیا ہے ان کا کہنا ہیکہ جب کوئی لڑکی اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور گھر بار کو چھوڑ کر سُسرال آتی ہے تو وہاں اسے ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ اپنی نظم ''سُسرال کا جغرافیہ'' میں وہ ایک ایسے سُسرال کا نقشہ پیش کرتے ہیں جہاں بے شمار برائیاں ہیں۔ نظم میں سب سے پہلے لڑکی اپنی ماں سے شکایت کرتی ہے۔

کیسے کنپوں کو تو کھنگالی گے
کیسے لوگاں میں منجے ڈالی گے
بہوت ارماں تھا میری شادی کا
کِتّے ارماں تو نکالی گے

سب سے پہلے وہ ساس کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے اُس کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں:

گھر کے کاموں سے دور ہے بُڈی
ڈب کو فیشن میں چور ہے بُڈی

بیل باٹم کبھی تو میکسی میں
جیسے فلموں کی حور ہے بُڈی

اس بڑھاپے میں بھی اُتانی ہے
اُن امیتابھ کی دِوانی ہے

سُسرال میں خاندان کا سرپرست خُسر ہوتا ہے وہ گھر کی ہر چیز کا ذمہ دار ہوتا ہے لیکن اگر اسے ہی اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں تو گھر کا کیا حال ہوتا ہے۔فرید انجم لڑکی کی زبانی سناتے ہیں۔

گھر میں سب سے ضعیف ہے سسرا
پتلا پاپڑ نحیف ہے سسرا

ذرا گانجے کی اس کو عادت ہے
ورنہ بالکل شریف ہے سسرا

جب بھی دو چار دم لگاتا ہے
ناچ تِگنی کا پھر نچاتا ہے

پنکی بُڈی سے بہوت ڈرتا ہے
اس کی چوکھٹ پو سجدے کرتا ہے

گھر کے بازو جو ایک بیوہ ہے
اس کو دیکھا تو آہیں بھرتا ہے

داتاں جھڑ کو ہے گنجی تالو ہے
اس پہ بیوہ سے لائن چالو ہے

اس نظم میں انہوں نے دیور، دیورانی اور جیٹھ پر بھی طنزیہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔انہوں نے اپنی ایک اور نظم ''نان میٹرک داماد'' میں ایسے دامادوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو سسرال کے پیسوں پر عیش کرتے ہیں اور انہیں شرمندگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ایک ہاتھ سے محروم مگر غیرت مند شخص کی زبانی فرید انجم سسرال کے پیسوں پر عیش کرنے والوں پر طنز کے تیر چلاتے ہیں ہوئے کہتے ہیں۔

یہ شرافت نہیں رزالت ہے
مرد کی ٹھوکروں میں دولت ہے

کام کر کام نام پیدا کر
کچھ تو اپنا مقام پیدا کر

گر ہے تھوڑی بھی شرم شرمانا
ساس کے مال پہ نہ اِترانا

کیا ڈراتا ہے تو زنانے کو
مرد بن کے دکھا تو زمانے کو

میں بھی ایسا کروں نہیں ممکن
تیرے جیسا بنوں نہیں ممکن

مجھ پے اللہ کی عنایت ہے
ایک بازو ابھی سلامت ہے

ایک روٹی جو میں کماؤں گا
آدھی بیوی کو بھی کھلاؤں گا

فرید انجم کا مشاہدہ کافی تیز ہے وہ سماج میں در آئی برائیوں پر کھل کر طنز کرتے ہیں وہ اپنے موضوعات اپنے آس پاس ہی تلاش کرتے ہیں۔ دور حاضر میں جہیز کی لعنت بڑھتی ہی جا رہی ہے اور جہیز کا لینا اب فیشن سے بڑھ کر روایت بنتا جا رہا ہے۔ اس صورتحال پر طنز کرتے ہوئے فرید انجم اپنے مخصوص دکنی لب ولہجہ میں کہتے ہیں:

مفت شادی ہے مفت کی بیوی
اور اوپر سے ایک کلر ٹی وی
انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں
کیا رکھا تھا میاں پڑھائی میں

ہم مردوئے ہو کے بھی جورو سے پیسہ مانگ رئیں
نئیں ملا پیسا تو بیویوں کو جلارئیں آخ تھو

فرید انجم نے ایسے شوہروں پر بھی طنز کیا ہے جو عورتوں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔فرید انجم نے معاشرے میں مرد کی بدلتی ہوئی سماجیات پر برملا گرفت کی ہے۔مرد کی اِن بدلتی ہوئی اقدار سے ہمارے معاشرے اور ہماری تہذیب پر منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ایسے شوہروں کو غیرت کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں:

الٰہی یہ آیا ہے کیسا زمانہ
کرے عیش شوہر کمائے زنانہ

کیا تھے پہلے کیا ہوئے ہیں شادی کے بعد
شیر خاں مٹھوں میاں بن گئے عجب اتفاق ہے

فرید انجم ان نوکری پیشہ بیویوں پر بھی طنز کے تیر چلاتے ہیں جو اپنے شوہروں پر حکومت چلاتی ہیں۔ایسی بیویوں پر فرید انجم دلچسپ انداز میں طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جب سے سروِس چوٹیاں بھی کرنے لگیں
مونچھ والے بیویاں بن گئے عجب اتفاق ہے

وصل کی شب حادثہ اک یہ بھی ہوا
نور بیگم، نور خاں بن گئے عجب اتفاق ہے

فرید انجم نے ایسی بیویوں پر بھی طنز کے تیر چلاتے ہیں جو شوہروں کا چین برباد کرتی ہے۔ان کا کہنا ہیکہ بیوی کو سکھ دُکھ میں ہمیشہ شوہر کا ساتھ دینا چاہئے لیکن بعض لڑاکو بیویاں شوہروں کی زندگی اجیرن بنا دیتی ہیں۔

کل تک جو پٹاخہ تھی، آفت تھی، قیامت تھی
اب آج وہ بیوی دوزخ کا فرشتہ ہے

کروں کیا میں گھر جاکے ان سے بہانہ
ہے دشوار بیگم سے پیچھا چھڑانا

فریدانجم نے ملک کی موجودہ سیاسی صورتحال کو بھی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔شاعراور فنکار اپنے عہد کا نقیب ہوتا ہے۔ملک کی سیاست کا ابتذال اور معاشی ابتری کیلئے وہ سیاسی لیڈروں کو ذمہ دار سمجھتا ہے۔ایک زمانہ تھا جب ہمارے ملک کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا لیکن ان خودغرض رہنماؤں نے اپنے ذاتی مفاد کیلئے لوٹ کھسوٹ شروع کردی۔غریب، غریب تر ہورہا ہے اُدھر امیر، اور امیر بنتا جارہا ہے۔ہمارے ملک کے لیڈر غریبوں کا پیسہ لوٹ کر گاڑی بنگلہ اور کوٹھیاں بنارہے ہیں اور عیش عشرت کی زندگی گذار رہے ہیں۔فریدانجم نے اپنے اکثر اشعار میں امیر اور غریب کی دوستی و معاشرتی حالات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہو:

لیڈری کا یہ انعام ہے
گاڑیاں، کوٹھیاں، کرسیاں

رات بھی لیڈروں کی پونم ہے
اپنا دن بھی اماس ہے باشا

ان کی ڈش میں ہے مرغ بریانی
اپنے چٹّے میں گھاس ہے باشاہ

جنتا روکھی سوکھی کھارئیں
نیتا کھارئیں حلوہ بابو

دور حاضر کی سیاست کا یہ المیہ ہے کہ سیاسی لیڈر اپنا وعدہ وفانہیں کرتے ہیں۔ملک کی بھولی بھالی عوام کو سبز باغ دکھا کر ووٹ حاصل کرتے ہیں اور کرسی کے حقدار بنتے ہی اپنے وعدوں سے طوطہ چشمی اختیار کرلیتے ہیں۔

سیاست میں مخلص لیڈر عنقا ہو گئے ہیں یہ مجرمانہ پس منظر رکھنے والے لوگ قوم کے رہنما بن بیٹھے ہیں۔ اپنی معاصر سیاسی صورتحال کو شعر کے پیکر میں ڈھال کر فرماتے ہیں:

ڈاکواں بھی لیڈراں بن گئے عجب اتفاق ہے
ووٹراں سب الوواں بن گئے عجب اتفاق ہے

لیڈر عوام کو نئے سپنے دکھائے ہے
کرسی ملے تو وعدے سبھی بھول جائے ہے

لے لے کے نام دھرم کا دنگے کرائے ہے
لاشوں پہ بیٹھ کر یہ حکومت چلائے ہے

فرید انجم نے نہ صرف سیاسی لیڈروں پر بلکہ نام نہاد عالموں اور مولاناؤں پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور ان کی بعض کمزوریوں کو آشکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ دور کے بعض مولانا قوم کی رہبری کے بجائے ذاتی مفاد کی خاطر عالم کا چولا پہن لیتے ہیں جس کی وجہ سے حقیقی مشائخین اور علماء بدنام ہوتے ہیں۔ اس لئے نام نہاد مولاناؤں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

ویری سمپل ہے ان کا فوڈ
مچھلیاں، مرغیاں، بکریاں

جو منسٹر ہوا اسے کھیر کھلادی جائے
ہو جو بھوکا اسے تقریر سنا دی جائے

کسی مولانا کو گر نیند بہت آئی ہو
مادھوری کی انہیں تصویر دکھا دی جائے

پورے ستر کے ہوگئے مرشد
پھر بھی شادی کی آس ہے باشا

فرید انجم نے اپنی غزلوں کے علاوہ اپنی نظموں میں بھی سماج کے سنجیدہ مسائل کی طرف نشاندہی کی ہے۔ فرید انجم کا کہنا ہیکہ پیٹ کی آگ لوگوں کو برائی کے راستے اختیار کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔ مثلاً بھوک کی وجہ سے بعض عورتیں جسم فروشی کا پیشہ اختیار کرلیتی ہیں۔ شاعر اپنا کلام سنا کر پیسے کماتا ہے اور ان پیسوں سے اپنی بھوک مٹاتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان بھوک کی وجہ سے اپنا ضمیر تک بیچنے کیلئے تیار ہوجاتا ہے۔ اس صورتحال کو فرید انجم اپنی نظم ''مریض'' میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

شام ہوتے ہی کوٹھے سجتے ہیں
روح بکتی ہے ، جسم بکتے ہیں

شاعروں کا کلام بکتا ہے
بن کے یوسف غلام بکتا ہے

بھوک بچوں کو بھی ستاتی ہے
بھوک بوڑھوں کو نوچ کھاتی ہے
سب صغیر وکبیر بکتے ہیں
بھوک ہو تو ضمیر بکتے ہیں

وہ مزید لکھتے ہیں کہ فی زمانہ بے روزگاری اتنی بڑھ گئی ہے کہ لوگ فاقہ کشی پر مجبور ہو رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں صرف داد سے شاعر کا پیٹ نہیں بھرتا بلکہ اسے پیسے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں شاعر اپنے زمانے کے فنکار کی علامت بن جاتا ہے۔

دل میں اک گدگدی ہوتی ہے
داد پاکر خوشی تو ہوتی ہے

پر میرے دوست یہ حقیقت ہے
داد تو ایک خیالی جنت ہے

داد چولہا جلا نہیں سکتی
بھوک میری مٹا نہیں سکتی

نئے موضوعات کو اپنے کلام کی زینت بنانا فرید انجم کا کمال ہے۔ایسی ہی ایک نظم ''ڈنڈا'' جس میں انہوں نے ڈنڈے کی مختلف صفات بتاتے ہوئے اسے طاقت اور اقتدار کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ڈنڈا ایک ایسی چیز ہے جس سے ہر کوئی ڈرتا ہے اور جس کے پاس ڈنڈا ہوتا ہے حکومت اس کی ہوتی ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہو:

ڈنڈے تیری ہر بات یہاں سب سے جدا ہے
ہر کوئی اشاروں پہ تیرے ناچ رہا ہے
غنڈوں کے لئے اِک تو ہی پیغام قضاء ہے
جِنات اتر جاتے ہیں تو ایسی بلا ہے
جس سر پہ تو برسا کب ہوش رہا ہے
دیکھا تجھے کمزور تو بے ہوش ہوا ہے
پولیس بھی اکڑتی ہے تیرا لے کے سہارا
چوروں کو سرِشام تو دیتا ہے بھپارا
داروغۂ زندان کی آنکھوں کا ہے تارا
تجھ کو نہ تو 'کاما' نہ 'فل اسٹاپ' گوارا
انسان تیرے نام سے پڑجاتے ہیں ٹھنڈے
حیوان بھی تجھے دیکھ کے ڈرجاتے ہیں ڈنڈے

فرید انجم نے سرور ڈنڈا کے شعر سے استفادہ کیا ہے۔سرور ڈنڈا کا شعر ہے۔

ڈنڈے کی شاعری میں پولیس کی ڈائری میں
نہ فُل اسٹاپ نہ کاما! سنجیوا ریڈری ماما

فرید انجم نے جب یہ نظم لکھی ہوگی تو ان کے ذہن میں یقیناً کوٹلیہ کی اَردھ شاستر کا فلسفہ رہا ہوگا۔جس میں اُس نے حکمران وقت کو مشورہ دیا تھا کہ ''دھرما'' سے جب کام نہ چلے تو پھر ''ڈنڈے'' سے کام لینا چاہیے۔

''ٹھنڈی غزل'' بھی ایک ایسی نظم ہے جسے اچھوتے موضوعات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔اس نظم میں فرید انجم نے موسم سرما کے مختلف اثرات کا ذکر کیا ہے۔یوں تو مختلف موسموں کا ذکر قلی قطب شاہ اور نظیر اکبرآبادی کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن فرید انجم کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے موسم سرما میں انسان جن حالات و کیفیات سے گذرتا ہے اُس کا بیان بڑے ہی لطیف اور مزاحیہ انداز میں کیا ہے کہ قاری بے ساختہ ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کیا لکھوں اپنا حال سردی میں
گھر میں نہ کمبل نہ شال سردی میں

اُن پہ آیا جلال سردی میں
ہوگیا میں نِڈھال سردی میں

گرم ایک چائے کی پیالی دو
ہے یہ سب کا سوال سردی میں

پہن سوئیٹر، لپٹ کے مفلر
سر پہ تھوڑے ہیں بال سردی میں

اب جمعہ کا بھی غسل کیا ہوگا
ہے جو پانی کا کام سردی میں

ہم کو نزلہ تھا اور ان کو بخار
ہوسکا نہ وصال سردی میں

زندگی تجھ کو ہے اگر پیاری
ان کی دعوت کو ٹال سردی میں

کل ولیمہ بھی کیانسل کردے
مت نہا شیخ لال سردی میں

فرید انجم نے لوگوں کے معیار زندگی اور دکھاوے کی عادت پر بھی قلم اٹھایا ہے عصر حاضر کے ایک اہم موضوع ''ٹی وی'' پر بھی انہوں نے ایک طویل نظم لکھی ہے جس میں انہوں نے پہلے تو اس کے مختلف فائدے اور اس سے مرتب ہونے والے اثرات گنائے ہیں ساتھ ہی انہوں نے ٹی وی سے ہونے والے اخلاقی نقصانات کی طرف بھی مزاحیہ انداز میں نشاندہی کی ہے۔

گھر میں جب سے آ گیا ہے ٹی وی
شان اپنی بڑھا گیا ٹی وی

پہلے اپنی نہ تھی کوئی قیمت
اب محلے میں بڑھ گئی عزت

اب تو دشمن کلام کرتے ہیں
جھک کے ہم کو سلام کرتے ہیں

دوسری طرف وہ ٹی وی سے مرتب ہونے والے منفی اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گھر میں کھانا ہے نہ پانی ہے
کتنی مغرور نوکرانی ہے

ہم سے کہتی ہے اب وہ مردار
آج فاقہ ہی کیجئے سرکار

فریدانجم کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں ٹی وی زندگی کا ایک لازمی جز سا بن گیا ہے۔لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے کئی نقصانات بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔ بچے اسکول جانے سے جی چراتے ہیں اور گھر کی خواتین امور خانہ داری کو بہتر طور پر انجام نہیں دیتیں۔ یہ ٹی وی کا ایک رُخ ہے اب دوسرا رُخ بھی دیکھئے:

دوسرا رُخ عجب ہے ٹی وی کا
گھر میں بچوں کا اور بیوی کا

بچے پڑھنے سے جی چراتے ہیں
کچھ بھی کہئے تو منہ بناتے ہیں

ولڈ کپ کا عجب زمانہ ہے
ان کو اسکول قید خانہ ہے

رات دن مجھ کو کھا رہا ہے غم
بات سنتی نہیں میری بیگم

فریدانجم اپنے موضوعات آس پاس کی دنیا سے اخذ کرتے ہیں اور جب ان کے اطراف کوئی برائی یا اخلاقی گراوٹ نظر آتی ہے تو ان کی رگِ ظرافت پھڑک جاتی ہے اور مزاح میں ڈوبا ان کا قلم طنز کے تیر داغنے لگتا ہے۔ ہمارے موجودہ سماج میں مغرب پرستی اتنی بڑھ گئی ہے کہ فیشن کے نام پر اقدار اور اخلاق پامال ہو رہے ہیں۔ ایسی ہی فیشن پرست لڑکیوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

وہ جو تیری زلفیں تھیں تا کمر
پڑیں ان پہ کس کی بری نظر

ہوئیں جھڑکے اتنی وہ مختصر
تو مزید ان کو کٹا نکو

وہ مزید کہتے ہیں کہ گھر کے بزرگ ان اخلاقی برائیوں کو روکنے کے بجائے خاموشی اختیار کرتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے چھوٹوں کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ دوسری طرف ہمارے نوجوان فیشن کے نام پر عورتوں کی شباہت اختیار کررہے ہیں۔فرید انجم بڑے ظریفانہ انداز میں اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی نظم ''آخ تھو'' میں کہتے ہیں:

ڈُب کو دادی جان ہیں برقعہ میں سر سے پاؤں تک
پن جوان پوتی کو بے پردہ پھرا رئیں آخ تھو
خوب روشن نام کررئیں باپ دادا کا میاں
چھوریوں کے ناد کیا زُلفاں بڑھا رئیں آخ تھو

''آخ تھو'' دکنی لفظ ہے جس میں شدید حقارت کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔فرید انجم نے اس ردیف کو نظم کا حصہ بناتے ہوئے موجودہ معاشرے پر اپنی شدید حقارت کا اظہار کیا ہے۔اس نظم میں آخ تھو ایسی ردیف ہے جس میں طنز کا تیر مزید تیز نظر آتا ہے۔ردیف کی ردیف اور طنز کا طنز اس نظم میں فرید انجم کا فن اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

فرید انجم نے نہ صرف اپنی شخصیت کو طنز کا نشانہ بنایا بلکہ ایسے شعراء کو بھی نہیں بخشا جو خود اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں۔ جو اپنی خامیوں سے انجان اور فن شاعری سے غافل ہیں لیکن دوسروں پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔ وہ فن کو فروغ دینے کے بجائے گروپ بندیوں کو فروغ دیتے ہیں ایسے شعراء پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شاعر بٹا ہوا ہے گروپوں میں جابجا
علم و ہنر میں خود کو سمجھتا ہے وہ سوا

کرتا ہے دوسروں پہ بھی تنقید خوا مخوا
خود اپنا شعر پڑھ کے کرے خود ہی واہ وا

فن کی نزاکتوں سے ہے انجان ہائے ہائے
آپس میں خود ہے دست و گریباں ہائے ہائے

فرید انجم دکنی شاعر نہیں لیکن انہوں نے دکنی میں بھی طبع آزمائی کی، ان کا لب ولہجہ حمایت اللہ کی طرح خالص دکنی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی تخلیقات میں سلیس اردو کے ساتھ ساتھ دکنی الفاظ کا بھی عمدہ استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے منفرد اور مخصوص دکنی لب و لہجے کی ہی وجہ سے طنز و مزاح میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں چند اشعار درج کئے جارہے ہیں جن میں دکنی الفاظ کا بہترین استعمال کیا گیا جسے پڑھنے کے بعد قاری خود بخود ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جو خطرناک باس ہے باشا
وہ بھی جورو کا داس ہے باشا

نو کے نو گھر میں پیدا ہوئے
پُٹیاں پُٹیاں پُٹیاں

کئیکو کر تا رے دوسری شادی
نکو عبدالوہاب اچھا نئیں

تمہاری ڈِش میں مرغ مسلم
مرے چپّے میں ترکاری نکو نا

پوٹے جُھک کو بُڈّے ہورئیں
دومن کا ہے بستہ بابو

لُنگی پھٹ کو چِندیاں ہوگئی
پین کو پھر روّں لہنگا بابو

گیس تُمی خود کر کو مہنگی
کئیکو دے رئیں چولا بابو

اما باوا دونوں کالے
پوٹا نکلا گورا کیسا

شیر کے جیسی مُچھیاں رکھ کو
جورو سے پھر ڈرنا کیسا

کھیر کُتّے کو نئیں پچتی
تم بھی پی رئیں پچنا کیسا

جوڑی اب یہ جمنا کیسا
اُن موٹی میں دبلا کیسا

جب بھی پی لے کو گھر کو آتے ہیں
الڈا الڈا کو گیتاں گاتے ہیں

جو بھی آتا ہے سامنے ان کے
اس کا باجا اُنوں بجاتے ہیں

کِتا اونچا مقام ہے اُن کا
سارے تھانوں میں نام ہے اُن کا

عید جاکو عید پھر سے آ گئی
اب کے کیسا بھی نہانا سوچ روَں

کیا بگاڑ لیتی مرا ان دیکھتوں
آج کھانا نہیں پکانا سوچ روں

بڑھ گیا ہے کام بیگم آپ کا
آپ کو سوکن دلانا سوچ روں

بس میں چڑ پیچ میرے پیچھے پڑ گیا ماٹی ملا
ہلو ہلو چمٹیاں لینے لگا ماٹی ملا

ایک جھانپڑ منہ پہ دیونگی بول کے پلٹی مگر
ہاتھ میرا رک گیا، اسماٹ تھا ماٹی ملا

فرید انجم کی شاعری میں انگریزی اور ہندی الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ فرید انجم کی خوبی یہ ہیکہ وہ انگریزی لفظوں کا استعمال بہت عمدگی سے کرتے ہیں۔ اور یہی بات ان کے کلام کی خوبی بن جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

چاول کھارئیں موٹا بابو
راشن کاڈ ہے عنقا بابو
ڈی اے ان کا بند کر ڈالے
پینشنرس کررئیں ہا ہا بابو

فرید انجم نے اپنی نظم ''ڈاکٹر'' میں بھی انگریزی الفاظ کا اچھی طرح استعمال کیا ہے اس نظم میں انہوں نے چند دکنی الفاظ کے مترادفات کے ذریعہ مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ویل تو پھر پہلے نام لکھواؤ
بعد میں حال پورا بتلاؤ
واٹ بکواس کررہے ہو تم
ٹائم کا لاس کررہے ہو تم

سالی نہ چاہیئے مجھے سالا نہ چاہیئے
اِنکم خسر کی لاکھوں میں سالا نہ چاہیئے
بڑا ہی شوخ ستم گر ہے کیا کیا جائے
بس اس کا باپ لوفر ہے کیا کیا جائے

ندی نالے سُک کو جارئیں آنکھ اُن کی نم نئیں
گھر کے لوگاں پیاسے مرریئں اس کا کچھ بھی غم نئیں

ہاں! پڑوسیوں کو نئی گنگا میں نہلانے کتے
شیخ چلی جاکے دلی راج فرماتے کہتے

فرید انجم کے مجموعہ کلام ''چغلیات'' میں ایک ''ہندی گیت'' بھی موجود ہے۔

بیت گیا یہ سال
سکھی ری......
بیتا یہ بھی سال
سونا سونا من کا آنگن
نیند نگوڑی بن گئی بیرن
مجھ سے بڑھ کر کون ابھاگن
پاس نہیں ہے میرے ساجن
کس کو سناؤں حال......
سکھی ری......

شاعری میں محاورات کا استعمال زمانہ قدیم سے ہی ہوتا رہا ہے۔محاورہ کے استعمال سے شعر کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔محاورہ کے لغوی معنی ہیں ''گفتگو کرنا یا ہم کلام ہونا''۔لیکن اہل زبان کی اصطلاح میں دو یا دو سے زائد الفاظ کے اس مجموعہ کو محاورہ کہتے ہیں جو کسی مصدر سے مل کر بنا ہو اور وہ اپنے لغوی یا حقیقی معنی کے بجائے کسی دوسرے مجازی، غیر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہو۔

فرید انجم کے کلام میں بھی دکنی محاورے روزمرہ اور ضرب الامثال کا استعمال ملتا ہے۔انہوں نے دکنی محاوروں کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنے اشعار میں باندھا ہے۔

محاورہ

بیوی ایسی قسمت سے پائی ہے
پوری اللہ میاں کی گائی ہے　　(اللہ میاں کی گائے)

کونسے ڈگریاں پو نوکری مل ری
ہنڈی دو وقت کس کے گھر جل ری　　(دووقت کی ہانڈی یا دووقت کی روٹی)

کون تو بھی تین پانچ کرتا کیا
سب کے نلڈے دبا کو رکھو میں　　(تین پانچ کرنا)

جب بھی دوچار دم لگاتا ہے
ناچ تگنی کا پھر نچاتا ہے　　(تگنی کا ناچ نچانا)

پنکی بُڈّی سے بہوت ڈرتا ہے
اس کی چوکھٹ پو سجدے کرنا ہے　　(چوکھٹ پر سجدہ کرنا)

کیا مصیبت میں ڈال ری اماں
جان آفت میں ڈال ری اماں　　(جاں مصیبت میں ڈالنا)

خواہش وصل، آرزوئے ملن
سب کو ''چولہے میں ڈال'' سردی میں　　(چولہے میں ڈالنا)

انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں
کیا رکھا تھا میاں پڑھائی میں　　(انگلیاں گھی میں سر کڑھائی میں)

فرید انجم کو زبان پر بھرپور قدرت حاصل تھی اور زبان کی نزاکتوں کا بھی انہیں بخوبی احساس تھا۔ ان کی شاعری میں محاوروں کے برجستہ استعمال پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

> ''دکنی زبان، اس کے لب ولہجہ اور اس کے مخصوص محاوروں پر انہیں گہری قدرت ہے۔ طنز و مزاح کے میدان میں زبان کے تخلیقی استعمال کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور فرید انجم زبان کی نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں''۔(4)

فرید انجم کا شمار دکنی طنز ومزاح کے مقبول عام شعرا میں ہوتا ہے۔ فرید انجم نے سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری کے علاوہ ڈرامے اور مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کی بذلہ سنجی اور حسِ مزاح نے انہیں مزاحیہ شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ وہ جب کسی مشاعرہ میں اپنا کلام سناتے تو اپنے منفرد لب ولہجہ اور انوکھے انداز بیان سے سامعین پر سحر طاری کردیتے۔ لوگ بار بار ان سے کلام کی فرمائش کرتے۔

فرید انجم حیدرآباد کے طنز ومزاحیہ شعرا میں ایک انفرادیت رکھتے ہیں اُن کی چال ڈھال حُلیے اور انداز تخاطب کو سامعین بہت پسند کیا کرتے تھے۔ اور ان کے لئے ہی فرید انجم نے معاشرے کے سلگتے ہوئے مسائل پر قلم اُٹھایا ہے۔ جہیز، رشوت خوری، مفلسی کے علاوہ سیاست اور سماج میں پائی جانے والی ناہمواریوں پر بھی طنز کے تیر چلائے ہیں۔ مجتبیٰ حسین ان کے کلام کے موضوعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''حیدرآباد میں طنز ومزاح کی روایت بہت پرانی ہے۔ اور فرید انجم اس روایت کے توانا شاعر ہیں۔ جہاں وہ گھریلو مسائل پر لطیف انداز میں طنز کرتے ہوئے اپنا مذاق آپ اُڑانے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ سماجی، سیاسی موضوعات پر بھی گہری چوٹ کرتے ہیں۔ موضوعات کو برتنے کا سلیقہ وہ خوب جانتے ہیں اور اعتدال کی روشنی سے کبھی دور نہیں جاتے، ان کا گہرا سماجی تصور اُنہیں ہمیشہ چاق و چوبند اور چوکس رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے طنز میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے''۔(5)

اردو کے نامور دانشور اور ان کے ہم عصر شعراء زبان و بیان پر ان کی قدرت کے قائل ہیں۔ رؤف رحیم ان کی سلیس دکنی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''ان کے پاس دکنی اور سلیس زبان میں چند نظمیں تھیں جن کو سن کر مرحوم سلیمان خطیبؔ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ہنساتے ہنساتے سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں''۔(6)

فرید انجم جسمانی طور پر دبلے پتلے انسان تھے لیکن مجتبیٰ حسین نے انہیں پہلوان سخن قرار دیا ہے۔ انہیں اپنے فن پر اس قدر قدرت حاصل تھی کہ وہ سنجیدہ مسائل کو مزاح کے پیرائے میں بڑی آسانی کے ساتھ بیان کر دیتے تھے۔ ان کے کلام میں زبان کی محبت ان کی طرز فکر کا بے لاگ اظہار نظر آتا ہے۔

---000---

حوالہ جات

(1) رؤف رحیم ''یادرفتگان' فرید انجم'' مطبوعہ روزنامہ ''منصف'' 24 اگست 2006ء صفحہ 3

(2) فرید انجم ''مشکل ہے عرض حال'' دیباچہ ''چغلیات'' صفحہ 9، 2004ء

(3) فرید انجم ''چغلیات'' صفحہ 16

(4) مجتبیٰ حسین ''فرید انجم مختصر تعارف'' مشمولہ ''چغلیات'' صفحہ 6-5

(5) مجتبیٰ حسین ''فرید انجم مختصر تعارف'' مشمولہ ''چغلیات'' صفحہ 2

(6) رؤف رحیم ''یادرفتگان' فرید انجم'' مطبوعہ روزنامہ منصف، 24 اگست 2006ء صفحہ 3

سید محمد علی خوندمیری بیخودؔ

سید محمد علی خوندمیری بیخودؔ کے والد کا نام سید عبدالکریم ہے۔ وہ 16 جون 1949 کو حیدرآباد کے قدیم محلّہ پنچلگوڑہ میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی اسکول سکندرآباد سے میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ وہ فائن آرٹس اکیڈیمی سے عرصہ دراز سے وابستہ ہیں اور ڈراموں میں حصہ لیتے ہیں۔ سید محمد علی خوندمیری بیخودؔ کے علاوہ ان کے دو اور بھائی طالب خوندمیری اور اشرف خوندمیری نے اردو ادب میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ڈاکٹر سید بشیر احمد لکھتے ہیں۔

> ''کسی خاندان کے دو افراد کے تعلق سے سننے میں آیا ہے کہ وہ کسی مخصوص شعبہ حیات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ لیکن ایک ہی خاندان کے تین افراد کسی مخصوص شعبہ حیات میں نمایاں کام انجام دیئے ہوں، یہ دوسری مثال ہے۔ حیدرآباد کے تین بھائی ابراہیم جلیسؔ، محبوب حسین جگرؔ، اور مجتبیٰ حسین نے اردو ادب میں اپنی ادبی کاوشوں پر خوب نام کمایا۔ دوسری مثال اشرف خوندمیری، طالب خوندمیری اور سید محمد علی خوندمیری کی ہے، یہ تینوں نے اردو شاعری میں طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ڈنکے بجادیئے۔''(1)

کہتے ہیں کہ بیخودؔ ابتداء میں مشاعروں میں ہوٹنگ کیا کرتے تھے پھر شاعری کا ذوق ان میں پیدا ہوا اور انہوں نے شعر گوئی شروع کردی۔ وہ اپنے بڑے بھائی طالب خوندمیری سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے ہیں۔ انہوں نے غزل، نظم، قطعات اور پیروڈی سمیت تقریباً ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی کی ایک مشہور زمانہ رباعی کی انہوں نے پیروڈی لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ جوشؔ کی رباعی یہ ہے۔

غنچہ تری زندگی پہ دل ہلتا ہے	بس ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے

غنچے نے کہا ہنس کر کہ اے بابا　　یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

اس رباعی پر انھوں نے پیروڈی لکھی۔ ملاحظہ ہو۔

کلچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے　　بس ایک نوالے کے لئے ملتا ہے
کلچے نے کہا اپنے وطن میں بابا　　یہ ایک نوالہ بھی کسے ملتا ہے

دکنی زبان کو بیسویں صدی میں استحکام بخشنے میں مزاحیہ شعرا نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے جس سے مزاحیہ شعراء کے دکنی زبان کی ترویج میں حصہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مہمان بن کو آئے تھے اب گھر کھنگال رئیں　　ٹوکا ذرا ان کو تو دیدے نکال رئیں
اب میرے پورے گھر کے بھی مالک انوچ کتے　　کیا جی انوں تو پیٹ سے پاوا ں نکال رئیں

اپنے پیش رو مزاحیہ شاعروں کو یاد کر کے وہ کہتے ہیں

پہلے ڈنڈا' پھر علی صائب' خطیب' اشرف' ظریف
کیسے کیسے شاعراں گئے' اپنا وطن چھوڑ کے

رباعی اور قطعہ سے ہٹ کر انہوں نے صنف غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ عاشق اور رقیب غزل میں ہمیشہ دست بہ گریباں نظر آتے ہیں۔ غالب رقیبوں کے گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوے اور بیخودؔ کو ان کی محبوبہ نے رقیبوں کے لئے دستر بچھانے پر مجبور کیا۔

رات کھانے پو رقیباں کو بلائیں　　آ کو میں دستر بچھانا بول رئیں

اردو شاعری میں پردے کے تعلق سے بیشتر شعراء نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ کسی نے کہا کیا خوب پردہ ہے' چلمن سے لگے بیٹھے ہیں۔ اکبرالہ آبادی نے بے پردگی پر کہا کہ بے پردہ خواتین کو دیکھ کر وہ غیرت قومی سے زمین میں گڑھ گئے۔ بیخودؔ کہتے ہیں۔

اُن کا جلوہ دیکھنا کر کو میں ترسا تو اُنوں
آ کو بیٹھئیں سامنے' پن موٹی چلمن چھوڑ کو

خاندانی نزاعات کے تعلق سے ان کی فکر ملاحظہ فرمائیے۔

دوچ بھائیاں ہیں مل کو رہ سکتیں　　　　بیچ آنگن میں دوار کئیکو رے

ہمیشہ ورثہ میں بٹوارے کے جھگڑے چلتے رہتے ہیں۔ بٹوارے کے تعلق سے بیخود کی پسند ملاحظہ فرمائیے۔

گھر کے بٹوارے میں منجے' کچھ بھی دلچسپی اچ نئیں
کچھ بھی کرلیو' کیا بھی کرلیو' میرا آنگن چھوڑکو

''آنگن'' دکنی تہذیب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بغیر آنگن کا گھر کبھی گھر نہیں سمجھا جاتا۔ بیخود آنگن مانگتے ہوئے اپنے ورثہ میں ساری تہذیب کا تقاضہ کیا ہے۔ کیا خوب کیا ہے۔

محبوب کی دل دکھانے والی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

اُن کا گھر ہے محفل جاناں کتے
میرے گھر کو چنڈو خانہ بول رئیں

محبوب کا سراپا بیان کرتے ہوئے آنکھوں کی تعریف میں مختلف شعراء نے اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں۔

زلفیں گھٹاؤں کی طرح' آنکھیں ستاروں کی طرح
چلنا ہواؤں کی طرح' رنگت شراروں کی طرح

خمار بارہ بنکوی کہتے ہیں۔

ہائے ری وہ مد بھری آنکھیں خمار
میکدے ویران نظر آتے ہیں

ولی دکنی کہتا ہے:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا
جادو ہے تیرے نین غزالاں سے کہوں گا

بیخود اپنے محبوب کی آنکھوں کے تعلق سے کہتے ہیں۔

اُن کی انکھیاچ اک قیامت ہے
اس پو کاجل کی دھار کئیکو رے

سید محمد علی خوندمیری بیخودؔ کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا اور ان شعری سفر جاری ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!

----OOO----

حوالہ جات

(1) ڈاکٹر سید بشیر احمد ''سید محمد علی خوندمیری بیخودؔ'' مضمون مشمولہ: مزاح نگاران حیدرآباد ص 77

رؤف رحیم

پورا نام محمد رؤف رحیم الدین قلمی نام رؤف رحیمؔ 10 جون 1954ء کو دبستان صفی کے مشہور شاعر شمس الدین تاباںؔ کے گھر پیدا ہوئے۔ متوسط گھرانے سے تعلق ہونے کے باعث ابتدائی تعلیم تحتانیہ اسکول شکر گنج، اور وسطانوی تعلیم مغلپورہ اسکول ملٹی پر پزسٹی کالج سے حاصل کی۔ گریجویشن انوار العلوم کالج اور پوسٹ گریجویشن یعنی ایم اے عثمانیہ یونیورسٹی سے اکسٹرنل کامیاب کیا۔

انہوں نے 1976ء سے 1980ء تک روزنامہ ''سیاست'' میں سرکولیشن منیجر اور سب ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور 1980ء سے محکمہ بلدیہ سے منسلک ہو گئے۔ اور 2008ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

رؤف رحیم کئی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ ''ادبستان دکن'' بہ یادگار حضرت صفی اورنگ آبادی اور ''بزم تاباں'' کے معتمد رہے نیز ''زندہ دلان حیدرآباد'' کے شریک معتمد۔ سرورڈنڈا میموریل سوسائٹی کے کنویز بھی رہے۔

رؤف رحیم نے شہر حیدرآباد کے علاوہ کئی اضلاع اور بیرونی ممالک کے مشاعروں میں اپنا کلام سنا کر داد تحسین حاصل کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی مشاعروں میں نظامت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ دلچسپ فقروں اور فی البدیہہ اشعار سے سامعین کی دلچسپی کو برقرار رکھتے۔ سید مختار عالم قادری رؤف رحیم کی شخصیت کے اس پہلو کی طرف توجہ دلاتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> ''نظامت میں فی البدیہہ اشعار ااستعمال کیا کرتے جس سے ان کی زودگوئی سامنے آتی ہے۔''(1)

رؤف رحیم ایک ہمدرد انسان تھے اور انکساری ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ وہ بزرگ شعراء کا بے احترام کرتے اور ساتھی شعراء کے ساتھ انکساری سے پیش آتے۔ ان کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر قیسی قمر نگری لکھتے ہیں۔

''شاعری میں جتنا طنز ومزاح ان کے پاس ہے۔ شخصیت میں اتنی ہی سنجیدگی اور بردباری ہے۔ بڑوں کا ادب چھوٹوں پر شفقت ان کی ہردل عزیزی کا ثبوت ہے۔ کبھی اپنے آپ کو بڑا شاعر نہیں سمجھتے خود 19 اور دوسروں کو 20 کہنے سے ان کے چاہنے والوں میں اضافہ لازمی ہے۔ حق گوئی میں کبھی اپنے قلم سے سمجھوتہ نہیں کرتے ان کی تحریر غیر جانبدار ہوتی تھی۔''(2)

شاعری کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا۔ ان کی پرورش ادبی ماحول میں ہوئی جس کی وجہ سے کم میں ہی شعر کہنے لگے۔ انہوں نے شاعری کی ابتداء 1976 سے کی۔ 15 اگست 1976ء کو روزنامہ ''سیاست'' کے شیشہ و تیشہ کالم میں پہلی پیروڈی شائع ہوئی جو ایک فلمی گیت ''کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے'' کی تھی۔ پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ پیروڈیز کی مقبولیت نے انہیں بھی مقبول کردیا۔ ان ہی دنوں ان کا افسانہ ''تربت کے پھول'' بے جوڑ شادیوں کے موضوع پر شائع ہوا۔

ان کا کلام سنجیدہ، مزاحیہ او رنعتیہ شاعری پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نثری نگارشات سنجیدہ مضامین، ڈرامے، افسانے اور تنقید و تبصروں پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی منعقدہ مشاعروں میں اپنا کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔

معروف مزاح نگار نریندر لوتھر (آئی اے ایس) رؤف رحیم کی شاعری کے تعلق سے رقمطراز ہیں۔

''ایک سامع کی حیثیت سے میں نے رؤف رحیم کے کلام کو غیرارادی طور پر سراہا ہے۔ میں ایک تخلیقی ادیب ہوں اس لئے تنقیدی رائے زنی میری بساط سے باہر ہے۔ کیا اتنا کہنا کافی نہیں کہ رؤف رحیم مجھے بے حد پسند ہے؟ افسوس کی بات ہے کہ اپنی پسند کی وجہ جواز بھی دینی پڑتی ہے، محض ذاتی ساکھ سے کام نہیں چلتا۔ اگر استغاثہ اصرار کرتا ہے تو میرا جواب ہوگا کہ رؤف رحیم میں وہ سب کچھ ہے جو میں طنز ومزاح کی شاعر میں دیکھنا یا سننا چاہتا ہوں۔ تفصیلات اور تکنیکی وجوہات اور لفاظی کیلئے نزدیکی ناقد سے ربط

پیدا کیجئے۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق نہ کرتا ہوتو اسے میرے پاس بھیج دیجئے ممکن ہے اس کی ادھوری تعلیم کچھ حد تک پوری ہو جائے لیکن ٹھہریئے چند وجوہات تو میں آپ کو بھی بتا سکتا ہوں' سنئے!

رؤف رحیم ایک ہمہ گیر ادیب ہیں' نثر اور نظم دونوں صنفوں میں دخل اندازی کے جرم کے مرتکب ہیں یہ بھی شکر کی بات ہے کہ مزاح پیدا کرنے کے لئے انہوں نے مزاحیہ تخلص اور دکنی کے صوتی انوکھے پن اور اجنبیت کی بیساکھیوں کا سہارا نہیں لیا۔حیدرآباد کے کئی ہونہار شاعر اس تحریص کا شکار ہو جاتے ہیں نتیجتاً ان کا امکانی فن پنپنے نہیں پاتا۔ ایسے شاعروں کے ہاں مزاح صرف ان کے تخلص یا مطلع سے ہی پیدا ہوتا ہے اور وہیں ختم ہو جاتا ہے۔

ان کے موضوعات میں بھی تنوع ہے۔لیڈر سے لے کر بیگم تک سب ان کی زد میں آگئے ہیں ان کے مسئلوں کا ذکر بھی ہے۔ اس انداز سے کہ وہ آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ بلکہ اچھے لگنے لگتے ہیں لیکن ان کا مزاح سنجیدہ ہے' پھکڑ پن سے بچا ہوا ہے اور کبھی بھی ایک مخصوص سطح سے نیچے نہیں جاتا۔ اپروچ میں شائستگی ہے اور اظہار میں بلاغت اور پختگی ہے۔ اوریجنل شاعری کے علاوہ پیروڈی میں بھی طبع آزمائی کی ہے' اس صنف میں کامیابی کے لئے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے اور پیروڈی کو کس رخ کی طرف وسعت دی جائے' اس کا عرفان بھی ضروری ہے۔ ان کے اس صنف میں تجربے کامیاب ہیں۔'' (3)

رؤف رحیم کی اب تک سات تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں۔

1۔ بساطِ دل　(سنجیدہ شاعری)　1987ء

2۔ خدا خیر کرے　(مزاحیہ شاعری)　1992ء

3۔نشاطِ الم (سنجیدہ شاعری) 1996ء

4۔نوک جھونک (مزاحیہ شاعری) 1998ء

5۔فصل نور (نعتیہ شاعری) 2000ء

6۔تبسم برطرف (مزاحیہ شاعری) 2003ء

7۔ترکش (مزاحیہ مضامین) 2005ء

اس کے علاوہ معروف ادباء و شعرا کے سوانحی خاکوں پر مشتمل مجموعہ ''دل کے رشتے'' اور ایک افسانوں اور ڈراموں کا مجموعہ ''بے نام'' ناسازی صحت کی وجہ سے ادھورہ رہ گیا۔

رؤف رحیم اپنے موضوعات اپنے آس پاس ہی تلاش کرتے ہیں۔جدید فیشن کے نام پر مغرب پرستی بڑھتی جارہی ہے۔آج کل کے فیشن زدہ لڑکے اورلڑکیاں فیشن میں اتنی ڈوب گئی ہیں کہ جنس کا پتہ نہیں چلتا اس تعلق سے حیدرآباد کے مشہور شاعر حلمی آفندی نے کہا تھا۔

شکل دیکھو ہمارے لڑکوں کی
یہ زنانی ہے نہ مردانی

اسی مضمون کو رؤف رحیم نے اس طرح باندھا ہے

میں نے لڑکی جان کر چھیڑا اُسے
اس کے فیشن پر مجھے دھوکا ہوا

فیشن کے نام پر بے راہ روی عام ہوتی جارہی ہے۔نوجوان تو نوجوان ہیں عمر رسیدہ لوگ بھی میک اپ سے جوان نظر آنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔اسی مضمون کو بڑی عمدگی سے رؤف رحیم نے باندھا ہے۔

ہے خواہش میک اپ سے مثال حور ہوجانا
مگر ممکن کہا کشمش کا پھر سے انگور ہوجانا

رؤف رحیم عصر حاضر کے مسائل پر بے لاگ اظہار کرتے ہیں۔ وہ شاعری میں ابتذال اور پھکڑ پن سے گریز کرتے ہیں۔ معیار کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ اپنے رعایت لفظی کے سہارے اپنے اشعار کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

بیماری آج مجھ کو جو شعر و شکر کی ہے
میں جانتا ہوں یہ بھی وراثت پدر کی ہے

ان کے پاس موضوعات کا دائرہ وسیع ہے بات میں بات پیدا کرنے کا فن جانتے ہیں۔ انہوں نے رعایت لفظی کا بھی خاص خیال رکھا۔ چند اشعار قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

پر کٹی معشوق لیکن شعر لمبی زلف پر
اس لئے کہتے ہیں جھوٹی شاعری اچھی نہیں

مہمانو! تم اگر اتنا بتاؤ گے مجھے
وہ پتہ دوں گا کہ تم گھر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

حقیقت کیا کروڑوں کی کسی لیڈر کی پاکٹ میں
بھلا اک اونٹ کے جبڑے میں زیرہ کون دیکھے گا

کس لئے واؤ بن گئی ہیں کمر
ان کی جانب سے کچھ دباؤ ہے کیا؟

ہے دل میں زہر تو آنکھوں میں ہم کھٹکتے ہیں
مگر زباں پہ تو اقبال کا ترانہ ہے

زباں کے شعر ہیں اس میں نہ شعر پائے کے
ہماری شاعری بس مرغ کی نہاری ہے

رؤف رحیم کے فن میں شعری محاسن کی پوری پوری پاسداری نظر آتی ہے۔انھوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کو عوامی مسائل کو پیش کرنے کا ذریعہ بنایا۔رؤف رحیم کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر قیسی قمرنگری لکھتے ہیں۔

''رؤف رحیم کی شاعری عصر حاضر کے تقاضوں کی عکاسی تھی۔وہ قلمی کاوشوں میں کامیابی کی معراج کو چھو جاتے اگر سنجیدگی اور مزاح دونوں کو ایک ساتھ لے کر نہ چلتے۔مرحوم کی سنجیدہ شاعری ان کی سنجیدہ فکر کی آئینہ دار تھی اور مزاحیہ شاعری دوست اور احباب کے ساتھ منسلک رہنے کا ایک خوبصورت ذریعہ تھی۔......انہوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کو خودغرضی کے حصار میں باندھ کر رکھنے کے بجائے عوام و خواص تک رسائی کے لئے کئی ایک راستوں کے ذریعہ محاسن شعر و سخن کو تابندہ رکھنے کی کی روایت کو برقرار رکھا ورنہ فی زمانہ شعری محاسنوں کے فقدان سے تقابل کی جرات نہیں کی جاسکتی۔اس طرح رؤف رحیم کی شخصیت صرف ایک ''شاعر'' کی بجائے اردو زبان و ادب کے ایک مستقل خادم کے زمرہ میں آ گئی۔''(4)

حالانکہ ان کی ابتدائی شاعری میں سطحی مضامین نظر آتے ہیں اس کے باوجود مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے انھوں نے معیار کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔پھکڑ پن اور ابتذال سے کوسوں دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ابتدائی دور کا ایک شعر دیکھئے جو انھوں نے مدن پلی ضلع چتور کے ایک مشاعرے میں پڑھا تھا اور اس کا ذکر قیسی قمرنگری نے بھی کیا ہے۔شعر ہے:

جب تک سری دیوی کا نظارہ نہیں ہوتا
سو ڈگری سے نیچے مرا پارہ نہیں ہوتا

محمد حسین بن نقیب رقمطراز ہیں۔

''رؤف رحیم کی نس نس میں شاعری بسی تھی۔طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے وہ گرو گھنٹال تھے۔کلام میں یہ خوبی تھی کہ طنز و مزاح کے باوجود کہیں پھکڑ پن

اور گراوٹ نہیں ہوتی تھی۔ سنجیدگی کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتا تھا۔
زبان کی شعریت اور ادبیت کو دھکا پہنچنے نہیں پاتا تھا۔'' (5)

شاعر اپنے عہد کا نقیب ہوتا ہے وہ روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور انہیں فکری سانچوں میں ڈھال کر شعری شکل میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے۔ اکبرالہ آبادی نے معاشرہ کی برائیوں کو دور کرنے کے لئے شعر کے تیر ونشتر کو لطافت کی شکل میں بیان کیا تا کہ احساسِ تلخی نمایاں نہ ہو۔ جس کے بعد اس سلسلے کو دیگر شعرا نے بھی جاری رکھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ شعر وشاعری زندہ دلانِ حیدرآباد کے شاعر کے نام سے موسوم ہوا اور مزاح نگار شعرا کا قافلہ اس شاہراہ پر رواں دواں ہوا' رؤف رحیم کا تعلق بھی اسی قافلے سے ہے۔ بیشتر مزاحیہ شعرا نے اپنی شاعری میں دکنی اور دہقانی زبان کا استعمال کیا ہے۔ تا کہ شاعری میں مزاحیہ پہلو زیادہ نمایاں ہو' لیکن رؤف رحیم نے اپنے لئے جس راستے کا انتخاب کیا وہ صرف کلام میں ظرافت کا عنصر ہے اور دہقانی زبان کے استعمال سے وہ گریز کرتے ہیں۔ ذیل میں رؤف رحیم کی دو مزاحیہ غزلیں درج کی جاتی ہیں۔

محنت سے اپنی ہم کو کمانا تو ہے نہیں ... لینا ہے قرض کیونکہ چکانا تو ہے نہیں
دینی ہے جتنی گالیاں اشعار میں تو دے ... محفل میں تیری تیرا زنانہ تو ہے نہیں
ڈر کس لئے ہو چوری کا شاعر ہوں دوستو! ... شعروں سے ہٹ کے کوئی خزانہ تو ہے نہیں
ترپٹ کے ساتھ آنکھ لڑاؤں گا کس لئے ... اتنا خراب میرا نشانہ تو ہے نہیں
کس واسطے ریاض کریں دھن بنائیں ہم ... اپنی غزل کے شعر ہیں گانا تو ہے نہیں
داماد بن گیا ہے تو سن گالیاں مدام ... اب اس سے ہٹ کے کوئی ٹھکانہ تو ہے نہیں
شادی کرے گا وہ بھی کسی سرپھری کے ساتھ ... اپنا رحیم اتنا دیوانہ تو ہے نہیں

پہلی سی بات آج کی سرکار میں نہیں ... سر ٹھوکروں میں آ گئے دستار میں نہیں
چیلہ گرو کو آنکھیں دکھاتا ہے آج کل ... اصلاح شعر میں ہوئی کردار میں نہیں
محفل کو لوٹتا ہوں ترنم کے زور پر ... میرے گلے میں جان ہے اشعار میں نہیں

فرشی سلام کرنے کی عادت نہیں مجھے　　کٹیا میں جی رہا ہوں میں دربار میں نہیں
لیڈر نہیں ہیں قوم کے شاعر ہیں دوستو　　پیدل ہی پھر رہے ہیں میاں کار میں نہیں
پیچھے سے وار کرتے ہیں ہم پر وہ اے رحیمؔ　　یہ وصف دوستوں میں ہے اغیار میں نہیں

راقم الحروف اپنے مقالے کے مبیضہ کی تیاری میں تھا کہ 4 دسمبر 2009 میں رؤف رحیمؔ نے طویل علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔

حوالہ جات

(1) سید مختار عالم قادری　''رؤف رحیم ہمہ پہلو ادبی شخصیت''　مطبوعہ: روزنامہ ''سیاست'' مورخہ 19 ڈسمبر 2009ء

(2) ڈاکٹر قیسیؔ قمر نگری　رؤف رحیم...... کچھ یادیں''　مطبوعہ: روزنامہ ''اعتماد'' مورخہ 4 جنوری 2010ء

(3) نریندر لوتھر　رؤف رحیم　مضمون مشمولہ: ''تبسم برطرف''　ص 5　سنہ 2003ء

(4) ڈاکٹر قیسیؔ قمر نگری　رؤف رحیم...... کچھ یادیں''　مطبوعہ: روزنامہ ''اعتماد'' مورخہ 4 جنوری 2010ء

(5) محمد بن حسین نقیبؔ　''رؤف رحیم کی یاد میں''　مطبوعہ: روزنامہ ''منصف'' مورخہ 28 جنوری 2010ء

دکن کی سرزمین زمانہ قدیم سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہی ہے۔اس مردم خیز سرزمین نے بے شمار اہل قلم پیدا کئے جنھوں نے اردو زبان وادب کے لئے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔مختلف اصناف سخن کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صنفِ قوی کو صنفِ نازک پر برتری حاصل ہے۔لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اردو ادب کو اپنے ادبی شاہکاروں سے مزین کرنے میں خواتین نے بھی مرد قلم کاروں کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش کی ہے۔اور جہاں تک طنز وظرافت کا تعلق ہے' طنز ومزاح کے فروغ میں خواتین نے بھی نمایاں خدمات انجام دیں ہیں۔

حیدرآباد میں ظرافت کی جڑیں کافی قدیم ہیں۔آزادی سے قبل بہت کم خواتین نے طنز ومزاح کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ان ہی میں ایک اہم نام ہے آصف جہاں بیگم بلگرامی۔آصف جہاں بیگم مرزا فرحت اللہ بیگ کی بھانجی تھیں۔بارہ مزاحیہ مضامین پر مشتمل ان کا مجموعہ ''گل خنداں'' 1941ء میں منصۂ شہود پر آیا۔گناہ دروغ برگردنِ......؟' غائب دماغ' دوست' شاپنگ' میرا کمرہ' جلترنگ اس مجموعے کے بہترین مضامین ہیں۔

جہاں بانو نقوی کی پیدائش 1909ء میں حیدرآباد کے ایک معزز تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم نامپلی گرلز ہائی اسکول' سے حاصل کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ سے بی اے کی تکمیل کی اور جامعہ عثمانیہ سے ہی ایم اے کی سند حاصل کی۔مختلف تعلیمی اداروں میں ملازمت کے بعد ویمنس کالج میں بحیثیت لکچرر خدمات انجام دیں۔1957ء

میں وظیفے پر سبکدوش ہوئیں۔

جہاں بانو نقوی کا شمار ہندوستان کی صاحب طرز نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد نئی نسل کی ذہنی تربیت میں خصوصیت سے دلچسپی لی۔انھوں نے نظم نگاری کے علاوہ نثر کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی۔ادبی، اخلاقی، سماجی اور اصلاحی مضامین کے علاوہ طنز ومزاح پر بھی قلم اٹھایا ہے۔افسانوں کا مجموعہ ''رفتار خیال'' شائع ہوا جس میں سترہ افسانے شامل ہیں۔خطوط نگاری میں بھی انہوں نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ رفتار خیال کے علاوہ ان کی تصانیف میں ''بربط ناہید'' ''محمد حسین آزاد'' اور ''فِتر اک'' قابل ذکر ہیں۔''فِتر اک'' میں مزاحیہ مضامین اور اِنشائیے شامل ہے۔ان تخلیقات کے مطالعہ سے ان کی زبان کی شستگی، روانی اور دلکشی کا اندازہ ہوتا ہے۔طرز تحریر دلچسپ ہے۔مضامین کا تنوع قاری کو متوجہ کرتا ہے۔خاص طور سے ان کے خطوط اپنی دلچسپی اور رنگینی اور لطافت کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔بقول نصیر الدین ہاشمی آپ کی معلومات وسیع، تخیل بلند اور طرز بیان دلکش و دلچسپ ہوتا ہے۔نثر میں آپ شاعری نہیں بلکہ ساحری کرتی ہیں۔خیالات میں آمد اور روانی غضب کی ہوتی ہے۔ ان کے مضمون ''مجھے کچھ عرض کرنی ہے'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''ادھر بھابی جان کی سہیلیاں ان کے مفت کرم داشتن کے طرز عمل سے بالکل تنگ آگئی ہیں۔ جہاں کسی دوست کے پاس کوئی نیا رسالہ یا اچھی کتاب دیکھی کہ ان کی رال ٹپکی۔آنکھیں بدلیں، رنگ نکھرا اور باتوں میں ایک سنسنی سی پیدا ہوئی۔ جب تک اس پر حملہ نہ کرلیں انہیں چین کہاں پھر تو وہ نہ منہ سے بولیں نہ سرے کھیلیں۔وہ ہیں اور ان کی کتاب۔ان کی بھی کہاں ہے وہ۔مگر اپنی چیز کی طرح اس کو اپنا بنا رکھا ہے۔ان کا نھا روئے، بسورے، چیخے چلاّئے، بھائی جان کے دفتر کا وقت ہوگیا ہے۔وہ سگریٹ اور پان کے طالب ایک سائل کی طرح ان کی سرکار میں ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں اور یہ محترمہ ہیں کہ مفت کی کتب بینی میں ایک مکھی کی طرح مصروف۔ ......بھوک پیاس کا بھوت جو اُن کو بڑی حد تک تنگ کرنے کا عادی تھا کہاں غائب ہوجاتا ہے۔نیند کا متوالا پن جوان کی زندگی کا ایک نمایاں کارنامہ

ہے کہاں روپوش ہوجاتا ہے۔کتاب صرف ختم ہی نہیں ہوتی اس پر بیسیوں نشان سرخ اور نیلے پنسل کے لگ گئے۔اُس کا نقشہ ایسا بگڑتا ہے جو کسی کے بنائے نہ بنے۔"(1)

جہاں بانوں نقوی کے مضامین کتابی شکل میں شائع ہونے کے علاوہ کئی مضامین ادبی رسائل میں شائع ہوئے جن میں "زیب النساء" "عصمت" "شہاب" اور "ناہید" قابل ذکر ہیں۔انشائیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں طنز و مزاح نگاری کی بہترین صلاحیتیں موجود ہیں۔بیشتر انشائیے ابتداء سے آخر تک انتہائی دلچسپ ہیں۔طنز و مزاح کی تاریخ جہاں بانوں نقوی کے ذکر کے بغیر یقیناً نامکمل اور ادھوری سمجھی جائیگی۔

رفیعہ منظور الامین ایک معزز اور علمی گھرانے میں 25 جون 1930ء کو حیدرآباد کے قدیم محلّہ عثمان پورہ میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد محمد عبدالحمید کا تعلق پولیس ڈپارٹمنٹ سے تھا۔جو پرنسپل پولیس ٹریننگ اسکول کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔رفیعہ منظور الامین کے والدین نے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔والد کی تعیناتی اکثر اضلاع پر ہوتی تھی لیکن ان کی والدہ نے حیدرآباد میں قیام کرتے ہوئے ان کی تعلیم پر توجہ دی۔رفیعہ منظور الامین نے نارمل اسکول' کاچی گوڑہ سے 1952ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔عثمانیہ یونیورسٹی کے ویمنس کالج سے 1956ء بی ایس سی کامیاب کیا۔23 اکتوبر 1957ء کو منظور الامین سے ان کا شادی ہوئی۔منظور الامین سے شادی کے بعد انھیں مختلف شہروں اور ملکوں کی تہذیب کا قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔

ان کی پہلی کہانی "سوداگر اور مچھر" رسالہ "پیامِ تعلیم" میں شائع ہوئی۔تب ان کی عمر محض آٹھ سال تھی۔لیکن ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز 1970ء کے آس پاس شروع ہوتا ہے۔ان کی پہلی کہانی "بختاور" رسالہ "شمع" میں شائع ہوئی تھی۔جس کی وجہ سے قومی سطح پر ان کی شناخت قائم ہوئی۔اس کے بعد ان کی تخلیقات مختلف اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہے۔اب تک ان کی کہانیوں کے دو مجموعے "دستک سی در دل پر" اور "آہنگ" شائع ہوئے۔اس کے علاوہ تین ناول "سارے جہاں کا درد" "عالم پناہ" "یہ راستے" شائع ہو چکے ہیں۔ان کے ناول عالم پناہ پر "فرمان" نام سے ٹی وی سیریل بھی بنایا گیا تھا۔جسے دوردرشن پر پیش کیا گیا۔انھوں نے اپنے ٹی وی سیریلوں میں زبان کے معیار کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی۔اس سلسلے میں ڈاکٹر اشرف رفیع لکھتی ہیں۔

''حیدرآبادی تہذیب اور زبان کا فلموں میں استعمال تو کیا گیا ہے۔مگر تہذیب کو استوار کرنے والے مثبت عناصر کی بجائے زیادہ تر منفی قسم کے عناصر ان میں پیش کیے گئے، جن سے مضحکہ خیز پہلو سامنے آتے ہیں۔جیسے کوئی غیر ثقہ زبان اور تہذیب ہو۔عالم پناہ میں رفیعہ نے حیدرآبادی شائستگی وضعداری، جاگیردارانہ شان و شوکت، رسم و رواج، زیورات اور لباس، زبان و لہجہ کی نرمی اور طبقہ واری لسانی حقائق کی سچی عکاسی کی ہے۔حیدرآباد کی عہد بہ عہد بدلتی ہوئی زندگی کے تناظر میں نہ صرف جاگیرداروں، بلکہ عام سماجی زندگی میں ردوقبول، تضاد و تصادم، ذہنی، جذباتی، طبقاتی کشمکش، معاشی اور معاشرتی نشیب و فراز کی بعینہ تصویر کشی کی ہے۔''(2)

انھوں نے مزاحیہ مضامین اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ان کے ناولوں کے بعض کرداروں میں بھی مزاح کا عنصر پایا جاتا ہے۔ان کے ڈرامے ''چڑھتی دھوپ اترتی دھوپ'' میں کہنہ مشق شاعر اور ایک شاگرد کا منظر ہے جس میں شاگرد کے غلط تلفظ سے استاد (تحسین احمد نزع) کی جو حالت ہوتی ہے اسے بہت ہی مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''نزع: ہاں کہو میاں......مزاج عاشقانہ

شاگرد: (جمائی لے کر) مجاز......آسکانہ......

نزع: (برداشت سے کام لے کر) مجاز نہیں میاں......مزاج۔۔مزاج

شاگرد: (کان کھجلا کر) مجاز......مجا......ز

نزع: ساقی شراب پینے دے شیشے کو توڑ کر (شاگرد دہراتا ہے) ساکی شراب

نزع: قلابازی کھا کر......لاحول ولاقوۃ......میاں یہ شاعری، یہ ردیف قافیہ تمہارے بس کی بات نہیں۔

(نزع ٹانگیں لٹکائے غصے سے شاگرد کو اور شاگرد بغیر کسی Expression کے انھیں گھور رہا ہے۔)

نزع: ارے یونہی بیٹھے ہو؟ ارے جاؤ میاں تم آزاد ہوٗ آزاد شاعری شروع کردو۔ یہ شاعری...... بس بس اب اٹھواور دفعان ہوجاؤ

شاگرد: کھانا کھا کر جاؤں گا

نزع: (آپے سے باہر ہوکر حقے کا پیچوان سنبھالتے ہیں اور شاگرد اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

خبردار جو ایک...... تجھے......خدا کی قسم چلم میں بھر کر پی جاؤں گا۔ نکل جا یہاں سے

شاگرد: (منہ بنا کر) جاتو رہا ہوں۔ گُسّہ کیوں ہوتے ہو۔''(3)

ڈاکٹر حبیب ضیاء ڈاکٹر رفیعہ منظور الامین کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''رفیعہ منظور الامین نے بحثیت ناول نگار اور افسانہ نگار عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے کئی ناول منظر عام پر آئے۔ جن میں ''عالم پناہ'' کو بڑی مقبولیت ملی۔ ٹی وی سیریئل ''فرمان'' کی بنیاد یہی ناول ہے۔ جسے ہزاروں ٹی وی شائقین نے پسند کیا۔ رفیعہ منظور الامین میں طنز ومزاح لکھنے کی بھی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ ان کے ناولوں کے بعض کردار اس کی عمدہ مثال ہیں۔ ٹی وی کے لئے لکھے گئے مزاحیہ ڈرامے بھی ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی طنز ومزاح نگاری کے جوہر سامنے آتے ہیں۔''(4)

رفیعہ منظور الامین کی عصری آگہی، سماجی بصیرت اور فنی مہارت نے اردو فکشن میں انھیں ایک منفرد مقام عطا کردیا ہے۔ رفیعہ منظور الامین 30 جون 2008ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

حیدرآباد کی مزاح نگار خواتین میں فاطمہ عالم علی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ فاطمہ عالم علی مراد آباد میں قاضی محمد عبدالغفار اور افضال بیگم (بیگماں) کے گھر 16 نومبر 1923ء کو پیدا ہوئیں۔ قاضی عبدالغفار ایک معروف صحافی اور ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ''ہمدرد'' سے صحافتی کیریئر کا آغاز کیا تھا۔

فاطمہ عالم علی کی ابتدائی تعلیم مراد آباد میں ہوئی۔ بعد میں لکھنؤ کے مسلم گرلس ہائی اسکول میں داخلہ لیا' جواب کرامت حسین گرلز کالج کہلاتا ہے۔ حیدرآباد آئیں تو انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے ویمنس کالج میں داخلہ لیا۔ فاطمہ عالم علی کئی ادبی وثقافتی انجمنوں سے وابستہ ہیں۔

انھوں نے زمانہ طالب علمی کے دوران اپنا پہلا مضمون اسکول میگزین کے لئے ''میرا بورڈنگ ہاؤس'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ ویمنس کالج میں فاطمہ عالم علی اپنی استاد جہاں بانو نقوی سے کافی متاثر تھیں۔ ان ہی کی حوصلہ افزائی نے ان کے فن کو جلا بخشی۔ ان ہی کے کہنے پر ''رکشا والا'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو رسالہ ''شہاب'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد فاطمہ عالم علی نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ان کے مزاحیہ مضامین' انشائیوں اور خاکوں پر مشتمل مجموعہ ''یادش بخیر'' منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ ''بہت پچھتائے فیشن کرکے'' ''بن بلائے مہمان'' ''سوکن'' ''اکبرالہ آبادی کے نام کھلا خط'' مزاح کے عمدہ نمونے ہیں۔ یہاں مضمون ''سوکن'' سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

> ''یوں تو ہمارے شوہر نامدار ایک نہیں کئی لائے اور لاتے ہی رہتے ہیں ارے صاحب یہ ان کا محبوب مشغلہ ہے یعنی کہ Hobby ہابی ہے اب یہ گِلہ ہی بیکاری ہے کہ وہ کیوں لاتے ہیں۔ اور پھر ان کی اس Hobby سے ہمیں کبھی تکلیف بھی تو نہیں پہونچی ان آنے والیوں میں ایک سے ایک حسین بھی رہیں۔ جوان اَدھیڑ اور بوڑھی بھی شامل ہیں۔ غرض ان آنے والیوں میں ہر قسم اور ہر ذات کی آتی رہیں اور جاتی رہیں۔...... ''ہمارے میاں ایک نہیں کئی لا چکے ہیں'' تو کیا خدانخواستہ آپ سمجھ رہے ہیں ''بیویاں'' جی نہیں جناب عرض ہے کہ موٹر یعنی کار۔'' (5)

رشید موسوی 9 جون 1935ء کو حیدرآباد کے معزز خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد محترم سید محمد علی موسوی پیشہ کے اعتبار سے ایک تاجر تھے۔ لیکن مختلف سماجی اور مذہبی انجمنوں سے بھی وابستہ تھے۔ وہ 1952ء سے 1957ء تک کانگریس کے ایم ایل اے بھی رہے۔

رشید موسوی نے نامپلی گرلز ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ اور فارسی میں ساری ریاست میں

سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے۔جس کا میرٹ اسکالرشپ انھیں انٹرمیڈیٹ میں دوسال تک ملتا رہا۔انٹرمیڈیٹ میں بھی فارسی میں امتیازی نشانات سے کامیاب ہوئیں جس کا میرٹ اسکالرشپ بی اے میں دوسال تک ملتا رہا۔ یونیورسٹی ویمنس کالج سے بی اے میں امتیازی اول کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔1956ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔اس کے بعد''دکن میں مرثیہ اورعزاداری 1857ءتا1957ء'' کے موضوع پر پروفیسر عبدالقادر سروری کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ 1961ء میں داخل کیا اور 1963ء میں ڈگری عطا کی گئی۔

1961ء میں راجہ بہادر وینکٹ رامار یڈی ویمنس کالج میں بحیثیت اردو لیکچرر تقرر ہوا۔ان کی دو کتابیں''دکن میں مرثیہ اور عزاداری''(1972) اور''کاغذی ہے پیرہن''شائع ہوچکی ہیں۔کاغذی ہے پیرہن طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں 18 مضامین اور دوخاکے ہیں۔یہ کتاب 1986ء میں زندہ دلان حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوئی۔اس کے علاوہ مزاحیہ غزلیں اور نظمیں ان کی مرتبہ کتاب ہے جس میں ابتداء سے لے کر حال تک کے شعراء کی منتخب تخلیقات شامل ہیں۔ساتھ ہی ان کی چار کتابیں شمس الدین فیض، زاری، تذکرہ یادگار ضیغم اور ڈولی سے ڈولے تک مختلف مسودے ہیں ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔''کوسے''عنوان سے ایک کتاب شائع ہوچکی ہے۔

رشید موسوی کو زمانہ طالب علمی سے ہی لکھنے کا شوق رہا۔ان کی تخلیقات اخبار''میزان''میں شائع ہوتی تھیں۔اس کے علاوہ''سب رس''اور''صبا''میں ان کے تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔طنزومزاح سے اپنے لگاؤ کے بارے میں وہ خود رقمطراز ہیں۔

> ''ادبی حلقوں میں مجھے ایک استاد اور محقق کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔لیکن طنزیہ ومزاحیہ ادب سے مجھے خاص دلچسپی رہی ہے۔شفیق الرحمٰن شوکت تھانوی، پطرس بخاری، مرزا فرحت اللہ بیگ، مشتاق احمد یوسفی، رشید قریشی، بھارت چند کھنہ اور مجتبیٰ حسین کو میں نے بہت پڑھا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ 1968 میں میرا رجحان طنزومزاح کی طرف ہوگیا تھا۔''(6)

رشید موسوی اپنے اساتذہ میں جہاں بانو نقوی اور ڈاکٹر زینت ساجدہ سے بے حد متاثر ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ان اساتذہ کے اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے۔انھوں نے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون''طنز کیا چیز

ہے مزاح کیا ہے'' کے عنوان سے لکھا۔ جسے انھوں نے زندہ دلان حیدرآباد کی 1968ء میں منعقدہ سالانہ کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ ان کے مزاحیہ مجموعے ''کاغذی ہے پیرہن'' میں جملہ 20 بیس مضامین ہیں جن میں چادر گھاٹ کا پُل، گلے کی تعویذ، مالن بی، برسی، اور کتے خصوصیت سے مزاح کے اعلیٰ نمونے کہلائے جاسکتے ہیں۔ ان کے مضمون ''کتے'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں کتوں کی مختلف اقسام کا مزاحیہ انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔

> ''کتوں کی کئی قسمیں ہیں۔ شجرہ دار کتے، مجہول النسب کتے، بری، بجری، للی پٹ، گلبوزچھلے ہوئے، بال دار، غرض اتنی گوناگوں قسمیں ہیں ان کتوں کی کہ میں تفصیل میں جاؤں تو شبہ ہوگا کہ انسانوں کی قسمیں گنانے لگی ہوں۔ اس لئے میں کتوں کو ان کی شہریت کے منطقوں میں تقسیم کرنا مناسب سمجھتی ہوں۔ مثلاً ریلوے اسٹیشن کے کتے، دواخانوں کے کتے، مارکٹ کے کتے، دھوبی گھاٹ کے کتے اور چند خاص کتے۔ ہر کتا اپنے منطقہ کا شیر ہوتا ہے اور کسی دوسرے منطقے کے کتے کو اپنی عملداری میں گھسنے نہیں دیتا اور نہ ہی خود اسے اس قسم کی مداخلت بے جا بہ منطقہ دیگر کی ہمت ہوتی ہے''(7)

رشید موسوی کی شادی معروف مزاحیہ شاعر حمایت اللہ سے 22 مئی 1974ء کو ہوئی۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے بھائی ابولقاسم کی بیٹی فاطمہ موسوی کو گود لیا ہے اور وہی ان دونوں کی کل کائنات ہے۔ حمایت اللہ کے مجموعہ کلام ''دھنرڑی'' کی اشاعت کی محرک بھی رشید موسوی ہی ہیں۔ انھوں نے اس کا 'تعارف' بھی لکھا ہے۔ اِن دنوں وہ بہت کم لکھنے لگی ہیں۔ امید کی جانی چاہیئے کہ طنز ومزاح کے فروغ میں خواتین کی حصہ داری بڑھانے کے لئے ان کا قلم ایک بار پھر رفتار پکڑے گا۔

عابدہ محبوب 1937ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد الحاج حکیم محبوب علی خاں نظامیہ صدر شفا خانہ یونانی چارمینار کے مہتمم اور طبیہ یونانی کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کی والدہ کا نام احمدی بیگم تھا۔ عابدہ محبوب کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہی ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی ویمنس کالج (کوٹھی) سے بی اے اور کالج آف ایجوکیشن سے بی ایڈ کامیاب کیا۔ خانگی امیدوار کی حیثیت سے عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد

پیشہ تدریس سے وابستہ ہوئیں۔28 سال تک ملازمت کے بعد گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میسرم (بارکس) سے ہیڈ مسٹریس کے عہدے سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئیں۔

عابدہ محبوب کے ادبی سفر کا آغاز 1955ء میں لطیفہ نگاری سے شروع ہوا۔اس عرصہ میں انھوں نے لطائف، مزاحیہ کہانیاں، افسانے اور ڈرامے وغیرہ لکھے۔جو کھلونا (دہلی) پھول (دہلی) آئینہ (دہلی) کھلاڑی (رام پور) بانو (دہلی) خاتون دکن (حیدرآباد) روزنامہ ''سیاست'' روزنامہ ''منصف'' روزنامہ ''رہنمائے دکن'' ماہنامہ شگوفہ (حیدرآباد) اور سب رس (کراچی) میں شائع ہوتے رہے۔

عابدہ محبوب کی دو تصانیف ''درد کے پیوند'' 1985ء اور دھجیاں 1988ء میں شائع ہوچکی ہیں۔''دھجیاں'' طنزیہ و مزاحیہ کہانیوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ان مضامین میں روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات، مشاہدات اور تجربات کو طنز و مزاح کے دلکش پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔کالج کی دیواریں ایک اچھا مزاحیہ مضمون ہے۔جس میں طالبات کی نفسیات اور ان کی دلچسپیوں کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ اگر کسی مزاح نگار کی تحریر قاری کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دے تو اس تحریر کو بار بار پڑھنا چاہئیے۔یہ مزاح نگار کی کاوش کا نہ صرف بہترین صلہ ہوگا بلکہ اپنی صحت کے لئے بھی مفید ہوگا۔ان کے مضمون ''کالج کی دیواریں'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''غرض لکھنے کی وجہ چاہے جو بھی ہو مگر لکھا ضرور جائے گا۔جس طرح انسان بغیر کھائے پیئے زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح طالبات بھی دیوار پر کچھ لکھے بغیر ''شاید'' زندہ نہیں رہ سکتیں۔یہ اور بات ہے کہ بعض طالبات ڈر کر لکھتی ہیں۔بعض چھپ کر چوروں کی طرح اور بعض علی الاعلان لکھتی ہیں مگر لکھتی ضرور ہیں۔......مگر جو ''شرمیلی'' ہوتی ہیں، وہ دیواروں کو اپنا آلہء کار بناتی ہیں۔اور اپنا دل، گردہ، کلیجہ، پھیپھڑا (نہ جانے کیا کیا) دیوار پر نکال کر رکھ دیتی ہیں۔''(8)

عابدہ محبوب نے افسانچے بھی لکھے ہیں۔ان کے یہ افسانچے ماہنامہ شگوفہ میں ''دھجیاں'' کے مستقل عنوان کے تحت شائع ہوئے ہیں۔ان تخلیقات میں انسانی زندگی کے بعض پہلوؤں پر ہمدردانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔چنانچہ اکثر

افسانچے معنویت اور افادیت کے لحاظ سے قاری پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہیں۔افسانچے کی صنف نے ابھی ادبی مقام نہیں پایا ہے،لیکن مستقبل میں نثری نظم کی طرح اس کے امکانات روشن ضرور ہیں۔عابدہ محبوب کا ایک افسانچہ ملاحظہ ہو:

علامہ اقبال

''شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کی ایک مشہور تصویر ہے۔جس میں علامہ سیدھے ہاتھ کی ہتیلی پر اپنا سیدھا گال رکھے غور وفکر میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔جب بھی کوئی پاکستانی اس طرح بیٹھتا ہے تو دوسرا اس سے پوچھتا ہے۔
''کیا بات ہے بھائی جان! آج علامہ اقبال بنے ہوئے ہو!''(9)

نسیمہ تراب الحسن کا تعلق اُتر پردیش کے ایک زمیندار خاندان سے ہے۔انکے والد سید آفتاب حسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ ایک کامیاب وکیل تھے۔نسیمہ تراب الحسن کی پیدائش 1940 کو میرٹھ میں ہوئی۔ملک کی آزادی کے بعد ان کے والدین نے حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیا کرلی۔

نسیمہ تراب الحسن کی ابتدائی تعلیم گوشہ محل گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں ہوئی اور وہیں سے انھوں نے میٹرک پاس کیا۔ویمنس کالج میں بی اے سیکنڈ ائیر کے دوران ان کی شادی تراب الحسن سے ہوئی جو ایک سرکاری عہدیدار تھے۔شادی کے بعد انھوں نے گریجویشن کی تکمیل کی۔فیملی پلاننگ اسوسی ایشن میں دس تک ملازمت کی اس کے بعد انھوں نے خود بے بی کیر سنٹر کھول لیا۔اس کے علاوہ سٹ وِن میں خواتین کے شعبہ میں جز وقتی کنسلٹنٹ ہیں۔

زمانہ طالب علمی سے ہی لکھنے کا شوق رکھتی تھیں۔لیکن وہ خود کہتی ہیں کہ ڈاکٹر زینت ساجدہ کی ہمت افزائی کی وجہ سے قلم چلانے کی جرات پیدا ہوئی ورنہ میرٹھ کے تو قینچی سروتے مشہور ہیں۔ان کے مضامین سب رس' آندھرا پردیش' روزنامہ ''سیاست''،''منصف''،''قومی زبان''ماہنامہ ''شگوفہ''اور''ندائے وقت''میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ان کے مضامین سیدھے سادے اور شگفتہ مزاح لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ان میں روزمرہ زندگی کی حقیقی تصویریں نظر آتی ہیں۔اور یہی بات ان کی تحریر میں انفرادیت پیدا کردیتی ہے۔ان کے مزاحیہ مضامن میں مچھروں

کی اٹکھیلیاں‘ نیند کیوں دیر تک نہیں آتی‘ مہنگائی کا بوجھ کیسے ہلکا کریں‘ باتوں باتوں میں لطف کی باتیں‘ بس میں بے بسی‘ پولیس کی شکایتیں‘ غیبت سوسائٹی‘ بڑے بے آبرو ہوکے تیرے آٹو سے ہم اترے‘ ہمارے مزاح نگار اور خراٹے قابل ذکر ہیں۔ ان کے مضمون ’’غیبت سوسائٹی‘‘ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> بعض لوگوں کو اپنی اولاد کی بدتہذیبی کا احساس نہیں رہتا لیکن دوسرے کے بچوں کی ہر حرکت قابل اعتراض دکھائی دیتی ہے۔ ایسے میں اگر آپ کہہ دیں کہ خود آپ کے بچے بھی تو ایسا کرتے ہیں تو بس قیامت کی گھڑی آجاتی ہے۔ بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ اس لئے تو غیبت سوسائٹی کا سہارا بہت غنیمت رہتا ہے۔ یہاں آپ کسی سے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں اس پر شریک محفل اپنے خیالات کی روشنی میں تبصرہ کرتے ہیں۔ مانا کہ نتیجہ کچھ نہ نکلے لیکن دلوں کو سکون مل جاتا ہے۔ اِدھر وہ خوش اُدھر ہم اور کسی سے بدمزگی نہیں ہوتی۔‘‘(10)

نسیمہ تراب الحسن مزاحیہ مضامین کے علاوہ شاعری بھی کرتی ہیں۔ دکنی زبان میں لکھے ان کے چوے اور نظمیں خاصے کی چیز ہیں۔ دکنی لفظیات اور محاوروں سے ان کی تخلیقات کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ ان کی نظم ’’ہونے والی بہو کے ارمان‘‘ سے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

درگا پوجا کے ایک دن چدّر چڑھاؤں گی
بانکا جوان ملیا تو انکھیاں لڑاؤں گی

اماں کی باتاں مانوگی نہ بھائی کنّا
مرضی سے خود بیچ اپنی میں شادی رچاؤں گی

میکپ کرونگی روز میں پارلر میں بیٹھ کو
میں بے دھڑک مرد کی کمائی لٹاؤں گی

مٹھاروں گی میاں کو میں نخروں سے رات دن

تھگلی کے جیسا ناچ میں اس کو نچاؤں گی (11)

نسیمہ تراب الحسن باغ و بہار طبیعت کی مالک ہیں اور ایک دردمند دل رکھتی ہیں۔ان کا مشاہدہ کافی تیز ہے اپنے تاثرات کو لفظوں کے پیکر میں اتارنے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔ان کے فن اور شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر آمنہ تحسین لکھتی ہیں۔

''حقیقت تو یہ ہے کہ ''نسیمہ باجی'' صرف اپنی شگفتہ بیانی سے ہی پیار اور خوشیاں بانٹتی نہیں پھرتیں بلکہ اپنی تحریروں سے بھی انسانوں کے درد کا مداوا ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہیں وہ ایک دردمند دل اور بصیرت افروز نگاہ رکھتی ہیں۔اسی لئے ان کے اطراف واکناف میں پھیلی معاشرتی ناہمواریاں' زندگی کے مسائل سے جڑی چھوٹی بڑی باتیں' درد وغم خاص کر خواتین کے مسائل پر ان کا دل کراہ اُٹھتا ہے۔وہ پوری صداقت کے ساتھ اس درد کو محسوس کرتی ہیں۔اور سماج کی ان ناہمواریوں کی نشاندہی کے لئے اپنے قلم سے کبھی نشتر کام لیتی ہیں تو کبھی تلخ حقائق کو مزاح کا لبادہ پہناتی ہیں تو کبھی سنجیدگی سے مسائل کی طرف غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں تو کبھی اپنی سوچ وفکر کو شاعری کا پیرہن بھی عطا کرتی ہیں۔''(12)

نسیمہ تراب الحسن کی تخلیقات میں دکنی لفظیات اور محاوروں کا برجستہ استعمال ملتا ہے۔وہ اپنے آس پاس پائی جانے والی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتی ہیں۔حیدرآباد کے ادبی افق پر نسیمہ تراب الحسن کا نام ایک ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔

نام سیدہ احمد النساء انور اقبال بیگم' قلمی نام سیدہ انور حیدرالدین' حسینی سادات سے ہیں۔1948ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔ان کے والد میر فریدالدین حسینی تسنیم ایک اچھے شاعر تھے۔ابتدائی تعلیم مغلپورہ ہائی اسکول میں ہوئی۔HSC کے بعد ان کے والد نے آگے پڑھنے سے منع کر دیا۔لیکن وہ خود انھیں ابتدائی عربی اور فارسی سکھاتے تھے۔ترک تعلیم کے بعد سیدہ انور الدین محلے کی عورتوں اور بالغ لڑکیوں کو انگریزی سکھاتی رہیں۔

سیدہ انور حیدرالدین کی شادی حیدرالدین رفاعی المعروف بدر افسر سے ہوئی۔ بدر افسر ایک کہنہ مشق ڈرامہ نگار تھے۔ انھوں نے ان کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ اور ریڈیو پر حرف تابندہ اور بہنوں کے پروگرام میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ 1985ء سے حرف تابندہ لکھ کر نشر کرنے لگیں۔ اس کے علاوہ ان کے مزاحیہ مضامین ماہنامہ ''شگوفہ'' اور روزنامہ ''سیاست'' میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔

سیدہ انور حیدرالدین مزاحیہ مضامین کے علاوہ خاکے بھی لکھتی ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خالص دکنی زبان میں ہوتے ہیں۔ انور حیدرالدین کو دکنی الفاظ، محاوروں اور ضرب الامثال کے استعمال پر خاصہ عبور حاصل ہے۔ دکنی الفاظ کا ان کے پاس ذخیرہ ہے۔ جسے وہ بڑے خوبصورت انداز میں استعمال کرتی ہیں۔ ان کے کئی خاکے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ دولت کی بدولت، ہاتھ کی صفائی، ساس بہو، ہری مرچی ان کے لکھے معیاری خاکے ہیں۔ دکنی زبان میں تقریباً 40 مضامین اور 30 سے زائد نظمیں اور غزلیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہاں ان کے مضمون ''نوک جھونک'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں دکنی زبان اور محاوروں کا برجستہ استعمال کیا گیا ہے۔

> بوآپا: ائی ہو تُمارے خاون بھارگیں ہیں ہور کیا ہونا سو لیو باپ نہ دادے سو پڑے بادے۔ باپ کیا کی ببرچی کے سنگات کا ماں کر کو عمر گجاریں۔ اب بچاں کو بڑے مدریسے میں پڑا کو کیا منسٹراں بناتیں۔ اب تمیں بی بچوں کے برابر پڑتے جاؤ۔ مرنے بیٹھوں پڑنے ڈالو جیو میرے لال بول کو۔
>
> خاتون آپا: چلو چلو کِدر کی بول رئیں اب ہمارے گھر والے نیں دوبئی میں بڑی ہوٹیل میں کام کرریں۔ اب کی چکر میں ہمارے شیخ جان کو بی لے کو چلے گئیں۔ دونوں کمارئیں ہمنا چار بیٹیاں کو اٹھانا ہے جو سوکی پاڈ ہو۔ یہ جمانے میں بچیاں کا ویتا گیج ہے۔ چار سِلّاں ہمارے سینے پو ہیں۔ پیسہ خونچ لگا کو شادیاں کریں تو بچیاں اچھے گھراں میں جاتیں کھا پی کو خوش رہتیں۔
>
> بوآپا: اگے او خاتون بی تمیں بڑے کو ماں کی بستی میں بھاڑے پو بنگلہ لیکو کونسا تیر ماریں سو۔ مہینا مہینا کو ہجار رُپے دینا اسان بات نہیں جی۔ ہیچ پیسہ بچیاں کی

شادی میں لگاؤ کام کی بات ہے۔مشکل اسان دوکھڑیاں کا گھر بن لینا۔

خاتون آپا: تمیں کائی کو جل کو مریں۔آج کے جمانے میں اچھا گھر شوکا ہونا۔ٹی وی ہونا' فریج ہونا' اچھے پردے لٹکانا ہور ٹیبلاں پو کھانا کھانا' سوپ چمکتے اشٹیل کے باسنا ہونا' گھر کا ٹھاٹ باٹ دیکھ کو بڑے اونچے گھراں کے لوکاں رگر کو آتیں۔جھانپ اچھا رہیا تو مرغا زلدی گھٹتائے' کھپریل کے گھراں کو پوچ کو پھیکتیں۔''(13)

سیدہ انور حیدرالدین کے والد حالانکہ شاعر تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی بھی شاعری میں دلچسپی لے لیکن اس وقت ان کا رجحان افسانہ نویسی کی طرف تھا۔لیکن 1989ء میں جب وہ محفل خواتین کی رکن بنیں اور لوگوں کی ہمت افزائی ملی تو ان کا رجحان دکنی شاعری کی طرف ہوا۔ان کی نظم ''نمائش کو جائیں گے'' سے ایک بند ملاحظہ ہو۔

چلو گے بھاناں نمائش کو جائیں گے — بیل گُما کو رسی لائیں گے
چمک کی ساڑیاں ہیلاں کے چپلاں — ہوٹاں پو مِسّی جما کو جائیں گے
مانگا میں عراش چونڈاں میں پھولاں — اپن بی فیشن میں ٹھن کو جائیں گے
چلو گے بھاناں نمائش کو جائیں گے

خرابی صحت کی وجہ سے انور حیدرالدین ان دنوں کم ہی لکھ رہی ہیں۔

حیدرآباد کی مزاح نگار خواتین میں فاطمہ تاج ایک اہم نام ہے۔پورا نام فاطمہ تاج النساء اور تخلص فاطمہ تاؔج ہے۔فاطمہ تاج 29 اکتوبر 1948ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔کم عمری میں ہی شاعری کرنے لگیں تھیں۔لکھنؤ کے معروف شاعر احسان علی عرشی سے تلمذ کیا۔کم عمری میں ہی شادی ہوگئی۔پہلی غزل روزنامہ ''سیاست'' میں شائع ہوئی جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ مدیر شگوفہ سید مصطفیٰ کمال' ڈاکٹر حبیب ضیا' ڈاکٹر زینت ساجدہ' محبوب حسین جگر کی حوصلہ افزائی سے نثر کی طرف توجہ کی اور خاص طور پر مدیر ''شگوفہ'' اور ڈاکٹر حبیب ضیا کی وجہ سے طنز و مزاح کی طرف مائل ہوئیں۔انھوں نے کئی اصناف جیسے نظم' غزل' افسانے ناولٹ' انشائیوں اور مزاحیہ مضامین میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کی اب تک دس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔جن تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

1 -	اب کے برس	غزلیں
2 -	امانت	مضامین
3 -	آس پاس	افسانے
4 -	وہ	ناولٹ
5 -	خوشبوئے غزل	غزلیں
6 -	حوصلہ	نظمیں
7 -	پھول غزل کے	غزلیں
8 -	چھاؤں کی چادر دھوپ کی کلیاں	افسانے
9 -	من مانی	مزاحیہ مضامین
10 -	دلاسا	مزاحیہ مضامین

فاطمہ تاج اپنے آس پاس رونما ہونے والے واقعات اور روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناتی ہیں۔ان کے مجموعوں میں بعض ایسے انشائیے ہیں جن میں لطیف مزاح پایا جاتا ہے۔ تہذیب کے انڈے، ہم نے بھی عید منائی، خادمہ کا خادم، لفافہ دیکھ کر، مر گئے ہم جیتے جی......! خزانہ میری تلاش میں ہے، ایسے مضامین ہیں جن میں شگفتہ مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں طنز کی کاٹ نمایاں نظر آتی ہے۔

> ''کسی اخبار میں حال ہی میں اٹلی کی ایک خبر پڑھ کر ہم لرزہ براندام ہوگئے (بلکہ اب تک بھی ہیں) معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹروں نے ایک 80 سالہ خاتون کو مردہ سمجھ کر اس کا پوسٹ مارٹم کر دیا۔جیسے ہی ڈاکٹروں کو اس خاتون کے زندہ ہونے کا احساس ہوا تو ڈاکٹر گھبرا گئے اور اسے بچانے کی کوشش کی۔مگر کام تمام ہو چکا تھا۔''(14)

مزاحیہ مضامین اور انشائیوں کے ساتھ ساتھ فاطمہ تاج شعری اصناف میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھاتی ہیں

اس سلسلے میں ان کی نظم ''اکھاڑہ ہورہا ہے'' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہاں صرف چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مسلسل دھم دھڑاکا ہورہا ہے　　　الیکشن ہے تماشہ ہورہا ہے
غلط وعدوں سے جنتا مطمئن ہے　　　اسی میں تو سارا خسارہ ہورہا ہے
جو پچھلی بار پبلک کھا چکی تھی　　　وہی دھوکہ دوبارہ ہورہا ہے
الیکشن میں کھڑے ہیں نا اہل بھی　　　جو دیکھا خواب پورا ہورہا ہے
امیدوں کے چراغوں کو بجھا کر　　　سمجھتے ہیں اُجالا ہورہا ہے(15)

یہ نظم عصری حسیت کی عمدہ مثال ہے جو موجودہ سیاسی قائدین کی چالبازیوں اور ہمارے جمہوری نظام کی خامیوں کا پردہ فاش کرتی ہے۔ فاطمہ تاج کا تخلیقی سفر اب بھی جاری ہے۔

حلیمہ فردوس 25 جولائی 1952ء کو شکر نگر، ضلع نظام آباد میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم شکر نگر میں ہی حاصل کی بعد ازاں وہ گلبرگہ منتقل ہوگئیں اور وہیں سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ وی جی ویمنس کالج سے بی اے اور میسور یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ بنگلور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔ ان کی دو تصانیف ''ماشااللہ'' اور ''بہر کیف'' 2002ء میں شائع ہوئی۔ ان کی تخلیقات طنز و مزاح کے علمبردار رسالے ''شگوفہ'' میں گاہے بہ گاہے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ وہ صنف نازک کے مختلف مسائل پر قلم اٹھاتی ہیں۔ وہ روایتی عورتوں کی طرح صنف قوی کو طنز کا نشانہ بناتی ہیں۔ ان کے مضامین میں کوئی 'تکنیک' کوئی فلسفہ یا اصلاحی نظریہ نظر نہیں آتا۔ وہ عمومی اور سطحی موضوعات کی طرف زیادہ دھیان دیتی ہیں۔

بشیر بانو حیدرآباد کے قدیم محلے دبیر پورہ میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے 1957ء میں بی تک تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی اور جون 2005ء میں وظیفہ حسن خدمات پر سبکدوشی اختیار کی۔

ابتدائی عمر سے ہی انہیں مطالعہ کا شوق رہا۔ ابتداء میں ان کے مضامین اور نظمیں ''میزان میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ ماہنامہ شگوفہ میں بھی ان کی تخلیقات شائع ہوئیں۔ انھوں نے ریڈیو پر بھی اپنی تخلیقات پیش کیں۔ رکشہ رانوں پر بہت سے قلم کاروں نے اپنے اپنے انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے مضمون ''رکشہ والے'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں رکشہ والوں کی نفسیات کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مضمون میں مزاح کی

چاشنی کے ساتھ ساتھ طنز کی کاٹ بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

''رکشہ والوں کی پسند بھی دنیا کے عام مرد وجیسی ہوتی ہے۔وہی نہ گھر کا کھانا اچھا لگتا ہے نہ بیوی۔میرے خیال میں رکشہ والوں جیسا خالص توکل پسند اور کوئی نہیں۔کل کے لئے آج کچھ بھی نہیں رکھتے۔کھانے کے بعد پی کر روز کی کمائی روز ختم کر دیتے ہیں کہ کل کا اللہ مالک ہے۔''(16)

اس مضمون میں رکشہ رانوں کو علامت بنا کر صنف قوی کی نفسیات اور طرز فکر پر طنز کیا گیا ہے۔ڈاکٹر حبیب ضیا بشیر بانو کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین میں چند نام ایسے بھی ہیں جن میں طنز و مزاح لکھنے کی بہترین صلاحیتیں موجود ہیں......بشیر بانو کے جو مضامین ملتے ہیں ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اس صنف کو برتنے کی فطری صلاحیت موجود ہے۔رکشہ والے' باتوں باتوں میں' ایک نمائش' ان کے معیاری مضامین ہیں جن میں طنز و مزاح کا بھر پور امتزاج ہے۔''(17)

بشیر بانو نثری اصناف میں اپنے جوہر بکھیرنے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتی ہیں۔سلیس اردو میں لکھی ان کی نظمیں مزاحیہ ادب میں ایک اچھا اضافہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ان کی نظم ''سہیلی کی دعائیں لیتی جا'' کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

ٹپکے تمہارے گھر میں بھی مہماں خدا کرے
ہوجائے سال بھر تو پریشاں خدا کرے

بچے ہوں سات آٹھ' سب شیطاں خدا کرے
ہر سال بڑھتی جائے یہ سنتاں خدا کرے

دھوبن ادھر کھینچے حجام کرے تنگ

جھنجھٹ میں جکڑ جائے تیری جاں خدا کرے

دروازہ ہلے کھڑکیاں دیوار گر پڑے
منٹوں میں تیرا گھر ہو ایک میداں خدا کرے

بشیر بانو تقریباً 30 برسوں سے لکھ رہی ہیں، لیکن تسلسل کے ساتھ نہیں۔ ان کے مضامین وقفے وقفے سے ماہنامہ ''شگوفہ'' کے علاوہ مقامی اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔

سعدیہ مشتاق کی پیدائش حیدرآباد کے ایک معزز اور علمی گھرانے میں ہوئی۔ والدین نے سعدیہ سعید نام رکھا۔ ان کے والد سعید احمد خاں کا تعلق محکمہ تعلیمات سے تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم نامپلی پرائمری اسکول میں ہوئی اور S.S.C کا امتحان نامپلی گرلز ہائی اسکول سے کامیاب کیا۔ 1954ء میں انٹرمیڈیٹ اور 1958ء میں بی ایس سی کی تکمیل ویمنس کالج (کوٹھی) سے کی۔

ہائی اسکول کے دور سے ہی لکھتی ہیں۔ گریجویشن کے دوران ان کے مضامین کالج میگزین میں بھی شائع ہوتے رہے۔ 1958-1972ء تک ترپ بازار میں واقع اسٹوڈنٹ انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت صدر مدرس برسرکار رہیں۔ اسکے علاوہ اعزہ اسکول ملک میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1964ء میں ان کی شادی مشتاق احمد خاں سے ہوئی اور وہ سعدیہ سعید سے سعدیہ مشتاق ہوگئیں۔ ان کے شوہر نے عثمانیہ یونیورسٹی کی آڈٹ برانچ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر خدمات انجام دیں۔ 1994ء سے ان کے مضامین روزنامہ ''سیاست'' اور روزنامہ ''منصف'' میں شائع ہونے لگے۔ اس کے علاوہ ''پاکستان اردو لنک'' میں بھی ان کے مضامین، غزلیں وار نظمیں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے مضامین سماج کے سلگتے ہوئے مسائل خاص طور پر عورتوں کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ ایک اقتباس دیکھئے جس میں ترقی کے نام پر مٹتی ہوئی اخلاقی اقدار پر طنزیہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔

> ''سچائی، حق اور انصاف کا زمانہ نہ رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب سچ مرجاتا ہے تو انسان مرجاتا ہے۔ چوٹیاں دقیانوسیت کا Award لے گئیں۔ ورنہ کبھی پاگل یا قیدی یا ہندو بیوہ عوتوں کے بال نکال دئے جاتے تھے۔ آج کٹے ہوئے بال ترقی اور فیشن کی علامت ہیں۔ ڈوپٹے گلے کا پھندہ ہوکر رہ

گئے ہیں۔شلواریں ٹخنوں سے اوپر اور شرٹس بس اب بلاؤز میں تبدیل ہونے کو ہیں۔بازار میں آستین والے شرٹس مشکل سے ملتے ہیں۔اور درزی آستین والے شرٹس سینے کا آرڈر لیتے ہوئے بڑے عجیب انداز میں اپنے گاہک کو غور سے دیکھنے لگا ہے۔" (18)

سعدیہ مشتاق عورتوں کی نفسیات کا بڑی گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتی ہیں۔روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے حادثات و واقعات کو وہ بڑے ہی شگفتہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ان کے مضامین کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے طنز کے نشتروں سے سماج کے رِستے ہوئے ناسوروں کا علاج کرنا چاہتی ہیں۔

نام رضیہ صدیقی اور تخلص بصیؔر ہے۔رضیہ صدیقی بصیؔر محمد حافظ علی اور افضل النساء بیگم کے گھر 7 اپریل 1946ء کو پیدا ہوئیں۔ادبی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ان کے والد محکمہ تعلیمات میں کارگذار تھے اور فارسی میں شاعری بھی کیا کرتے تھے۔

رضیہ صدیقی بصیؔر کی ابتدائی تعلیم مدرسہ فوقانیہ نسواں چادرگھاٹ میں ہوئی اور وہیں سے انھوں نے S.S.C کا امتحان کامیاب کیا۔1965ء میں عثمانیہ یونیورسٹی ویمنس کالج (کوٹھی) سے بی اے کی تکمیل کی۔1968ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کی سند حاصل کی۔اور 1978 میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔Ph.D میں ان کے مقالے کا موضوع تھا "شاہ سلطان ثانی کے دیوان کا تنقیدی جائزہ"۔

ویمنس کالج کوٹھی میں بحیثیت پارٹ ٹائم لیکچرر عملی زندگی کا آغاز کیا۔دانش گاہ تبریز (ایران) میں بھی برسرکار رہیں۔1974ء میں ان کی شادی خلیق الزماں قریشی سے ہوئی۔خلیق الزماں قریشی، جامعہ عثمانیہ گورنمنٹ ڈگری کالج میں کیمیا کے لیکچرر تھے۔

زمانہ طالب علمی سے ہی لکھنے کی شوقین رہیں۔ان کے متعدد مزاحیہ مضامین اور شعری تخلیقات روزنامہ "سیاست" اور روزنامہ "منصف" کے علاوہ "حیدرآباد بلیٹن" اور ماہنامہ "شگوفہ" میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے مضامین نشرگاہ حیدرآباد سے براڈکاسٹ بھی کئے گئے۔فارسی پر اچھا عبور رکھتی ہیں۔شاعری کا شوق ورثے میں ملا۔کئی برسوں سے مزاحیہ مضامین لکھ رہی ہیں۔"دوبول نکاح کے" "جوتے" "ہوئی مدت کہ غالبؔ

مرگیا پر یاد آتا ہے' ان کے دلچسپ اور معیاری مضامین ہیں جن میں مزاح کے ساتھ طنز کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔

مضمون ''ہوئی مدت کہ غالبؔ مرگیا پر یاد آتا ہے'' میں رضیہ صدیقی بصیؔر نے یونیورسٹی کے ماحول کی بڑے ہی شگفتہ انداز میں عکاسی کی ہے اور ہر واقعے کو غالبؔ کے اشعار اور مصرعوں سے مزین کیا ہے۔ جس سے ان کی تحریر کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''ہماری ایک ساتھی اونچی ایڑی کا سینڈل پہنے بہت تیز چلا کرتی تھیں' اور بذاتِ خود تھیں بھی قیامت' ان کو دیکھ کر کہنا پڑتا ''لرزے ہے موج مئے تری رفتار دیکھ کر'' دوسری پستہ قد صاحبہ سر کے بالوں کو ایک بڑے ٹوکرے کی شکل میں اوپر باندھتی تھیں تاکہ قد اونچا دکھائی دے۔ انھیں دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ''بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا'' اگر اس طرۂ پر پیچ وخم کا پیچ وخم نکلے'' ایک طویل عرصے بعد ایک خاتون سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بہت حسین سمجھی جاتی تھیں لیکن شادی کے بعد پے در پے بچے ہوگئے جنہوں نے ماں کا حسن بانٹ لیا۔ ان کو دیکھتے ہی غالبؔ کا یہ مصرعہ فوری یاد آیا ''سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں'' اتفاق کی بات ہے کہ ایک لڑکے کو ''لالہ'' اور دوسری لڑکی کو ''گل'' کی عرفیت دی گئی تھی۔'' (19)

رضیہ صدیقی بصیؔر کے مضامین میں شگفتگی کے ساتھ ساتھ لطیف مزاح پایا جاتا ہے۔ وہ طویل عرصے سے لکھ رہی ہیں لیکن اس درمیان میں کچھ ٹھہراؤ آگیا تھا۔ امید کی جانی چاہیے کہ وہ اس جانب ضرور توجہ دیں گی اور طنزیہ و مزاحیہ ادب کو اپنی تخلیقات سے مزین کریں گی۔

بشیر النساء جعفری 25 جولائی 1931ء کو حیدرآباد میں سید علی موسوی اور بتول النساء کے گھر پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سید علی موسوی کانگریس کے ایک سینئر لیڈر رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ نظام سرکار میں ڈپٹی میئر کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔

بشیر النساء جعفری کی ابتدائی تعلیم ماڈل پرائمری انگلش پرائیویٹ اسکول میں ہوئی۔ نامپلی گرلز ہائی اسکول سے

میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔عثمانیہ یونیورسٹی ویمنس کالج، کوٹھی سے گریجویشن کی تکمیل کی۔اور جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کی سند حاصل کی۔گریجویشن کے دوران ہی ان کی شادی سید سراج الحسن جعفری سے ہوئی۔سراج الحسن ایک جاگیردار اور نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔اور ساتھ ہی ایک معروف ایڈوکیٹ کے طور پر جانے جاتے تھے۔ بشیر النساء جعفری نے شادی کے بعد لائبریری سائنس میں بھی گریجویشن کی تکمیل کی۔

بشیر النساء جعفری نے گورنمنٹ ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ میں لائبریرین کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد 1959ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج آف فزیکل ایجوکیشن میں بحیثیت لائبریرین تقرر عمل میں آیا۔ 1973ء میں ان کا تبادلہ بیگم پیٹ ہوا۔یہاں انھوں نے فزیکل ڈائریکٹر اور اردو لیکچرر کی حیثیت سے بھی اعزازی خدمات انجام دیں۔یہاں سے ان کا تبادلہ اندرا پریہ درشنی گورنمنٹ ڈگری کالج میں ہوگیا جہاں سے وہ 1989ء میں وظیفہ حسن خدمات پر سبکدوش ہوئیں۔ریٹائرمنٹ کے بعد بھی نصر اسکول خیرت آباد میں بحیثیت لائبریرین دو سال تک خدمات انجام دیں۔بشیر النساء اور ان کے شوہر ریٹائرمنٹ کے بعد 1991ء سے اپنے بیٹے مسعود حسن جعفری کے پاس ہوسٹن (امریکہ) میں مقیم ہیں۔

کم سنی سے ہی مزاحیہ شاعری سے شغف رہا۔ڈرامے اور فلمی طرز پر پیروڈیاں بھی لکھا کرتی تھیں۔1950ء سے سنجیدہ کلام کے علاوہ سے طنزیہ ومزاحیہ شاعری بھی موزوں کرنے لگیں۔اس کے علاوہ انھوں نے مزاحیہ مضامین میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔بشیر تخلص کرتی ہیں۔یہاں ان کی ایک مزاحیہ غزل نمونے کے طور پر درج کی جاتی ہے۔جس میں دکنی لفظیات اور روزمرہ کا عمدہ استعمال کیا گیا ہے۔

میرے جاناں تُمنا ہوا کیا ہے　　تھوپڑا یوں جلا بُھنا کیا ہے
چُھپکو چُھپکو عشق لڑاتے پھرئیں　　مُنجھے سب کچھ معلوم پڑا کیا ہے
ہمنا گھر تم خود بچ تو آئے تھے　　مُنجھے آکو جلاکو جانا کیا ہے
وہ تو ناگن ہے دیکھنا تمنا　　ڈسکو بچ جائے گی تمنا کیا ہے
کھوپڑی میں بھرا ہے تمنا گوبر　　نہ سمجھ ہوکو بیٹھنا کیا ہے
انکھیاں پھاڑ پھاڑ کو کیوں ڈراتیں مُنجھے　　آخر تمنا مرض ہوا کیا ہے

بشیر تُمنا بتانے آئی ہے   اچھا کیا ہے بُرا ہوا کیا ہے

حیدرآباد میں طنز و مزاح کے فروغ میں خواتین کی بے حد اہم حصہ داری ہے ۔نثری اصناف میں بہت سی خواتین مزاح کی پھلجھڑیاں بکھیرتی نظر آتی ہیں۔لیکن مزاحیہ شاعری کی طرف بہت کم خواتین نے توجہ دی ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر حبیب ضیا رقمطراز ہیں۔

''مزاحیہ شاعری کی جانب بہت کم خواتین نے توجہ دی ہے۔ہوسکتا ہے کہ حیدرآباد میں چند خواتین ایسی بھی ہوں گی جو مزاحیہ اشعار لکھ کر چھپاتی نہیں چُھپا کر رکھ دیتی ہوں۔بشیر جعفری جن کا قیام بیرون ملک ہے غزلوں کے علاوہ حمد'نعت' نوحے اور سلام لکھتی ہیں۔جن میں والہانہ عقیدت کا پہلو واضح ملتا ہے۔لکھنے کا انداز متاثر کن ہے۔اس کے علاوہ مزاحیہ نظمیں بھی لکھتی ہیں ۔ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ طنز کا تیکھا پن لئے ان کی نظمیں بے حد پسند کی جاتی ہیں۔......دکنی میں لکھی گئی ان کی نظمیں خاصے کی چیز ہیں۔''(20)

نام رئیسہ بیگم عرفیت گلریز اور ادبی دنیا میں رئیسہ محمد کے نام سے جانی جاتی ہیں۔رئیسہ محمد 11 اگست 1943ء کو حیدرآباد کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد محمد محی الدین نظام شوگر فیکٹری میں اکاؤنٹ آفیسر کے عہدے پر مامور تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم نامپلی گرلز ہائی اسکول میں ہوئی۔بیسک ٹریننگ کے بعد بحثیت ٹیچر پہلے پی یوسی اور پھر بعد میں نظام کالج کے ایوننگ سیشن سے بی اے کی تکمیل کی۔اس کے بعد عثمانیہ یونیوسٹی سے ایم اے اور بی ایڈ درجہ اول میں کامیاب کیا۔1974ء میں ان کی شادی فقیر محمد جواد سے ہوئی جو عثمانیہ یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ ہیں۔

رئیسہ محمد کو زمانہ طالب علمی سے ہی لکھنے کا شغف رہا۔ان کا پہلا مضمون ''انسان اقبال کی نظر میں'' ایوننگ کالج کے میگزین ''شب تاب'' میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ ان کے مضامین ''قومی زبان'' ''سب رس'' ''شگوفہ'' کے ساتھ ساتھ روزنامہ ''سیاست'' ''منصف'' اور ''رہنمائے دکن'' میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔رئیسہ محمد بنیادی طور پر ایک مضمون نگار ہیں لیکن ان کے مزاحیہ مضامین بھی قابل توجہ ہیں۔ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''شان امن''

1998ء میں منظر عام پر آیا۔ان کے مزاحیہ مضامین میں جیون دھارا' چوری میں چوری' خلل ہے زبان کا' چائلڈ فلاسفی' میچنگ' گھروندہ' شباہت' اور مدھوبالا قابل ذکر ہیں۔ان مضامین میں مزاح کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ان کے مضمون ''میچنگ'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''اب رہا سوال میچنگ کا تو ہمیں میچنگ ماسٹر سمجھ چکی تھیں۔اور اب کی بار تو صرف دھاگے کے گچھے پر ہی اکتفا کرلیا اور کہہ دیا کہ بس تقریباً یہی کلر ہونا چاہیے اور ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ہمارے ہاتھوں میں اکثر پسینہ آتا رہتا ہے۔تاگے کے گچھے نے رنگ بدلنا شروع کردیا۔گویا گرگٹ ہاتھ میں ہوں۔
>
> بہر حال میچنگ سنٹر پہنچے اور جو گچھا ہم نے بڑی احتیاط سے ایک کاغذ میں رکھ کر اس میچنگ سنٹر کے لڑکے کو دیا کہ بھائی اس کلر کا کپڑا چاہیے۔گچھے کا رنگ کچھ عجیب ہوگیا تھا وہ لڑکا لاکھ تلاش کے باوجود ناکام رہا اور وہ گچھا یہ کہتے ہوئے ہمارے ہاتھوں میں تھما دیا کہ فارن کا کلر ہے'اس کا ملنا بڑا مشکل ہے۔''(21)

صفیہ شاہین نے 1951 کو سرزمین حیدرآباد پر آنکھیں کھولیں۔ان کے والد محمد احسان رسول سابق ریاست حیدرآباد میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدہ پر فائز تھے۔پرائمری سے لے کر ہائی اسکول تک کی تعلیم نامپلی گرلز ہائی اسکول میں حاصل کی۔ملٹی پرپز سے بارھویں کا امتحان پاس کرکے ونیتا مہا ودیالیہ سے بی ایس سی کا امتحان کامیاب کیا۔1975 میں ایم اے انگریزی کی تکمیل جامعہ عثمانیہ سے کی۔1982 سے بطور جونیر لکچرر خدمات انجام دے رہی ہیں۔

صفیہ شاہین نے متوسط خاندانوں کے جذبات اور انسانی احساسات کو کبھی نظم کبھی افسانے اور کبھی مضامین کی شکل میں صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے مزاحیہ مضامین میں بھی طبع آزمائی کی ہے جو ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہوتے ہیں۔وہ کہتی ہیں کہ مزاح لکھنا آسان نہیں'لیکن وہ یہ بھی مانتی ہیں کہ مزاح سے دکھی دل کا درد دور کیا جاسکتا ہے۔

''اگرچہ کہ مزاح بہت مشکل صنف ہے مگر طنز کے ساتھ مل جائے تو نہ صرف دل بہلائے بلکہ وہ کام کرے جو اصلاح معاشرہ جیسے فریضہ کو بھی انجام دے سکے۔''(22)

صفیہ شاہین سماج میں رونما ہونے والی خامیوں پر گہری نظر رکھتی ہیں ان کے مضامین دلچسپ اور شگفتہ مزاح لئے ہوئے ہوتے ہیں۔'ہماری ملازمہ' ہم نے بھی شاپنگ کی' نہیں ہم کسی سے کم' چوتھی سیٹ' سستا سونا مہنگی پیاز' ڈیڈی گھر آئے' دودھ کا جلا' میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ ساتھ جابجا طنز کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ان کے مضمون ''چوتھی سیٹ'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ویسے چوتھی سیٹ کالج کے لڑکوں کی پسندیدہ سیٹ ہوتی ہے۔ جہاں ایک طرف باہر کے پوسٹرس نظر آتے ہیں تو دوسری طرف سامنے بیٹھی ہوئی لڑکیاں۔ایسے وقت تو حالات حاضرہ پر بے لاگ تبصرے ہو سکتے ہیں اور ذومعنی جملوں کی ادائیگی بھی۔اگر کسی نے بیچ بچاؤ کرنے کی حماقت کر لی تو وہی نشانہ بن جائے۔شرارت کبھی شرارت تک محدود رہے تو عرصے تک مسکراتے رہنے کی وجہ بن جاتی ہے اور اگر تجاوز کر جائے تو تلخی زہر کا گھونٹ بن جائے۔کبھی لڑکیوں کو کتابوں میں مصروف دیکھ کر سوال کیا جاتا ہے کہ آخر یہ پڑھائی کب تک۔اور کبھی بس کے سفر کو زندگی کا سفر سمجھ لیا جاتا ہے۔''(23)

صفیہ شاہین کی شدید خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنیں لیکن معاشی تنگدستی کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوسکا۔لیکن وہ کہتی ہیں کہ مزاح سے بھی دکھی دلوں کا مداوا کیا جاسکتا ہے' اور انسانیت کی خدمت کی جاسکتی ہے۔

شبینہ فرشوری بنیادی طور پر انشائیہ نگار اور مضمون نگار ہیں۔انھوں نے بہت کم عرصہ میں اپنے معیاری اور شائستہ مضامین کے ذریعہ شہرت حاصل کر لی ہے ان کے کئی مضامین روزنامہ ''سیاست'' کی زینت بن چکے ہیں۔ شبینہ فرشوری ایک ادب نواز گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔وہ اترپردیش کے شہر بدایوں میں پیدا ہوئیں۔بی اے تک

تعلیم حاصل کی۔2اپریل 1975 کواسلم فرشوری سے ان کی شادی ہوئی اور وہ حیدرآباد منتقل ہوگئیں۔اسلم فرشوری اُس وقت آل انڈیا ریڈیو میں اناؤنسر تھے۔محفل خواتین میں پہلا مضمون ''مثالی زندگی کس طرح گذاریں'' سنایا جسے لوگوں نے بے حد سراہا۔مضامین کے علاوہ افسانے بھی لکھتی ہیں جو''باتیں اپنے دل سے'' کے عنوان سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کے مزاحیہ مضامین میں ہم کو وہم نے مارا' خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو' بریانی کی کہانی' شادی کی دعوت ڈنر کے بغیر' نام جو آیا کام' بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کے' ستھرے مزاح کے بہترین نمونے ہیں۔ان کے مضمون ''خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''بعض خطوط ایس ہوتے ہیں جنہیں پھاڑنے کو نہیں سنبھال کر رکھنے کو جی ہوتا ہے۔جیسے شادی کے بعد ماں باپ کے خط شادی سے پہلے محبوب کے خط' شوہر کے خط جو شروع دنوں میں لکھے جاتے ہیں یادگار خط ہوتے ہیں۔جن کو بار بار پڑھنے سے بھی دل نہیں بھرتا۔خالی وقت میں وہ خط پڑھ کر دل بہلایا جاتا ہے۔ایک صاحب کو اپنی بیوی کی جدائی اتنی کھلتی ہے کہ ان کو روز خط لکھ مارتے۔کئی مہینے یہ سلسلہ چلتا رہا۔جوڑا کیہ یہ خط لا کر دیتا تھا بیوی صاحبہ ان سے ہی دل لگا بیٹھی ہیں اور شوہر کے خط کے بجائے قاصد کے انتظار میں وقت گذارتی ہیں یہ سب دیکھ کر وہ صاحب نوکری کو لات مار کر بیوی کے پاس آگئے۔
>
> دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
> کچھ تو پیغام زبانی اور ہے۔''

شبینہ فرشوری کے مضامین روزمرہ کے مسائل اور خواتین کی نفسیات کا احاطہ کرتے ہیں۔

عزیزہ محبوب 1935 کو حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔انکے والد شیخ محبوب قادری چنچل گوڑہ ہائی اسکول میں تاریخ اسلام کے استاد تھے۔اور شاعری بھی کیا کرتے' شاعری میں مفتوں تخلص اختیار کر رکھا تھا۔ طالب علمی کے دور سے ہی مضامین لکھتی ہیں۔آٹھویں جماعت میں زیر تعلیم تھیں جب ان کا پہلا مضمون ''ہر چیز پر بہار

تھی ہر شئے پر حسن تھا'' سب رس میں شائع ہوا۔اس کے بعدان کے مضامین روز نامہ رہنمائے دکن' میزان' ہمارا اقدام' اور رسالہ'ارشاد' میں شائع ہوتے رہے۔ان کی شادی ڈاکٹر سید محبوب علی سے ہوئی جو ایگریکلچر یونیورسٹی میں ڈائریکٹر کے عہدہ پر ریٹائر ہوئے۔شادی کے بعد چند سالوں تک لکھنے کا سلسلہ بند ہو گیا لیکن اب پھر سے لکھنے لگیں ہیں۔

''منکیر نکیر''''دعائیں''''اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی'' بہترین انشایئے ہیں جن میں طنز ومزاح کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ان کے مضامین اور مزاحیہ غزلیں روز نامہ سیاست میں شائع ہو چکے ہیں۔''ایک ملازم کی تلاش ہے'' میں ایک عام مسئلے پر مزاحیہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔اس مضمون میں مالک (جو لندن سے آیا ہوا ہے اور ہندوستانی گھریلو ملازم چاہتا ہے) ملازم کا نہیں بلکہ ملازم مالک کا انٹرویو لیتا ہے۔

> ''ہم نے اخلاقاً ان سے کہا کہ اگر آپ کو کوئی بات ہم سے دریافت کرنی ہو تو کرلیں۔انہوں نے کہا کہ صاحب گستاخی معاف جب آپ لندن سے یہاں آئے ہیں تو کتنے پیسے لائے ہیں؟اس سوال پر ہم غور ہی کر رہے تھے کہ انہوں نے دوسرا سوال کیا آپ کی آمدنی کیا ہے؟ اور یہ بھی کہا' جب تک کہ کوئی بینک مینیجر آپ کی مالی حیثیت کا صداقت نامہ نہ دیدے اور کوئی شریف آدمی آپ کے نیک چال چلن کی تصدیق نہ کردے ہم ملازمت کے لئے ہاں نہیں کر سکتے۔''(24)

مضامین کے علاوہ شاعری بھی کرتی ہیں۔حمد نعت' غزل' نظم جیسی اصناف میں طبع آزمائی کر چکی ہیں۔ان کی ایک مزاحیہ نظم ''ایک معصوم تمنا'' کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

خدایا مجھے ایک لیڈر بنادے　　میں ہر دن نیا ایک گھٹالہ کروں گی
اگر بھوکی مرتی ہے جنتا مجھے کیا　　میں مرغ مسلم اڑایا کروں گی
دھواں دھار تقریر ایسی کروں گی　　میں آپس میں سب کو لڑایا کروں گی
دہائی میں مذہب کی دے دے کے اکثر　　فساد اور دنگا مچایا کروں گی
قسم جھوٹی کھانی پڑے جو عزیزہ　　میں کرسی کو اپنی بچایا کروں گی

عزیزہ محبوب ایک اچھی قلم کار ہیں امید کی جانی چاہیے کہ وہ اسی طرح اپنی تخلیقات سے اردو ادب میں اضافہ کریں گی۔

نام سروری بیگم ہے اور ادبی دنیا میں اطہری فضاء کے نام سے مقبول ہیں۔اطہری فضاء 20 اپریل 1952ء کو غلام رسول کے گھر پیدا ہوئیں۔ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول نورالامراء نورخاں بازار میں حاصل کی۔اس کے بعد چادرگھاٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور دسویں جماعت تک پڑھائی کی۔اس کے بعد ایک خانگی ادارہ ''سروس گلڈ'' میں داخلہ لیا اور عثمانیہ میٹرک اور گیارھویں کا امتحان دیا اور اسی انسٹی ٹیوٹ سے PUC کی تکمیل کی۔گریجویشن کا امتحان خانگی طور پر کامیاب کیا۔

اطہری فضاء کا شمار غزل گو شاعرات میں ہوتا ہے۔1997ء میں ان کی پہلی تصنیف ''راہ گذارِ سخن'' شائع ہوئی۔2000ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔اور وہاں کے تاثرات کو ایک کتاب کی شکل دی۔حمد اور نعت کا مجموعہ ''شمعِ فروزاں'' 2001ء میں منظر عام پر آیا۔اطہری فضاء کو بچپن ہی سے شاعری سے لگاؤ تھا۔انھوں نے علی احمد جلیلی کے سامنے زانوئے ادب طئے کیے۔اور پھر 2004ء میں ان کا تیسرا مجموعہ کلام ''ورقِ گل'' کے نام سے شائع ہوا۔

اطہری فضاء سنجیدہ شاعری کے ساتھ طنزیہ و مزاحیہ غزلیں بھی لکھ لیتی ہیں۔ان کی کئی مزاحیہ نظمیں اور گیت ایسے ہیں جن میں خواتین کے اسراف، بے جا رسومات، اور سماج کی دیگر برائیوں پر عمدگی کے ساتھ طنز کے تیر برسائے گئے ہیں۔دکھنی محاوروں پر مشتمل طنزیہ و مزاحیہ کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

سوئیں بن کو میرے گھر میں گھوسیں اُنو سبل بن کو نکلیں نا　　گھر کا بھیدی لنکھا ڈھائے ایسا سمجھی میں نئیں نا
بلی بن کو سامنے رہتئیں، پچھے شیر اُنو بن تیئں نا　　کونسا رنگ ان کا ہے سچا اب تک سمجھی میں نئیں نا
باتاں کرے تو ایسے کررئیں دھکا دل کو نئیں لگنا　　تلملا کو رہتیوں دیکھو چمٹیاں زور سے لے تیئں نا
گُڑ نئیں سونچ پوریاں بناتیئں مٹھے باتاں کر کو بُھلاتیئں　　سو گز کپڑا اوار تو دے تیں اک گز بھی نہیں پھاڑتیئں نا
دنیاں میں بھوت ہوگئیں دیکھو تھالی کے بیگن لوگاں　　دوستی ایسے لوگاں سے بولو جی کیسے رکھ لئیں نا
اگلے پچھلے دُکھڑے بُھلا کو مذہب کو بھی اپنے بُھلا کو　　دشمن بھی آ کو گلے مل تیئں ''عید مبارک'' بولتیئں نا(25)

جہیز کی لعنت کے خلاف بھی اطہری فضا کا قلم آواز اٹھاتا ہے۔وہ کہتی ہیں کہ جہاں معاشرے میں ایک طرف

لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں وہیں دوسری طرف المیہ یہ ہے کہ لوگ اپنی شادی کی سالگرہ پر ہزاروں روپئے پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ایک اور معاشرتی مسئلہ جو آج کل بہت زیادہ دکھائی دے رہا ہے وہ ہے شادیوں میں عمر کا تفاوت۔ بڑی عمر کے حضرات اپنی اولاد کی عمر کی لڑکیوں سے عقد ثانی کر رہے ہیں۔

غریباں کی بے بسی سے یوں فائدہ اٹھارئیں
جہیز نئیں سو شادی بولکو سب لوگاں کو گُھمارئیں

تیس چالیس کے دہے میں وِیڈیو گرافی نئیں تھی
فلم اپنی وہ بنانے دوسرا بیاہ رچا رئیں

جوان بیٹے سجارئیں اسٹیج ولیمہ کا مل کو دیکھو
ادھر بیٹیاں بھی اپنی دلہن اماں کو سجارئیں

حسرت نئی ہے باقی فضاؔ کچھ بھی اب تو دل میں
مرنے کے بعد پنشن نئی بیوی کو کرارئیں (26)

فیشن کے نام مٹتی ہوئی مشرقی اقدار پر بھی اطہری فضا کا قلم خوب چلتا ہے۔عصر حاضر میں مغرب کی اندھی تقلید میں نئی نسل کے ساتھ ساتھ بزرگ بھی شامل ہو رہے ہیں۔اطہری فضا لکھتی ہیں۔

میاں کو وظیفہ کا گوٹہ ملا ہے　　بیگم کو میک اپ کا ڈبہ ملا ہے
جوڑے میں گجرا آنکھوں میں کجرا　　بالوں پو خِضاب کا روغن چڑھا ہے
ہوٹوں پو لِپ اسٹک لگائیں ہیں لیکن　　منہ میں دانتوں کا چوکڑا لگا ہے
چوڑیوں کی میاچنگ بھی ساڑی کے جیسی　　اس پو چمک کا بوٹا سجا ہے
ہاتاں میں مہندی کاناں میں جُھمکے　　بوڑھاپا اب یوں جوانی بنا ہے

اطہری فضاء اپنی تخلیقات میں معاشرتی برائیوں اور عورتوں کے مسائل کو اجاگر کرتی ہیں ساتھ ہی وہ صنفِ نازک کی اصلاح کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ایک اور خصوصیت جو اطہری فضاء کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے دکنی

لفظیات کا استعمال ۔ اپنی تخلیقات میں دکنی روزمرہ اور محاوروں کو برجستہ استعمال کرنے کا فن وہ بخوبی جانتی ہیں۔

اسریٰ عمر انگریزی سے اردو میں ترجمے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسریٰ عمر نے روزری کانونٹ ہائی اسکول سے ایس ایس سی اور پھر ونیتا مہاودیالیہ سے انٹرمیڈیٹ' اور بی ایس سی کا امتحان کامیاب کیا۔ M.Sc کے لئے ویمنس کالج کوٹھی میں داخلہ لیا لیکن اسے مکمل نہیں کر پائیں۔ اسریٰ عمر معروف شاعرہ عزیزہ محبوب اور سید محبوب علی ڈائریکٹر آف ریسرچ اگریکلچر یونیورسٹی کی دختر ہیں۔ حالانکہ اردو ان کے نصاب کا حصہ نہ تھی لیکن ان کی والدہ کی دلچسپی اور گھر کے ماحول نے انھیں اردو سے قریب کیا۔

اسریٰ عمر کے مضامین روزنامہ سیاست' منصف' ندائے وقت' اور خوشبو کا سفر میں شائع ہوئے۔ ان کی ایک انگریزی نظم Memories انگریزی میگزین Womens era میں بھی شائع ہوئی۔ انھوں نے روزنامہ ہمارا عوام میں خواتین اور سائنس سپلمنٹ کے سب ایڈیٹر کے فرائض بھی انجام دئے۔ سنجیدہ مضامین کے ساتھ ساتھ مزاحیہ مضامین بھی لکھتی ہیں۔ نام میں کیا رکھا ہے' انسان بمقابلہ مشین' ہماری خوشدامن صاحبہ' ماڈرن ماں اور دوسرے کئی مضامین ہیں جن میں مزاح کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

''ہماری خوشدامن صاحبہ'' ایک ایسا مضمون ہے جس میں ایک ایسی عورت (ساس) کا مرقع پیش کیا گیا ہے جنھیں ہر بات میں مداخلت کرنے کی عادت ہے۔ لیکن ان سادگی بھی قابل دید ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''سچ بڑی پرمزاح ہستی ہیں اور بڑی معصوم بھی۔ ایک بار ٹی وی پر فلم چل رہی تھی۔ سہاگ رات کا منظر تھا۔ پھولوں سے سجی سیج نظر آرہی تھی۔ اس کے سامنے ہیرو اور ہیروئین دولہا دلہن بنے کھڑے تھے۔ دلہا' دلہن کا گھونگھٹ اُلٹتا ہے۔ دلہن اس کے دھرم کے مطابق اس کے چرن چھونے جاتی ہے مگر اس پہلے ہی دولہا اسے اٹھا کر بانہوں میں لے لیتا ہے۔ سب لوگ اس جذباتی سین میں غرق تھے۔ اتنے میں ساس صاحبہ کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔'' کون۔ اس کا باوا ہے شائد؟ اور سب کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ کتنی سادہ لوح ہیں کہ ناتے نواسیوں کی شادی ہوگئی' ایک باپ اور شوہر

میں فرق نہیں کر سکتیں۔''(27)

صنف مزاح کو اس کی عمر سے امیدیں وابستہ ہیں۔

راسیہ نعیم ہاشمی، معروف شاعر وحید الحسن ہاشمی کے گھر پیدا ہوئیں۔ وحید الحسن نے شاعری میں تائب تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم ڈائزلنگ ہائی اسکول مغل پورہ میں ہوئی۔ گریجویشن کی تکمیل ونیتا مہاودیالیہ سے کی۔ اس کے بعد پریزیڈنسی کالج سے بی سی جے اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم سی جے کی سند حاصل کی۔

تعلیم کے حصول کے دوران ہی روزنامہ ''منصف'' سے وابستہ ہوئیں۔ اور روزنامہ منصف کے سپلمنٹ گھر آنگن، نئی منزلیں نئے قدم، میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ''منصف'' کے انگریزی سپلمنٹ بونس کی ادارتی ذمہ داری بھی نبھائی۔ ان کی مزاحیہ تخلیقات منصف کے کالم ''زیروزبر'' میں بھی شائع ہوئیں۔ چند مزاحیہ مضامین آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوئے۔ راسیہ نعیم ہاشمی اپنی تخلیقات سے سماج میں پھیلی برائیوں اور سماجی ناہمواریوں کو دلچسپ انداز میں بے نقاب کرتی ہیں۔ حیدرآباد کی دعوتیں، نئی روشنی کے اندھیرے بہت پچھتائے جرنلسٹ بن کے اور دیگر مضامین طنز و مزاح کا دلکش نمونہ ہیں۔ ''بہت پچھتائے جرنلسٹ بن کے'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ایک جرنلزم کے طالب علم کی معلومات کا احاطہ بہت مزاحیہ انداز میں کیا گیا ہے۔

''......کہنے لگے: جرنلسٹوں کو اخباروں، ٹی وی وغیرہ کے علاوہ میگزینوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ آپ ہمیں Eve's Weekly کے بارے میں کچھ بتائیں۔ ہمارے کچھ کرم فرماؤں نے ہمیں اخبار پڑھنے اور ٹی وی دیکھنے کے لئے تو کہا تھا لیکن میگزینوں کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس لئے اس فیلڈ میں ہماری معلومات صفر تھیں لیکن ہم نے سوچا کہ کبھی کبھی اندھیرے میں پھینکا ہوا تیر بھی نشانے پر بیٹھتا ہے کیوں نہ ہم یہ تجربہ بھی کر گذریں، کہنے لگے: Eve's Weekly دراصل Evening Weekly کا شارٹ ہے اور یہ میگزین چونکہ ہر ہفتہ شام کے وقت نکلتا ہے اس لئے اس کا نام Eve's Weekly رکھا گیا ہے۔

جیسے کہ اتوار کو نکلنے والے کا Sunday آج کے ہندوستان کے بارے میں
بتانے والے کا India Today اور بک اسٹال پر سب سے پہلی لائن میں
رکھا جانے والا نام Front LIne رکھا گیا ہے۔اسی طرح ہر سوال کے
بہتر انداز میں جواب دینے کے بعد ہمیں پورا یقین ہو چلا تھا کہ ہمیں ضرور
اسکالرشپ کا مستحق قرار دیا جائے گا۔"(28)

سماج میں رونما ہونے والے واقعات پر راسیہ نعیم ہاشمی کی گہری نظر ہے اصلاحی مضامین کے علاوہ ان کی طنزیہ تحریریں قابل دید ہیں۔حال ہی میں مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

---000---

حوالہ جات

(1) جہاں بانو نقوی　"مجھے کچھ عرض کرنی ہے" مضمون مشمولہ "حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین" از ڈاکٹر حبیب ضیاء ص35 سنہ 2005ء

(2) ڈاکٹر اشرف رفیع　"رفیعہ منظور الامین......فنکار اور فن"　مورخہ روزنامہ "سیاست" 27 جون 2010ء

(3) ڈاکٹر رفیعہ منظور الامین "چڑھتی دھوپ اترتی دھوپ"　مطبوعہ "شگوفہ" جنوری فروری 1991ء (سالنامہ) ص36

(4) ڈاکٹر حبیب ضیا　"رفیعہ منظور الامین" مشمولہ "حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین" ص17

(5) فاطمہ عالم علی　"سوکن" مضمون مشمولہ "یادش بخیر"　ص82

(6) ڈاکٹر رشید موسوی　مضمون مشمولہ: حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین　ص89

(7) ڈاکٹر رشید موسوی　"کتے" مضمون مشمولہ: کاغذی ہے پیرہن ص 90

(8) عابدہ محبوب　"کالج کی دیواریں" مضمون مشمولہ "دھجیاں"　ص120 1988ء

(9) عابدہ محبوب　"علامہ اقبال"　مطبوعہ "شگوفہ" اگست 1987ء ص56

(10) نسیمہ تراب الحسن　"غیبت سوسائٹی"　مضمون مشمولہ: حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین　ص130

(11) نسیمہ تراب الحسن　بحوالہ: حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین　ص133

(12) ڈاکٹر آمنہ تحسین　"خوشیاں بانٹنے والی جگ آپا"　مطبوعہ: روزنامہ "منصف" مورخہ 8 اکتوبر 2009

(13) سیدہ انور حیدر الدین ''نوک جھونک'' مشمولہ: حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین ص136

(14) فاطمہ تاج ''مر گئے ہم جیتے جی......!'' مضمون مشمولہ: دلاسا ص56

(15) فاطمہ تاج ''اکھاڑہ ہو رہا ہے'' نظم مطبوعہ ماہنامہ ''شگوفہ'' اپریل2009

(16) بشیر بانو ''رکشہ والے'' مضمون مشمولہ ''حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین'' ص154

(17) ڈاکٹر حبیب ضیاء ''حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین'' ص20

(18) سعدیہ مشتاق ''باقی خیریت'' مضمون مشمولہ ''حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین'' ص165

(19) رضیہ صدیقی بصیر ''ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے'' ایضاً ص170

(20) ڈاکٹر حبیب ضیاء ''حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین'' ص22

(21) رئیسہ محمد ''میچنگ'' مضمون مشمولہ ایضاً ص183

(22) صفیہ شاہین ''حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین'' ص187

(23) صفیہ شاہین ''چوتھی سیٹ'' مضمون مشمولہ ''حیدرآباد کی مزاح نگار خواتین'' ص 190

(24) عزیزہ محبوب ''ایک ملازم کی تلاش'' ایضاً ص201

(25) اطہری فضا ''دکھنی محاوروں پر مشتمل طنزیہ و مزاحیہ کلام'' ایضاً ص207

(26) اطہری فضا ''آرزو وار ماناں'' نظم مشمولہ ایضاً ص208

(27) اسریٰ عمر ''ہماری خوشدامن صاحبہ'' ایضاً ص214

(28) راسیہ نعیم ہاشمی ''بہت پچھتائے جرنلسٹ بن کے'' ایضاً ص222

آصف جہاں بیگم بلگرامی

عہد آصف جاہی میں ادب کی ہر صنف کو فروغ حاصل ہوا۔طنز ومزاح نگاروں نے بھی شعری اور نثری ادب میں اپنا سکہ جمانا شروع کیا۔دکن کی سرزمین فکاہی ادب کے لئے ہمیشہ زرخیز رہی ہے۔یہاں بلند پایہ شاعر اور نثر نگار اس صِنف کو اپناتے نظر آتے ہیں۔ایک طرف جہاں مردوں نے فکاہی ادب میں پیش رفت کی وہیں خواتین نے بھی اس صِنف میں اپنے پائے نازک کو جنبش دی اور خراماں خراماں بڑھتی گئیں۔ان ہی خواتین میں ایک نام آصف جہاں بیگم بلگرامی کا بھی ہے۔

آصف جہاں بیگم 1924ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔والدین نے آنسہ آصف جہاں بیگم نام رکھا۔ادبی دنیا میں آصف جہاں بیگم کے نام سے معروف ہوئیں۔ان کے اجداد کا تعلق بلگرام سے تھا۔ان کے والد عبدالمجید حکومت میں صدر مہتمم تعمیرات تھے۔آصف جہاں بیگم ممتاز مزاح نگار فرحت اللہ بیگ کی بھانجی ہیں۔آصف جہاں بیگم کے تعلق سے انیسہ سلطانہ رقمطراز ہیں۔

> ''آصف جہاں بیگم حیدرآباد کی مزاح نگار خاتون ہیں۔اور وہ ممتاز مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کی بھانجی ہیں۔ان کا پورا نام آنسہ آصف جہاں بیگم ہے۔آپ کے والد عبدالمجید کا تعلق بلگرام سے تھا۔حیدرآباد میں صدر محکمہ تعمیرات کے عہدے پر فائز رہے۔اور یہیں انتقال کیا۔''(1)

آصف جہاں بیگم کی ابتدائی تعلیم رواج کے مطابق گھر پر ہی ہوئی۔بعد میں انہیں مشن اسکول میں داخل کروایا گیا۔میٹرک کا امتحان خانگی طور پر کامیاب کیا۔بعد میں مزاح نگاری کی طرف توجہ مرکوز کی۔شاید اپنے خالو مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں سے انہیں تحریک ملی ہو۔ان کے مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے،ان میں تہذیب نِسواں، ٹریژر چیسٹ (Treasure Chest)، شہاب اور ناہید قابل ذکر ہیں۔ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''گل خنداں'' 1941ء میں شائع ہوا۔جس میں جملہ سولہ (16) مزاحیہ مضامین ہیں۔گناہ

دروغ بر گردنِ......؟ دوست، غائب دماغ، بے تکی، شاپنگ، میرا کمرہ، جدوجہد، جل ترنگ اس مجموعے کے بہترین مضامین ہیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء آصف جہاں بیگم کے تعلق سے لکھتی ہیں۔

''طنزومزاح کو فروغ دینے کے لئے کئی حیدرآبادی خواتین نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ ابتدائی دور میں آصف جہاں بیگم کا نام ملتا ہے۔ آصف جہاں بلگرامی مرزا فرحت اللہ بیگ کی بھانجی تھیں۔ ان کے بارہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ گل خنداں 1941 میں شائع ہوا۔'' (2)

آصف جہاں بیگم کی مزاح نگاری کے تعلق سے ان کے خالو مرزا فرحت اللہ بیگ ''گل خنداں'' کے تعارف میں لکھتے ہیں۔

''میری ایک بھانجی ہیں۔ نام ہے ان کا آصف جہاں بیگم، رسالوں کی بہتات نے ان میں بھی لکھنے کا شوق پیدا کر دیا ہے۔ اور سنتا ہوں انعام بھی پاتی ہیں۔......ہم سمجھتے تھے کہ مزاحیہ مضامین صرف مردوں کا ہی حصہ ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ صنف نازک بھی ہماری حصہ دار بن گئی ہے۔ بلکہ یوں کہوں کہ صنف نازک بننے سے قبل ہی لڑکیوں نے ہمارے ''مال'' پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ آپ بھی ان مضامین کو دیکھئے کہ یہ ہیں کیا چیز۔ فقرہ میں چٹکیاں لی گئی ہیں اور مزہ یہ ہے کہ ہر فقرہ پر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے۔'' (3)

آصف جہاں بیگم کے مضامین کے مجموعہ ''گل خنداں'' کے مقدمہ میں نصیر الدین ہاشمی نے طنز و مزاح کے ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان کے نامور طنز و مزاح نگاروں کے نام گنائے ہیں۔ آگے لکھتے ہیں۔

''خواتین میں ایک دو مزاح نگاروں کے سوا اور کوئی نہیں۔ حجاب امتیاز علی کے افسانوں کے مجموعے 'تحفے' کا ذکر کرنے کے بعد حیدرآباد سے تعلق رکھنے والوں میں صرف ایک ہی نام ہے وہ ہے آصف جہاں کا......'' گل خنداں'' کے جملہ مضامین پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کسی مضمون میں بھی

بدتمیزی یا بے ہودگی نہیں ہے۔ وہ پاکیزہ مذاق اور دل نواز لطافت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بیان میں سلاست ہے۔ ان کا ہر مضمون سرور اور کیف پیدا کرتا ہے۔ وہ لطافت اور بلند پائیگی کے اعلیٰ جوہر سے مزین ہیں۔'' (4)

آصف جہاں بیگم اپنے مجموعے کا تعارف کراتے ہوئے اپنی مزاح نگاری کے بارے میں لکھتی ہیں:

'' مجھے اس میدان میں آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ٹھیٹ دکن کی اردو میں یوں سمجھ لیجئے کہ '' جمعہ جمعہ آٹھ دن!!! ابھی تو میں اس میدان میں طفل مکتب بھی نہیں بلکہ طفل شیرخوار ہوں۔ مگر پھر اس خیال سے کہ بڑے بڑے مصنف جو اب آسمان شہرت پر درخشاں ہیں وہ بھی تو آخر کسی زمانے میں نومشق رہ چکے ہونگے اور پھر اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ '' گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں '' ذرا تسلی ہو جاتی ہے۔'' (5)

آصف جہاں بیگم نے باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی لیکن ان کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ جس کا ثبوت 'گل خنداں' کے مضامین کے مطالعہ کے بعد مل جاتا ہے۔ ان کے مضامین میں طنز اور اس کی کاٹ ان کی فکری گہرائی کا پتہ دیتی ہے۔ ان کے طنز میں کہیں تیکھا پن ہے تو کہیں خالص مزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ سماج اور اس کے اندر موجود کمزوریوں اور ناانصافیوں کو آصف جہاں بیگم نے اپنے طنز سے نہ صرف نمایاں کیا ہے بلکہ قارئین کو ان مسائل اور کمزوریوں پر غور کرنے پر مجبور بھی کیا ہے۔ ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد طیب علی کہتے ہیں۔

'' آصف جہاں بیگم کے لگائے گھاؤ گہرے نہیں ہوتے اس میں سوزش تو ہوتی ہے لیکن تکلیف نہیں ہوتی۔ ان کے طنز میں تلخی نہیں پائی جاتی بلکہ ہلکا سا کڑوا پن مزاح کی میٹھی گولی میں لپیٹ کر پیش کیا گیا ہے جس کا کھٹا میٹھا ذائقہ قاری کو عجیب لطف سے آشنا کرتا ہے۔'' (6)

آصف جہاں بیگم کی تحریریں صاف شستہ اور نکھری ہوئی ہیں۔ بات میں بات کرنے کے ہنر نے ان کی تحریروں میں نُدرت پیدا کی ہے۔ پیرایہ اظہار دلچسپ' انداز بیان رنگین اور بے ساختگی نے ان کی تحریروں میں چاشنی

اور نزاکت خیال کو پروان چڑھنے میں مدد دی ہے۔زبان پران کی گرفت ایک اضافی خصوصیت ہے۔ان کے مضامین سوقیانہ پن سے کوسوں دور معلوم ہوتے ہیں۔وہ پاکیزہ مذاق اور دلنواز لطافت میں ڈوبے ہوتے ہیں۔یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ٹھیرو! وہ بولا میرے خیال میں اس روز ہم نے سینما دیکھا تھا۔''
ہش !اس سے کیا ہوتا ہے۔اچھا خیر کونسی فلم دیکھی تھی'
'بھروسہ'
بیوقوف 'بھروسہ' تو ابھی چل رہا ہے
تو شاید 'دیوالی' دیکھا ہوگا۔
ارے پاگل 'دیوالی' تو ابھی ختم ہوا ہے۔
ہاں ہاں یاد آ گیا 'پاگل' دیکھا تھا
عقل مند ''پاگل'' تو ابھی آیا بھی نہیں۔
نہیں نہیں مجھے یقین ہے کہ دشمن دیکھا تھا دشمن ٹھیک ہے
اچھا اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے دشمن دیکھا تو اس سے کیا ہوتا ہے۔دشمن تو کئی ہفتے چلا تھا۔
اچھا اب میرا دماغ کام نہیں دے رہا ہے۔گھر جا کر سوچوں گا۔اگر کسی نتیجہ پر پہنچا تو فوراً اطلاع دوں گا۔''(7)

''غائب دماغ'' ایک اچھا مزاحیہ افسانہ ہے۔اس کے پلاٹ کے بارے میں خود آصف جہاں بیگم رقمطراز ہیں۔

''افسانہ 'غائب دماغ' کا پلاٹ بالکل صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے۔اگر چہ کہ اس میں حسب ضرورت نمک مرچ لگائی گئی ہے اور نام تبدیل کردئے گئے ہیں۔لیکن پلاٹ کی صحت کا میں آپ کو یقین دلاتی ہوں۔(8)

آصف جہاں بیگم مرقع کشی میں کمال رکھتی تھیں۔ان کے کردار بے حد جاندار اور دلچسپ ہوا کرتے

ہیں۔ایک اقتباس دیکھئے۔

''بی مغلانی (چاند بی) اُف اُف! باری تعالیٰ رحم کرتو ہم پر۔ یا تو اس دنیا میں تو ہم کو رکھ یا ان بی مغلانی کو......آپ کا وہ ساڑھے پانچ فٹ کا ''بوٹا سا قد' وہ ڈھائی سو پونڈ وزن کا' لاغر جسم' وہ تربوز نما سر' وہ ایک کان سے دوسرے کان تک چرا ہوا تنگ دہانہ' وہ کاجو جیسی ناک' ارے نہیں میں نے غلط کہا۔ بیچارہ کاجو تو ذرا سا ہوتا ہے۔آپ نے کبھی پیسٹری بھی کھائی ہے جو گردے کی شکل کی ہوتی ہے؟ بس وہی جی ہاں بالکل وہی۔اگر وہ بجائے زرد رنگ کے چاکلیٹی رنگ کی ہو تو دیکھنے والے یہیں سمجھیں کہ کسی نے ہماری پیاری بی مغلانی کی ناک (خدانخواستہ) کاٹ کر رکھ دی ہے......اور جب وہ اپنی ننھی سی ''نقارہ نما'' توند (جوایسی نرم ہے جیسے بگلے کے پروں کا تکیہ) ڈائیننگ ہال کی میز پر ٹکا کر اور دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر پوچھتی ہیں ''بیگم صاحبہ کیا پکے گا؟ تو خدا کی قسم ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے دھنک کی ایک آڑی قاس کاٹ کر بی مغلانی کی انگلیوں پر رکھ دی ہے۔اور جب آپ آتشی گلابی رنگ کا چوڑی دار پائنچوں کا پائجامہ زرد رنگ کا کرتا اور سبز رنگ کا دوپٹہ (جس پر ہمیشہ جھوٹا مسالا ٹکا ہوتا ہے) پہنتی ہیں تو قسم خدا کی بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک رنگا رنگ کا پہاڑ ہے یہ چلا آرہا ہے۔''(9)

مصنفہ نے اپنے کئی مضامن میں مختلف موضوعات کو اپنا ہدف بناتے ہوئے بڑی دلچسپ اور مفید باتیں بتائی ہیں۔توہم پرستی کے خلاف ان کی کوشش بھی ان مضامین میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔

''کبھی میں نے سفید ساری پہننے کو نکالی اور انہوں نے دیکھتے ہی حلق پھاڑنا شروع کردیا۔اوئی بی بی! یہ کیا ہے؟ پھینکو یہ ساڑی' جب دیکھو کالی یا سفید۔تمہارے دشمن کالے اور سفید کپڑے پہنیں۔بیگم صاب! کیا آپ

ڈھیلی ڈوری چھوڑ دیئے ہیں۔ بی بی کو ذرا نئیں بولتے۔ توبہ سنتے نہیں۔ کچھ نہیں جو جی چاہے کرواب سے کبھی نہیں بولوں گی۔

کبھی۔ اوئی بی بی ذرا دیکھ رئیں صاحبزادی کے کاماں۔ بارہ بجے نہا کو پیلا بلاوڑ (بلاؤز) اور پیلی ساڑی پہن کو نکلیں۔ میں بولتیوں اگر سایا وایا ہو گیا تو؟ (10)

باتوں باتوں اور مزاحیہ انداز میں کارآمد باتیں بتانے کا فن انھیں بخوبی آتا ہے۔ اس سلسلے میں انیسہ سلطانہ لکھتی ہیں۔

''بیماری ان کا دلچسپ مضمون ہے۔ اس میں تصویر کے دونوں رخوں کو دکھایا گیا ہے۔ اگر بیماری کسی سنجیدہ کام میں حائل نہ ہو تو ہم اس کو مفید سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ بیماری جو کئی دن تک مریض کو اذیت پہنچاتی رہے۔ مصنفہ کی دانست میں اچھی نہیں، ان دونوں پہلوؤں کو انہوں نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔'' (11)

اس مجموعے میں شامل مضمون 'بے تکی' میں آصف جہاں بیگم نے خالص ٹھیٹ دکنی زبان استعمال کی ہے۔ عام طور پر ایسے مضامین سلیس اردو میں لکھے جاتے رہے ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے ایسے لوگوں پر گہرا طنز کیا ہے جو سنجیدہ کام کرنے کے بجائے بے پر کی اڑاتے ہیں۔ اور وقت گذاری کے لئے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

''کیا بولوں جی پاشا کیا بھینس تھی۔ تُمنا یقین نئیں آئینگا بس اس کو دیکھتے تو ہماری دادی کی صورت یاد آ کو رونا آتا تھا اس کے رہنے کو ہمارے باوا سو کا حوض تیار کروائے وہ چار مینار ہے نیں؟ ادے وئچ۔ وہ ہمارے باوا تیار کرے سو ہے۔

کیا بولوں جی پاشا میں کیا دودھ دینے والی بھینس تھی۔ بیس گولیاں تو

فــخـط دودھ کھینچنے کو نوکرر کھے تھے۔ بچے کو دودھ پلا کو سارا گھر دودھ پیتا تھا۔ باقی سارے محلے کو تقسیم ہوتا تھا۔اس پو بھی بچ جاتا تو حوض میں ڈال کو اونٹاتے تھے۔

آہاہا! کیا بولوں جی پاشا میں۔دودھ اونٹائے تو کیا موٹی ملائی آتی تھی۔چاندنی کے سفید پاٹوں کی نات ملائی آتی تھی۔لوگاں پھاؤڑوں سے نکال نکال کو کھاتے تھے۔اور ہمارے باوا کو دعایاں بددعایاں دیتے تھے۔

ارے خاں۔ہور کیا بولوں تُمیں سنکر کُتّا کانپے جیسا کانپیں گے۔پن کہ سنائے نیں تو رہے بھی نیں جاتا۔‘‘(12)

آصف جہاں بیگم کسی ایک نہج پر مزاح کے گل بوٹے نہیں کھلاتیں۔وہ مختلف موضوعات پر الگ الگ انداز مزاح پیدا کرتی ہیں۔ان کے مضامین میں بے ساختگی، شیرینی، نزاکت خیال موجود ہے وہ روزمرہ کی معمولی معمولی باتوں میں لطف پیدا کر دیتی ہیں بے ساختہ پن اور سادہ الفاظ میں ایسی مرقع نگاری کرتی ہیں کہ لبوں پر بے اختیار تبسم بکھر جاتا ہے۔ان کے مضامین صرف مزاح پیدا نہیں کرتے بلکہ قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

’’بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ بڑے تو نو نو بجے دن تک بستر پر پڑے اینڈتے رہتے ہیں لیکن اگر ہم نے بیدار ہونے میں معمول سے ذرا بھی زیادہ دیر لگائی تو چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھایا لیا جاتا ہے۔اس پر بھی اگر ہم صبر کر کے لیٹے رہے تو سرد پانی کے گلاس ہم پر انڈیلے جاتے ہیں یا پھر لحاف کھینچ کر ہم کو ’’جمنے‘‘ کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے مجبور ہو کر ہم کو اٹھنا پڑتا ہے۔......اور استادوں کے ظلم کی تو انتہا ہی نہیں وہ وہ سزائیں دی جاتی ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ جب شیطان نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اگر اللہ میاں اس کو اُن سزاؤں میں سے ایک سزا بھی دیتے جو استاد اپنے شاگردوں کو دیا کرتے ہیں تو ہم کو یقین ہے کہ شیطان کو جنت سے نکالنے کی نوبت ہی نہ آتی۔‘‘(13)

''جل ترنگ'' ایک شگفتہ اور دلچسپ مضمون ہے جس میں انہوں نے ایسے لوگوں کا مضحکہ اڑایا ہے جو ڈینگیں ہانکتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر باتیں بناتے ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''لاکھ سمجھایا کہ بھائی صاحب! اگر آپ کو جل ترنگ بجانے کا ایسا شوق ہے تو بجالیا کیجئے' اپنے احباب کی محفل میں۔
>
> یہ بیچارے گھر والوں کی صبح سے لے کر شام تک کیوں شامت آتی رہتی ہے۔مگر لاحول ولا کافر ہے وہ جو شرافت سے کوئی بات مان لے۔بھلا وہ دھوبی ہی کیا جو کہے سے گدھے پو سوار ہو!!!(14)
>
> ''حالانکہ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ان کے نالائق دوستوں کی دعوت کا میں نے اس سے قبل کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔لیکن ذرا ان کی احسان مندی ملاحظہ فرمایئے کہ آپ لونڈے کو بطور خاص سکھا کر بھیجتے ہیں اور وہ گدھے کا بچہ بالکل انجان بن کر (جی ہاں! بالکل انجان بن کر گویا موقعہ ومحل کی نزاکت کا اسے ذرا اندازہ نہیں ہے) آکر شکور بھیا کا یہ حواس باختہ کر دینے والا جواب سناتا ہے کہ آپ ہی نے تو آج دعوت کے بہانے اپنے سہیلیوں کے درشن خفیہ طور پر کروانے کا وعدہ کیا تھا تا کہ میں اپنے شادی کے لئے اچھی سے اچھی بیوی کا انتخاب کرسکوں۔اور اب آپ ہی 'میں نے کب دعوت دی تھی' کہکر انجان بن رہی ہیں؟؟؟(15)

آصف جہاں بیگم نے مزاح نگاری کو اس وقت کے لحاظ سے سجایا اور اس میں اپنی بساط کے مطابق رنگ بھرے۔آصف جہاں بیگم نے ایسے وقت فن مزاح نگاری کو اپنایا جب کہ اردو میں بالعموم اور فکاہی ادب میں بالخصوص صنف شاعری کو ہی زیادہ تر اپنایا جاتا تھا۔نثر کے ذریعہ فکاہی ادب کے فروغ دینے کا رواج کم ہی تھا۔

مزاح نگاری ایک مشکل اسلوب نگارش ہے اور اس فن میں احتیاط کی بے حد ضروری ہے۔تھوڑی سی بھی چوک سارے فن پارے کو تباہ کر دیتی ہے۔اس سلسلے میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں۔

''مزاحیہ نگاری ایک خاص شعبہ ہے جو ہر کس و نا کس کا اس میدان میں جولانی دکھانا آسان کام نہیں ہے۔طنز نگاری میں لغزش ہو جائے تو پورا مضمون تباہ ہو جاتا ہے۔یا پھر سوقیانہ پن آجاتا ہے۔اس لئے نہایت حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔آصف جہاں بیگم کے مضامین میں اس لغزش سے پاک وصاف ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔سخت سے سخت نکتہ چیں بھی نکتہ چینی کے لئے آمادہ ہو تو اوس کو مشکل سے کامیابی ہوگی۔''(16)

متنوع موضوعات اور ان پر دلچسپ انداز میں بحث کرنے میں آصف جہاں بیگم کو کمال حاصل تھا۔اس کے علاوہ وہ اپنے کرداروں کی تخلیق میں بھی بڑی فنکاری اور چابکدستی سے کام لیتی تھیں۔کردار سازی اور اس کے تمام تر لوازمات اور اس کی پیچیدگیوں سے آصف جہاں بیگم بخوبی واقف تھیں اور انہیں بہ کمال خوبی پیش کرنے کی استعداد بھی رکھتی تھیں۔

---000---

حوالہ جات

(1) انیسہ سلطانہ ''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو نما'' ص43

(2) ڈاکٹر حبیب ضیاء ''حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین'' ص16

(3) مرزا فرحت اللہ بیگ ''تعارف'' مضمون مشمولہ ''گل خنداں'' 1941 ص 6

(4) نصیر الدین ہاشمی ''مقدمہ'' مشمولہ ''گل خنداں'' 1941ص9

(5) آصف جہاں بیگم ''عرض حال'' مشمولہ ''گل خنداں'' ص22-21

(6) محمد طیب علی ''آزادی کے بعد جنوبی ہند میں اردو طنز و مزاح کا ارتقاء'' 2007 ص84 غیر مطبوعہ

(7) غائب دماغ مضمون مشمولہ ''گل خنداں'' ص105

(8) آصف جہاں بیگم ''عرض حال'' مشمولہ ''گل خنداں'' ص26-25

(9) آصف جہاں بیگم ''گناہ دروغ بر گردنِ......؟'' مضمون مشمولہ ''گل خنداں'' ص12

(10) آصف جہاں بیگم ''گناہ دروغ بر گردنِ......؟'' مضمون مشمولہ ''گل خنداں'' ص14

(11) انیسہ سلطانہ ''حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو نما'' ص42

(12) آصف جہاں بیگم ''بے تکی'' مضمون مشمولہ ''گل خنداں'' ص132

(13) آصف جہاں بیگم ''جدوجہد'' مضمون مشمولہ ''گل خنداں'' ص147

(14) آصف جہاں بیگم ''جل ترنگ'' مضمون مشمولہ ''گل خنداں'' ص162

(15) آصف جہاں بیگم ''جل ترنگ'' مضمون مشمولہ ''گل خنداں'' ص169

(16) نصیر الدین ہاشمی ''مقدمہ'' مشمولہ ''گل خنداں'' ص15

ڈاکٹر زینت ساجدہ

ڈاکٹر زینت ساجدہ کا پیدائشی نام زینت النساء۔ساجدہ بانو ہے' ادبی دنیا میں زینت ساجدہ کے نام سے معروف ہیں۔ڈاکٹر زینت ساجدہ کی پیدائش 28 مئی 1924ء رائچور کے ایک سادات گھرانے میں ہوئی ان کے والد مولوی سید مصطفیٰ قادری سبز پوش انعام دار خاندان نوردیا سے ددھیالی اور قاضی محمود بحریؒ سے ننھیالی رشتہ رکھتے تھے۔جو گلبرگہ کے شرفاء اور سادات گھرانے کے بزرگ تھے۔ننھیال اور ددھیال میں تقریباً سبھی ذی علم اور طریقت وسلوک سے وابستہ رہے۔

زینت ساجدہ کی ابتدائی تعلیم اس دور کے رواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔انھوں نے اپنے دادا سید رسول قادری سبز پوش سے قرآن' دینیات' اور اخلاقیات کی تعلیم حاصل کی۔زینت ساجدہ کو ان کے دادا بے حد عزیز رکھتے تھے' ان کی تربیت میں ان کے دادا کا بے حد اہم کردار رہا۔سید رسول قادری محکمہ تعلیمات میں ناظر اور پھر مددگار ناظم کے عہدے پر فائز رہے۔ملازمت کے سلسلے میں جب ان کے دادا حیدرآباد منتقل ہوئے تو زینت ساجدہ بھی اپنے والد سید مصطفیٰ قادری کے ساتھ حیدرآباد آ گئیں۔

حیدرآباد میں ان کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کاچی گوڑہ میں واقع مدرسہ تعلیم المعلمین (ٹیچرس ٹریننگ اسکول) میں ہوئی اور پھر وہیں سے 1941ء میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔1943ء میں ویمنس کالج سے ایف اے اور پھر بی اے 1945ء میں کامیاب کیا۔اس کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کا امتحان کامیاب کیا۔اس زمانے کے طریقہ کار کے مطابق ایم اے کے لئے پروفیسر سید سجاد کی نگرانی میں ''اردو غزل'' پر مقالہ لکھا۔یہ مقالہ 1948ء میں سقوط حیدرآباد کے ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔زینت ساجدہ نے ڈاکٹر حفیظ قتیل اور پروفیسر مسعود حسین خاں کی نگرانی میں اشرف بیابانی کی تصنیف ''نوسرہار کی تنقید وتدوین'' کے عنوان پر ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ تسوید کیا۔اس قابل قدر مقالہ پر 1964ء میں انھیں جامعہ عثمانیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔

زینت ساجدہ بچپن سے ہی ذہین واقع ہوئی تھیں۔انھیں تحریر سے زیادہ تقریر میں دلچسپی تھی۔انھوں نے

ابتدائی تعلیم کے دور ہی سے تحریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کیا اور ہر بار انعام حاصل کیا۔ان کی پہلی تخلیق ایک افسانہ نما مضمون ''لاٹری'' ہے جو ماہنامہ ''شہاب'' حیدرآباد میں شائع ہوا تھا۔حالانکہ چوتھی جماعت میں ہی ایک چھوٹا سا ڈرامہ ''باغبان'' لکھ کر اپنے اساتذہ کو چونکا دیا تھا(یہ ڈرامہ اب دستیاب نہیں)جماعت نہم میں زیر تعلیم تھیں کہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے کہانیاں اور مضامین نشر کرنے لگیں۔جامعہ عثمانیہ میں وہ اپنی غیر معمولی ذہانت اور فعال شخصیت کی بناء پر ہمیشہ مقبول رہیں۔زنانہ کالج کی تہذیبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ایم اے کی طالب علمی کے دور میں کہانیوں کا مجموعہ ''جلترنگ'' منظر عام پر آیا۔دیگر کتابوں میں حیدرآباد کے ادیب' تلگو ادب کی تاریخ' علی عادل شاہ ثانی شاہی اور کلیات شاہی قابل ذکر ہیں۔بچوں کے لئے دو کتابیں 'محبّ وطن خواتین' اور 'بہادر خواتین' تصنیف کیں۔دکنیات کے ماہر اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد ملک کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ملک کی تعمیر میں خواتین بھی مردوں کے شانہ بشانہ شریک ہو رہی تھیں۔1947ء میں ایم اے کی طالب علمی کے دوران ہی انھوں نے ملازمت اختیار کی۔ 1969ء میں ریڈر مقرر ہوئیں اور پھر صدر شعبہ اردو' عثمانیہ یونیورسٹی کے عہدے پر خدمات انجام دے کر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئیں۔

زینت ساجدہ ذہنی طور پر ترقی پسند تحریک سے متاثر تھیں۔چنانچہ وہ ترقی پسند مصنفین کی حیدرآباد کانفرنس 1948ء میں شریک تھیں۔اس اجلاس میں سردار جعفری' کیفی اعظمی' فراق گورکھپوری' سکندر علی وجد' کرشن چندر اور نیاز حیدر وغیرہ نے شرکت کی تھی۔یہ تمام ادیب وشعرا ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتے تھے۔زینت ساجدہ بھی ادب کے ذریعہ سماج کو بدلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''جلترنگ'' اس کا بین ثبوت ہے۔ان ہی اجلاسوں میں ان کی ملاقات حسینی شاہد سے ہوئی۔دونوں میں نظریاتی ہم آہنگی تھی۔دھیرے دھیرے یہ ایک دوسرے کے قریب آئے اور بالآخر 1958ء میں دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔دراصل حسینی شاہد کو زینت ساجدہ کی ادبی شخصیت نے بے حد متاثر کیا۔عاتق شاہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

> ''میں نہیں جانتا کہ زینت نے شاہد کو دریافت کیا یا شاہد نے زینت کو'
> اور یہ بھی نہیں جانتا کہ ان دونوں میں کون کس کی فتوحات میں شامل اور کون
> کس کی زندگی کا حاصل۔''(1)

زینت ساجدہ ایک کامیاب قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شفیق ماں بھی رہیں انھیں تین اولادیں ہوئیں، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ سجاد شاہد، فیضی شاہد اور آمنہ شاہد۔ زینت ساجدہ ایک ہمہ پہلو شخصیت کا نام ہے وہ بیک وقت ایک اچھی دوست بھی ہیں ایک کامیاب انشاپرداز ایک شفیق استاد بھی اور ایک بے باک قلم کار۔ کسی بھی شخصیت کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور ہر پہلو میں ایک رنگ اور اس کے ہر رخ میں ایک آہنگ پایا جاتا ہے۔ زینت ساجدہ بھی ایک ایسی ہی ہمہ رخی شخصیت کا نام ہے۔ بقول فاطمہ عالم علی خاں فنون لطیفہ کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس پر زینت ساجدہ کو دسترس نہ ہو۔ اس سلسلے میں ممتاز حبیب لکھتی ہیں:

> ''ادبیت تو انسانی شخصیت کا ایک پہلو ہوتی ہے۔ اور پہلوؤں کا مشاہدہ تو ساتھ رہ کر ہوسکتا ہے۔ زینت ساجدہ کے مختلف پہلو ادبیت، سخن شناسی، سخن نوازی، استاذیت وغیرہ منظر عام پر ہیں۔ بہت سارے دوستوں نے ان کی شخصیت کے اور پہلوؤں یعنی ان کی جرات، بے باکی، صداقت ہمدردی، صلہ رحمی، فرائض شناسی کو بھی اجاگر کردیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی نجی زندگی کے بعض پہلوؤں کو بھی پبلی سٹی دے دی ہے۔ یوں تو زینت ساجدہ خود کھلی کتاب ہیں، ان کا ظاہر اور باطن ایک ہے بلکہ میں تو کہوں گی کہ باطن ظاہر سے بھی اچھا ہے۔'' (2)

زینت ساجدہ ایک اچھی انشائیہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک دردمند دل کی مالک ہیں۔ شوخی اور شگفتگی ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ نڈر اور بے باک اظہار میں یقین رکھتی ہیں، لیکن پھکڑ پن سے کوسوں دور۔ وہ بے تکلف ضرور ہوتی ہیں مگر شائستگی کا دامن کبھی وہ اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ زینت ساجدہ کے بارے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی رائے جامع معلوم ہوتی ہے۔

> ''کوئی کہے 'زینت بڑی دین دار' مذہبی بلکہ مولوی قسم کی عورت ہے'۔ لیکن کوئی اور کہے گا 'جی نہیں! بڑی بے باک اور پھکڑ ہے'۔ بھری محفل میں کچھ بھی کہہ دے گی اور اچھے اچھوں کے دل توڑ دے گی۔ رکھ

رکھاؤ کی، جسے صاف ستھری زبان میں مکاری اور نستعلیق زبان میں مصلحت کہا جاتا ہے، زینت قائل نہیں ہے اور یہی اس کی کمزوری ہے جس کی وجہ سے اگر کچھ لوگ اس سے ناراض ہیں تو اکثر لوگ اسی بناء پر اسے ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ زینت چاہے بہت کچھ ہو لیکن میں اسے بنیادی طور پر ٹیچر اور مدرس سمجھتا ہوں۔ اس کو تدریس سے عشق اور ٹیچری کی عادت پڑی ہوئی ہے۔"(3)

ان کے مضامین اور انشائیے ماہنامہ "سب رس" "ایوان" "شہاب" "صبا" ہفتہ وار "نیا آدم" "شہکار" "گجر" "اردو بلٹز" "سب رس" کراچی" "پونم" "شگوفہ" اور روزنامہ "سیاست" میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ مختلف قلمکاروں کی تصانیف پر مقدمات اور تعارفی نوٹ مختلف عنوانات سے تحریر کئے۔ مثلاً حمایت اللہ کا مجموعہ کلام دھنمڑی میں "تو دکنی ہے پیارے تو دکنیچ بول" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ (حمایت اللہ کو وہ بہت عزیز رکھتی تھیں اور انھیں پیار سے "چنوں میاں" کہہ کر بلاتی تھیں۔)

زینت ساجدہ کی تصانیف کی تفصیل کچھ اسطرح ہے۔

جلترنگ (طبع زاد افسانوں کا مجموعہ)		مطبوعہ مارچ 1947ء
حیدرآباد کے ادیب	حصہ اول (ترتیب)	مطبوعہ ڈسمبر 1958ء
حیدرآباد کے ادیب	حصہ دوم (ترتیب)	مطبوعہ اگست 1962ء
کلیات شاہی (ترتیب)		مطبوعہ فروری 1962ء
علی عادل شاہ ثانی شاہی		مطبوعہ 1962ء
تلگو ادب کی تاریخ (ترتیب)		مطبوعہ 1962ء
تاش کے محل (تلگو ناول کا ترجمہ)		
اردو غزل (مقالہ برائے ایم اے)		غیر مطبوعہ (عدم دستیاب)
نوسر ہار کی تنقید و تدوین		تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی غیر مطبوعہ
محبّ وطن خواتین		

حکمران خواتین

نگر نگر کی بات

اسلوب بیاں اور (انشائیوں اور افسانوں کا مجموعہ)　　　مطبوعہ 2009

''اسلوب بیاں اور'' ان کی پہلی برسی کے موقع پر اردو مجلس کی جانب سے شائع کیا گیا۔ جس میں 17 انشائیے اور 9 افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں فاطمہ عالم علی خاں کا ایک تاثراتی مضمون ''درد تھمے تو بات کریں'' بھی شامل ہے اور اس کا دیباچہ یا پیش لفظ مرزا ظفر الحسن نے لکھا۔ پیش لفظ کے تعلق سے ڈاکٹر رحمت یوسف زئی لکھتے ہیں۔

> ''یہ پیش لفظ انھوں نے 1982ء میں اُس وقت تحریر کیا تھا جب آپا اپنے عزیز واقارب سے ملنے پاکستان گئی تھیں۔ تب ظفر الحسن صاحب نے پیش کش کی تھی کہ ان کے انشائیے مل جائیں تو وہ انھیں کراچی سے شائع کردیں گے۔ آپا نے حیدرآباد سے اپنے انشائیے منگوائے' ظفر الحسن صاحب نے ان پر پیش لفظ لکھا لیکن زندگی نے انھیں مہلت نہ دی اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔ اب جب کہ یہ تحریریں شائع ہونے جارہی ہیں' مناسب سمجھا گیا کہ مرزا ظفر الحسن کی تحریر کو من وعن شامل کرلیا جائے۔''(4)

زینت ساجدہ رواں نثر لکھنے پر بھرپور قدرت رکھتی ہیں۔ بے تکلف اور بے لاگ اظہار ان کی تحریروں کا خاص وصف ہے۔ وہ موضوع کی جزیات اور متعلقات کا بغائر جائزہ لیتی ہیں اور اپنے فن سے موضوع کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ ان کے انشائیے ''مکان بنا ڈالا'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''پہلے ہماری محفل میں گل وبلبل' عارض ورخسار' ناول وافسانہ' ادب اور سماج' انسان اور انسانیت کے تذکرے ہوتے تھے اور آج کل وڈر' اوڑ' بیلدار' اور مستری سے بنڈ' گنٹ' کڑیاں' گُنڈ' پھاوڑا اور دھمس کی بات کرتے ہیں اور اینٹ' چونے' سمنٹ اور لوہے کی فکر میں گُھلے جارہے ہیں۔

ہر وقت مستری اور گتہ دار کی چوری پکڑنے کی فکر کیا کرتے ہیں۔سوچتے ہیں
کہ کسے دھمکائیں، کسے پٹوائیں، کس کی مزدوری کاٹ لیں اور کسے جھانسہ
دیں، بعض اوقات اپنی اوقات پر خود لعنت بھیجتے ہیں۔'' (5)

اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں۔

زینت آپا موضوع اور نفس موضوع کا بھرپور مطالعہ کرتیں، متعلقات
موضوع کا جائزہ لیتیں اور جب موضوع پوری طرح ان کی گرفت میں آجاتا
تو اس کے مقدر کو چمکا دیتیں۔'' (6)

زبان وبیان پر زینت ساجدہ بھرپور قدرت رکھتی ہیں۔وہ عام فہم انداز میں اظہار خیال کرتی ہیں۔ثقیل الفاظ اور طول طویل جملوں سے گریز کرتی ہیں۔ان کی تحریر اور تقریر میں یکسانیت معلوم ہوتی ہے۔اس سلسلے میں مرزا ظفر الحسن رقمطراز ہیں۔

''صحیح زبان لکھ لینا کوئی کمال نہیں ہے۔کمال تو یہ ہے کہ قاری زبان کی
وجہ سے بھی کسی تخلیق کے مطالعہ کی طرف مائل ہو۔اس لحاظ سے زینت ایک
با کمال قلمکار ہیں۔صاف ستھری اور سادہ زبان لکھتی ہیں اور اُسی روانی اور
شگفتگی کے ساتھ جیسی کہ وہ تقریر کرتی ہیں۔جملوں میں نہ آرائشی تراکیب اور
نہ چربی چڑھے ہوئے موٹے موٹے الفاظ ملتے ہیں جن سے مفہوم خبط اور
قاری خبطی ہوجاتا ہے۔'' (7)

زینت ساجدہ کے انشائیوں میں دکنی تہذیب کی خوشبو واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔حیدرآباد کی مخصوص اور منفرد شناخت کا احساس ان کے انشائیوں سے بخوبی ہوتا ہے۔ان کی تحریروں کی ایک اور خصوصیت ہے ندرت بیان۔وہ کسی بھی موضوع کو ایک انوکھے زاویے سے قاری سے روشناس کراتی ہیں۔

زینت ساجدہ کی تحریروں میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ ساتھ گہرا طنز بھی ملتا ہے۔ان کی ہر تخلیق میں سماجی

پہلو واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعے کو لے کر اپنی تخلیق کا تانا بانہ بنتی ہیں طنز کے نشتروں کے ساتھ مزاح سے بھی کام لیتی ہیں۔ بڑے سے بڑے عالمی مسئلے کو بھی وہ مقامی رنگ میں بیان کرنے میں ماہر ہیں۔ وہ کردار کی مناسبت سے زبان لکھتی ہیں۔

> ''یہ بندر نچانے والے بھی عجیب مسخرے ہیں۔ بے چارے جانوروں کو نچاتے ہیں۔ بی جمالو کو دیکھئے اچھے بھلے انسانوں کو نچاتی ہیں۔ یہ کٹھ پتلی کے بازی گر کی طرح پیچھے بیٹھی ڈور کھینچتی ہے اور ہم آپ تگنی کا ناچ ناچتے ہیں......مزاح پوچھا اور کہنے لگیں' ہے ہے بہن! یہ کیا لیے بیٹھی ہو' تم بھی عجیب ہو' یہ پرانے چوحاشیے یہ اکلائی پشواز بھلا کس کے لیے سینت سینت کر رکھتی ہو؟ جنھیں ان چیزوں کو سر آنکھوں پر رکھنا تھا وہ تو ان کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ تمہاری آنکھیں مُندی نہیں کہ مٹی کے شیر میں بکتے نظر آئیں گے' اور لو' بھلا تم آنکھیں کھولے جاگتی بیٹھی ہو تو تمہاری کون سی چیز بازار میں نہیں رلتی پھرتی۔'' (8)

بی جمالو ایک ایسا کردار ہے جو ہر کسی کے معاملے میں دخل اندازی کرتا ہے اور پر امن ماحول میں آگ لگا کر خاموشی سے کھسک جاتا ہے۔ بی جمالو ایک علامتی کردار ہے۔ یہ کردار ہمارے معاشرے میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ بین الاقوامی منظر نامے میں امریکہ ایک ایسا ہی کردار ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں میں ایک خصوصیت ان میں مقامی رنگ کا نظر آنا ہے۔ مغل پورہ' نیا پل' گنڈی پیٹ' سالار جنگ میوزیم' عثمانیہ یونیورسٹی' عابد روڈ' مٹی کا شیر' جمعرات بازار' گھانسی بازار وغیرہ جیسے محلوں کا ذکر ان کے انشائیوں میں نظر آتا ہے۔ حالانکہ وہ سلیس اردو میں لکھتی ہیں لیکن ان کی تخلیقات میں دکنی روزمرہ اور لفظیات کا استعمال نہایت خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ سینت سینت کر رکھنا' پھول کو کُپّا ہو جانا' دیکھا دیکھی' جڑ کالہ' ٹام ٹام کرنا وغیرہ اور ان جیسے کئی الفاظ ان کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ وہ کسی بھی شئے کا ذکر اس کی جزیات' اقسام اور اس کے مترادفات کے ساتھ کرتی ہیں۔ مثلاً زیورات کا ذکر وہ کچھ اس طرح کرتی ہیں۔

> ''آپ میاں کے ساتھ بازار جا رہی ہیں' کانوں میں جُھمکے' ماتھے پر

جھومر، چوٹی میں سونے کا تعویز اور سر میں پھول، کمر بگلوس، ہاتھوں میں کڑے کنگنیاں، گلے میں کنٹھا، ہنسلی، لاطمع، چندن ہار، کنگن پہنچیاں، ادھے دتیاں، پور پور چھلے، پاؤں میں توڑے، پازیب۔ میاں کو دفتر جانا ہے یا آپ کو وقت پر کہیں پہنچنا ہے مگر ٹھمک ٹھمک کر چھم چھم کرتی چلی جا رہی ہیں دل اس فکر میں کہ زیور گم نہ ہو جائے۔''(9)

مختلف پکوانوں کو کچھ ایسے لطیف انداز میں گناتی ہیں جس سے دکن کی تہذیب کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔

''جب سالن دسترخوان پر آتا ہے تو اتفاقاتِ زمانہ نام بدل دیتے ہیں۔ کوفتہ کا سالن، بھنڈی کی کڑی کہلاتا ہے اور پسندے، سوختہ کبابوں کو مات کرتے ہیں۔ میٹھے میں شکر کم یا زیادہ ہو جاتی ہے۔ چاول زیادہ گل گئے ہیں۔ ایک تو جان جلا کر پکاؤ اس پر کھانے والے سو نام دھریں۔ سارا کیا کرایا غارت اُلٹے کوفت ہونے لگی۔ وہی مثل ہوئی مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والے کو مزہ نہ آیا۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا ہاتھ سے ڈوئی چلا رہے ہیں، کان بچے کی آواز پر لگے ہیں اور منی بی بی کے بے معنی سوالوں کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ کہتے سب یہی ہیں واہ بھئی کیا شاندار پکوان ہے۔ کھانے کا مزہ کرکرا ہو گیا۔(10)

موسم گرما کی مناسبت مختلف چیزوں کے ذکر کے بعد پھلوں کا جب ذکر کریں گی۔

''ان سب باتوں کو چھوڑ بھی دیجئے تو ایک نعمت ایسی ہے جس پر لاکھوں نعمتیں قربان اور وہ ہیں آم۔ آم تخمی آم، قتی آم، سپیدہ، لنگڑہ، نیلم ملغوبہ، دل پسند، پدّ ارسال، بے نشان، چھوٹے بڑے قسم قسم کے اور مزے مزے کے آم۔ پھلوں کی دکانوں پر رونق آ گئی۔''......معلوم نہیں جنت میں آم ہوں گے کہ نہیں۔ نہیں تو دنیا سے پارسل اور بھنگی منگوانی پڑے گی۔''(11)

انھیں دکنی تہذیب اور حیدرآباد سے بے پناہ محبت ہے۔ حیدرآباد ایک ایسا شہر ہے جس نے ہمیشہ باہر والوں کو سایہ فراہم کیا لیکن یہ احسان فراموش لوگ اس جنت نشان شہر کی مختلف طریقوں سے برائی کرتے ہیں اس صورتحال کو زینت ساجدہ ''گنڈی پیٹ کا پانی'' میں کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں۔

''دیکھئے نا چلے آرہے ہیں۔اب کیوں بتائیں کہاں سے۔ میلے چیکٹ کپڑے زیب تن' حلیہ ایسا کہ پشتینی نواب ہوں۔کھڑی کھٹیا پر زندگی بسر ہوتی ہے۔یہی ان کا بیڈروم ہے اور یہی ڈرائنگ روم۔منہ اُ گالدان بنا ہوا ہے۔جوتیاں چٹخاتے گھر سے چلے تو سیدھے یہیں آکر دم لیا۔نقاہت یا نزاکت کا یہ عالم ہے کہ ہر قدم پہ گر پڑنے کا گمان ہوتا ہے۔آپ ترس کھا کر گنڈی پیٹ کا پانی پلاتے ہیں۔کچھ دنوں بعد دکھائی دیں تو پہچاننا دشوار ہو جاتا ہے۔توند نکل آئی گردن پر چربی چڑھ گئی۔پہلے سر جھکا رہتا تھا' اب لقا کبوتر بن گئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ حیدرآباد کو صلواتیں سنائی جارہی ہیں۔اپنی تہذیب وشائستگی کے گُن گاتے ہیں۔ہائے وطن میں کیا کیا چھوڑ آئے۔بات بات میں وس طرف وس طرف سنتے سنتے آپ کے کان پک جاتے ہیں۔وطن گئے بھی تو دوسرے ہی ہفتہ پھر یک بینی ودو گوش موجود۔سچ ہے ایک بار پیا تھا دوسری بار پینے کی ہوس ہے والی بات ثابت ہوجاتی ہے۔'' (12)

''کباڑ خانے سے میوزیم تک'' اس انشائیے میں زینت ساجدہ نے گھر کی بے کار چیزوں کو میوزیم بنانے اور کاٹ کباڑ سے نوادارات برآمد کرنے کی اچھوتی ترکیب درج کی ہے۔اور اس طرح نوادرات کا کاروبار کرنے والے ان دھوکہ بازوں کی پول کھول دی ہے جو بے کار چیزوں کو تاریخی اہمیت کا حامل بتا کر دام کھرے کر لیتے ہیں کیونکہ نوادرات کے اس کاروبار میں شئے اور اس کے ساتھ جڑی ہوئی کہانیوں کی اہمیت ہوتی ہے۔

''ہم نے کہا' چائے تو پی لیجئے اور چائے پینے سے پہلے ہم مصر ہوئے

کہ ہاتھ ضرور دھولیں۔ یہ ہماری تہذیب ہے۔ہم نے پرانا آفتابہ سلفچی منجھوا رکھا تھا۔ دیکھ کر پھڑک گئی اور فوراً ہم نے ریکارڈ بجانا شروع کر دیا' ادے یہ آپ کو پسند ہے لے جائیے۔ ہماری نانی کے دادا کو کسی مغل شہزادی نے نذر کیا تھا کہ سید ہیں وضو کریں اور اس کے حق میں دعا فرمائیں۔ کہنے لگی' اسے تو کسی میوزیم میں ہونا چاہیے اور آپ اسے دن رات استعمال کرتی ہیں۔ ہم نے کہا' آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ پھر یہ بیدری اگالدان جو تخت کے نیچے دھرا ہے اور قطب شاہیوں کے دور کی صنعت ہے' یہ سماوار جو کشمیر کی بادشاہ بیگم کی ملکیت رہا ہے اور یہ گیا جو شاعرہ حبہ خاتون کا ہے' یہ بھی میوزیم میں رکھنے لائق ہیں۔ کہتے کہتے ہم بڑی معصومیت سے ہنسے۔ وہ سنجیدہ ہو کر ہمیں ان کی اہمیت سمجھانے لگیں کہ ان چیزوں کو جھاڑ پونچھ کر شوکیس میں سجا دینا چاہیے۔ ہم نے کہا جاگیر ضبط ہو جانے کے بعد ہم نے اتنی تکلیفیں ناحق اٹھائیں۔ یہ چیزیں کسی میوزیم کو بیچ دیتے' مگر ہمارے دیس میں ان چیزوں کا قدرداں کہاں۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ سر ہو گئی کہ ابھی ابھی ان چیزوں کا سودا ہو جائے......زبردستی دو ہزار روپے اس نے ہمیں پکڑا دیے اور ہم نے نہیں نہیں کرتے انھیں پاندان میں رکھ لیا۔''(13)

ڈاکٹر زینت ساجدہ کا سماجی شعور اور تاریخی شعور بہت گہرا نظر آتا ہے وہ عورت کو اس کا پاکیزہ مقام دلانا چاہتی ہیں اور ان کی نظر میں عورت صرف رسوئی گھر کا حصہ نہیں اور نہ ہی بچے پیدا کرنے والی مشین۔ اس لئے زینت ساجدہ کے یہاں نسوانی کرداروں میں جنسی ابتذال نظر نہیں آتا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ابھی اماں کہتی تھیں کہ اللہ کو اپنے بندوں سے ستر ماؤں کے برابر محبت ہوتی ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا ستر باپوں کی محبت ہے۔ باپ میں وہ مامتا کہاں جو صرف ماں میں ہوتی ہے۔ یوں اولاد کو وہ بیوی کی خاطر چاہے تو چاہ لے۔ مگر جہاں موقع ملا اور باپ چچا بن گیا۔ وہ تو شاید اس لیے ہے کہ بچوں کے لئے

روپیہ پیدا کرتا رہے۔ وہ ماں کی طرح دکھ کب جھیلتا ہے۔ راتوں کی نیند کب حرام کرتا ہے۔ اولاد کے لئے اپنی ذات کو کہاں بھول جاتا ہے۔ وہ قربانی کر ہی نہیں سکتا۔ جانتا ہی نہیں کہ قربانی اور مامتا میں کیا تعلق ہے۔ مامتا صرف ماں میں ہوتی ہے۔ اور ماں عورت ہوتی ہے۔ خالص عورت۔ عورت کا کمال اس کا ماں بن جانا ہے۔ وہ فطرتاً ماں بن کر ہی پیدا ہوئی ہے۔ اور جب ستر ماؤں کی مامتا ایک ہوجائے تو وہ ہستی ایک عظیم ماں ہوئی نا۔ عالم گیر مامتا والی قوتِ تخلیق دونوں میں ہے۔ اللہ میں بھی اور ماں میں بھی۔ جس کی کوکھ سے جنم لینے والے سب بچے اس کے لئے یکساں ہیں۔'' (14)

ان کے مضمون ''میری مرغیاں'' سے ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے حیدرآباد کے قدیم معاشرے میں گھریلو ماحول کی عکاسی کی ہے اور محاوروں اور ضرب الامثال کا استعمال بڑی مہارت سے کیا ہے۔

''ادھر مرغیوں میں بھی لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اب دونوں کی جو چشمک شروع ہوئی تو جینا دوبھر ہو گیا۔ اچھی خاصی نند بھاوج کی لڑائی تھی۔ اس کی بات پر وہ ناک بھوں چڑھائے۔ اس کی بات پر وہ منہ بنائے۔ میں بہیترا کہوں کہ بھئی تو پرانی ہے گھر کی بیٹی ہے تو ہی غم کھالے' جی بڑا کرلے' چار روز میں بہو کو آپ ہی سمجھ آجائے گی۔ اس سے لاکھ کہوں کے بہو تو آخر بہو ٹھہری گھر بار تیرا مگر گھر کی بیٹی سے لاگ ڈانٹ کیسی۔ اس سے اچھا سلوک کرنا' آنچل پھیلا کر دعا دے گی تو جنم جنم تیری نسل پھیلتی پھولتی رہے گی۔ مگر قسم لے لو جو' ان کے کان پر جوں بھی رینگے۔ دانا کھلاتے وقت الگ آفت' شام کو ڈربے میں بند کرتے وقت الگ مصیبت' ادھر سارے گھر والے میرے سر ہوگئے کہ بھئی قصہ ختم کرو اب چھری پھیر دو گردن پر۔ پہلے ہی بچوں کا شور کیا کم تھا جو تم نے نئی آفت مول لی۔ کان پھٹے جاتے ہیں۔'' (15)

ڈاکٹر زینت ساجدہ کی شخصیت مختلف اوصاف کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے جس میں نثر نگاری کے گلاب بھی ہیں تحقیق کے پھول بھی اور تقریر کی نورس کلیاں بھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شاعری سے انھیں خدا واسطے کا بیر ہو۔ وہ مقصدی شاعری سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔ وہ اچھے شعروں کی نہ صرف تحسین کرتی ہیں بلکہ اس پر اپنا قلم بھی اٹھاتی ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین اور انشائیوں میں اشعار کا برجستہ اور برمحل استعمال ملتا ہے۔

زینت ساجدہ نے کئی شخصی خاکے بھی لکھے ہیں۔ جیسے ''بھائی جان'' (عبدالمجید خاں) ''بابا'' (مولوی حبیب الرحمٰن) وغیرہ مخدوم پر تو ان کے کئی مضامین شائع ہوئے جیسے ''من ترا حاجی بگویم'' '' مخدوم محی الدین'' '' مخدوم...... کئی صحبتوں کا اجالا کتنے نغموں کا سرور'' وغیرہ۔ ان خاکوں کی خاص بات یہ ہے کہ ان خاکوں میں مزاح کی ایک لطیف رو بین السطور میں رواں ملے گی۔

وہ مخدوم سے والہانہ عقیدت رکھتی ہیں اس لئے نہیں کہ مخدوم ان کے رفیق تھے یا ان کے جیون ساتھی کے ہمدم دیرینہ' بلکہ اس لئے کہ مخدوم اچھے شاعر ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل بھی تھے۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

> ''قارئین کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ مخدوم کا احترام کریں اور اس پر حوصلہ شکن نکتہ چینی سے پرہیز کریں کہ کہیں شاعر کی تخلیقی رو سرد نہ پڑ جائے'' (16)

آگے چل کر وہ کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''مغل پورہ کے نوابوں سے لے کر چکڑ پلی کے مزدوروں تک جس کو دیکھئے فیشن سا بنا لیا ہے کہ مخدوم کی محبت میں مرے جا رہے ہیں۔ سال بھر میں وہ ایک ہی غزل کیوں نہ کہے سارا شہر اسے منہ زبانی پکا پانی یاد کر لیتا ہے۔ حیدرآبادیوں کی خیر مخدوم کمزوری بن گیا ہے۔ افیون کی طرح وہ اس کے عادی ہوگئے ہیں۔ مگر آندھرا کے نوسِکھ بھی لہرا لہرا کر ''منڈیلی کے چنوے تلے'' گنگناتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو سیکھ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں نے اس کا دماغ اور بھی خراب کر دیا ہے۔ ایک تو شاعر ویسے ہی اتراتا ہے پھر ان تعریفوں نے تو ناس ہی مار دیا اس پر کریلا اور بھی

نیم چڑھا بن گیا۔اس لئے میرا جی چاہتا ہے سب تعریف کریں اور میں ہجو
گوئی پر اتر آؤں۔''(17)

مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر زینت ساجدہ مخدوم کی نکتہ چیں ہونے کا ادعا کر رہی ہیں لیکن ان جملوں میں محبت اور بے پناہ اُلفت کا جو اظہار پوشیدہ ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔زینت ساجدہ اپنی سادگی، زود گوئی، اور لطیفہ گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔مرزا ظفر الحسن لکھتے ہیں۔

''مخدوم کی طرح زینت میں بھی ایک خوبی یہ ہے، جس محفل میں بیٹھتی
ہے توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔جس کی وجہ اس کی زبان ہے۔زود گو ہے، پُر گو
ہے مگر اپنی زبان کو ضائع نہیں کرتی۔کوئی نہ کوئی نکتہ، لطیفہ یا کام کی بات ضرور
کرے گی۔''(18)

حیدرآبادی محاورے زینت ساجدہ کی تحریروں کی خصوصیت ہیں۔بعض انشائیوں کے عنوانات ہی کہاوتوں اور محاوروں پر رکھے گئے ہیں مثلاً کاہ کروں سنگھار پیا مورا اندھا، دیکھا دیکھی، سونا لاون پی گئے وغیرہ۔حیدرآبادی خواتین کی مخصوص زبان اور حیدرآبادی محاوروں پر زینت ساجدہ کو مکمل عبور حاصل ہے ان کے مضامین اور انشائیے حق و صداقت، عدل و انصاف کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں۔

''زینت آپا کے زیادہ تر انشائیے عورت، معاشرے میں اس کی حیثیت،
اس کے کردار، اس کی مجبوریوں، مختاریوں، اس کے حقوق اور اس کی ذمہ
داریوں اور اس پر عائد کردہ پابندیوں کا احاطہ کرتے ہیں۔کہیں کہیں
اعتراف بھی ہے اور کہیں کہیں احتجاج بھی، تھوڑا بہت کھینچ تان کر کہہ لیں تو
کہا جاسکتا ہے کہ زینت آپا کی تحریروں میں تانیثی تحریک (Feminism)
کی تھوڑی بہت جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔زینت آپا نے نہایت حقیقت بیانی
سے کام لیا ہے اور قارئین کی عدالت میں عورتوں کے مقدمہ کو نہایت مدلل
انداز میں ثبوتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔''(19)

زینت ساجدہ کی تخلیقات مشرقی اخلاق وآداب کی علمبردار نظر آتی ہیں۔ان کے مزاج میں عجز وانکساری اور مروت کچھ زیادہ ہے۔مشرقی اقدار کا پاس ولحاظ ان کا مقصد حیات تھا۔ان کی تخلیقات میں ان کی شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے۔زینت ساجدہ کا انسان دوستی پر بھرپور ایقان تھا' تادم زیست وہ قومی یکجہتی کی عظیم علمبردار رہیں وہ چاہتی تھیں کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب ہمیشہ قائم رہے۔رحمٰن جامی زینت ساجدہ جیسی ہمہ پہلو شخصیت کو منظوم تہنیت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

علم ودانش کا ہیں اک منشور زینت ساجدہ
تیرگی جہل میں ہیں نور زینت ساجدہ
اپنی استادی میں مشہور زینت ساجدہ
پڑھتے ہیں اہل بصیرت زندگی کا قاعدہ
اور پڑھاتی ہیں انھیں دکتور زینت ساجدہ(20)

حیدرآباد کی مختلف ادبی انجمنوں جیسے انجمن ترقی اردو' ساہتیہ اکیڈیمی' آندھراپردیش اردو اکیڈیمی' مخدوم ادبی ایوارڈ کمیٹی' اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ رہیں۔وظیفہ حسن خدمات پر سبکدوشی کے بعد وہ ملک و بیرون ملک کے تشنگانِ اردو زبان و ادب کی پیاس بجھاتی رہیں۔ڈاکٹر زینت ساجدہ نے 3ڈسمبر 2008ءکو داعی اجل کو لبیک کہا۔

---000---

حوالہ جات

(1) عاتق شاہ ''ایک آواز ایک تاثر'' مطبوعہ ماہنامہ ''پونم'' جشن زینت نمبر ص35 جون جولائی 1983

(2) ممتاز حبیب ''زینت ساجدہ ایک دوست'' مطبوعہ ماہنامہ ''پونم'' جشن زینت نمبر ص50-49 جون جولائی 1983

(3) ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ''بھرے گھر کی بہو'' مطبوعہ: ماہنامہ ''پونم'' ص جون جولائی 1983

(4) ڈاکٹر رحمت یوسف زئی ''عرضِ مرتب'' مشمولہ ''اسلوب بیاں اور'' ص6-5

(5) زینت ساجدہ ''مکان بناڈالا'' مشمولہ ''اسلوب بیاں اور'' ص47 ڈسمبر 2009ء

(6) ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ''زینت آپا'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' 13 ڈسمبر 2008

(7) مرزا ظفر الحسن ''پیش لفظ'' مشمولہ ''اسلوب بیان اور'' ص8

(8) زینت ساجدہ ''بی جمالو'' مشمولہ ''اسلوب بیاں اور'' ص35

(9) زینت ساجدہ ''سونالاون پی گئے'' مشمولہ ''اسلوب بیاں اور'' ص116

(10) زینت ساجدہ ''ہم ہیں ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اورا'' مشمولہ ''اسلوب بیاں اور'' ص30

(11) زینت ساجدہ ''چلی گئی گرمی...... جب بیلا پھولے آدھی رات'' مشمولہ ''اسلوب بیاں اور'' ص104

(12) زینت ساجدہ ''گنڈی پیٹ کا پانی'' مشمولہ ''اسلوب بیاں اور'' ص 56-55

(13) زینت ساجدہ ''کباڑ خانے سے میوزیم تک'' مشمولہ ''اسلوب بیاں اور'' ص 93-92

(14) زینت ساجدہ ''اگر اللہ میاں عورت ہوتے'' مشمولہ ''اسلوب بیاں اور'' ص21-20

(15) زینت ساجدہ ''میری مرغیاں'' مشمولہ ''اسلوب بیاں اور'' ص 109

(17) زینت ساجدہ ''من تر احاجی بگویم'' مطبوعہ ماہنامہ ''صبا'' مخدوم نمبر ص199 سنہ 1966

(18) مرزا ظفر الحسن ''جادو بیاں جادو نگار'' مطبوعہ ماہنامہ ''پونم'' جشن زینت نمبر ص43-42 جون جولائی 1983

(19) ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ''اسلوب بیاں اور'' (تبصرہ) مطبوعہ: روزنامہ ''سیاست'' 9 جنوری 2010ء

(20) رحمٰن جامی ''زینت ساجدہ'' مشمولہ ''کیف'' ص39 سنہ 2008ء

ڈاکٹر حبیب ضیاء

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا بسایا ہوا شہر حیدرآباد ہمیشہ سے ہی گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔علم وادب کے میدان میں اس شہر نے ایسے باکمال اہل فن پیدا کئے جنہوں نے دنیا کے بیشتر حصوں میں گرانقدر خدمات انجام دیں اور اپنے وطن کا نام روشن کیا۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء یکم نومبر 1935ء میں حیدرآباد کے ایک معزز علمی خانوادہ میں پیدا ہوئیں۔(1) آپ کے والد مرزا ضیاالدین بیگ کا سلسلہ نسب حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی سے ملتا ہے جو بیدر کی سرزمین میں آسودہ خاک ہیں اور جن کا مزار آج بھی مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔حبیب ضیا کی والدہ محترمہ قمرالنساء کا تعلق بھی علمی گھرانے سے ہے۔آپ کے نانا نواب سخاوت جنگ تھے۔جن کا سلسلہ نسب دہلی کے لوہارو خاندان سے ملتا ہے' اسی خاندان سے مرزا غالبؔ کا سسرالی رشتہ رہا ہے۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء کے دادا کا نام مرزا سرفراز بیگ ہے۔جن کے دو بیٹے تھے مرزا ضیاءالدین بیگ اور مرزا اسداللہ بیگ۔مرزا ضیاءالدین نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے اور علی گڑھ سے بی ای کی ڈگری حاصل کی۔وہ پرنسپل مددگار ناظم تعلیمات کے عہدے پر فائز رہے۔مرزا ضیاءالدین بیگ کی 10 اولادیں ہوئیں جن میں 7 لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔

(1) مرزا شمس الدین بیگ (2) ڈاکٹر مرزا بدرالدین بیگ (3) مرزا ظہیرالدین بیگ (4) مرزا صلاح الدین بیگ (5) مرزا رضی الدین بیگ (6) مرزا مجیدالدین بیگ (7) مرزا رفیع الدین بیگ اور لڑکیوں میں (1) زہرہ بیگم (2) حبیب ضیاء (3) نورجہاں ضیاء شامل ہیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء کے والد مرزا ضیاءالدین بیگ ایک اچھے مصنف بھی تھے انہوں نے تین کتابیں لکھیں۔ (1) حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کرمانیؒ کی حیات اور ادبی خدمات (2) میرے شب و روز (خودنوشت سوانح) (3) دل کے کرشمے۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء کے والدین نے اپنی اولاد کی تربیت میں خصوصی توجہ دی۔

حبیب ضیاء کی ابتدائی تعلیم نامپلی گرلز ہائی اسکول حیدرآباد سے ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ 1954ء اور بی اے یونیورسٹی کالج فار ویمن عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے 1957 میں اور ایم اے (اردو) 1959 میں آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے کیا۔ 1966 میں شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی سے "کشن پرشاد شاد کی علمی وادبی خدمات" کے موضوع پر پروفیسر حفیظ قتیل کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔ ہندی آ تما 1976ء اور وشارد 1977ء میں کامیاب کیا۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے 1967ء سے 1984ء تک اورینٹل کالج اردو حیدرآباد میں بحیثیت لکچرر خدمات انجام دیں۔ 1984ء میں ان کا تقرر بحیثیت ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی میں ہوا۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کالج فار ویمن کوٹھی حیدرآباد میں بھی خدمات انجام دیں۔ بعد میں وہ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئیں اور صدر شعبہ بھی بنیں، اور وہیں سے وظیفہ حسن پر سبکدوش ہوئیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء کی شادی سید رحیم الدین توفیق سے (گیسٹ ہاؤز منیجر آئی ڈی پی ایل) سے ہوئی۔ رحیم الدین توفیق نے ایک اچھے رفیق حیات کے طور پر زندگی کے ہر موڑ پر ان کا ساتھ دیا۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء کی دو اولادیں ہیں ایک بیٹا سید فہیم الدین اور ایک لڑکی عفت النساء۔ ان کے بیٹے نے ایم بی اے کیا ہے ساتھ ہی کارپوریٹ سیکریٹری شپ کا ڈپلومہ بھی کیا ہے۔ سید فہیم الدین کی شادی ہو چکی ہے ان کی اہلیہ کا نام آمنہ کوثر ہے۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء ایک ذہین اور شوخ طبیعت کی مالک ہیں۔ وہ زمانہ طالب علمی سے ہی مزاح کا ذوق رکھتی ہیں۔ اس تعلق سے عتیق اقبال لکھتے ہیں۔

> "انہوں نے اپنی طالب علمی کے دوران خود اپنی موت کا جھوٹا بہانہ خوب رچایا تھا۔ انہیں خود اپنی موت کا تماشہ دیکھنے کا شوق جو تھا۔ بعد میں وہ مطمئن ہوگئیں کہ جب درحقیقت موت آجائے گی تو ان کے چاہنے والے ان کی بخشش کرواہی لیں گے۔" (2)

ڈاکٹر حبیب ضیاء کی اب تک سات تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ دکنی زبان کی قواعد، مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ، اُنیس بیس، گویم مشکل، شاد و نیاز، جو مژگاں اٹھایئے، اور حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین۔ "اُنیس بیس"، "گویم

مشکل‘‘ اور ’’جو مژگاں اٹھائیے‘‘ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء تقریباً 25 برسوں سے زندہ دلان حیدرآباد سے وابستہ ہیں۔ وہ انجمن ترقی اردو انجمن ترقی پسند مصنفین، ادارہ میرے شہر میرے لوگ، محفل خواتین اور دیگر کئی ادبی اور سماجی انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ انہیں کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ہائی اسکول کے زمانے میں کر دیا تھا۔ وہ مختصر کالم یا مضمون لکھ کر ماہ نامہ ’’بانو‘‘ میں اشاعت کیلئے بھیج دیتیں۔ اس سلسلے میں فاطمہ یزدانی لکھتی ہیں۔

> ’’حبیب ضیاء نامپلی گرلز ہائی اسکول میں جواب نامپلی گرلز جونیر کالج بن چکا ہے، زیر تعلیم رہیں......اسی زمانے میں انہوں نے لکھنے کی ابتداء کی۔ ’’بانو‘‘ میں جو بھی مضامین آتے یہ پڑھ کر اپنے مزاحیہ انداز میں اس پر تبصرہ کرتیں جو آہستہ آہستہ لوگوں کو پسند آنے لگے اور کالم کی طرح بانو میں چھپنے لگے۔‘‘(3)

ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ’’بچہ باہر گیا ہے‘‘ 1967ء میں شگوفہ میں شائع ہوا۔ ’’گویم مشکل‘‘ ڈاکٹر حبیب ضیاء کے 16 طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور چند انشائیوں پر مشتمل پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل بیشتر مضامین زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان ماہنامہ ’’شگوفہ‘‘ میں شائع ہو چکے ہیں۔

اُردو ادب میں بہت کم خواتین نے طنز و مزاح کے میدان میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان ہی میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر حبیب ضیاء کا ہے۔ انہوں نے عورتوں کے مسائل کو خاص طور پر اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ اپنے اِردگرد ہونے والے واقعات کو طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کرنے کا فن بخوبی جانتی ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح کو عوام کے مسائل کی اصلاح کا ہتھیار بنایا ہے۔ ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے اور لکھنے سے ان کا قلم کبھی نہیں چوکتا۔ برق آشیانوی ڈاکٹر حبیب ضیاء کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ۔

> ’’ہمارے ملک میں خاتون مزاح نگاروں کی کمی ہے جس کی وجہ سے مرد مزاح نگار سکون و اطمینان کے ساتھ بلاخوف و خطر طنز و مزاح کے میدان

> پر قدم جمائے بیٹھے ہیں۔ ویسے چند خواتین جو دیگر اصناف ادب میں اپنے جوہر دکھارہی تھیں طنز و مزاح کے میدان میں بھی ہاتھ پاؤں مارنے کیلئے اُتریں لیکن دو چار قلا بازیاں کھانے کے بعد پورے خشوع و خضوع اور حضور قلب کے ساتھ توبہ کر کے اپنے اصلی میدان میں واپس چلی گئیں“۔(4)

”گویم مشکل“ ان کا پہلا مزاحیہ مجموعہ ہے۔ ان میں شامل مضامین کی زبان شستہ اور معیاری ہے۔ وہ اپنے آس پاس ہی کی فضاء اور ماحول میں اپنی تحریروں کے موضوعات تلاش کرتی ہیں۔ وہ خواتین کے مسائل اور ان کے شب و روز کا مشاہدہ کافی گہرائی سے کرتی ہیں۔ حیدرآباد کے پرانے شہر میں ایک بازار ”لاڈ بازار“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جہاں پر عورتوں کی آرائش و زیبائش کی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء اس بازار کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتی ہیں۔

> ”لاڈ کے لغوی معنی پیار، محبت کے ہوتے ہیں۔ اور لاڈ بازار سے مراد وہ بازار ہوتا ہے جہاں لاڈ پیار پر ہر کسی کی روک ٹوک نہ ہو اس بازار میں لاڈ پیار کی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔ جیسے مہندی، افشاں، کاجل، پوڈر، چوڑیاں وغیرہ...... چوڑیوں کی دوکان پر جاتے ہی عورتیں دکاندار کو اپنا ہاتھ دے دیتی ہیں۔ نت نئے ہاتھوں کا لمس طبیبوں کو بھی محظوظ کرتا ہے لیکن وہ چوڑی والوں کی طرح ایسے ویسے ہاتھوں کے قائل نہیں صورت دیکھ کر ہاتھ پکڑتے ہیں۔“(5)

ڈاکٹر حبیب ضیاء کی تحریروں میں زندگی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جو زندگی کے حقائق پر روشنی نہ ڈالتا ہو۔ زندگی کے حقائق ان مضامین میں شدت سے نظر آتے ہیں۔ ان کے ایک مضمون ”جلسے“ میں انہوں نے جلسوں کی مختلف اقسام پر روشنی ڈالی ہیں۔ ہمارے ملک میں مختلف قسم کے جلسے ہوتے ہیں جیسے سیاسی، سماجی، مذہبی، ٹریڈ یونینوں کے جلسے وغیرہ۔ کسی مخصوص جلسے کے مقرر اگر دوسرے جلسوں میں جا کر تقریر کرتے ہیں تو کیا صورتحال ہوتی ہے اس کا نقشہ ڈاکٹر حبیب ضیاء کچھ اس طرح کھینچتی ہیں۔

''ہر جلسے کے مقرر الگ الگ ہوتے ہیں۔ایک صاحب جو عام طور پر محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے خطاب کیا کرتے تھے پہلی بار ادبی جلسے میں مدعو کئے گئے۔ وہ انتہائی جوش وخروش سے تقریر کررہے تھے۔ادبی حلقہ تھا۔سیدھی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا''مثال کے طور پر یہ رکشے والے! انہیں دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر نصیب نہیں ہوتی نہ رہنے کا مناسب ٹھکانہ ہے۔ یہ روکھا سوکھا کھا کر رکشہ میں سو جاتے ہیں یہ سنتے ہی سامنے کی نشستوں سے ایک صاحب جو پھول دار شرٹ پہنے براؤن کوٹ ہاتھ پر ڈالے بیٹھے تھے۔ غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے''ابے چپ! کون بولتا ہے میں بھوکا رہ کر رکشے میں سوتوں۔ پہلے چادر گھاٹ کی ''نیا گرا'' ہوٹل میں کھا کے رکشے میں سوتا تھا۔اب ایر کنڈیشنڈ''نیا گرا'' میں کھا کے فٹ پاتھ پر سوتوں۔آ تو میرے باپ کا نئیں ہے۔منتظم جلسہ جھگڑا ہوتے دیکھ کر مقرر کا داہنا ہاتھ مائیک سے باندھ دیا''۔(6)

اس مضمون کے بارے میں ان کے شاگرد عارف مجاہد کا کہنا ہیکہ۔

''اپریل 1981ء میں منعقدہ''زندہ دلان حیدرآباد'' کے جلسے میں ایک خاتون مزاح نگار نے میدان مارلیا ان کا مضمون''جلسے'' حاصل جلسہ رہا''۔(7)

''گوئم مشکل'' مضمون میں ڈاکٹر حبیب ضیاء نے ماما یعنی نوکرانی کی اہمیت وافادیت اور اس کے کردار کی عکاسی مزاح کے پیرائے میں کچھ اس طرح سے کرتی ہیں کہ قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بے اختیار لبوں پر بکھر جاتی ہے۔اس مضمون میں ڈاکٹر حبیب ضیاء نے گھریلو زندگی میں میاں، بیوی اور ماما (کام کرنے والی) کا ایک مثلث بنا کر پیش کیا ہے۔جنگی نقطہ نظر سے یہاں ماما کا مورچہ مستحکم ہوتا ہے۔وہ پہلے بیوی کی طرف بڑھتی ہے اور اس کے قریب پہنچ کر اس کے اطراف گھیرا ڈال دیتی ہے اور بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر شوہر پر یلغار کردیتی ہے۔ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اس صورتحال کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

''ایک دن اوپری کام کرنے والی بیمار ہوگئی۔ہم نے شہزادی آپا سے کہا میں چولھے کا کام سنبھالتی ہوں آپ برتن دھولیں۔اس پر وہ چراغ پا ہوگئیں اور کہنے لگیں ''بڑی مشکل ہے آپ لوگوں سے ''گونم مشکل وگرنہ گونم مشکل'' میں بیٹھ کر دھوتی ہوں تو کمر درد کرتی ہے۔کھڑی ہو کر دھوتی ہوں تو کپڑوں پر چھینٹے اُڑتے ہیں۔اللہ نے مجھے اتنا دیا ہوتا کہ کسی کو رکھ کر برتن دھلواتی۔ آخری فقرہ ہمارے دل میں نقش کر گیا۔شہزادی آپا کا مزاج کافی خطرناک لگا۔اس فقرہ پر جتنا سوچا اتنے گہرے معنی نکلتے ہیں۔اس فقرہ کا معنوی تجزیہ صرف نسوانی دماغ ہی بخوبی کرسکتا ہے۔جس کو ماما کی طرف سے شوہر کی جانب کافی خطرہ محسوس ہونا شروع ہوجاتا ہے''۔(8)

ڈاکٹر حبیب ضیاء کا ایک اور دلچسپ مضمون ''پانی'' ہے۔اس مضمون میں ایک عام مسئلے کو بڑے ہی لطیف انداز میں پیش کیا گیا ہے ان کی اس تخلیق میں شگفتہ مزاح ہے اور دل کو چھیدنے والے طنز کے تیر بھی۔کہیں پر گھریلو تلخیوں کو پیش کیا گیا ہے تو کہیں سماج کے ضمیر فروش تاجروں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ڈاکٹر حبیب ضیاء لکھتی ہیں کہ

''دنیا کے ذہین تاجروں کو سماج کی خدمت کی خاطر پانی میں ملاوٹ کا کوئی نہ کوئی طریقہ معلوم کر لینا چاہئے۔''(9)

آج کل بارش کی کمی کی وجہ سے پانی کی قلت شہروں کا مقدر بن گئی ہے اور متوسط طبقے کے خاندان کیلئے پانی کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔اس مسئلے کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ڈاکٹر حبیب ضیاء لکھتی ہیں:

''زندگی میں کوئی چیز جب اہمیت اختیار کرلیتی ہے تو ہر کس و ناکس کی زبان پر اسی کا ذکر ہوتا ہے۔جن لوگوں کے پاس بات کرنے کیلئے کوئی موضوع نہیں تھا وہ اب مستقل موضوع ''پانی'' پر بولنا شروع کردیتے ہیں۔ ہر زمانے میں کسی خاص نام کو ترجیح دی جاتی ہے۔ہمارا زمانہ ''پانی کی قلت'' کا زمانہ ہے۔سب کی زبان پر ایک ہی لفظ ہے۔پانی، پانی، پانی، کسی کی

مزاج پرسی کیلئے جائیں، یا پرسے کیلئے، پانی کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔جس کو ''آب پرسی'' کہنا بیجا نہ ہوگا۔...... پانی کیلئے کس قدر اپنا سکون برباد کرنا پڑتا ہے۔کب آتا ہے کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔کبھی صبح آتا ہے کبھی شام، کبھی رات۔اگر رات کو آ گیا تو سمجھئے نیند حرام ہوگئی۔اور ستم بالائے ستم اگر میاں بیوی نے سمجھوتہ کرلیا کہ ایک دن میاں پانی بھریں اور ایک دن بیوی مگر یہ سمجھوتہ ساس کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔بیوی پانی بھرتی ہو تو میاں کی ساس کی آنکھوں میں پانی آجاتا ہے۔چلا کر کہتی ہے ''اے ہے! پانی بھرتے بھرتے میری بیٹی آدھی ہوگئی ہے''۔(10)

آگے وہ لکھتی ہیں کہ ''آب پرسی'' کے تعلق سے تشفی بخش صورتحال بتانے پر مہمان نوازی کس طرح وبال جان بن جاتی ہے اس کا اظہار بڑے ہی مزاحیہ انداز میں وہ اس طرح کرتی ہیں۔

''ایک دن میرے چچا ملنے آئے ''آب پرسی'' پر ہم نے کہا، یہاں اللہ کا فضل ہے پانی کا سسٹم بہت اچھا ہے۔مانجرا سے آتا ہے، رات دن نل کھلا رہتا ہے۔اور لائٹ بھی فیل نہیں ہوتی۔اتنا سننا تھا کہ چچا کے چہرے کا رنگ فرطِ مسرت سے کھل اُٹھا اور دوسرے دن کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی میلے کپڑوں کا گٹھرا لئے گھر میں گھسا چلا آرہا ہے۔ہم نے سوچا دھوبی ہوگا نظر اٹھا کر دیکھا تو چچا اپنی پوری ٹیم کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں۔صرف چچی صاحبہ کے بغیر جو کچھ ماہ پہلے ''آؤٹ'' ہو چکی تھیں۔پورے کھلاڑی نل پر ٹوٹ پڑے۔سرف کا ڈبہ ختم۔اچھا خاصا گھر دھوبی گھاٹ بن گیا۔اخلاقاً کہہ دیا کہ آپ لوگ تھک گئے ہوں گے رات کی رات رہ جایئے۔حکم کی تعمیل فوراً ہوگئی۔''(11)

روزمرہ کے مشاہدات اور زندگی کے حقائق کو مزاح کے روپ میں ڈھالنا اچھے انشائیہ نگار کی شناخت ہے۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء اپنے مشاہدات کے ذریعہ سماج کے مختلف افراد کے نفسیات کا مطالعہ کرتی ہیں۔''ہمارے بھی ہیں

امتحان'' میں ڈاکٹر حبیب ضیاء نے طلباء کی نفسیات کو پیش کیا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے نقل نویسی کرنے والوں پر طنز کیا ہے۔ وہ نقل کرنے والے طلباء کو فنکار کا نام دیکر بڑے ہی پُر مزاح انداز میں لکھتی ہیں:

''ایسے فنکار کو مطلوبہ جوابات کی تعداد کے مطابق 'ضرورت' لاحق ہوتی ہے۔ کبھی کبھی شبہ ہونے لگا ہے کہ وہ ضرورت کی زیادتی کا شکار ہے۔ ایک ایسے ہی فنکار کو ہم نے ماہر امراض گردہ ومثانہ سے رجوع ہونے کا مشورہ دیا تو اس نے خونخوار نظروں سے دیکھا تو ایسا لگا کہ کہہ رہی ہیں ''تمہارا دماغی توازن تو ٹھیک ہے؟ اسی طرح ایک فنکار پیاس سے بار بار بے حال ہوتے جارہے ہیں اور چپراسی ہر پندرہ منٹ پر ایک گلاس پانی پیش کررہا ہے۔ پانی کے ساتھ ساتھ حسبِ ضرورت شئے بھی ساتھ تھی''۔(12)

اس مضمون میں انہوں نے ایک ایسے فنکار کی دو ٹوپیوں کا ذکر کیا ہے جس کی مدد سے وہ نقل کررہے تھے لکھتی ہیں:

''اس فنکار مولوی کے پاس دو ٹوپیاں تھیں ایک اُجلی دوسری میلی۔ ایک میں سورۂ نادعلی اور دوسری میں سورۂ فتح۔ مولوی اسی لئے بار بار باوضو لکھنے کے قائل تھے۔ وہ ہر نئے سوال کے لئے تازہ وضو ضروری سمجھتے تھے۔ پانچ سوال حل کرنے کیلئے انہیں پانچ بار امتحان ہال چھوڑنا پڑتا تھا۔ وہ اتنی دیر میں لوٹتے گویا پانچ وقت کی نماز یکمشت ادا کرکے آرہے ہوں۔ لیکن وہ جب بھی باہر جاتے سورۂ فتح کی ٹوپی سر پر ہوتی اور ''نادعلی'' میز پر لوٹتے ہی' نادعلی کی ٹوپی اوڑھ لیتے اور سورۂ فتح کی ٹوپی بہت ہی احتیاط کے ساتھ جوابی بیاض سے متصل رکھ لیتے اور جب تک لکھتے رہتے۔ بیاض ، ٹوپی اور نظروں کا ربط ٹوٹنے نہیں پاتا تھا۔''(13)

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے مختلف قسم کے فنکاروں اوران کی خصوصیات کا بیان کرتے ہوئے ان فنکاروں کو قاری سے روبرو کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''ایک صاحب غالبؔ پر نقل مار رہے تھے۔ جملہ تھا
''غالب کا ایک مختصر سا دیوان چھپ چکا ہے سادگی اور شگفتگی غالبؔ کی شاعری کی طرۂ امتیاز ہے''
پیچھے کی سیٹ سے نقل در نقل چل ہی رہی تھی ''طرۂ امتیاز'' کی وضاحت ضروری سمجھی گئی تا کہ کچھ تو لکھا جائے وضاحت اس طرح کی گئی ''غالب کا شمار اپنے زمانے کے امیر لوگوں میں ہوتا ہے ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر بات میں عام لوگوں سے ہٹ کر چلتے تھے۔ چنانچہ وہ جو ٹوپی پہنتے تھے اس میں ایک ''طرہ'' لگا ہوتا تھا۔ اسی کو غالبؔ کا طرۂ امتیاز یعنی غالبؔ کا امتیازی نشان سمجھا جاتا ہے۔ غالبؔ جب الیکشن میں کھڑے ہوتے ان کا طرۂ امتیاز ان کے کام آتا''۔(14)

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے امتحان ہال کے فنکاروں اور ان کے فن کا بیان ایسی جزئیات کے ساتھ کیا ہے کہ ان کی استادی اور معلومات پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے۔

ہمارے شہر سے اکثر لوگ تلاش معاش میں خلیجی ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے اثرات ان کے خاندان پر کس طرح مرتب ہوتے ہیں اس کا اندازہ انہیں خود نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء نے ''بدیسی مال'' میں باہر سے آنے والے کے حال اور استقبال کا اور اس کے اپنے ہی گھر والوں کے ہاتھوں بننے والی درگت کا نقشہ بڑے اچھے انداز میں اتارا ہے۔ دیکھئے:

''کسی گھر کا فرد جب باہر یا بدیس جاتا ہے اور ایک سال بعد واپس آتا ہے تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ خاندان کے افراد اس سے اپنے گھر آنے کو کہیں تو کہتا ہے کہ ''دیکھوں گا اور کوشش کروں گا'' وغیرہ وہ جب ایئرپورٹ پہنچتا ہے تو اس کے استقبال کے لئے گھر کے وہ افراد بھی پہنچ جاتے ہیں جو اس کے یہاں رہنے پر اس کو بیروزگاری کے طعنے دیا کرتے تھے اور مسلسل لڑتے جھگڑتے رہتے

تھے۔ ایک آس ایک ہوس ہوتی ہے جو باہر سے آنے والے کا پرجوش استقبال کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔'' (15)

اسی طرح کا ایک اور مضمون 'بچہ باہر گیا ہے'' میں ڈاکٹر حبیب ضیاء نے بڑا لطیف نکتہ پیش کیا ہے۔ روزگار کی تلاش میں ہندوستان کے بیشتر نوجوان اکثر خلیجی ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اس کا اندازہ اس مضمون سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

''اس دور کا ایک اہم مسئلہ معاش کے سلسلے میں خلیجی ممالک جانے کا ہے۔ بیرون ملک معاشی خوشحالی دیکھ کر ہر کسی کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے گھر سے بھی کوئی بچہ ضرور باہر جائے اور ان کے گھر میں بھی رونا لیلیٰ کی غزلیں بجنے لگیں ان کی بچیاں بھی چمکیلی بھڑکیلی میکسیاں پہنیں''۔ (16)

مجموعہ گویم مشکل میں شامل مضمون ''بنام'' میں اخبارات میں شائع ہونے والے نوٹسوں، اشتہارات کو موضوع بنا کر مزاح پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے ایک اقتباس دیکھئے:

''نوٹس بنام امیر بی''

''امیر بی زوجہ غریب خاں تم کو مطلع کیا جاتا ہے کہ شادی کے چند دن بعد ہی سے تم نے پیٹ میں سے پاؤں نکالنے شروع کردیئے۔ عورتوں کے بین الاقوامی سال سے کافی فائدہ اٹھایا۔ اب وہ سال ختم ہو چکا ہے تم کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ تم اس نوٹس کو پڑھ کر واپس نہ آؤ تو میں اپنی ان بیویوں کو گھر لالوں گا جنہیں تمہارے ڈر سے الگ رکھا ہے''۔ (17)

''بنام سالم بن ظالم''

''بنام سالم بن ظالم 62 سال تمہیں اطلاع دی جاتی ہے کہ تم نے سعودی عرب سے آکر مجھ سے نکاح کیا تھا۔ تمام بدیسی مال سے مالا مال

کر کے یہ کہہ کر چلے گئے کہ تین ماہ بعد بلالوں گا۔ اب تین سال ہونے کو آرہے ہیں۔ اس نوٹس کو پڑھ کر اندرون ایک ماہ مجھے نہ لے گئے تو میں اس 65 سالہ شیخ سے نکاح کرلوں گی جس کے پیٹ میں آنت ہے نہ منہ میں دانت اور جو میری ماں کے لئے گھر کے چکر کاٹ رہا ہے"۔(18)

"ضرورت ہے"

"نرسری سے لے کر میٹرک تک کے بے ماں کے بچوں کو پڑھانے کیلئے ایک ایسی خوبصورت ہمہ وقتی لیڈی ٹیچر کی ضرورت ہے جو ہندی، اردو، تلگو، انگریزی اور دیگر زبانوں میں مہارت رکھنے کے علاوہ کھانا پکانا بھی خوب جانتی ہو۔ تنخواہ کا تصفیہ صورت دیکھ کر کیا جائے گا۔"(19)

ڈاکٹر حبیب ضیاء کی تخلیقات کی خصوصیت زبان اور بے ساختگی ہے وہ لفظ ڈھونڈ کر جملے نہیں بناتے بلکہ ان کے پاس الفاظ کا ایک ایسا خزانہ ہے کہ وہ لفظ کو جملوں میں نگینے کی طرح جڑ دیتی ہیں۔ اپنے فطری لگاؤ کے باعث ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اس ذمہ دارانہ اور مشکل صنفِ ادب کو نبھایا ہے۔ اسی لئے ان کا طنز و مزاح بڑا لطیف اور سبک ہے۔ جسے پڑھ کر ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آجاتا ہے۔

"اُنیس بیس" حبیب ضیاء کے مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ 16 مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ 1988ء میں شائع ہوا۔ یہ مضامین مختلف اخبارات اور رسائل میں چھپ چکے ہیں اور بعض آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوئے۔ اس کتاب میں عید، اچھے پڑوسی، باہر کا دولہا، میرا پہلا مزاحیہ مضمون پڑھنا' اور چلر قابل ذکر ہیں۔

مضمون چاہے سنجیدہ ہو یا مزاحیہ ایک قابل اور با صلاحیت ادیب آسانی کے ساتھ لکھ لیتا ہے وہ اپنی اسی صلاحیت کا صحیح استعمال کرتے ہوئے مسلسل لکھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اسی ادیب کو جب پہلی بار ریڈیو، ٹیلی ویژن یا اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے تب اس پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے یہ اسی کا دل جانتا ہے۔"میرا پہلا مزاحیہ مضمون پڑھنا" میں ڈاکٹر حبیب ضیاء نے خود اپنی آپ بیتی پیش کی ہے۔ جو انہوں نے "گویم مشکل" میں "بچہ باہر گیا ہے" کے نام سے تحریر کیا ہے۔

'' لکھنے اور پڑھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ 1978ء کی بات ہے کہ اس دن مصطفیٰ کمال صاحب ایڈیٹر ماہنامہ ''شگوفہ'' کالج آئے اور اپنے مخصوص شائستہ اور سنجیدہ انداز میں مجھ سے کہا کہ اس سال آپ زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاس میں مضمون سنائیے۔ جلسے کا دن آیا۔ وقت سے آدھا گھنٹہ قبل میں گاندھی بھون پہنچ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ لوگ آنے لگے کچھ دیر بعد کسی کرم فرمانے ایک بیاج میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ مجھے ایسا لگا گویا موت کا پروانہ مل گیا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے بیاج لگا لیا۔ جلسہ شروع ہوا۔ موت واقعی سر پر منڈلا رہی تھی۔ بوگس حیدرآبادی جو اسٹیج کے بازو کھڑے ہوئے تھے پوچھا:

آپا! مرنے سے پہلے آپ کی آخری خواہش کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے ایک گلاس پانی چاہئے۔ مشکل سے ایک گھونٹ پانی سے حلق تر کیا۔ باقی گلاس وہ میرے ہاتھوں میں ناچنا چاہتا تھا۔ غور کیا تو پتہ چلا کہ بیچارے گلاس کا کچھ قصور نہیں تھا بلکہ خود میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے میرے نام کا اعلان ہوا۔ مائک پر آ کر میں نے سانس روک کر کہا میرے مضمون کا عنوان ہے ''بچہ باہر گیا ہے'' عنوان سنتے ہی سامعین کی طرف سے قہقہوں کی بارش ہونے لگی۔ مضمون شروع ہوا۔ اگر آپ کسی کے گھر جائیں اور صدر خاندان کے ہاتھ میں چار مینار سگریٹ کے بجائے ڈن ہل کا قیمتی پاکٹ دیکھیں تو کھٹ سے یقین کر لیجئے کہ اس گھر کا کم از کم ایک بچہ باہر ضرور گیا ہوا ہے۔ میں مضمون سناتی چلی گئی ایسا لگ رہا تھا ملک بھر کے نامور طنز ومزاح نگار میری جانب دیکھ کر آنکھ دکھانے لگے کہ لکھنا شروع کر کے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے کہ ہم پر رعب جمانے آئی ہے۔ باہر کے کرشمے دیکھ کر ہمارے منہ میں بھی پانی آیا کہ ہمارا تیرہ سالہ بیٹا بھی کاش باہر جاتا۔

کچھ دیر بعد دروازہ پر کھٹکا ہوا۔ کچھ رشتہ دار سعودی عرب سے ملنے آئے تھے۔ کچھ ادھر ادھر دیکھ کر انہوں نے پوچھا آپ کا بچہ کہاں ہے؟ ہم نے سر اونچا کر کے فخریہ انداز میں کہا ''بچہ باہر گیا ہے، گلی ڈنڈا کھیلنے'' غرض سامعین سے خوب داد وصول ہوئی۔ اور پہلی آزمائش میں پوری کامیاب ہوئی اور پہلی بار ایک بڑے جلسے میں جو مزاحیہ مضمون سنایا وہ میری زندگی کا ایک اہم اور کبھی بھی نہ بھلایا جانے والا واقعہ ہے۔ اس کو میں خدا کی دین سمجھتی ہوں۔ مستقل مزاجی سے لکھتے چلی جارہی ہوں۔ یہی واقعہ مجھے جہاں پست ہمت کیا وہیں آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیا''۔ (20)

دنیا میں کئی واقعات اور حادثات رونما ہوتے ہیں۔ عام آدمی اسے اہمیت نہیں دیتا لیکن ایک فنکار کا حساس دل و دماغ ان واقعات پر غور و فکر کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس کا اثر واضح طور پر اس کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء نے مضمون ''چلر'' میں اپنے پاکستانی سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات کو بڑے ہی مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس مضمون میں پاکستان کے معاشی حالات اور وہاں کے روپئے کی قدر اور لوگوں کی طرز زندگی کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔

''پاکستان میں چلر دیکھنے کو نہیں ملتا۔ سب دوکان والے اپنا حساب و کتاب روپیوں میں رکھتے ہیں۔ کم سے کم خیرات ایک روپیہ دینا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ ہم کو ایک فقیرنی سے سابقہ پڑا۔ ہم نے جھٹ پرس میں سے اٹھنی نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دعاؤں کا انتظار کرنے لگے۔ اٹھنی دیکھتے ہی فقیرنی آن کی آن میں شیرنی بن گئی۔ ہماری اٹھنی سمیت اور ایک روپیہ اضافہ ہمارے ہاتھ تھما کر چلتی بنی اور کہا' چلر چالیں چھوڑو اور خیرات کرنا سیکھو''۔ (21)

ڈاکٹر حبیب ضیاء موضوعات اپنے اردگرد ڈھونڈتی ہیں۔ ہلمٹ ان دنوں خاص موضوع ہے۔ اور یہ کہا

جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ''ہلمٹ'' ایک تحقیقی موضوع ہے۔ کون کونسے ممالک میں ہلمٹ پہننے کا لزوم ہے اور کون کونسے ممالک میں اختیاری اس بات کا اندازہ ایک ریسرچ اسکالر ٹھیک ڈھنگ سے کرسکتا ہے۔ مضمون ''ہلمٹ'' میں ڈاکٹر حبیب ضیاء نے قارئین کو موت کی یاد دلائی ہے لوگ ہلمٹ اپنی جان بچانے کیلئے رکھتے ہیں نہ کہ چالان دینے کے ڈر سے۔ وہ لکھتی ہیں۔

''بہت دنوں کی خاموشی کے بعد ہلمٹ نے پھر دھوم مچادی۔ جن لوگوں کے پاس پرانی ہلمٹ نہیں تھی ان میں چند نے نئی ہلمٹ خرید لی اور چند لوگوں نے پہلی تاریخ کے آنے تک مختلف طریقوں سے پولیس والوں کو مصروف رکھا۔ ذات، پات، مذہب فرقہ کا فرق مٹ گیا۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی، لگتے ہیں بھائی بھائی۔

سکھ کو اسلئے مثتنیٰ چھوڑ دیا کہ وہ پگڑی کو اتارنا اپنا ایمان خراب ہونے کے برابر سمجھتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوا کہ ہلمٹ کی آڑ میں ایک شخص نے دن دہاڑے کسی کے ہزاروں کی رقم چھین لی اور فرار ہوگیا۔ خبر یہ چھپ گئی کہ پولیس کو اس ہلمٹ والے کی تلاش ہے۔ ہلمٹ اتار پھینکنے کے بعد بھلا وہ کیسے ہات لگ سکتا ہے۔ ویسے ہلمٹ بڑے کام کی چیز ہے۔ سودے سُلف لانے کے کام آتی ہے۔ پیچھے بیٹھی ہوئی بیوی کی نت نئی فرمائشوں سے بچاتی ہے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہیکہ خدانا خواستہ کوئی حادثہ ہوجائے تو سر سے ٹل جاتا ہے۔ ایک صاحب نے صبح آفس آنے سے پہلے بیوی کو آواز دی۔ سنو! جلدی سے میری ہلمٹ تو دینا۔ بیوی نے کہا آپ بڑے بے رحم ہیں۔ ترس کھائیے ان چھوٹے چھوٹے بچوں پر۔ شوہر سٹپٹا گئے بولے میں صرف بچوں کو نہیں بلکہ تمہیں بھی دل و جان سے چاہتا ہوں۔ اس لئے ہلمٹ مانگ رہا ہوں۔ بیوی نے وضاحت کی۔ آپ کی عقل ماری گئی ہے میں ان چوہے کے بچوں کی بات کر رہی ہیں جو آپ کی ہلمٹ میں پروان چڑھ رہے ہیں۔ بڑے پیارے سے ہیں۔ چلہ نہ سہی چھٹی تو ہوجانے دیجئے۔''(22)

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اپنے مضمون ''سولہ برس کا سن'' میں عمر چھپانے والی خواتین ہی نہیں بلکہ مرد حضرات کو بھی منظر عام پر لا کھڑا کیا ہے۔اس مضمون میں لوگوں کی نفسیات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''ایک صاحبہ تو تابڑتوڑ جھوٹ بولتی ہیں اپنے تیس سالہ لڑکے کی شادی کے وقت انہوں نے اپنی عمر 42 سال بتائی۔ حساب کی ماہر خواتین نے احتجاج کیا کہ آپ بارہ سال کی عمر میں ہرگز ماں نہیں بن سکتیں۔ خدا کے لئے اپنی عمر میں چند سالوں کا اضافہ کیجئے۔انہوں نے اپنی عمر تو نہیں بڑھائی البتہ بیٹے کی عمر یہ کہہ کر کم کردی کہ اسکول میں شرکت کے وقت زیادہ لکھوائی تھی۔ دانت نزلے سے گر گئے، بال دھوپ میں سفید ہوگئے بینائی ویڈیو کی لعنت سے کم ہوگئی''۔(23)

ڈاکٹر حبیب ضیاء کا ایک مضمون ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' پڑھ کر فوراً یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان مگر پھر بھی کم نکلے

مگر انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی، کچھ خواہشیں اور ارمان وہ اپنے دل میں لئے ملک عدم کوچ کر جاتا ہے۔کچھ خواہشیں پوری ہوتی ہیں اور کچھ پوری ہوتی ہیں مگر نقصان کے ساتھ' ڈاکٹر حبیب ضیاء لکھتی ہیں:

> ''ایک صاحبہ کو لوگوں کی ہمدردی اپنے تئیں حاصل کرنے کی عجیب و غریب خواہش تھی۔ وہ مختلف ڈھنگوں سے ایکٹنگ کرتی ہیں یہ انہیں زیب نہیں دیتا اور تندرست ہیں چلتی پھرتی ہیں مگر وہ چاہتی ہیں کہ بیمار کہلائیں۔ لوگوں کی ہمدردی سمیٹنے کیلئے وہ گرنے کی بھونڈی ایکٹنگ کرتی ہیں۔ پھر اس کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں۔اس پر بھی توجہ نہ ملے تو وہ لنگڑا کر چلنا شروع کردیتی ہیں۔لیکن چال کو دھیما کرنا بھول جاتی ہیں۔اپنے آپ کو اندھا ظاہر کرنے کی خواہش میں سامنے رکھی چیزوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتی ہیں۔ پھر تنہائی میں

سب کی نظریں بچا کر پیسے گنتے وقت وہ بھول جاتی ہیں کہ انہوں نے جس
چیز کی خواہش کی تھی اس کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ایسی صورت میں دیکھنے
والے ان پر فقرے کستے ہیں۔ مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی
خواہش پوری کرنی ہوتو کم ازکم پونا انسٹی ٹیوٹ میں کچھ عرصہ رہ کرا یکٹنگ
سیکھ لیں تا کہ جگ ہنسائی نہ ہو''۔(24)

آ گے وہ لکھتی ہیں کہ آج کے دور میں لوگ ایسی بیواؤں کی خواہش کرتے ہیں جو مالدار ہو،خوبصورت ہواور امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ وہ یہ نہیں دیکھتیں کہ سیرت' خاندان اور حسب ونسب کیسا ہے۔ایسی لالچی ساسوں کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتی ہیں کہ انہیں اپنے گریبان میں جھانکنا چاہئے۔ان کےلڑکے کیسے ہیں کیا وہ بااخلاق اورخوبصورت ہے۔کیا وہ ایک اچھے شوہر ثابت ہوسکتے ہیں۔

''بہو کی تلاش میں نکلنے والی خواتین کی خواہش ہوتی ہیکہ ان کے گھر بہو
بن کے آنے والی لڑکی میں تمام گن موجود ہوں۔یعنی مالدار، دراز قد،
خوبصورت، نیک سیرت پڑھی لکھی اور صوم وصلوٰۃ کی پابند اور پریوں جیسی بہو
کی خواہش رکھنے والی ساس کےلڑکے کو دیکھیں تو وہ ہوگا توّے کے پیچھے کا
چاند،منہ کھولے گا تو ایک دانت صحیح جگہ پر نہ ہوگا۔مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ
وہ خوبصورت بیوی کو حاصل ہی کر لیتا ہے۔ایسے جوڑے کو دیکھ کر دودھ
پیڑے اور مکوڑے کا خیال ایک ساتھ آتا ہے''۔(25)

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اپنے مضمون''خوش رہنا بھی ایک فن ہے''میں بہت سی کارآمد باتیں اور نسخے بتائیں ہیں جن پر عمل کر کے ہم خوش رہ سکتے ہیں۔ان کا کہنا ہیکہ خوش مزاج شخص ہر محفل کی جان ہوتا ہے۔ وہ خود بھی خوش رہتا ہے اور دوسروں کو بھی خوش کرنا جانتا ہے۔وہ ایک ماہر نفسیات کی طرح لوگوں کو خوش رہنے کیلئے مختلف مشورے دیتی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں انسانی دکھ درد کے مداوے کی کتنی فکر ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''مجھے یقین ہیکہ پہلی فرصت میں وہ اپنے چہرے سے افسردگی اور

غمزدگی کا جھوٹا نقاب نکال پھینکے گے جو جان بوجھ کر چڑھا رکھا ہے۔ سب سے پہلے بیماری کو لیجئے برائے نام بلڈ پریشر میں مبتلا رہنے والے ان مریضوں کو دیکھیں۔ جو کینسر، دق، گٹھیا، فالج، دمہ جیسے تکلیف دہ امراض میں مبتلا ہیں۔ یہ سوچ کر خوش رہیں اور اللہ کا شکر ادا کریں کہ وہ نوجوانوں سے زیادہ چاق و چوبند ہیں کھانا اچھا ہضم ہوجاتا ہے۔ بینائی اور ٹی وی میں گہری دوستی ہے۔ اور کیا چاہئے۔ خاموش رہنے والوں کیلئے میرا ایک اور مشورہ ہے کہ وہ ہمیشہ کمزور اور چھوٹی چیزوں پر نظر رکھیں۔ کسی کو اگر شکایت ہیکہ گھر چھوٹا ہے گنجائش کم ہے چلتے پھرتے دیواروں سے ٹکریں لگتی ہیں تو ناخوش اور شاکی رہنے کے بجائے اُن ہزاروں افراد کو دیکھیں جن کے لئے گھر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بے شمار لوگ ایسی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جو اُنہیں دھوپ اور بارش سے بھی نہیں بچاسکتیں۔ (26)

ڈاکٹر حبیب کے مضامین کے زیادہ تر موضوعات اپنے اطراف کے مادی چیزوں اور واقعات ہوتے ہیں جیسے وہ اپنے قلم کے ذریعہ نہ صرف قارئین تک پہنچاتی ہیں بلکہ مزاح سے بھی محظوظ کرتی ہیں اور طنز کے نشتر سے سماج کے ظلم و زیادتیوں اور استحصال کے سدباب کی کوشش کرتی ہیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیا کا قلم وقت کے تقاضوں اور مسائل کے حل کے لئے ہوتا ہے مثلاً ان کا ایک مضمون ''حیدرآباد کی سڑکیں'' میں ناقص بلدی انتظامات کا مزاحیہ انداز میں ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ شہر کی بڑھتی آبادی کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلدی انتظامات کی وسعت کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''گذشتہ چند برسوں میں ماہرین تعمیرات اور متعلقہ ذمہ دار افراد کی مہربانی سے حیدرآباد کی سڑکیں خستہ تر ہوگئیں ہیں۔ سڑکوں کی تباہ حالی کی وجہ سے ٹائر ٹیوب والوں، ہڈی کے ڈاکٹروں اور جراحوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔ ہم جسے سڑک کہتے ہیں وہ کچرا، کیچڑ، کھڈے، کھلے مین ہول اور چھوٹے بڑے پتھروں کے ڈھیر کا نام ہے۔ اکثر سڑکوں پر عرصہ سے

بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے ہیں ان سے بچنے کیلئے جانے والی گاڑیاں بے وقت بے موقع گلے ملتی ہیں۔ جراح اور لیڈی ڈاکٹرس دست بدعا ہیں کہ یہ سڑکیں یوں ہی خستہ رہیں تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خدمت کا موقع دے سکیں۔ اکثر خواتین نو مہینے کے بجائے سات ماہ میں ہی بچوں کو جنم دے رہی ہیں۔ میڈیکل ہال والے پریشان ہیں کہ دردزہ بڑھانے والی دوا بالکل فروخت نہیں ہو رہی ہیں حالانکہ حسب معمول آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے دواخانہ آنے والی ایک خاتون سے اس بارے میں استفسار کیا۔ اس نے جواب دیا میں نے کوئی دوا استعمال نہیں کی۔ صرف آٹو میں بیٹھ کر گھر سے یہاں آئی ہوں۔'' (27)

حیدرآباد شہر بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ بڑھتی آبادی کے پیش نظر ذرائع حمل و نقل میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس تیز رفتار زندگی میں انسان میں وقت کی قدر کرنے کا سلیقہ آ گیا ہے۔ وقت پر اپنی منزل پر پہنچنے کی خاطر لوگ بے بسی سے بس کا انتظار کرنے کے بجائے آٹو کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ لیکن آٹو والوں کا رویہ دلبرداشتہ ہوتا ہے۔ ان ہی تلخ حقائق کو ڈاکٹر حبیب ضیاء اپنے مضمون ''آٹو والے'' میں پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہیکہ آٹو کی نہ تو آوازوں پر پابندی ہے اور نہ ہی میٹر پر، آٹو اور میٹر کی چال میں صرف اتنا فرق ہے کہ آٹو صرف چلتا ہے جبکہ میٹر بھاگتا ہے۔ ڈاکٹر حبیب ضیا نے منظر کشی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کرتی ہیں۔

''ایک دن ہماری عادت کے مطابق ہم نے آٹو میں بیٹھتے ہی آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دیا۔ جب آٹو پر یہ شعر لکھا ہوا تھا

موت کو میں گلے لگالوں گا
زندگی تیرا اعتبار نہیں

اس شعر کے پڑھنے کے بعد لاشعوری طور پر آیت الکرسی کی آخری آیت چھوڑ کر با آواز بلند ہم نے یہ مصرعہ دہرانا شروع کر دیا۔ موت کو میں

گلے لگالوں گی۔موت کو میں گلے لگالوں گی۔۔ بازو بیٹھے ہوئے ہمارے بچے نے پوچھا مما آپ کیا پڑھ رہی ہیں ہم نے کہا آیت الکُرسی ۔ بچے کو یقین ہوگیا کہ خلل دماغ کی یہ پہلی خطرناک علامت ہے جو آٹو کی گڑگڑاہٹ کے بعد وجود میں آئی ہے''۔(28)

گویم مشکل اورانیس بیس میں شامل مضامین کے علاوہ ڈاکٹر حبیب ضیاء کے کئی مضامین مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ایسا ہی ایک مضمون ہے''فن چمچہ گری'' جس میں انہوں نے خوشامد اور چاپلوسی کرنے والوں پرطنز کیا ہے۔انہوں نے استاداورشاگرد کے رشتے کی اہمیت کواجاگر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اساتذہ کی عزت اوراحترام کی ایک حد ہوتی ہے۔اوراگرکوئی طالب علم عزت واحترام کی حد سے پھلانگ لگا کراستاد کی چمچہ گری تک پہنچ جائے تووہ بغیر لڑکھڑائے گرجاتا ہے۔یعنی وہ لوگوں کی نظروں میں گرجاتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''دنیا جس سمت میں جارہی ہے اسے دیکھ کر ہمارا تو یہ مشورہ ہے کہ مختلف فنون جیسے چاپلوسی،خوشامد، چمچہ گری وغیرہ کی بھی باقاعدہ تعلیم کا انتظام کروایا جائے تاکہ نوجوان فنون کوحربہ بنانے میں کم ازکم صحیح ڈھنگ سے ان کا استعمال سیکھ جائیں، ویسے چندآسان نسخے جنہیں عموماً چمچے آزماتے ہیں وہ یہ ہیں۔جھوٹی تعریفوں کے پل باندھنا، جوتے سیدھے کرنا محفل میں سایہ کی طرح ساتھ رہنا۔بغیر پیسے دیئے سوداسلف لانا وغیرہ''۔(29)

مضمون''بے بی''میں انہوں نے اوٹ پٹانگ ناموں اورعرفیتوں پربھی مزاحیہ انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ان کا کہنا ہیکہ بے بی ایک ایسا نام ہے جو ہرکوئی عرفیت کے طور پر رکھتا ہےلیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ نام بڑا مضحکہ خیز اوردلچسپ صورتحال پیش کرتا ہے۔اکثرعورتیں زندگی بھر یہ عرفیت اپنائے رکھتی ہیں۔ایک گھر کی نئی بہو بے بی ہے اوریہی چندسالوں بعد مختلف سائز کے بے بیوں کی ماں بن جاتی ہے تب بھی وہ بے بی ہی کہلانا پسند کرتی ہے۔ایک صاحب کاذکروہ کچھ اس طرح کرتی ہیں:

''آپ کو کتنے بچے ہیں، دوران گفتگو ہم نے پوچھا انہوں نے کہا دو

لڑکیاں ہیں، بڑی بے بی پی ایچ ڈی کر رہی ہیں اور چھوٹی ایم فل میں ہے''۔(30)

ڈاکٹر حبیب ضیاء زندگی سے قریب تر عنوانات پر قلم اُٹھاتی ہیں اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور لکھنے سے ان کا قلم کبھی نہیں چوکتا۔ مثلاً انہوں نے ''گویم مشکل'' میں میاں بیوی اور نوکرانی کا مثلث پیش کیا ہے۔ فن چمچہ گری میں انہوں نے خوشامد، چاپلوسی اور جھوٹی تعریف کو چمچہ گری سے تشبیہ دی ہے۔

ان کے مضامین میں جہیز کی لعنت کے خلاف بھی کافی طنز ملتا ہے۔ ان کے مضامین میں نسوانی مسائل پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اکثر کردار عورتوں پر مشتمل ہیں۔ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کو مختصر اور واضح انداز میں بیان کر دیتی ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا خزانہ ہے وہ اپنی تحریروں سے قارئین کے چہروں پر تبسم بکھیر دیتی ہیں۔ ان کے مضامین کی زبان شگفتہ ہے وہ دلچسپ انداز میں روزمرہ کے حالات کو بے تکلف بلا روک ٹوک اور سچائی کے ساتھ بیان کر دیتی ہیں۔ ان کی تحریر میں کبھی کبھی استفہامیہ انداز بھی ملتا ہے۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء کے موضوعات مرد طنز ومزاح نگاروں سے ذرا مختلف ہیں۔ ان کا مشاہدہ کافی تیز ہے وہ اپنے اطراف کے واقعات سے متاثر ہو کر مزاح کے نکتے تلاش کرتی ہیں اور کامیابی کے ساتھ اس پر تبصرہ کرتی ہیں۔ ان کے مضامین کی ایک اور خصوصیت ان میں حیدرآبادی تہذیب واضح طور پر جھلکتی ہے۔

ان کے اسلوب میں سادگی اور سچائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی زبان میں روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ ان کی زبان کافی شائستہ ہوتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب وہ بڑے ماہرانہ انداز میں کرتی ہیں وہ لفظوں کو جملے میں نگینے کی طرح جڑتی ہیں۔ ان کے ہاں نادر اور عمدہ تشبیہات ملتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ کبھی کبھار وہ عربی الفاظ کا بھی استعمال کرتی ہیں۔

انشائیہ کی دنیا میں عورتوں نے بہت کم دلچسپی لی ہے۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے انشائیہ نگار ڈاکٹر ضیاء الحسن نے بھی اپنے ایک سیمینار میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہاں خواتین نے انشائیہ سے دلچسپی نہیں لی۔ ہندوستان میں بھی یہی صورتحال ہے۔ شفیقہ فرحت نے چند ایک انشائیہ ضرور لکھے ہیں اور یہی صورت حال حبیب ضیاء کی ہے

ان کی اصل دنیا مزاح ہے۔انشائیہ ان کے لئے ثانوی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان کے مجموعوں میں جو انشائیے ملتے ہیں جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔اگر حبیب ضیاء نے انشائیہ کو مستقل اپنا لیا تو یقیناً وہ ایک اچھی فنکارہ کے طور پر یاد رکھی جائیں گی۔

طنز و مزاح کے میدان میں بہت کم خواتین نے اپنی شناخت بنائی ہے۔ان میں ڈاکٹر حبیب ضیاء کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ان کی مزاحیہ تحریریں اُردو ادب میں سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور اُن کے ان کارناموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) بحوالہ ''ڈاکٹر حبیب ضیاء فن اور شخصیت'' مقالہ برائے ایم فل، از: جمیل فاطمہ صفحہ 6، 1997 غیر مطبوعہ

(2) عتیق اقبال　''ڈاکٹر حبیب ضیاء''　مضمون مشمولہ روزنامہ سیاست 15 اکتوبر 1995

(3) فاطمہ یزدانی　''محترمہ حبیب ضیاء صاحبہ (صدر محفل خواتین)''　مضمون مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ 31 جولائی 2010ء

(4) برق آشیانوی　مضمون مشمولہ: ''انیس بیس''　صفحہ 90-89 سنہ اشاعت......

(5) ڈاکٹر حبیب ضیاء　''لاڈ'' مشمولہ ''گویم شکل'' صفحہ 62-61 سنہ اشاعت......

(6) ڈاکٹر حبیب ضیاء　''جلسے'' مشمولہ ''گویم مشکل'' صفحہ 29-28

(7) عارف مجاہد　مضمون مشمولہ:　''گویم شکل'' صفحہ 13

(8) ڈاکٹر حبیب ضیاء　''گویم مشکل'' مشمولہ ''گویم مشکل'' صفحہ 72-71

(9) ڈاکٹر حبیب ضیاء　''پانی'' مشمولہ ''گویم مشکل'' صفحہ 37

(10) ڈاکٹر حبیب ضیاء　''پانی'' مشمولہ ''گویم مشکل'' صفحہ 39

(11) ڈاکٹر حبیب ضیاء　''پانی'' مشمولہ ''گویم مشکل'' صفحہ 45

(12) ڈاکٹر حبیب ضیاء　''ہمارے بھی ہیں امتحان'' مشمولہ ''گویم مشکل'' صفحہ 98-97

(13) ڈاکٹر حبیب ضیاء　''ہمارے بھی ہیں امتحان'' مشمولہ ''گویم مشکل'' صفحہ 103

(14) ڈاکٹر حبیب ضیاء "ہمارے بھی ہیں امتحان" مشمولہ "گویم مشکل" صفحہ 104

(15) ڈاکٹر حبیب ضیاء "بدیسی مال" مشمولہ "گویم مشکل" صفحہ 103

(16) ڈاکٹر حبیب ضیاء "بچہ باہر گیا" مشمولہ "گوئم مشکل" صفحہ 79-78

(17) ڈاکٹر حبیب ضیاء "بنام" مشمولہ "گویم مشکل" صفحہ 171

(18) ڈاکٹر حبیب ضیاء "بنام" مشمولہ "گویم مشکل" صفحہ 173

(19) ڈاکٹر حبیب ضیاء "بنام" مشمولہ "گویم مشکل" صفحہ 175

(20) ڈاکٹر حبیب ضیاء "میرا پہلا مضمون پڑھنا"، مشمولہ "انیس بیس" صفحہ 67-66

(21) ڈاکٹر حبیب ضیاء "چلر" مشمولہ "انیس بیس" صفحہ 77

(22) ڈاکٹر حبیب ضیاء "ہلمٹ" مشمولہ "انیس بیس" صفحہ 24-23

(23) ڈاکٹر حبیب ضیاء "سولہ برس کا سن" مشمولہ 'انیس بیس' صفحہ 33

(24) ڈاکٹر حبیب ضیاء "ہزاروں خواہشیں ایسی" مشمولہ انیس بیس صفحہ 42

(25) ڈاکٹر حبیب ضیاء "ہزاروں خواہشیں ایسی" مشمولہ 'انیس بیس' صفحہ 43

(26) ڈاکٹر حبیب ضیاء "خوش رہنا بھی ایک فن ہے" مشمولہ "انیس بیس" صفحہ 45

(27) ڈاکٹر حبیب ضیاء "حیدرآباد کی سڑکیں" مشمولہ "انیس بیس" صفحہ 69

(28) ڈاکٹر حبیب ضیاء "آٹو والے" مشمولہ انیس بیس"، صفحہ 72

(29) بحوالہ "ڈاکٹر حبیب ضیاء" شخصیت اور فن، از: جمیل فاطمہ، صفحہ 84

(30) بحوالہ "ڈاکٹر حبیب ضیاء" شخصیت اور فن ، از: جمیل فاطمہ' صفحہ 84

جیلانی بانو

جیلانی بانو مہذب اور علم دوست گھرانے میں 14 جولائی 1936ء(1) کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد علامہ حیرت بدایونی، عربی فارسی کے عالم اور بلند پایہ شاعر تھے۔1922ء میں بدایوں سے حیدرآباد آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ جیلانی بانو کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔اردو، فارسی اپنے والد علامہ حیرت بدایونی سے پڑھی۔انگریزی کے لئے گھر پر ماسٹر کا انتظام کیا گیا تھا۔انہوں نے 1953ء میں علی گڑھ سے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے میٹرک کا امتحان دیا اور درجہ اول میں کامیاب ہوئیں۔ پھر 1956ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی خانگی طالب علم کی حیثیت سے درجہ اول میں کامیاب کیا۔1959ء میں انہوں نے بی اے کا امتحان سماجیات (Sociology) معاشیات (Economics) اور اردو کے مضامین کے ساتھ ویمنس کالج سے خانگی طور پر کامیاب کیا۔1973ء میں دہلی یونیورسٹی سے اردو ادبیات سے ایم اے کامیاب کیا۔اس طرح انہوں نے پوسٹ گریجویشن تک خانگی طالبہ کی حیثیت سے ہی اپنی تعلیم برقرار رکھی۔ اور ہر دفعہ امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کی۔ایم اے کے بعد وہ عثمانیہ یونیورسٹی سے ''اردو افسانے میں سماجی اور سیاسی رجحانات'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے لئے ریسرچ شروع کیا لیکن:

''گھریلو ذمہ داریوں کے سبب اپنے تحقیقی کام کو آگے نہ بڑھا سکیں۔''(2)

جیلانی بانو کی شادی والدین کی پسند سے 1959ء میں پروفیسر انور معظم سے حیدرآباد میں ہوئی۔اپنی شادی کے متعلق وہ خود اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں۔

''59ء میں میری شادی ڈاکٹر انور معظم سے ہوئی یہ بھی ایک دلچسپ حادثہ تھا۔کم سے کم مجھ ایسی جذباتی لڑکی کے لئے تو یہ ایک بے حد مشکل مسئلہ تھا۔شاید زندگی میں سب سے بڑا صلہ یہی ملا کہ انور بالکل ویسے ہی آئیڈیل ثابت ہوئے جیسے ایک حساس جذباتی لڑکی اپنے خوابوں میں

ڈھونڈتی ہے۔(3)

پروفیسر انور معظم ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد کچھ عرصہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبہ ریسرچ سے وابستہ رہے۔1964ء میں ڈاکٹر انور معظم عثمانیہ یونیورسٹی کے اسلامک اسٹڈیز کے شعبہ میں لکچرار مقرر ہوئے اور اسی شعبہ کے صدر کے عہدے سے وظیفہ حسن خدمات پر سبکدوش ہوئے۔

جیلانی بانو کو1960ء میں ایک لڑکا تولد ہوا جس کا نام انہوں نے اشہر ثمین رکھا۔لیکن گیارہ مہینے بعد اشہر ثمین بعارضہ یرقان اللہ کو پیارا ہو گیا۔اشہر ثمین کی وفات کے بعد1966ء میں جیلانی بانو کے ایک اور لڑکا ہوا جس کا نام انہوں نے اشہر فرحان رکھا جسے وہ بے حد چاہتی ہیں۔

جیلانی بانو نے 1954ء سے مختصر کہانیاں لکھنی شروع کیں۔اب تک ان کی بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں دو ناول' کہانیوں کے سات مجموعے' دو ناولٹ اور ملیالم زبان میں لکھی گئی کہانیوں کا ہندی ترجمہ شامل ہے۔

جیلانی بانو کی عالمگیر شہرت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کی تقریباً سبھی کتابوں کے ترجمے دنیا کے مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔انہیں یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ اکثر کتابوں کے ایک سے زائد ایڈیشن حیدرآباد کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک سے شائع ہوئے۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔جن میں پدم شری ایوارڈ اور سوویت یونین (روس) کا نہرو ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔

جیلانی بانو صف اول کی قلم کار مانی جاتی ہیں۔سنجیدہ مضامین' ناول' مختصر افسانوں کے علاوہ انھوں نے طنزومزاح پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے کچھ دنوں تک روزنامہ سیاست کا مزاحیہ کالم ''شیشہ و تیشہ'' بھی تحریر کیا۔ان کے کئی انشائیے اور مزاحیہ مضامین ماہنامہ ''شگوفہ'' اور روزنامہ ''سیاست'' میں شائع ہوئے۔'' کچھ چائے کے بارے میں'' اور ''بیکاری کے مشغلے'' ان کی مزاح نگاری کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ڈاکٹر حبیب ضیا لکھتی ہیں۔

> ''جیلانی بانو نے مزاح نگاری کی جانب بھی توجہ دی ہے۔مختلف رسائل اور اخبارات میں ان کے انشائیے شائع ہو چکے ہیں۔جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں مزاح لکھنے کی عمدہ صلاحیتیں موجود ہیں۔چائے بہترین انشائیہ

ہے۔جس میں چائے نوشی کرنے والوں پر شگفتہ انداز میں اظہار خیال کیا
ہے۔انشائیہ کے علاوہ ٹی وی سیریئل بھی طنز ومزاح کا عمدہ نمونہ ہیں‘‘۔(4)

جیلانی بانو نے بحیثیت افسانہ نگار ادبی دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے۔دوسری طرف انھوں اپنی ادبی زندگی میں کئی مزاحیہ مضامین اور خاکے بھی سپرد قلم کئے ہیں۔ان کے مضامین میں زندگی کی معنویت اور گردوپیش کے بے ہنگم واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔سلجھا ہوا انداز بیان‘بات سے بات پیدا کرنا اور محاوروں کا استعمال ان کی مضمون نگاری کی پہچان بن گیا ہے۔جیلانی بانو کا مزاح قہقہہ بردوش نہیں بلکہ زیرلب تبسم بکھیرتا ہے۔وہ روزمرہ کے واقعات کو جس انداز میں دیکھتی ہیں اسی کو تھوڑے سے مزاحیہ انداز میں قلم بند کردیتی ہیں۔

جیلانی بانو کے بیشتر مضامین اور انشائیے روزنامہ ’’سیاست‘‘میں شائع ہوئے۔ایک اچھا قلم کار اپنے عصر کا ترجمان ہوتا ہے۔اور اپنے اطراف کے ماحول اور اپنے آس پاس رہنے والوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔جیلانی بانو اپنے اطراف پھیلی اس دنیا کا بغور مطالعہ کرکے اس میں اپنے موضوعات تلاش کرتی ہیں۔ان کے مضامین اس کا بین ثبوت ہیں۔

’’اُجاڑ صورت‘‘عنوان سے ہی دکنی تہذیب کی خوشبو آنے لگتی ہے۔دکن میں یہ لفظ خواتین عام طور پر زیادہ استعمال کرتی ہیں۔جیلانی بانو اس لفظ کے کئی معنٰی بتاتی ہیں۔اس مضمون میں بڑی شگفتگی کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ لفظ کس موقع پر کس معنٰی میں استعمال کیا جاتا ہے۔وہ لکھتی ہیں۔

’’خاک میں اتنی صورتیں کہاں پنہاں ہوسکتی ہیں جتنی اس لفظ نے ڈھانپ لی ہیں۔یوں صورت کو اُجاڑ وقت کا اور خصوصاً عورتوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔خصوصاً لڑکیوں کی اصطلاح میں سب سے زیادہ‘ اجاڑ صورت‘وہ ہے جو سب سے زیادہ پیارا ہے۔‘‘(5)

امتحانات کے دور میں طلبا کی صورتحال اور ان کے شب و روز کو کئی قلم کاروں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔’’امتحان کا بخار‘‘مضمون میں جیلانی بانو نے امتحان سے قبل طالب علم پر نفسیاتی طور پر جو ہیبت طاری رہتی ہے اس کیفیت کو مختلف زاویوں سے اجاگر کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

''امتحان کے دن ان پرلرزہ طاری ہوجاتا ہے جلدی میں ہال ٹکٹ بھول جاتے ہیں' امتحان ہال میں سیٹ کہیں نہیں ملتی' رول نمبر لکھنا یاد نہیں رہتا۔وہ سارے ہی سوال جو گھر سے یاد کر کے گئے تھے پھر گھر آتے ہی یاد آجاتے ہیں۔''(6)

رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ ظرافت میں طنز مضمر ہوتا ہے۔اس مضمون میں بھی مزاح کی چاشنی کے ساتھ طنز کی نشتریت بھی نظر آتی ہے۔

دھوبی بھی ایک ایسا عنوان ہے جس پر کئی مزاح نگاروں نے اپنی نوک قلم سے ظرافت کے پھول بکھیرے ہیں۔جیلانی بانو کے مضمون ''ہماری دھوبن'' میں اس کردار کے حوالے سے طنز ومزاح کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔دھوبنیں کس طرح کپڑے دھونے اور انھیں خود استعمال کرتے ہوئے حیلے بہانوں سے کام لیتی ہیں۔اسی محور کے گرد یہ مضمون گھومتا ہے۔اس مضمون میں جیلانی بانو لکھتی ہیں کہ ''چند خاص پیشوں ے وابستہ لوگوں کے سانچے اللہ میاں نے مقرر کردیے ہیں۔چنانچہ دھوبن کا تصور کیجئے تو ایک بھاری بھرکم چیختی چلاتی بدمزاج خاتون سامنے آجاتی ہے۔لیکن جیلانی بانو کی دھوبن اس سے بالکل مختلف ہے۔وہ تو بڑی چھیل چھبیلی' نازک اندام سی ہے۔جیلانی بانو کی اس نازک اندام دھوبن پر موسم کا اثر شدید ہوتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''گرمیاں ہوں تو سورج کو دیکھو تو سر پر دھپے مارتا ہے۔ندی میں پانی سوکھ گیا۔اب کپڑے کیا تھوک لگا کر دھوؤں۔ یا برسات میں تو خیر بڑی آسانی سے قائل کر دیتی ہے۔اِتی برسات میں کپڑے دھونے کیسے جاؤں چڑی میوہ کھانے کو بھی تو نہیں نکل سکتی۔سردیاں آتے ہی دھوبن سے ایک اور بہانہ سن لیجئے۔

میرے کوز کام لگی صاب' کیا پانی میں کھڑے ہوکر مر جاؤں۔''(7)

''آپ کا ڈرائنگ روم'' ایک ایسا مضمون ہے جس میں بدلتی تہذیب اور رہن سہن کے بدلتے طور طریقوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ساتھ ہی جیلانی بانو نے خواتین کو ڈرائنگ روم سجانے کی تراکیب بتاتی ہیں۔ڈرائنگ روم

اور دیوان خانے کا تعارف کرواتے ہوئے ان کا تقابل کیا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ لکھتی ہیں۔

''ہمارے آبا و اجداد کے زمانے میں اس کمرے کو انگریزی نام نہ ملا تھا تو یہ ''بیٹھک'' یا ''دیوان خانہ'' کہلاتا تھا۔ یہاں چند مونڈھے دو ایک پلنگ نماز کی چوکی، چاندنی کا فرش، حقہ اور خاصدان ضروری چیزیں ہوتیں اور یہی مکمل عیش پسندی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔''

آج کا ڈرائنگ روم دیکھئے:

دولت اور عقل کے پورے پورے امتحان کے بعد بھی آپ جو ڈرائنگ روم تیار کرتی ہیں۔ اس میں نہ تو پیر پسار کے بیٹھ سکتی ہیں نہ آرام کے ساتھ سو سکتی ہیں۔ بلکہ یہ تو وہ کمرہ ہے جسے آپ جی جان سے سجانے کے باوجود نہ صرف گھر کے دوسرے افراد بلکہ خود اپنا داخلہ وہاں ممنوع قرار دیتی ہیں۔''(8)

ایک اچھے قلم کار کی تخلیقات میں عصری حسیت کا عنصر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ جیلانی بانو کے فن پاروں میں بھی یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی میں کئی لوگوں سے ہمارا سامنا ہوتا ہے۔ ترکاری فروش، دودھ والے، آئس کریم والے اور ایسے نہ جانے کتنے کردار ہوتے ہیں جو ہماری زندگی میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک کردار ہے ''سوئیاں پوت والی''۔ جیلانی بانو نے اس مضمون میں گلی گلی پھیری لگانے والی ''سوئیاں پوت'' بیچنے والی عورت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اور ہمارے متوسط طبقے کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ اس طرح کی عورتوں کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتی ہیں۔

''سوئی پوت والی، علم نفسیات کی صرف ایم اے ہی نہیں بلکہ پی ایچ ڈی ہوتی ہے ایک منٹ میں وہ خریدار کی نفسیات، اس کے سماجی رشتوں اور معاشی سچویشن کو بھانپ لیتی ہے۔''(9)

اس مضمون کو پڑھتے ہوئے سوئی پوت والی کی نفسیات سے جیلانی بانو کی واقفیت پر حیرت ہوتی ہے۔

حیدرآباد میں ہر سال جنوری کے مہینے میں صنعتی نمائش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔اور ڈیڑھ ماہ تک چلنے والی اس نمائش میں ایک دن خواتین کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔نمائش سے متعلق جیلانی بانو نے دو مزاحیہ مضامین لکھے ہیں۔ ’’خواتین اور نمائش‘‘ اور ’’یوم خواتین‘‘ کے عنوان سے تحریر کردہ ان مضامین میں جیلانی بانو نے یوم خواتین کا نقشہ کھینچتے ہوئے بڑے ہی موثر انداز میں خواتین پر طنز کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

> ’’جس طرح حیدرآباد کی ہر عورت کو نمائش کے ’’یوم خواتین‘‘ میں شرکت کرنا لازمی ہے اسی طرح وہاں جا کر کچھ نہ کچھ کھانا اور خریدنا بھی اشد ضروری ہے۔کہتے ہیں عورت گھر کی ملکہ ہے جس گھر میں اس کی ڈولی جائے وہاں سے اس کا ڈولا نکلا کرتا ہے۔لیکن ارباب نمائش اس بات کو نہیں مانتے کیونکہ یوم خواتین کی رات کسی عورت کو اپنا گھر یاد نہیں رہتا۔وہ اس خاموش اور فضول گھر کو واپس جانے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوتی جہاں اس کا میاں اکیلا بیٹھا گھر کی نگرانی کر رہا ہے۔‘‘(10)

ڈاکٹر سیدہ جعفر طنز و مزاح کے پس منظر کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ’’ہر دور کا طنز و مزاح اس کے اخلاق‘ تہذیبی اور معاشرتی معیار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس آئینہ میں اس نسل کے خدوخال آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔‘‘(11)

جیلانی بانو کے مندرجہ بالا مضامین کے مطالعہ سے ان کے مشاہدے اور عصری حسیت سے ان کی آگہی واضح ہوتی ہے۔

’’دشمن بنانے کا فن‘‘ یہ مضمون بھی روزنامہ سیاست کی زینت بن چکا ہے۔انسان کی زندگی میں دوست ہمنوا اور ہمدرد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان جتنا خیال اپنے دشمن کا کرتا ہے‘ جتنی تگ و دو دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لئے کرتا ہے‘ دوست کے لئے نہیں کرتا۔جیلانی بانو لکھتی ہیں۔

''دشمن کی موجودگی صحت کے لئے وٹامن کی طرح ضروری ہے۔ جس طرح وٹامن کی کمی والے انسان کے چہرے پر نقاہت' بیماری اور تھکن نظر آتی ہے۔ یوں ہی دشمن نہ رکھنے والے شخص کی صورت پر ناکامی' مایوسی اور شکست خوردگی چھائی رہتی ہے۔''

دشمن اور خواتین کے بارے میں وہ لکھتی ہیں۔

خواتین کو دشمن بنانے کے نسخے بتانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ابھی پرسوں ایک پارٹی میں ایک خاتون کہہ رہی تھیں' نہ جانے ہاجرہ میری کیوں دشمن بن گئی ہے ایک بار میں نے اتنا کہہ دیا کہ اس کا شوہر اس سے اچھا ہے۔''(12)

یہ اقتباسات جیلانی بانو کے گہرے مشاہدے اور سماج کی نفسیات پر ان کی گہری نظر و بصیرت کی مرہون منت ہیں۔ عید کے موضوع پر بھی کئی مزاح نگاروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ جیلانی بانو کے پاس بھی یہ موضوع موجود ہے۔ عید کے موضوع پر ان کے دو مضامین شائع ہوئے۔ جس میں مختلف طبقوں کی عید کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ''عید کا دن'' کے عنوان سے لکھے مضمون میں عید کے دن کی گہما گہمی کا تذکرہ بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں جہاں انہوں نے عید کی خوشیاں منانے والوں کا ذکر کیا ہے وہیں ان لوگوں کا ذکر بھی ملتا ہے' جنھیں عید کیا ہوتی ہے' اس کا پتہ نہیں۔ ایک اقتباس دیکھئے:

'' کچھ لوگ اس لئے عید مناتے ہیں کہ عید انہیں ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتی' کچھ لوگ محض اپنے پڑوسیوں کو نیچا دکھانے کے لئے عید مناتے ہیں' بلکہ عید انھیں مناتی ہے۔ عید کا احساس سب سے زیادہ باپوں کو اور ان کی سب سے چھوٹی اولاد کو ہوتا ہے اور عید کو عید نہ ماننے والے لوگ یہ ہوتے ہیں۔ کھانا پکانے والی ماما' پنجرے میں بند چیخنے والا مٹھو۔ امی جان اور پڑوس کا ہمیشہ سے گندہ رہنے والا لڑکا منو۔''(13)

ایک صالح معاشرے میں جھوٹ سے گریز اور سچائی کو اپنانے کی بات کی جاتی ہے اور موجودہ سماج کا یہ المیہ

ہے کہ انسان ہر وقت جھوٹ کا سہارا لیتا نظر آتا ہے اور بعض لوگ تو اسے ایک فن قرار دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ ''جھوٹ کی تائید میں'' ایک طنزیہ مضمون ہے جس میں جیلانی بانو نے اپنے تیکھے انداز میں حقائق کی تلخی کو ابھارا ہے اور سچ بولنے کا کیا انجام ہوتا ہے اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''سچ کو برداشت کرنے والے اب کہاں ہیں جب کہ آج ہر شخص اعصابی تناؤ اور ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا ہے۔ یوں بھی سچ بولنے والوں کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو کیا منصور اور کیا سقراط کیا گاندھی جی اور کیا غالبؔ ہر سچ بولنے والے انسان کو سچ بولنے کے جرم کی سزا دی گئی ہے۔'' (14)

جھوٹ اور سچ کے بارے میں جیلانی بانو کا یہ استدلال ان کے اخلاقی اقدار کا ثبوت ہے۔ اس مضمون میں ان کا اسلوب سیدھا اور پر اثر ہے۔ ایک اور اقتباس دیکھئے۔

> ''کسی زمانے میں جھوٹ بولنا گناہ تھا پھر آرٹ بنا پھر ضرورت بن گیا ہے۔'' (15)

حیدرآبادی معاشرے میں چائے ایک لازمی شئے مانی جاتی ہے۔ جیلانی بانو نے ''کچھ چائے کے بارے میں'' عنوان سے ایک انشائیہ لکھا۔ فبروری 1983ء میں ایوان اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد میں منعقدہ ایک تقریب میں جیلانی بانو نے یہ مضمون سنایا تھا جو بعد میں روزنامہ ''سیاست'' میں بھی شائع ہوا۔ اس انشائیہ میں انہوں نے چائے پینے اور پلانے والے حضرات کی غرض وغایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''چائے پینے کے بہت سے مدارج ہیں اور اس کے آداب ہیں۔ مثلاً ایک کلرک اپنے باس کو چائے پلائے یہ ''مصلحت پسند چائے'' ہے۔ ایک شاعر کسی نقاد کو چائے پلائے تو یہ خوشامدانہ چائے ہے۔ ایک باس اپنے اسٹاف کو چائے پلائے تو یہ بدبختانہ چائے ہے ایک لڑکا کسی لڑکی کو چائے کی دعوت دے تو یہ رومانی چائے کہلائے گی۔'' (16)

''نام بڑا اور......'' جیلانی بانو کا یہ مزاحیہ مضمون سلسلہ مطبوعات روزنامہ ''سیاست'' سے شائع ہونے والی کتاب ''حیدرآباد نگینہ'' میں شائع ہوا ہے۔ ''نام بڑے اور درشن چھوٹے'' ایک محاورہ ہے' اسی کو اپنا موضوع بنا کر جیلانی بانو نے ان نامور آدمیوں اور شخصیتوں کے چھوٹے درشن گنائے ہیں۔

''گنڈی پیٹ کا پانی'' یہ مضمون بھی ''حیدرآباد نگینہ'' میں شامل ہے اس مضمون کے لکھنے والوں میں دو نام دئے گئے ہیں۔ زینت ساجدہ اور جیلانی بانو' گویا یہ دونوں کی کاوش ہے۔ واضح رہے کہ یہ مضمون زینت ساجدہ کے انتقال کے بعد شائع ہونے والے مجموعے ''اسلوب بیاں اور'' میں بھی شامل ہے۔ اس مضمون کے سلسلے میں شاید جیلانی بانو نے زینت ساجدہ سے مدد لی ہو۔ بہر حال مزاحیہ مضمون ہے۔ حیدرآباد شہر کو گنڈی پیٹ سے پینے کے پانی کی سپلائی ہوا کرتی تھی۔ عموماً دوسری ریاستوں اور دیہاتوں سے آئے ہوئے افراد جب حیدرآباد میں بس جاتے ہیں۔ اور ان میں ''میں'' پن آجاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ''گنڈی پیٹ کا پانی لگ گیا''۔ اس مضمون میں اسی نکتہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اچھا مضمون ہے۔

''بیکاری کے مشغلے'' ایک اچھا مزاحیہ مضمون ہے جس میں جیلانی بانو تاریخ کی نامور شخصیتوں کے کارناموں کو بیکاری کا نتیجہ قرار دیتی ہیں۔ ان کا اسلوب انتاروا اور دلکش ہوتا ہے کہ قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''ہٹلر کی بیروزگاری بڑھی تو اس نے ساری خدائی میں آگ لگانے کی ٹھان لی۔ سکندر اعظم نے سوچا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے سے اچھا ہے ساری دنیا کو فتح کر ڈالوں۔ بُش کو بیکاری نے گھیرا تو اس نے پہلے اُسامہ بن لادن کو افغانستان سے نکال باہر کیا پھر صدام حسین کو کسی گٹر میں ڈھکیل دیا۔ اُردو کے پروفیسر جب ریٹائرڈ ہوتے ہیں تو شدید بیکاری انہیں نقاد بنا دیتی ہے کیونکہ تنقید اپنی علمی صلاحیتوں اور خود خالق کا بہترین اظہار ہے۔'' (17)

جیلانی بانو کا مزاح قہقہہ بردوش نہیں۔ ان کے مضامین میں مزاح کی ایک سبک لہر چلتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی طنز کے تیر بھی اپنا اثر دکھاتے رہتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ عمیق ہے۔ وہ سماج کے ہر طبقے کے مسائل کو اپنی تخلیقات میں

پیش کرتی ہیں۔ جیلانی بانو کی مزاح نگاری کے بارے میں ڈاکٹر لئیق صلاح کا خیال ہے۔

''انھوں نے سنجیدہ مسائل کی تلخی کو مزاح کی چاشنی سے کم کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (18)

اس کے علاوہ ان کے بیشتر مضامین جیسے جھوٹی خبریں' ضرورت ہے' میرا دوست میرا یار' ٹرانسسٹر' قسط باقی ہے' عورتوں کا سال' ادبی شامیں' غرارہ' میٹھی میٹھی باتیں' جی نہیں پہلے آپ' وغیرہ ایسے مزاحیہ مضامین ہیں جس میں ہماری روزمرہ زندگی کے مختلف مضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مزاحیہ مضامین اور انشائیوں کے علاوہ جیلانی بانو ایک عرصہ تک روزنامہ سیاست کے کالم ''شیشہ و تیشہ'' لکھتی رہی ہیں۔ اس کالم کے بارے میں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ ہر روز دنیا بھر کی دہشت ناک خبروں کو پڑھنے کے بعد اس کالم کے مطالعہ سے نہ صرف دنیا پر حکمراں بربریت کا تاثر ختم ہوجاتا ہے۔ بلکہ قاری ایک ایسی دنیا میں پہونچ جاتا ہے۔ جہاں پر کچھ دیر ہی کے لئے صحیح اُسے ذہنی سکون ملتا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے شاہد صدیقی مرحوم کے لکھے ہوئے شیشہ و تیشہ کے کالموں کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ جیلانی بانو کے شیشہ و تیشہ کے کالم بالکل مختصر ہیں۔ جس میں انھوں نے اپنے قلم کی نشتریت کو برقرار رکھا ہے۔ شیشہ و تیشہ کے تمام مضامین کسی نہ کسی خبر یا واقعے کو موضوع بنا کر لکھے گئے ہیں۔

15 مارچ 1981ء کے کالم میں انھوں نے ''شادیوں کے موسم'' کو موضوع بنایا ہے جس میں انہوں نے شادیوں کی تفصیل لکھتے ہوئے بڑے خوبصورت انداز میں اس شخص کی کیفیت کو بیان کیا ہے جس کو شادی کا رقعہ دیکھنے کے بعد بجائے خوشی کے تحفہ کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ ایک اقتباس دیکھئے:

''جب شادی کا کوئی کارڈ آتا ہے تو ہمیں دولھا سے ہمدردی کرنے کے بجائے اپنے اوپر ترس آنے لگتا ہے کیونکہ ہمیں ایک تحفہ کی فکر پڑ جاتی ہے۔'' (19)

شادی کے موضوع پر جیلانی بانو نے ایک اور کالم بھی لکھا ہے۔ عام اور دلچسپ واقعات کے ساتھ ساتھ چبھتے ہوئے معاشرتی مسائل پر جیلانی بانو نے اپنے کالم لکھے۔ 19 جولائی 1981ء کے کالم میں فسادات کو موضوع

بنایا گیا ہے۔اس خبر سے متاثر ہوکر یہ کالم لکھا گیا ہے کہ حسین ساگر میں اُگنے والی بیلوں کو صاف کرنے کے لئے مزدوروں کے ساتھ طالب علم لڑکےلڑکیاں بھی کام کررہی ہیں' یہ کالم خوب ہے۔ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہوجس میں خوبصورت طنز بھی موجود ہے۔

''حیدرآباد کی نئی نسل قلی قطب شاہ اورآصف جاہوں کی طرح حیدرآباد کی منفرد خوبصورتی اورتہذیب کواور شاندار بنانا چاہتی ہے۔صفی' کشن پرشاد' رائے محبوب نارائن' اور مخدوم کی طرح اس شہر کی تہذیب کی وارث ہے۔''(20)

9اگست 1981ء کے کالم کے لئے جیلانی بانو نے اورنگ آباد کی اس خبر کوموضوع بنایا ہے کہ بابن نامی ایک نوجوان نے تین سو(۳۰۰) سانپوں کے ساتھ ایک سودس (۱۱۰) گھنٹے گذارنے کاارادہ کیا ہے۔

اس کالم میں جیلانی بانو نے انسانوں اور سانپوں کا تقابل بھی کیا ہےاورآج کے انسانوں کوسانپوں سے زیادہ خطرناک قرار دیا ہے۔برخلاف اس کے سانپ کو بےضرر بتایا ہے۔سانپ ایک زہریلا اور موذی جانور ہے چاہے وہ پالتو ہی کیوں نہ ہوبہر حال کاٹتا ہے۔جبکہ انسان چاہے کتنا ہی براہوٗ اچھائی کی طرف مائل ہوسکتا ہے۔اس کالم میں بعض اچھے نتائج بھی اخذ کئے گئے ہیں۔ایک اقتباس پیش ہےجس میں آج کے انسان کی درندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

''یہ کسی بھی وقت ڈس سکتے ہیں اور کسی بھی وقت بابن ان کے ڈسنے سے مرسکتا ہے۔اس سچائی کو قبول کرنا بابن کے لئے بہت آسان تھا لیکن شاید وہ اس جھوٹ کو برداشت نہیں کرسکتا ہے کہ اپنے آس پاس منڈلانے والے درندوں کوانسان مان لے۔''(21)

30 ستمبر 1981ء کے کالم میں فرانسیسی سائنسداں کرچین مارنل کے اس دعویٰ کوموضوع بنایا ہے کہ وہ دن کورات اور رات کودن میں تبدیل کرسکتے ہیں۔جیلان بانو نے اس کارنامہ کومعمولی بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

''اردوشاعری کامطالعہ کیجئے تو وہاں بھی جابجا آپ کومحبوب کی دوری اورقربت میں دن کورات اور رات کودن میں بدلنے کے گوشے نظر آئیں گے۔''(22)

یہ ایک بہت ہی شگفتہ کالم ہے۔ایک کالم میں جیلانی بانو نے لندن سے موصول ہونے والی اس خبر کو موضوع بنایا ہے کہ ایک خاتون نے اپنی وصیت میں اپنی چہیتی بلی کو دس ہزار پونڈ دینے کو لکھا ہے اور شوہر کو صرف ایک ہزار پونڈ۔اس خبر کا ہندوستانی شوہروں پر کیا اثر پڑا اس کو مبالغے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے پڑھتے ہوئے بار بار حقائق کے غیر فطری ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

ایک کالم میں جیلانی بانو نے مرغی کے لئے انسان کے قتل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔جس پر مرغیاں احتجاج کرتیں ہیں۔ پولٹری فارم پہنچ کر ایک خاتون اس خبر کے بارے میں مرغیوں سے انٹرویوں لیتی ہے۔ یہ ایک مضحکہ خیز تصور ہے۔

جیلانی بانو کی تحریروں میں پھکڑ پن کا شائبہ تک نظر نہیں آتا ان کا مزاح شگفتہ، شائستہ اور مہذب ہوتا ہے۔ سماج کے سلگتے ہوئے تلخ مسائل کو مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کرنا ان کا خاص وصف ہے۔ان کی ادبی خدمات کی مقبولیت کا اندازہ ملک و بیرون ملک سے ملنے والے اعزازات سے لگایا جا سکتا ہے۔ادبی حلقوں میں انہیں احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔حکومت ہند نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر پدم شری کے اعزاز سے نوازا ہے۔مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی 2007ء میں اُنہیں اعزازی ڈاکٹریٹ سے سرفراز کیا ہے۔

مزاح کو عموماً بہت ہی آسان سمجھا جاتا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ مزاح پیدا کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ یہ اُسی ادیب کے لئے ممکن ہے جو زندگی میں نہ صرف ہنستا ہو بلکہ ہنسانا بھی جانتا ہو۔جس طرح ایک بہترین اسکیچ اتارنے والا ایک اچھا کارٹونسٹ نہیں بن سکتا اسی طرح ایک اچھا ادیب ضروری نہیں ایک کامیاب مزاح نگار بن جائے۔

جیلانی بانو اردو فکشن کی دنیا میں ایک معتبر نام ہے لیکن ان کے مزاحیہ مضامین اور شیشہ و تیشہ کے کالم اتنے جاندار نہیں ہیں۔شیشہ و تیشہ کے کالم پڑھتے وقت یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ آمد نہیں بلکہ آورد کی پیداوار ہیں۔ جیلانی بانو کی حساس طبیعت نے روزمرہ زندگی کے معمولی معمولی واقعات اور غیر اہم باتوں میں طنز ومزاح کے پہلو نکالنے کی کوشش کی ہے۔جن میں انھیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔بعض جگہ زندگی کے ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات پیش کئے ہیں جن سے ہر شخص اپنے آپ کو مانوس پاتا ہے۔ بہر حال ان کالموں سے جیلانی بانو کے

نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے اور پھر یہ مضامین اور کالم صرف چند واقعات کے کتھونی نہیں بلکہ ان میں عصری حسیت بھی موجود ہے جو اہمیت کی حامل ہے۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) جیلانی بانو کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہاں جو سنہ پیدائش دیا گیا ہے وہ خود جیلانی بانو نے انٹرویو میں بتایا ہے۔ بحوالہ مقالہ برائے ایم فل ''جیلانی بانو' حیات اور ادبی خدمات'' از ممتاز سلطانہ' 1983ء مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

(2) بحوالہ روزنامہ جسارت کراچی مورخہ 30 اکٹوبر 1979ء

(3) جیلانی بانو ''فن اور شخصیت' آپ بیتی نمبر'' ص 243 سنہ 1978ء

(4) ڈاکٹر حبیب ضیاء ''حیدرآباد کی طنز ومزاح نگار خواتین'' ص 17

(5) جیلانی بانو ''اجاڑ صورت'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ 26 جولائی 1959ء

(6) جیلانی بانو ''امتحان کا بخار'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ: 12 مارچ 1961ء

(7) جیلانی بانو ''ہماری دھوبن'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ: 12 نومبر 1961ء

(8) جیلانی بانو ''آپ کا ڈرائنگ روم'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ: یکم جون 1964ء

(9) جیلانی بانو ''سوئیاں پوت والی'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ: 6 ڈسمبر 1964ء

(10) جیلانی بانو ''یوم خواتین'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ: 26 جنوری 1969ء

(11) سیدہ جعفر ''رشید احمد صدیقی کی نثر نگاری'' مضمون مشمولہ: رسالہ ''غزلوں کی رات'' ص 8 سنہ 1978ء

(12) جیلانی بانو ''دشمن بنانے کا فن'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ: 19 اگست 1973ء

(13) جیلانی بانو ''عید کا دن'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ: 16 ڈسمبر 1977ء

(14) جیلانی بانو ''جھوٹ کی تائید میں'' مطبوعہ روزنامہ سیاست'' مورخہ: 26 جولائی 1980ء

(15) جیلانی بانو ''جھوٹ کی تائید میں'' مطبوعہ روزنامہ سیاست'' مورخہ: 26 جولائی 1980ء

(16) جیلانی بانو　''کچھ چائے کے بارے میں'' مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' 16فبروری 1983ء

(17) جیلانی بانو　''بیکاری کے مشغلے'' مضمون مشمولہ: حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین　ص48

(18) ڈاکٹر لئیق صلاح　''عکس در عکس'' ص122 سنہ 1998ء

(19) جیلانی بانو　''شیشہ و تیشہ'' مطبوعہ ''سیاست'' مورخہ 15مارچ 1981ء

(20) جیلانی بانو　''شیشہ و تیشہ'' مطبوعہ ''سیاست'' مورخہ 19جولائی 1981ء

(21) جیلانی بانو　''شیشہ و تیشہ'' مطبوعہ ''سیاست'' مورخہ 9اگست 1981ء

(22) جیلانی بانو　''شیشہ و تیشہ'' مطبوعہ ''سیاست'' مورخہ 30ستمبر 1981ء

ڈاکٹر لئیق صلاح

ڈاکٹر لئیق صلاح 1938ء میں صلاح بن شمشیر یار جنگ کے گھر پیدا ہوئیں۔ ان کے اجداد کا تعلق یمن کے ایک معروف عربی خاندان ''القعیطی'' سے تھا۔ ان کے جد (عمر بن عوض القعیطی) نظام چہارم کے دور میں ہندوستان آئے اور فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کی گوناگوں خصوصیات اور کارناموں کو دیکھتے ہوئے انھیں ''شمشیر الدولہ'' اور جنگ بہادر کے خطابات سے بھی نوازا گیا۔ لئیق صلاح کے والد اچھے سپاہی ہی نہیں ایک اچھے اہل قلم بھی تھے۔ ان کے نانا میر تہنیت علی خان بھی عالم دین اور حافظ تھے۔ ان کی نانی بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں اور گھر پر مذہبی محفلیں منعقد کیا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر لئیق صلاح کا تعلق چونکہ ایک علمی گھرانے سے رہا ہے اس لئے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ان کی تربیت میں ان کی والدہ اور نانی کا خاص رول رہا۔

انہوں نے گریجویشن عثمانیہ یونیورسٹی اور ایم اے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ ڈاکٹر لئیق صلاح نے ''میر شمس الدین فیض، حیات اور کارنامے'' کے موضوع پر ایم فل اور ''ارسطو جاہ کی علمی و ادبی خدمات'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے مقالے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی نگرانی میں تحریر کیے۔

عملی زندگی کا آغاز انہوں نے 1980ء میں بی بی رضا ڈگری کالج برائے اناث گلبرگہ سے بحیثیت لکچرر کیا۔ 1983ء میں ان کا تقرر گلبرگہ یونیورسٹی میں ہوا۔ اس کے بعد ریڈر اور 1995ء میں وہ اردو کی پروفیسر کیلئے منتخب ہوئیں۔ 1995ء سے 1997ء تک وہ صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر لئیق صلاح نے ''میر شمس الدین فیض، حیات اور کارنامے'' اور ''عہد ارسطو جاہ کی علمی و ادبی خدمات'' کو زیور طباعت سے آراستہ کیا۔ اس کے علاوہ ''عکس در عکس'' اور ''نقد و جستجو'' کے عنوان سے ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کئی تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی ملک کے موقر و معتبر ادبی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔

لئیق صلاح ایک سلجھی ہوئی محقق ہیں لیکن ان کی ادبی زندگی کا آغاز مزاح نگاری سے ہوا ہے۔ ان کے اکثر مزاحیہ مضامین زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان رسالہ ''شگوفہ'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بعدازاں میں یہ مضامین ''سُنی سُنائی'' کے نام سے 1981ء میں شائع ہوئے۔ اس میں 16 مزاحیہ مضامین اور خاکے شامل ہیں۔ اس مجموعہ کا مقدمہ مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص اسلوب میں لکھا ہے اور ڈاکٹر لئیق صلاح کے فن پر اپنی رائے دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> ''لئیق صلاح کی مزاح نگاری کی ایک خوبی مجھے یہ نظر آئی کہ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مزاح لکھتی ہیں۔ لئیق صلاح کے مزاحیہ مضامین میں بلند و بانگ قہقہوں کی گنجائش نہیں البتہ تبسم زیریں کی ایک خوش گوار روسارے مضامین میں جاری وساری ملے گی۔'' (1)

ماضی قریب کے حیدرآباد دکن میں ہاتھ رکشہ اور سائیکل رکشہ کا چلن عام تھا ''سُن تو سہی'' میں لئیق صلاح نے رکشہ رانوں اور سواریوں کی آپسی نوک جھونک کو مزاحیہ پیرائے میں پیش کیا ہے۔ مضمون کی شروعات ہاتھ رکشہ کی تاریخ سے ہوتی ہے۔ زنانہ و مردانہ سواریوں کے رویوں، پردے کا استعمال اور پردے کی آڑ میں عورتوں اور بچوں کا ٹھسا ٹھس بھر جانا۔ ان روزمرہ کے حقائق میں لئیق صلاح نے مزاح کے پہلو ڈھونڈ نکالے ہیں۔ رکشہ رانوں اور سواریوں کی تکرار، رکشے پر چپکائی گئی تصویریں، رکشے پر لکھے گئے اشعار......ان کی تشریح اور ان اشعار کے ذریعہ لئیق صلاح نے تبسم کے شگوفے کھلائے ہیں۔ اس مضمون میں خاکہ نگاری اور واقعہ نگاری کی آمیزش پائی جاتی ہے ایک اور خوبی اس مضمون میں یہ ملتی ہے کہ انہوں نے محاوروں کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔

مضمون ''حجام کا آئینہ'' میں انہوں نے سڑک چھاپ حجاموں سے لیکر فیشن ایبل حجام کی دوکانوں تک کے آئینوں کو سمیٹتے ہوئے مزاح پیدا کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''حجام کا آئینہ سب کچھ تو ہوتا ہے لیکن آئینہ نہیں ہوتا اس میں سوائے عکس کے سب کچھ نظر آتا ہے۔ پارہ تو پتہ نہیں کس صدی میں اس سے پیچھا چھڑا کر پارہ پارہ ہو گیا''۔ (2)

غرض حجاموں اور ان کے گاہکوں کی گفتگو اور دیگر جزئیات کی بڑی شگفتہ تصویریں کھینچی ہیں مضمون میں آئینے کے توسط سے آئینوں سے متعلق اشعار کا استعمال کرتے ہوئے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''اگر میں'' ایک عام سا عنوان ہے۔ اسکول میں طلبہ کے تقریری مقابلوں میں اس طرح کے عنوان دیئے جاتے ہیں جیسے ''اگر میں ٹیچر ہوتا، اگر میں پولیس انسپکٹر ہوتا'' وغیرہ اس مضمون میں لئیق صلاح نے ایسے ہی عنوانات کا سہارا لے کر ایسے ایسے نکتے بیان کئے ہیں کہ ایک یہ عنوان مزاح کا سرچشمہ بن گیا ہے۔ ایک خاتون ہونے کے باوجود انہوں نے ''اگر میں عورت ہوگی'' کے عنوان کے تحت عورتوں کی اُن خامیوں سے بچنے کی خواہش کی ہے۔ جن کی وجہ سے عورت معاشرے میں مردوں کا ٹارگٹ بنتی ہے۔ جیسے نئے فیشن کے کپڑوں کے لئے عورتوں کی تڑپ زیورات کی خواہش، بار بار آئینہ دیکھنے کی کمزوری وغیرہ۔ گویا انہوں نے عورت کی ان کمزوریوں پر چوٹ کی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مردوں پر بھی طنز کیا ہے۔ دراصل انہوں نے عصر حاضر میں عورت اور مرد کے بدلتے تقاضوں کو نمایاں کیا ہے اور عورتوں کی مشکلات کو اجاگر کیا ہے۔ ملازمت پیشہ خواتین کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں۔

> ''اب وہ گھر کے سے آرام وسکون کی متلاشی ہے تو وہ کہاں نصیب
> ہوگا۔ اس لئے وہ عورت نما مرد ہوگئی ہے۔ بچے بھی سنبھالے، گھر گرہستی کی
> بھی دیکھ بھال کرے اور ملازمت بھی'' (3)

اس مضمون میں لئیق صلاح نے بات سے بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ 1975ء پہلی بار خواتین کا بین الاقوامی سال منایا گیا اس میں بھی لئیق صلاح نے ایک پُر لطف نکتہ پیدا کیا۔

> ''اس پر وہ خوش ہوگئیں کہ ہماری کہیں تو قدر وعزت اور توقیر ہو رہی
> ہے۔ یہ نہیں سوچا کہ ایک ہزار نو سو چوہتر 1974ء سال مردوں کے اور
> صرف ایک سال عورت کو دیا جا رہا ہے''۔ (4)

''آج کا اخبار'' میں خبروں کو موضوع بنایا گیا ہے اور ساتھ ہی ایسے لوگوں کا خاکہ اڑایا گیا جو اخبار کے لئے بے چین رہتے ہیں تاکہ اپنے احباب میں خبریں سنا کر خود توجہ کا مرکز بنے رہیں۔ اس کے علاوہ کس طرح ایسے افراد خبر کو افواہ میں اور افواہ کو خبر میں بدل دیتے ہیں' اس ہنر کا بیان کرتے ہوئے مضمون میں شگفتگی پیدا کی ہے۔ اس میں وہ ایک واقعہ بیان کرتی ہیں۔ 1969ء میں حیدرآباد میں کچھ دن تک لگاتار موسلا دھار بارش ہوتی رہی، نتیجے میں افواہ پھیل گئی کہ تالاب گنڈی پیٹ کا بند ٹوٹ گیا ہے اس افواہ نے لوگوں کی جو درگت بنائی اس کا حال لئیق صلاح کے الفاظ میں سنئے۔

''نیا پل، پرانا پل، مسلم جنگ پل اور چادر گھاٹ کا پل سب پل صراط بن گئے کمال یہ تھا کہ پرانے شہر والے نئے شہر کی طرف اور نئے شہر والے پرانے شہر کی طرف دوڑ رہے تھے.. چند اشخاص جو اسی وقت اضلاع کی بسوں سے اترے تھے انہوں نے جب دوسروں سے سنا کہ دوڑ و دوڑ و انہوں نے ایسی دوڑ لگائی کہ گویا کرکٹ کا بہترین کھلاڑی لگا تا ہے۔'' (5)

لئیق صلاح کے مضامین میں حیدرآباد کی تاریخ اور تہذیب کے حوالے سے مزاح پیدا کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ وہ اپنے بعض مضامین کی ابتداء ایسے انداز میں برجستگی کے ساتھ کرتی ہیں کہ پہلا ہی جملہ مزاح کا بیت الغزل بن جاتا ہے چنانچہ ''بلی چلی حج کو'' مضمون کی شروعات کچھ اس طرح ہوتی ہے:

''یہ مقولہ بہت قدیم ہو گیا ہے، جیسے قدیم روایات اور رسومات فرسودہ ہوگئی۔ ویسے ہی یہ مقولے'' (6)

اس مختصر جملے میں عنوان کا مطلب اور مضمون کے معنی در آئے ہیں ویسے تو اس مضمون کا حاصل حج کے سفر اور اس کی روداد ہے مگر ایک غیر تعلیم یافتہ اور فرسودہ خیالات کی حامل بڑی بی کو موضوع بنا کر مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ایسے طبقے کو نشانہ بنایا ہے جو حج کے ارکان سے ناواقف ہوتا ہے لیکن درگاہ، عرس، صندل وغیرہ میں زیادہ دلچسپی دکھاتا ہے۔ ضعیف خاتون اور لئیق صلاح کی گفتگو کچھ اس طرح پیش کی گئی ہے۔

''ایک بات پوچھتیوں سچی بولنا۔ ارے کعبہ بولے تو کیا؟ مکا (مکہ) بولے تو کیا۔ میں نے جواباً دریافت کیا۔ آپ نے طواف کیا کہ نہیں؟ بولیں، ارے وہ پلنگ کے ویسا رہتا نئیں۔ اس میں بٹھا کو دو آدمیاں سروں پو اٹھا کو گول گول پھرے۔ وہ پتھر (حجر اسود) ہے کتے وہ بھی دور سے نئیں دکھا۔ ادلے واں اُتار کو پھر کرسیوں پو بٹھا کو ڈھکیلے۔ اس کو بچ بولیں کتے نا سفا مروا (صفا مروہ) ارے باوا نہ کوئی درغاں (درگاہ) نہ کوئی مزار ہے۔ مزار ہے بولے تھے پھر وہ کاں ہے۔ نہ اُود نہ پھول'' (7)

یوں تو سارا مضمون مزاحیہ انداز لئے ہوئے ہے مگر مصنفہ نے بین السطور میں توہم پرستی اور فرسودہ خیالات رکھنے والے لوگوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ پہلے حاجیوں کے ساتھ صرف تبرکات ہوتے تھے مگر آج کل تبرکات کے ساتھ کئی دیگر چیزوں کا اضافہ ہو گیا ہے اور وہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ کس طرح پیسے کی فراوانی نے حج جیسے مقدس فریضہ کی ادائیگی میں بھی انسانی خواہشات اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اب یہ مقدس عمل عبادت کے بجائے تجارت کا رنگ اختیار کر گیا ہے۔

''جیسے جیسے حج قریب آ رئے مجھے ایک فِخر (فکر) ہوگئی ہے (معلم صاحب) اور ان کے بھائیوں کو کِتے وقت بولی کہ میرے لئے ایک ڈنڈا اور عینک لا دیو۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے وہ ماٹی ملے شیطان کی آنکھ میں پتھر ماروں گی۔ اس کے دیدے پھوڑوں گی۔ تو کوئی لا کوئیں دیا پھر میں بولی ہمت کر کو نچ کیوں نہیں جانا ایک دن ہلو ہلو سیڑھیاں اُتر کو دوکان کی طرف گئی۔ پوچھ لیتے (آپ غور کیجئے کہ پوچھی کیا ہوں گی کیونکہ عربی سے بالکل ناواقف) چلی۔ ایک جگہ مڑ کے دیکھی تو کیا ہے میرے پیچھے دو یہ لمبے لمبے کالے لوگاں ہیں (نیگرو) جھٹ بول کو خیال کیا' ہو نہ ہو یہ شیطان اچ ہے۔ ماٹھی ملا ماروں گی بولے سوسن لیا شائد، اس لئے پیچھے پیچھے ہے''۔(8)

لئیق صلاح اپنے مضمون میں معصومیت کے پردے کا سہارا لے کر معاشرے میں بڑھتی فرسودہ رسومات اور خیالات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اسی لئے مجتبیٰ حسین نے اس مضمون سے متعلق لکھا ہے کہ:

''موصوفہ واقعہ کو توڑ مروڑ کر یا پھر مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتی۔''(9)

''شاعر اور ساغر'' عنوان سے لکھے گئے مضمون میں عنوان کی مناسبت کے لحاظ سے اس میں خمریہ شاعری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ خمریہ شاعری کے کردار، ساقی، جام، واعظ، زاہد کی پند و نصیحت رندوں کا الٹا اُنہیں قائل کرنا وغیرہ سے متعلق اشعار کو ڈرامائی انداز میں سوال و جواب کی تکنیک میں پیش کیا گیا ہے۔ اشعار کی ترتیب عمدہ ہے۔ زیادہ تر اشعار غالب کے ہیں۔ لئیق صلاح نے اشعار کے مضمون سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے جملے تراشے ہیں

جیسے:

''اب تک یہی شکوہ تھا کہ ساقی نے جام نہ بڑھایا ورنہ وہ توبہ توڑنے کیلئے بھی تیار تھے لیکن جب جام آتا ہے تو کچھ مشکوک ہوجاتے ہیں۔

مجھ تک کب اس کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں　(10)

''زاہد کو ستانے میں اسے بہت لطف آتا ہے کہتا ہے کہ بادہ نوشی ترک کریں تو کس لئے:

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں
خلد شیشے میں ہے۔ فردوس ہے میخانے میں　(11)

اس مجموعہ میں چند خاکے بھی شامل ہیں ''حق مغرفت کرے'' ایک تانگہ والے کا خاکہ ہے لئیق صلاح اس کا خاکہ کچھ اس طرح کھینچتی ہے:

''دبلا پتلا اوسط قد و قامت کا ناک ستواں، آنکھیں نیلی تھیں اور رنگ سانولہ، اس متضاد Combination پر ہم سب لوگ اسی سے تعجب سے پوچھا کرتے تھے کہ تیری آنکھیں نیلی کیسے ہوگئیں تو وہ جواباً کہتا باپ انگریز تھا۔ ازراہِ مذاق کہتا یا پھر ''احوال حقیقی'' تھا بہر حال وہ دیسی تھا اور آنکھیں پردیسی غالباً یہ بدیسی راج ہی کی نشانی تھی، جب تانگہ کا رواج ختم ہوا تو اس تانگہ والے یعنی سائیلو کو گھر کے اوپر کے کام پر رکھ لیا گیا''۔ (12)

اس مضمون میں آگے وہ دو ایک واقعات کی مدد سے سائیلو کی شخصیت اور اس کی فکر پر مزاحیہ انداز میں روشنی ڈالتی ہیں۔ جیسے ایک روز بھائی کے کوئی دوست آئے وہ اس وقت گھر پر نہیں تھے لئیق صلاح نے انہیں مطلع کیا کہ بھائی نہیں ہے وہ چلے گئے۔ آنے کے بعد بھائی نے دریافت کیا مجھ سے ملنے کون آیا تھا......

صاحب وہ دبلے سر کے ذرا لمبے ہیں دیکھئے وہ صاحب ''ارے

بیوقوف تو نے نام کیوں نہیں پوچھا'' جواب ملاحظہ کیجئے:

نام کائی کو پوچھوں گا۔ پہچانتے سو صاحب ہیں، وہ بشیر باغ کے پاس رہتے ہیں اُنوچ کیا کوئی نوا آدمی ہے جو نام پوچھوں''۔(13)

ایک اور جگہ لکھتی ہیں:

''کام اس قدر لگن سے کرتا کہ کام لینے والا گھبرا جاتا۔ پودوں کی کٹنگ ہوتی تو اس طرح کے بہار کے موسم میں خزاں کا موسم معلوم ہونے لگے، بلکہ بعض پودے تو جڑ سے ہی اکھڑ جاتے۔''(14)

ان خاکوں سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ لئیق صلاح کی اپنی ایک منفرد فکر ہے اور وہ ایک خاص دل کی مالک ہیں۔انہوں نے زیادہ تر اپنے ملازمین اور آس پاس کے لوگوں کا خاکہ کھینچا ہے۔جس میں لئیق صلاح نے ان کی زندگی کے حالات' ذہنی پریشانی، معصومیت وغیرہ کو بہت خوبی سے اجاگر کیا ہے۔عام افراد کی شخصیت کے ان کے مختلف گوشوں کو نمایاں کیا ہے' ان کی جزئیات پر روشنی ڈالی ہے۔ بلی چلی حج کو، خان صاحب،حق مغفرت کرے، ہرفن مولا خدا بخشے وغیرہ ایسی نگارشات ہیں جس میں مزاح اور خاکہ نگاری کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ان خاکوں کے مطالعے سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ بقول مجتبیٰ حسین ان کے پاس بلند بانگ قہقہوں کی گنجائش نہیں بلکہ زیرِ لب تبسم کی ایک خوشگوار روسارے مضامین میں جاری ساری ملے گی۔

تمکنت' وقار اور شائستگی لئیق صلاح کی شخصیت کا حصہ ہے اور یہی خوبیاں ان کی تحریریں میں امڈ آئی ہیں ان کا مزاح بہت ہی شائستہ بلکہ صرف مسکرانے کے لائق ہوتا ہے۔ڈاکٹر حبیب ضیاء اپنی کتاب ''جو مژگاں اٹھائیے'' میں طنز ومزاح نگار خواتین کے عنوان سے تحریر کردہ اپنے مضمون میں ڈاکٹر لئیق صلاح کے متعلق لکھتی ہیں:

''لئیق صلاح نے بھی تنقید و تحقیق کے ساتھ طنز ومزاح کو اپنایا ہے۔ بقول ان کے طنز ومزاح سے ان کا تعلق پیدائشی ہے۔ان کے مضامین ''سنی سنائی'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔انشائیہ نگاری میں انکا منفرد مقام ہے''(15)

''سنی سنائی'' ایک منفرد اور ہلکے پھلکے مزاح پر مبنی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں مصنفہ نے مختلف موضوعات

کو مزاح کا موضوع بنایا ہے۔ان کے ہاں مزاح ایک خوشگوار کیفیت لئے ہوئے ہوتا ہے۔طنز کے کانٹوں سے وہ اپنا دامن حتی الامکان بچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ڈاکٹر حبیب ضیاء ''سنی سنائی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''سنی سنائی'' میں لطیف مزاح ملتا ہے۔چودہ مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ طنز و مزاح کا خوشگوار امتزاج پیش کرتا ہے۔لئیق صلاح کی مزاح نگاری کے بارے میں مجتبیٰ حسین نے سچ لکھا ہے کہ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مزاح لکھتی ہیں۔رکھ رکھاؤ اور سلیقے کے نام پر اپنے مضامین میں مصنوعی فضاء پیدا ہونے نہیں دیتیں۔''(16)

ڈاکٹر لئیق صلاح کی تخلیقات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک بہترین مزاح نگار ثابت ہوسکتی ہیں۔لیکن اس کے باوجود انہوں نے بہت کم لکھا ہے۔مگر جتنا بھی انہوں نے لکھا ہے قابل تحسین ہے۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) مجتبیٰ حسین ''مقدمہ'' ''سنی سنائی'' از ڈاکٹر لئیق صلاح سنہ 1981ء صفحہ 16

(2) ڈاکٹر لئیق صلاح ''حجام کا آئینہ'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 25

(3) ڈاکٹر لئیق صلاح ''اگر میں'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 26

(4) ڈاکٹر لئیق صلاح ''اگر میں'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 26

(5) ڈاکٹر لئیق صلاح ''آج کا اخبار'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 41

(6) ڈاکٹر لئیق صلاح ''بلی چلی حج کو'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 41

(7) ڈاکٹر لئیق صلاح ''بلی چلی حج کو'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 42

(8) ڈاکٹر لئیق صلاح ''بلی چلی حج کو'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 50

(9) مجتبیٰ حسین ''مقدمہ'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 4

(10) ڈاکٹر لئیق صلاح ''شاعر اور ساغر'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 6-7

(11) ڈاکٹر لئیق صلاح ''شاعر اور ساغر'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 8

(12) ڈاکٹر لئیق صلاح ''حق مغرفت کرے'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 102

(13) ڈاکٹر لئیق صلاح ''حق مغفرت کرے'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 107

(14) ڈاکٹر لئیق صلاح ''حق مغفرت کرے'' مضمون مشمولہ ''سنی سنائی'' صفحہ 107

(15) ڈاکٹر حبیب ضیاء ''حیدرآباد کی مزاح نگار خواتین'' مضمون مشمولہ: ''جو مژگاں اٹھایئے'' ص 18 سنہ 2001ء

(16) ڈاکٹر حبیب ضیاء ''حیدرآباد کی مزاح نگار خواتین'' مضمون مشمولہ: ''جو مژگاں اٹھایئے'' ص 19

پروفیسر شمیم علیم

حیدرآباد کی مزاح نگار خواتین میں شمیم علیم ایک اہم نام ہے۔شمیم علیم ایک معزز اورادب نواز فیملی سے تعلق رکھتی ہیں۔شمیم علیم کی پیدائش ناگپور میں ہوئی۔ چھ بھائی بہنوں میں یہ سب سے چھوٹی ہیں۔معروف مزاح نگار شفیقہ فرحت ان کی بڑی بہن ہیں۔شمیم علیم نے ابتداء سے بی اے تک اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کی۔انھوں نے ناگپور یونیورسٹی سے پولٹیکل سائنس اور پھر پبلک ایڈمنسٹریشن میں ایم اے کیا۔اور بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔ 1961ء میں بحیثیت لکچرر عثمانیہ یونیورسٹی میں تقرر عمل میں آیا۔1984ء میں یہ پروفیسر بنی اور اس کے بعد صدر شعبہ اور بورڈ آف اسٹڈیز کی صدر اور یونیورسٹی کے اکیڈیمک سینیٹ کی رکن بھی رہیں۔ان کی شادی پروفیسر ایم اے علیم کے ساتھ ہوئی جن سے ان کی دو اولادیں ایک بیٹا' ایم اے سلیم اور بیٹی یاسمین ہیں۔ پروفیسر ایم اے علیم کی وفات کے بعد 1996ء میں رضا کارانہ طور پر وظیفہ حسن خدمات پر سبکدوش ہوئیں اور اپنے بچوں کے پاس امریکہ چلی گئیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران ان کی شناسائی مدیر 'سیاست' عابد علی خاں مرحوم سے ہوئی۔اس کے بعد ان کے مضامین اخبار روزنامہ ''سیاست'' میں شائع ہونے لگے۔اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔اس تعلق سے وہ خود رقمطراز ہیں۔

> ''جب عثمانیہ یونیورسٹی چھوٹی اور میں 1996 میں امریکہ آئی تو میری دوست اُردو بھی میرے ساتھ آ گئی۔اگر میں یہ کہوں کہ سیاست نے مجھے اُردو میں مضامین لکھنا سکھایا تو غلط نہیں ہوگا۔غالبًا امریکہ سے میرا پہلا مضمون 'میں نے تمہیں طلاق دے دی' تھا۔''(1)

ایک اور جگہ لکھتی ہیں۔

> ''چال بدل گئی اب قلم نے انگریزی میں نہیں بلکہ اُردو میں دوڑنا

> شروع کیا۔شروع شروع میں صرف ''سیاست'' کے لئے لکھتی تھی۔بعد میں خیال آیا کہ مجھے دوسرے رسالوں کے لئے بھی لکھنا چاہیے۔ڈرتے ڈرتے ایک دن ''شگوفہ'' کے لئے مضمون بھیجا' یقین نہیں تھا کہ ''شگوفہ'' کے معیار پر اُتر بھی سکوں گی یا نہیں۔'' (2)

شمیم علیم کی اب تک انگریزی میں سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں' جن میں Women in India Police قابل ذکر ہے۔ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور انشائیے روزنامہ ''سیاست'' کے علاوہ ماہنامہ ''شگوفہ'' میں بھی شائع ہوتے ہیں۔شمیم علیم کے انشائیوں اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل دو مجموعے ''عکسِ کائنات'' اور ''سوندھی مٹی کا عطر'' منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔''عکسِ کائنات'' اور ''سوندھی مٹی کا عطر'' میں موجودہ دور کے سلگتے ہوئے مسائل پر کئی مضامین ہیں جن میں ان کا طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب واضح نظر آتا ہے۔'' کچھ داستانیں فقیروں کی'' ''عثمانیہ یونیورسٹی میں نقل نویسی'' ''جو نہ بن سکی ہماری سمدھن'' ''سلیقہ'' ''ترازو'' ''مکھی'' ''پیار ایک احساس'' ''ڈاکیہ'' اور دیگر مضامین میں طنز و مزاح کی واضح جھلکیاں ہیں۔ڈاکٹر سید مصطفی کمال لکھتے ہیں۔

> ''اپنے تخلیقی اظہار کے لئے انھوں نے طنز و مزاح کا اسلوب اختیار کیا اور معمولی نوعیت کے روزمرّہ واقعات کو انشائیہ کے لطیف فن میں ڈھالا۔ان کے انشائیے اپنے عہد کی تصویریں ہیں جن میں مجبوریوں کمزوریوں' کج رویوں ناانصافیوں اور جبر و بے بسی کا بے حد سادگی لیکن پُرکاری کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔ شمیم علیم کا اعلیٰ سماجی شعور اور نکتہ رسی ان کی تحریروں کے اوصاف ہیں۔'' (3)

اس سلسلے میں مجتبیٰ حسین رقمطراز ہیں۔

> ''شمیم علیم کی تحریریں' ان کا اسلوب' ان کے کردار' ان کے واقعات اور تانے بانے کچھ اتنے چست ہوتے ہیں کہ لگتا ہے برسوں سے ادب کے دشت کی سیاحی کر رہی ہوں۔چھوٹی اور معمولی سی بات یا واقعہ کو کچھ ایسی چابکدستی کے ساتھ اپنی تحریر میں پیش کرتی ہیں کہ یہ بات خود بخود بڑی اور غیر

معمولی بن جاتی ہے۔ یہی ان کا خاص وصف ہے۔''(4)

شمیم علیم کو اپنے وطن اور اس کی تہذیبی اقدار سے بے پناہ محبت ہے۔ ان کی تحریریں اس کا بین ثبوت ہیں۔ ان کے دوسرے مجموعے کے عنوان سے ہی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انہیں حیدرآباد اور اس کی مٹی سے کس قدر والہانہ محبت ہے۔ بعض اوقات شمیم علیم کا قلم دیارِ غیر میں بسے ہم وطنوں کی دل کی آواز بن جاتا ہے۔ ایک فنکار بہت ہی حساس ہوتا ہے' اور جب کوئی بات اس کے دل سے نکلتی ہے تو سیدھے قاری کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''جب خشک مٹی پر پہلی بارش کی بوندیں گرتی ہیں اور وہ گیلی ہو جاتی ہے تو اس کی سوندھی سوندھی خوشبو سے بہتر خوشبو نہیں مل سکتی۔ سوچئے نا' لوگ اپنے ملک سے دور اس مٹی اور مٹی کی خوشبو کے لئے کتنا ترستے ہیں۔ اگر اس خوشبو کو ہم عطر کی شیشی میں بند کر کے بیرونی ممالک میں رہنے والے ہندوستانیوں تک پہنچا دیں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لوگ ٹوٹ پڑیں گے اپنے ملک کی مٹی کی خوشبو کے لئے۔''(5)

شمیم علیم طنز و مزاح میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ معمولی معمولی واقعات کو موضوع بنا کر مزاح پیدا کرتی ہیں۔ اور حسبِ ضرورت طنز کے تیر و نشتر چلانے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ اپنے ایک انشائیے میں وہ حیدرآباد کی بدلتی تصویر کو بڑے ہی دلسوز پیرائے میں پیش کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''دیکھتے ہی دیکھتے اس شہر کی شکل و صورت بدلنے لگی' سڑکیں ٹوٹنے لگیں' گندگی بڑھتی گئی' صفائی گھٹتی گئی۔ ٹرافک بڑھتا گیا' جانیں جاتی گئیں۔ لیکن ان سب سے بے خبر بڑھتی گئی آبادی۔ جہاں دو منزلہ عمارتیں نظر نہ آتی تھیں وہاں اب آٹھ آٹھ دس دس منزل کے اپارٹمنٹس آ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے شہر میں ماچس کی ڈبیاں کھڑی ہو گئیں۔ خوبصورتی ختم ہو گئی' چیخ پکار بڑھتی گئی۔ بالکنیوں میں سوکھتے ہوئے کپڑے' صحن میں کچرے کے انبار' پانی اور بجلی کا قحط۔ عثمان علی پاشاہ کے پانی کا ذخیرہ ختم ہونے لگا۔ درخت کٹنے لگے گرمی بڑھنے لگی۔''(6)

شمیم علیم کی فن پارے عصری حسیت کا عمدہ نمونہ ہیں۔ وہ بہت ہی لطیف انداز میں مزاح کی گل کاریاں بکھیرتی ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات کو مزاحیہ پیرائے میں بیان کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ماں کو یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اس کے بچے کا وزن بڑھ نہیں رہا ہے
اور شوہر کو یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اس کی بیوی کا وزن کم نہیں ہو رہا ہے۔''(7)

شمیم علیم کی تحریروں میں زیر لب تبسم نظر آتا ہے۔ مزاح کی ایک زیریں لہران کی تحریر میں جاری وساری رہتی ہے۔ مضمون ''کرسی خالی ہے وائس چانسلر کی'' میں ایسے کرداروں کو پیش کیا گیا ہے جس میں ایک نان گزیٹیڈ عہدیدار اور ایک صدر شعبہ وائس چانسلر بننے کے خواب دیکھتے ہیں وہ بھی محض اس لئے کہ چیف منسٹر نے اعلان کیا ہے کہ اس یونیورسٹی کا آئندہ وائس چانسلر ایک مسلمان ہوگا۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''کریم میاں کو لکھنے میں مصروف دیکھ کر بیوی نے پوچھا'' آپ کیا لکھ رہے ہیں' اس سے پہلے تو میں نے کبھی آپ کو پڑھتے لکھتے نہیں دیکھا؟ کریم میاں نے غصے سے کہا: تم نہیں سمجھو گی ان باتوں کو' فاطمہ بی سے صبر نہ ہوسکا' تنک کر بولی' کیا مجھے لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ میٹرک پاس ہوں۔ ذرا میں بھی تو سنوں آپ کی داستاں......تو سنو بی بی عنقریب وائس چانسلر کی کرسی خالی ہونے والی ہے۔ فاطمہ بی نے بیچ میں ٹوکا۔ یہ تو ہمیشہ کی بات ہے ایک وائس چانسلر جاتا ہے تو دوسرا آتا ہے۔ کریم میاں نے نہایت اطمینان سے کہا ''بیگم اب کے وہ دوسرا وی سی میں ہوں گا۔''(8)

شمیم علیم کا مزاح صرف شگفتگی ہی نہیں بکھیرتا بلکہ قاری کو دعوت فکر بھی دیتا ہے۔ وہ مزاح کی پھلجھڑیاں بکھیرتے بکھیرتے طنز کے تیر چلانے لگتی ہیں۔ وہ معاشرے کی بوالعجبیوں' اور انسانی حماقتوں کے ذریعہ مزاح پیدا کرتی ہیں۔ ان کے ایک مضمون ''محترم گدھے صاحب'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''خان صاحب اخبار پڑھتے ہی آگ بگولا ہو گئے اور چیخ کر انہوں نے

بیوی سے کہا ''دیکھا تمہارا گدھا (بیٹا) پھر فیل ہوگیا''۔اس کے دوستوں کی شان میں بھی انہوں نے قصیدہ پڑھ دیا ''گدھوں کی ساتھ رہے گا تو اور کیا ہوگا''۔رام موہن نے بھی اپنی بیوی پر غصہ اتارا ''تمہارا بھائی بالکل گدھا ہے میرے پورے پیسے اندر کردیا''۔آٹو والے نے زور سے آٹو گھمایا اور آپ کی گاڑی سے آٹکرایا۔آپ برس پڑے ''گدھے تجھے دِکھتا نہیں؟......سب سے بڑا گدھا تو منسٹر ہوتا ہے۔ہر وقت اس کی شان میں قصیدہ پڑھا جاتا ہے۔'' کیا چیف منسٹر ہے۔بالکل گدھا' پوری اسٹیٹ کو تباہ کردیا۔''(9)

شمیم علیم مزاحیہ انداز میں فکرانگیز نکتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے طنز کے تیر و نشتر چلانے لگتی ہیں۔وہ گدھے کی زبانی انسانی معاشرے کی تلخ حقائق' ناہمواریوں اور بےاعتدالیوں کو بےنقاب کرتی ہیں۔

''میری مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ مجھ میں اور انسانوں میں بہت کم فرق ہے۔میری کم عقلی میری نادانی' میری نافہمی' سب بالکل انسانوں جیسی ہے۔ انسانوں کو اچھے برے کی تمیز کہاں؟ نہ ان کے پاس عقل ہے ورنہ وہ اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی کیوں مارتے۔کیوں اپنا گھر اپنا ملک آگ میں جھونکتے لیکن ایک بات ہے جو انسانوں کو ہم سے ممتاز کردیتی ہے۔ہم کبھی اپنے بھائی کا خون نہیں کرسکے۔لیکن انسان ایک ہی جھٹکے میں ہزاروں انسانوں کو ختم کردیتا ہے۔اس کا غصہ شیر سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔وہ غصہ میں شہر کے شہر تباہ کردیتا ہے۔وہ انسان کے خون کا پیاسا ہوجاتا ہے۔اس گدھے کو یہ نہیں معلوم کہ سب خون ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔وہ خون کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرکے ان پر لیبل لگادیتا ہے۔اور پھر اس خون سے ہولی کھیلتا ہے۔مذہب' صوبہ' سرحد' پانی اور پتہ نہیں کتنے عنوانات سے تقسیم کرتا ہے۔ اپنی ہی عورتوں کی عصمت ریزی کرتا ہے۔اپنے ہی بچوں کو نیزے پر لٹکا دیتا ہے۔''(10)

شمیم علیم ان دنوں امریکہ میں مقیم ہیں اور وہاں رہنے والے برصغیر کے باشندوں کے مسائل کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتی ہیں۔ ''چلتے پھرتے'' ایک ایسا مضمون ہے جس میں بزرگوں کے ساتھ روا رکھے جارہے سلوک پر طنز کیا گیا ہے۔ ہندوستان ہو یا امریکہ ہر جگہ یہی حالات ہوتے جارہے ہیں۔ وہاں کی معاشرت میں بزرگ الگ تھلگ ہوجاتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ بعض جگہوں پر تو Old Age Home کا چلن عام ہوچکا ہے۔ اسی لئے ان بزرگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی کے محتاج نہ رہیں۔ یہ اقتباس دیکھئے۔

> آج کل لوگ اسّی نوے سال آرام سے جی لیتے ہیں بلکہ کچھ اشخاص تو سنچری مارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اب ذرا غور کیجئے کہ خداوند کریم کے کے پاس کتنی درخواستیں جمع ہوگئی ہونگی۔ ہر شخص یہی دعا کرتا ہے کہ یا خدا مجھے چلتے پھرتے اُٹھائے۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی رحیم وکریم ہے۔ وہ اپنے بندوں کی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے۔ لیکن مسئلہ ''چلتے پھرتے'' کا ذرا تشریح طلب ہے۔ وہ بندہ کہاں اور کیسے مرنا چاہتا ہے۔ اگر اس کی بھی تشریح ہوجائے تو کام تیزی سے ہونے لگے۔ ورنہ ہماری بیوروکریسی کی طرح وہاں بھی فائلیں برسوں برف خانہ میں پڑی رہنے لگیں۔'' (11)

شمیم علیم مشرقی تہذیب کی دلدادہ ہیں۔ وہ اپنے مضامین اور انشائیوں میں مغرب کی اندھی تقلید کرنے والوں پر لطیف طنز کرتی ہیں۔ اپنے ایک انشائیے ''گولی کی حرکت میں برکت'' کی شروعات وہ کچھ اس طرح کرتی ہیں۔

> ''صدیوں سے دنیا کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ تمام انسانوں کا پیٹ کس طرح بھرا جائے۔ دنیا کے ہر کونے میں ننگے بھوکے لوگ موجود ہیں۔ کتنا ہی اناج اگاؤ پیٹ بھرتے ہی نہیں۔ آبادی بڑھتی جاتی ہے...... تمام سائنس داں اسی مسئلہ کو حل کرنے میں لگے تھے۔ اور پھر ایک دن امید کی کرن نظر آئی۔ امریکہ پھر ایک بار سب پر سبقت لے گیا۔ اس نے ایک ایسی دوا ایجاد کرلی جس کو کھانے سے بھوک ختم ہوجاتی ہے اور پیٹ خود بخود بھر جاتا ہے۔

......اس دوا سے سب سے زیادہ سکون تو عورتوں کو (خاص طور پر ہندوستانی عورتوں کو) ملا۔ جو بیچاریاں صبح سے شام تک چولھے میں ہی رہتی ہیں۔ بچوں کا ناشتہ بنانا، ان کا لنچ پیک کرنا، پھر میاں کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، اسکول سے آتے ہی بچوں کو بھوک لگتی۔ میاں رات کے کھانے پر کچھ نہ کچھ نئی چیز کا انتظار کرتے۔ دن میں کم ازکم دوبار ڈش واشر آن کرنا۔ ڈش واشر میں برتن ڈالنے سے پہلے انہیں دھونا اور پھر بگونے اور فرائی پین! بستر پر جاتے جاتے کمر ٹوٹ جاتی ہے۔'' (12)

تصویر کا دوسرا رخ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ اس مضمون میں وہ اس دوا سے ہونے والے معاشی اور اخلاقی نقصانات کی تفصیلی بڑی شگفتگی سے بتاتی ہیں۔

''لیکن پھر ایک دن لوگ گولیاں کھاتے کھاتے تھک گئے تھے۔ عورتیں بیکار بیٹھے بیٹھے اُکتا گئیں۔ ان کا دل چاہنے لگا کہ وہ پھر کھانا پکانا شروع کردیں۔ پھر سے لوگ ان کے کھانے کی تعریف کریں۔ پھر سے بچے کہیں Mom, you are the best cook پھر سے میاں چٹخارے لینے لگیں، اور بیوی کا ہاتھ چوم لیں۔'' (13)

شمیم علیم کی تحریروں میں عصری مسائل کا پرتو نظر آتا ہے۔ وہ مغربی طرز معاشرت اور طرز فکر کو ہدف طنز بناتی ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ کام کی بات نہایت عمدگی سے بیان کر جاتی ہیں اور قاری بے اختیار مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ طنز بھی بھرپور کرتی ہیں ساتھ ہی مزاح کی شگفتگی کی مدد سے طنز کی تلخی کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے مضمون ''ماڈرن وصیت'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''بھابی، لوگ اپنی وصیت میں لکھ دیتے ہیں کہ جن چیزوں سے انہیں دلی لگاؤ ہے وہ ان کے ساتھ قبر میں رکھ دی جائیں۔ ہم پھر دریا حیرت میں غرق ہو گئے، بھابی دلی لگاؤ تو بچوں سے ہوتا ہے۔ کیا وہ اپنے بچوں کو......

انہوں نے ہماری بات کاٹتے ہوئے کہا' ارے بھابی امریکنوں کو اپنے بچوں سے کب دلی لگاؤ ہوتا ہے۔ انہیں تو اپنے کتے بلی ان سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ تو کیا وہ ان کو اپنے ساتھ قبر میں لے جانا چاہتے ہیں؟ ہم نے اشتیاق سے پوچھا: انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ بھابی کیا یہ ممکن ہے؟ اگر کسی نے بلی کُتّے کو ہاتھ بھی لگایا تو امریکن گورنمنٹ اسے زندہ درگور کر دے گی۔'' (14)

شمیم علیم نے صنف قوی کی بالادستی والے معاشرے میں عورتوں کی حالتِ زار پر بے باکانہ اظہار کیا ہے۔ طلاق' بیوی سے شوہر کی بے توجہی' معاشرے کی بے حسی' جہیز کی لعنت' Contract Marriage کے نام پر سودے بازی جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی تحریریں قارئین کو صرف تفریح فراہم نہیں کرتیں بلکہ دعوت فکر دیتی ہیں۔

''ایک مہینے بعد زاہدہ پھر واپس آ گئی۔ ہاتھ میں طلاق کے پیسے لیکر۔ ابھی چند مہینے بھی نہ گذرے تھے کہ جگت خالہ پھر حاضر ہوگئیں۔ اور پھر تیسری بار زاہدہ کی شادی ہوگئی۔ اتنی سی عمر میں وہ تین بار دُلہن بن چکی تھی تین بار بِک چکی تھی۔ اب تو شاید یہ معمول بن گیا تھا۔ یہ کہانی تو ہر اس گھر کی ہے جہاں غریبی نے جوانی کو دبوچ لیا ہے۔'' (15)

انہوں نے صنف نازک سے جڑے مختلف مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ ''میں نے تمہیں طلاق دے دی'' ''تو اس آنچل سے اِک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا'' ''بدلے کی آگ'' ''نشیمن پھونکنے والے'' ''اور شمع پگھلتی رہی'' ''سفاک باپ'' ''روشنی کا دریچہ'' ''وہ کس کی بیوی ہے؟'' ''کون ہے قاتل'' ''بدنامی کا گھڑا'' ''کب تک ہوگا یہ ظلم'' ان کے ایسے انشائیے ہیں جن میں انہوں نے عورت پر معاشرے کے ظلم و استبداد کے واقعات کی نشاندہی کرتے ہوئے عورت کے حق میں آواز بلند کی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید رقمطراز ہیں۔

''طلاق' عورت کی مجبوریوں اور اس پر جبر کی داستانوں کو بھی انہوں نے نہایت جرات کی ساتھ لکھا اور پوری قوت کے ساتھ اپنی آواز اٹھائی۔

Feminism کے سلسلہ میں ان کی تحریروں کو اونچا مقام ملتا ہے۔ان کے
کئی انشائیے' معاشرے کے ذہن کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی ہیں۔''(16)

شمیم علیم کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں۔

تین سال پہلے ان کی کتاب ''عکسِ کائنات'' شائع ہوئی تھی اور پچھلے
سال ان کی دوسری کتاب ''سوندھی مٹی کا عطر'' شائع ہوئی ہے۔کتاب کا
خوبصورت اور معنی خیز نام ہی اپنے وطن کی مٹی سے ان کے جذباتی وابستگی کا
ترجمان ہے۔لیکن وہ صرف Nostagia کو لے کر ہی اپنے وطن اور اس
سے وابستہ زندگی کو یاد کر کے آنسو بہانے اور دل کو مسوسنے کی قائل نہیں ہیں
بلکہ وہ اپنے وطن کے مسائل' اس کے تقاضوں اور اس کے تعلق سے اپنی نجی
ذمہ داریوں کا ایک صحت مندانہ اِدراک رکھتی ہیں ان کی روشن خیالی صرف
خیالی روشنی سے عبارت نہیں ہے بلکہ زمین سے جڑی ہوئی حقیقتوں کا
ایماندارانہ اور بے باکانہ اظہار ہے۔''(17)

پروفیسر منظور الامین شمیم علیم کے موضوعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میں شمیم علیم کا شمار ایسے تخلیق کاروں میں کرتا ہوں جو جزو میں کل اور
قطرے میں دجلہ کا نظارہ کر لیتے ہیں۔انہیں موضوع کی تلاش نہیں کرنی
پڑتی' لگتا ہے موضوعات ان کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں......
ان کے مضامین ایسے Plebecian یا عام سماجی موضوعات پر بھی ہیں
جیسے بکری' چور' فقیر' مکھی وغیرہ''(18)

اردو کی نئی بستیوں میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے طنز و مزاح نگاروں کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اس سلسلے میں شمیم علیم جیسے قلم کاروں کی خدمات قابل تحسین ہیں۔

---000---

حوالہ جات

(1) پروفیسر شمیم علیم　مضمون مشمولہ: حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین ص142

(2) پروفیسر شمیم علیم　''چند کلیاں نشاط کی'' مطبوعہ ''شگوفہ'' ص12 مارچ 2007ء

(3) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ''اداریہ''　مطبوعہ ''شگوفہ'' ص60 ایضاً

(4) مجتبیٰ حسین　''کچھ شمیم علیم کے بارے میں'' مطبوعہ ''شگوفہ'' ص7 ایضاً

(5) پروفیسر شمیم علیم　''سوندھی مٹی کا عطر'' ص57 2006ء

(6) پروفیسر شمیم علیم　''عکس کائنات'' ص69 2004ء

(7) پروفیسر شمیم علیم　''سوندھی مٹی کا عطر'' ص21

(8) پروفیسر شمیم علیم　''کرسی خالی ہے وائس چانسلر کی'' مضمون مشمولہ ''حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین'' ص144-143

(9) پروفیسر شمیم علیم　''محترم گدھے صاحب'' مطبوعہ ''شگوفہ'' جولائی 2010ء ص25

(10) پروفیسر شمیم علیم　''محترم گدھے صاحب'' مطبوعہ ''شگوفہ'' جولائی 2010ء ص26

(11) پروفیسر شمیم علیم　''چلتے پھرتے''　مطبوعہ روزنامہ ''سیاست'' مورخہ 27 ستمبر 2009ء

(12) پروفیسر شمیم علیم　''گولی کی حرکت میں برکت'' مطبوعہ: روزنامہ ''سیاست'' مورخہ 27 جون 2010ء

(13) پروفیسر شمیم علیم　''گولی کی حرکت میں برکت'' مطبوعہ: روزنامہ ''سیاست'' مورخہ 27 جون 2010ء

(14) پروفیسر شمیم علیم　''ماڈرن وصیت''　مطبوعہ ''شگوفہ'' جون 2006ء ص43

(15) پروفیسر شمیم علیم　''کانٹریکٹ میریج'' مشمولہ ''سوندھی مٹی کا عطر'' ص103

(16) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ''شمیم علیم کی انشائیہ نگاری'' مطبوعہ ''شگوفہ'' ص30 مارچ 2007ء

(17) مجتبیٰ حسین　''کچھ شمیم علیم کے بارے میں'' مطبوعہ ''شگوفہ'' ص7 مارچ 2007ء

(18) منظور الامین　''چشم نگراں (شمیم علیم کا تخلیقی سفر)'' مطبوعہ ''شگوفہ'' ص24 مارچ 2007ء

فاطمہ تاج

طنز ومزاح کے فروغ میں حیدرآباد کا کافی اہم رول رہا ہے اور اس سلسلے میں خاتون مزاح نگاروں کا حصہ نہ صرف قابل قدر ہے بلکہ قابل ستائش بھی۔ آزادی کے بعد حیدرآباد کی جن مزاح نگار خواتین نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے ان میں ڈاکٹر زینت ساجدہ، فاطمہ عالم علی خان، ڈاکٹر رشید موسوی، ڈاکٹر حبیب ضیاء اور ڈاکٹر لئیق صلاح قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی خواتین نے طنز مزاح کے افق پر صنف قوی کے شانہ بہ شانہ اپنے فن کو پیش کیا ہے۔ ان میں فاطمہ تاج کا نام نمایاں طور پر ابھرتا ہے۔ فاطمہ تاج کی تخلیقات متعدد اخبارات اور رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء فاطمہ تاج کے تعلق سے کچھ اس طرح اظہار خیال کرتی ہیں:

> ”فاطمہ تاج نے بہت کم عرصہ میں بحیثیت شاعر، افسانہ نگار اور مزاح نگار ادبی دنیا میں اپنا مقام بنایا ہے۔ ان کی آٹھ تصانیف شائع ہو چکی ہیں...... ”دلاسا“ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ 32 عنوانات کے تحت انہوں نے روزمرہ زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو نشانہ بنایا ہے۔ بعض انشائیے ہیں جن میں لطیف مزاح ملتا ہے“۔ (1)

پورا نام فاطمہ تاج النساء اور تخلص فاطمہ تاجؔ ہے۔ فاطمہ تاج 29 اکتوبر 1948ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ کم عمری میں ہی شاعری کرنے لگیں تھیں۔ لکھنؤ کے معروف شاعر احسان علی عرشی سے تلمذ کیا۔ کم عمری میں ہی شادی ہوگئی۔ پہلی غزل روزنامہ ”سیاست“ میں شائع ہوئی جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ مدیر شگوفہ سید مصطفیٰ کمال، ڈاکٹر حبیب ضیا، ڈاکٹر زینت ساجدہ، محبوب حسین جگر کی حوصلہ افزائی سے نثر کی طرف توجہ کی اور خاص طور پر مدیر ”شگوفہ“ اور ڈاکٹر حبیب ضیا کی وجہ سے طنز ومزاح کی طرف مائل ہوئیں۔ انھوں نے کئی اصناف جیسے نظم، غزل، افسانے، ناولٹ، انشائیوں اور مزاحیہ مضامین میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی اب تک دس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

فاطمہ تاج کی تخلیقات میں گہرائی کے ساتھ ساتھ زبان کی چاشنی بھی نظر آتی ہے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی انہیں ادب سے لگاؤ رہا۔ ان کے مضامین تازگی، بذلہ سنجی اور شوخی کی عمدہ مثال ہیں۔ ان کی مزاح نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے مدیر ''شگوفہ'' ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال لکھتے ہیں:

''فاطمہ تاج کے مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر طرح کے موضوع پر لکھنے کی قدرت رکھتی ہیں۔ اخبار ''سیاست'' پر لکھا ہوا ان کا مضمون اس کی بہترین مثال ہے۔ زبان نہایت سہل، دل کو چھو لینے والی، غیر ضروری ثقیل الفاظ وتراکیب سے عاری، چھوٹے چھوٹے نپے تلے جملے، لہجہ میں شگفتگی خیالات میں روانی ہے۔ جن پر فکر کی دبیز تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ فاطمہ تاج کے مضامین تازگی' شوخی و بذلہ سنجی کا مرقع ہیں۔ انہوں نے مزاح کو سطحی انداز میں نہیں برتا۔ ان کا غم شرارہ بن کر رگ و پے میں اُترتا اور نوکِ قلم سے کبھی طنز اور کبھی ہلکے مزاح کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔'' (2)

ڈاکٹر محمد علی اثر فاطمہ تاج کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''فاطمہ تاج نے اپنے کلام میں کہیں بھی تہذیب و شائستگی' نفاست' لطافت' ضبط و تحمل کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔'' (3)

یوں تو اردو ادب میں طنز ومزاح کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ لیکن ہر دور کا مزاح اپنے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ فاطمہ تاج کا مزاح بھی عصری حسیت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے مزاح میں جابجا اسی مزاح اور کیفیات کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ فطری امر ہے کہ خواتین جذبہ ہمدردی میں صنف قوی سے کہیں آگے ہیں۔ ذرا سی ناانصافی اور ظلم انہیں اشکبار کرنے کیلئے کافی ہے۔ فاطمہ تاج کے مزاح میں ہمدردی اور نرمی کی لہریں رواں دواں ہوتی ہیں۔ انہوں نے سبک اور شیریں انداز میں مختلف موضوعات کو اپنے نوک قلم کی زد پر رکھا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے۔

''سیاست'' میں جب کبھی ہم انڈوں کے دام کم دیکھتے ہیں تو فوراً ملازمہ کو دوڑا کر اسٹاک کروالیتے ہیں کیونکہ انڈے ہمارے کئی مسائل حل کرتے

ہیں۔ٹماٹوں کے کٹ میں، تو کبھی کٹلٹ پر کبھی پلاؤ میں تو کبھی سینڈوچ کے
لئے کہیں لوز کی شکل میں تو کبھی پڈنگ کی ڈش میں، کبھی کیک کے سانچوں
میں تو کبھی فرائی پین میں، کبھی آملیٹ تو کبھی اُبلے ہوئے۔ ہمارے یہاں
انڈوں کا بہت خرچ ہے۔ بچوں کے ہینڈورک میں بھی انڈوں کے چھلکوں کی
سخت ضرورت پیش آتی ہے''۔(4)

انڈوں اوراس کے مختلف استعمال پر فاطمہ تاج نے دل نشین انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ان کے مضامین آسان زبان اور روزمرہ لئے ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات اور تجربات کو ایسے دلچسپ انداز میں بیان کرتی ہیں کہ طبیعت شگفتہ ہوجاتی ہے۔ آج کی تیز رفتار زندگی اور مصروف ترین آدمی کی تصویر کشی وہ کچھ اس انداز میں کرتی ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ہم اپنے آپ میں کچھ عرصہ سے ایسی تبدیلی محسوس کر رہے ہیں۔ جو
بیان سے باہر ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ خبریں ہماری نظروں سے نہیں
گذرتیں بلکہ نظریں خبروں پر سے گذرتی جارہی ہیں۔ نتیجتاً ہم غلط سلط
پڑھنے لگ گئے ہیں۔ مثلاً فلاں ولد فلاں کا انتقال، ہم ولد کے بجائے اور
پڑھ کر دل میں افسوس کرنے لگتے ہیں کہ ایک ہی گھر میں دوافراد وفات پاگئے
اور بھرے دل سے دعائے مغفرت بھی کرنے لگتے ہیں۔ کہیں اکتوبر لکھا ہو تو
کبوتر نظر آتا ہے۔ مثلاً کبوتر میں برساتی میلہ، ہم یہ سوچتے ہیں کہ شائد بڑا سا
کبوتر نما کوئی ہال بنا کر اس میں مصنوعی بارش سے میلہ لگایا جائے گا اور لوگ
بھیگ بھیگ کر بلی بن جائیں گے''(5)

فاطمہ تاج کی نگارشات اپنی سادگی اور سبک روی کی بناء پر توجہ کی طالب ہیں وہ بات سے بات پیدا کرنے کا فن بخوبی جانتی ہیں۔ وہ گفتگو کے انداز میں لیکن بین السطور میں بات کہنے کا ہنر جانتی ہیں۔ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج ملتا ہے۔موضوع کے انتخاب میں انہیں دقت پیش نہیں آتی جملے آسان اور نپے تلے ہیں۔

بات کو دہرانے کی خامی ان کے پاس کم ہی نظر آتی ہے۔اپنی ذات کو طنز کا ہدف بنانا قدرے مشکل فن ہے لیکن فاطمہ تاج اسے سہل اور آسان بنادیتی ہیں۔

''دلاسا'' میں ایسے کئی مضامین ہیں جو قاری کو دعوت فکر دیتے ہیں۔بعض خالص مزاحیہ رنگ میں ہیں تو بعض میں مزاح کے ساتھ طنز کے نشتر بھی دل کو اپنی چبھن کا احساس دلاتے ہیں۔انہیں زبان و بیان پر عبور حاصل ہے،اپنی مزاح نگاری کے بارے میں وہ خود کہتی ہیں۔

> ''مجھے خود خبر نہیں کہ میں نے طنز و مزاح کی راہوں پر کس طرح قدم رکھا۔
> لیکن یہ بات تو ثابت ہیکہ طنز و مزاح انسان کی فطرت کا جز ہے۔اب اگر میں
> کچھ تجربات کرنے پر آمادہ ہوں تو کسی کو بھی اعتراض نہیں ہونا چاہئے''۔(6)

وہ کہتی ہیں کہ کسی کے غم کو کم کرنا انسان کے بس کی بات نہیں لیکن وہ ایک ہمدرد انسان کی طرح حساس دل رکھتی ہیں اسی لئے ہر انسان کو مسکراتے دیکھنا پسند کرتی ہیں۔

''دلاسا'' 1993ء میں اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد سے طبع ہوکر منظر عام پر آیا۔اس میں جملہ 32 مضامین ہیں۔کتاب کا پیش لفظ مدیر شگوفہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے تحریر کیا ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر رفیعہ منظور الامین اور پروفیسر حبیب ضیاء کی آراء بھی اس میں شامل ہیں۔

فاطمہ تاج اپنے مضامین میں عموماً اپنی ذات کو نشانہ بناتے ہوئے بین السطور میں سماج کی محرومیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔اس طرح وہ اصلاح معاشرے کا دعویٰ نہ کرتے ہوئے بھی اس کارِخیر میں چپکے چپکے مصروف ہیں۔وہ شعر بھی کہتی ہیں اور عصری موضوعات کو اپنے اشعار میں پیش کرکے سماج کی کوتاہیوں کی جانب توجہ دلاتی ہیں اس کے علاوہ انہوں نے افسانے،رپوتاژ اور خاکے بھی لکھے ہیں۔خود ان کا کہنا ہے

> ''قطعی طور پر فیصلہ کرچکی ہوں کہ ادب کی زمین کا کوئی بھی گوشہ خالی
> نہیں چھوڑوں گی۔مضمون نگاری،تبصرہ نگاری،طنز و مزاح،شاعری غرض کہ
> میں اپنی نگارشات کے ڈھیر لگادوں گی۔چاہے سامعین کی سمع خراشی ہو یا
> قارئین کا ذہن الجھ کر رہ جائے''۔(7)

مندرجہ بالا الفاظ سے قطع نظر اب تک فاطمہ تاج کے مزاحیہ مضامین اپنی اسی سبک خرامی سے بہہ رہے ہیں۔جس طرح ان کا مزاج ہے۔جون 2005ء میں فاطمہ تاج کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ ''من مانی'' شائع ہوا۔اس مجموعے میں 29 مضامین دو تاثراتی خاکے اور مجتبیٰ حسین کا لکھا تعارف نامہ بحق مصنفہ شامل ہے۔

''من مانی'' میں شامل مضامین سادگی لئے ہوئے ہیں۔اس میں فاطمہ تاج کا مزاح نہ تو مقصدی نظر آتا ہے اور نہ ہی افادی بلکہ اس میں راست طنز بھی نظر نہیں آتا۔فکر اور بیان کے لحاظ سے بعض مضامین پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔مضحک پہلوؤں پر بہت کمزور انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔شوخی، فطری ظرافت اور اچھوتے موضوعات کے انتخاب میں جو قدرت ان کے پہلے مجموعے میں پائی گئی وہ یہاں پوری طرح نہ سہی لیکن مجموعی طور پر مفقود نظر آئی ہے۔آج کل ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین لکھے جارہے ہیں۔اس میں نہ تو موضوع کا خیال رکھا جارہا ہے اور نہ ہی الفاظ کے مناسب استعمال کا، املاء کی صحت بھی متاثر ہورہی ہے۔املاء کی فاش غلطیوں کو کاتب کے کاندھوں پر ذمہ داری ڈال کر مصنف صاف بچ جاتا ہے۔فاطمہ تاج نے ''من مانی'' میں شامل مضمون ''مر گئے ہم جیتے جی'' ......میں لکھا ہے:

''ربر کے دستانوں میں چھپے ہاتھ جب ہمارے سر کی طرف بڑھتے ہیں تو دماغی توانائی والا بٹن خود بخود اسپارک ہونے لگتا ہے۔دماغی شریانوں میں توانائی کی حدت شدت کے ساتھ سرگرم عمل ہوجاتی ہے اور ہمارے دست ناتواں کی گرفت میں آجاتا ہے ''پنجۂ عزابیل'' اور اس پنجہ عزابیل کو ہم اتنا مروڑتے ہیں کہ چیخ چیخ کر انگلیوں کے ناخن جھڑنے لگتے ہیں۔''(8)

حالانکہ ''پنجہ عزابیل'' املا کے اعتبار سے غلط ہے۔صحیح املا ''پنجہ ازابیل ہوگا'' Isabelle کو Azabelle تحریر کیا گیا ہے۔اس مجموعہ میں صرف ایک مضمون دلاسا کے بیشتر مضامین کا ہم پلہ ہے۔مضمون ''چپکے سے'' میں انہوں نے بہت ہی خوبی سے اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔چپکے سے کی تکرار سے بات سے بات پیدا کرتے ہوئے مصنفہ نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔جس میں بے ساختگی اور شوخی پوشیدہ ہے۔ملاحظہ کیجئے۔یہ اقتباس:

'' ... عوام کے لئے مختلف انداز میں کئی طرح کی اسکیموں سے آراستہ کمپنیاں کھولی گئیں چپکے سے ... کافی عرصہ تک منافع حاصل کرنے کیلئے عوام نے بھی ان کمپنیوں میں اپنا سارا اثاثہ مشغول کیا چپکے سے ... اور منافع

بھی وصول کیا چپکے سے... اور پھر کمپنیوں کے مالک سب کا اثاثہ لے بھاگے چپکے سے... جہیز اور گھوڑے جوڑے کی رقم کے بغیر شادی کرنے پر زور دینے والے برابر ''لین دین'' کر رہے ہیں چپکے سے ... نئی دلہنیں جلائی جا رہی ہیں چپکے سے......''(9)

اس مضمون میں دل کو چھو لینے والے موضوعات کو بہت ہی دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ حال ہی میں حیدرآباد میں کئی فائنانس کمپنیاں حلال منافع کا لالچ دیکر عام لوگوں کی خون پسینے کی کمائی لیکر چمپت ہوگئیں۔ اس سنجیدہ مسئلے کو بھی انہوں نے بہت ہی دلکش انداز میں پیش کیا ہے اسکے علاوہ جہیز کی لعنت پر بھی انہوں نے خامہ فرسائی کرتے ہوئے اچھا مضمون لکھا ہے۔

''چپکے سے'' میں مزاح کے ساتھ طنز کی زیریں لہر بھی موجود ہے اور مزاح کی قند بھی۔ مشاعرے میں چلی آ رہی سماجی برائیوں کی نشاندہی بھی اور چالباز اور چالاک افراد کے ہاتھوں عوام کا لٹنا بھی دکھایا گیا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

--- OOO ---

حوالہ جات

(1) ڈاکٹر حبیب ضیاء ''حیدرآباد کی مزاح نگار خواتین'' مضمون مشمولہ ''جو مژگان اٹھائیے'' ص 2

(2) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ''پیش لفظ'' مضمون مشمولہ ''دلاسا'' ص 8-7 اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد 1993ء

(3) ڈاکٹر محمد علی اثر ''فاطمہ تاج'' مضمون مشمولہ ''قومی زبان'' ص 56 سنہ 1992ء

(4) فاطمہ تاج ''سیاست'' مضمون مشمولہ ''دلاسا'' ص 22

(5) فاطمہ تاج ''انداز بیان گرچہ بہت شوخ نہیں ہے'' مضمون مشمولہ ''دلاسا'' ص 61

(6) فاطمہ تاج ''انداز بیان گرچہ بہت شوخ نہیں ہے'' مضمون مشمولہ ''دلاسا'' ص 15

(7) فاطمہ تاج ''انداز بیان گرچہ بہت شوق نہیں ہے'' مضمون مشمولہ ''دلاسا'' ص 15

(8) فاطمہ تاج ''مر گئے ہم جیتے جی!'' مضمون مشمولہ ''من مانی'' ص 24
مطبوعہ اے ایس گرافکس آفسیٹ، حیدرآباد جون 2005ء

(9) فاطمہ تاج ''چپکے سے'' مضمون مشمولہ ''من مانی'' ص 65-64

اختتامیہ

انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے' ہنسنا اور رونا انسانی فطرت میں داخل ہے۔اور ہنسنے کی یہی صفت اسے کائنات کی دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔انسان کو جب کسی چیز سے مسرت حاصل ہوتی ہے تو وہ مسکرانے لگتا ہے اوراس کی انتہا قہقہ کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ادب انسانی جذبات واحساسات کے اظہار کا نام ہے۔اسی کے ساتھ ادب انسان کے جذبات واحساسات کو شگفتگی اور شائستگی سے پیش کرنے کا نام بھی ہے' اوراس لحاظ سے طنز ومزاح ادب کا ایک اسلوب قرار پاتا ہے۔

اردو ادب میں طنز ومزاح کے ابتدائی نقوش ہمیں جعفر زٹلی اور غالبؔ کے فن پاروں میں مل جاتے ہیں' غالبؔ کو مولانا الطاف حسین حالؔی نے حیوانِ ظریف قرار دیا۔ابتدائی دور میں تفریح طبع کے لئے مزاح تخلیق ہوتا رہا' لیکن عہد بہ عہد اس رجحان میں تبدیلی آتی گئی اور طنز کا عنصر بھی اس میں داخل ہونے لگا۔اورایک دور ایسا بھی آیا کہ افسانہ نگار ہو یا' شاعر یا پھر کوئی نقاد ہر کوئی طنز ومزاح لکھنے پر آمادہ نظر آنے لگے تھے۔

طنز ومزاح کے ارتقاء میں رسالہ''اودھ پنچ'' کا دور کافی اہمیت رکھتا ہے۔اودھ پنچ ایسے عہد میں جاری ہوا جب ملک سماجی ناہمواریوں اور پُرآشوب وناساعد حالات سے دوچار تھا۔اودھ پنچ نے اپنی تحریروں سے اپنے عہد کی عصری حسیت کے بیان کرنے کی بھرپورسعی کی۔اس اخبار نے طنز ومزاح لکھنے والوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جو اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔اس کے قلمکار خبروں کو ایسی شگفتگی اور بے ساختگی کے ساتھ پیش کرتے کہ قارئین بے اختیار مسکرانے پر مجبور ہوجاتے۔

اودھ پنچ کے اثر سے اردو میں مزاحیہ صحافت کی شروعات ہوئی۔حیدرآباد میں بھی کئی اخباروں نے مزاحیہ کالم شروع کئے۔جیسے دکن پنچ' جیت' وغیرہ۔اس کے علاوہ بعض سنجیدہ اخبارات اور رسائل میں بھی مزاحیہ تخلیقات شائع ہونے لگیں۔1948ء تک جاگیردارانہ معاشرہ تھا۔حیدرآباد میں اُس وقت شاہی حکومت تھی' یہاں جو مزاحیہ ادب

(شاعری ونثر) ملتا ہے اس کا مقصد نہ اصلاحِ معاشرہ تھا اور نہ طنز، یہ صرف شگفتگی کے لئے تھا، ہنسنے ہنسانے کے لئے تھا۔

آزادی کے بعد رونما ہونے والے واقعات اور حالات اور سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے طنز و مزاح خوب فروغ پانے لگا۔ معیار کے اعتبار سے آزادی سے قبل کا طنز و مزاحیہ ادب کچھ خاص تاثر نہیں رکھتا لیکن اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس دور میں مزاحیہ ادب کی شروعات ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس اسلوب نگارش نے اپنی پکڑ مضبوط کر لی، اور بعد کے نامساعد حالات اور واقعات نے اس ادب کو نئے موضوعات اور نئے اُفق سے روشناس کرایا۔

1948ء سے 1956ء تک، جو مزاح ملتا ہے اس کا مقصد حیدرآباد کے عوام کو حوصلہ بخشنا اور زندگی کرنے پر رضامند کرنا تھا۔ سماجی دھارے میں شامل کرنا تھا۔

آزادی کے بعد اہل حیدرآباد، دو بڑے سانحوں سے دوچار ہوئے۔ ایک آزادی کے بعد ملک بھر میں رونما ہونے والے فسادات اور پھر سقوط حیدرآباد۔ سقوط حیدرآباد کے بعد حیدرآبادی معاشرے میں اضطراب اور خوف کا ماحول تھا۔ لوگ سہمے ہوئے تھے۔ کل تک جو قوم حاکم تھی وہ آج محکوم ہو گئی تھی۔ سقوط حیدرآباد کو پولیس ایکشن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کے علاقوں میں ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، لوگ اتنے سہمے ہوئے تھے کہ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے سے بھی خائف نظر آتے تھے۔ ایسے ماحول میں ''نالگو برادران'' سے وابستہ فنکاروں نے اپنی اجتماعی کوششوں سے لوگوں کو حوصلہ بخشنے میں اہم رول ادا کیا۔ ہنسی قہقہے کی محفلوں اور انجمن سازی کی مدد سے لوگوں کے دلوں سے خوف و ہراس کو مٹانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ کمیونسٹ پارٹی نے PDF (پیوپلز ڈیموکریٹک فرنٹ) کی بناء ڈالی اور اس کے کلچرل ونگ کے فنکاروں نے اپنے ڈراموں اور نکڑ ناٹکوں کے ذریعہ عام آدمی کے دل سے خوف کو مٹانے اور ہنسنے ہنسانے کی طرف مائل کیا۔

1956ء میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تقسیم عمل میں آئی۔ جس کی وجہ سے معاشرے پر دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ تقسیم کے بعد حیدرآباد ریاست کے شعراء مزاح کے ساتھ طنز کی آمیزش کرنے لگے۔ طنز دن بدن تیز اور تلخ ہوتا گیا۔ اعجاز حسین کھٹا، سرور ڈنڈا، سلیمان خطیب وغیرہ اسی معاشرتی اثرات کو پیش کرتے ہیں۔ جن حالات میں اہل حیدرآباد نے طنز و مزاح کی آبیاری کی وہ سیاسی لحاظ سے کافی دگرگوں اور نامساعد تھے۔ حیدرآباد کے مزاح نگاروں کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی نے اپنی لگاتار کوششوں سے پوری قوم کا، سیاسی، سماجی، اور مذہبی شعور بیدار کرنے کی

کامیاب سعی کی۔

1966ء میں عالمی مزاحیہ کانفرنس نے طنز و مزاحیہ ادب کے فروغ کے لئے ایک ماحول تشکیل دیا اور طنز و مزاح اپنے عروج پر پہنچ گیا۔اس کانفرنس نے ملک بھر کے مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔مزاحیہ محفلوں، انجمن سازی اور اس کے زیر اثر لطیفہ گوئی، مزاحیہ افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، جیسے علمی کام انجام دئے جانے لگے۔زندہ دلان حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا اور اسی کی تقلید کرتے ہوئے ملک بھر میں اسی طرز کی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔نومبر 1968ء میں طنز و مزاح کا ترجمان رسالہ ''شگوفہ'' حیدرآباد سے جاری ہوا۔جس کے نتیجے میں معیاری طنز و مزاح لکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت تیار ہوگئی۔جنہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ سماج کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، اور تہذیبی اصلاح کی قابل تحسین خدمات انجام دیں۔

1985ء کے بعد مزاح میں ہلکا پن نظر آتا ہے۔اہل حیدرآباد تلاش معاش میں خلیج کا رُخ کرنے لگے۔ اور جب لوگوں کے پاس روپئے کی فراوانی ہونے لگی، تو تعلیم کی اہمیت جاتی رہی۔اور جو قوم اب تک سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے پسماندہ تھی اب تعلیمی میدان میں بھی دیگر قوموں سے پیچھے ہونے لگی۔اس دور کے مزاح میں عامیانہ پن اور سطحیت کا عنصر نمایاں ہونے لگا۔الفاظ سے کھیلنا یا لطیفوں کے سہارے واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے کا رواج ہوا۔اردو کے ارتقاء کے سلسلے میں بھی اسی زمانے میں مایوسی ہونے لگی۔اسی زمانے میں مجتبیٰ حسین نے ''اردو کا آخری قاری'' لکھا۔

اس زمانے کی شاعری میں بھی تخیل کی پرواز میں کمی نظر آتی ہے۔اور مضامین میں تکرار کے علاوہ پھکڑ پن زیادہ ملتا ہے۔اس دور کی مزاحیہ شاعری میں عریانی بھی در آئی۔

آفس سے میں تھک کو آیوں چُمٹیاں مت لیو سونے دو
اب میں کچھ بھی کر سکتا نئیں نئی بولے تو سنتے نئیں (غوث خواہ مخواہ)

گھر کے بازو جو ایک بیوہ ہے
اس کو دیکھا تو آہیں بھرتا ہے (فرید انجم)

جب تک سری دیوی کا نظارہ نہیں ہوتا
سو ڈگری سے اوپر میرا پارہ نہیں ہوتا (رؤف رحیم)

مشاعروں کے مزاح نگار شاعروں نے صرف اپنے سامعین کو خوش کرنے پر توجہ مرکوز کی جس کی وجہ سے اس دور میں کسی اعلیٰ ادبی معیار کی شاعری نظر نہیں آتی۔

1990ء کے بعد حیدرآباد کا روایتی مزاح پھر سے لوٹنے لگا۔ چند نئے لکھنے والوں نے بھی اس رجحان کو فروغ دیا۔ حیدرآبادی معاشرے میں اعلیٰ تعلیم کے تئیں شعور بیدار ہونے لگا۔ قاری کے شعور میں پختگی آنے لگی اور حالات کا یہ تقاضہ ہونے لگا کہ طنز ومزاح میں سماجی واخلاقی قدروں کی آمیزش ہو اور یہ حقیقی انسانی تجربات سے اخذ کیا گیا ہو۔ جب معاشرے کی فکر میں تبدیلی واقع ہوتی ہے تو ظرافت نگار کو نہ صرف موضوع ہاتھ آتا ہے بلکہ وہ اس میں ایک نئی جان اور نُدرت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اس دور کے مزاح نگار حقیقی زندگی کو موضوع بنا کر زندہ تہذیب و اقدار سے مواد حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے تا کہ قاری پر خوشگوار تاثر قائم ہو اور اس کا اثر دیرپا ثابت ہو۔

اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے فروغ میں طنز ومزاح نگاروں کی خدمات بھی قابل تحسین ہیں۔ حیدرآباد کے ایسے مزاح نگار جو یوروپی وخلیجی ممالک میں رہ رہے برادران وطن کی جانب سے قائم کردہ زندہ دلان کے ادبی اجلاسوں میں اپنی تخلیقات پیش کیں۔ ان مزاحیہ قلمکاروں نے دوسروں کو بھی طنز ومزاح لکھنے کی طرف مائل کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ طنز ومزاح کے لئے خواہ وہ نثر ہو یا نظم' موضوعات اور مواد کی کمی نہیں ہے۔ سماج میں جو ناہمواریاں ہیں' ذات پات' مذہب ومسلک کے جو مسائل ہیں' سیاسی انارکی' بدعنوانی' اقربا پروری' حکمرانوں کی نااہلی' ذہنی افلاس' اخلاقی گراوٹ' کثرت آبادی' مفلسی' بیروزگاری' بیماری' ادب کی تجارت زدگی' اردو کی زبوں حالی' خودغرضی اور خود پرستی غرض طنز ومزاح کے لئے خام مال کی بہتات ہے لیکن اس کچے مال سے سونا بنانے کا ہنر جاننے والے کمیاب ہیں۔

یہ بھی ایک حقیت ہے کہ اردو ادب میں طنز ومزاح کا جو معیار ومقدار ہے' وہ ہندو پاک کی کسی دیگر زبان میں یقیناً نہیں ہے اردو کا طنز ومزاح برصغیر کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مزاح ہے۔ حیدرآباد میں طنز ومزاح کی ایک صدی اپنے مضامین' تاریخیت' سماجی حقیقت نگاری میں بے مثال ادب کی امین ہے۔

مشاعروں کے مزاح نگار شاعروں نے صرف اپنے سامعین کو خوش کرنے پر توجہ مرکوز کی جس کی وجہ سے اس دور میں کسی اعلیٰ ادبی معیار کی شاعری نظر نہیں آتی۔

1990ء کے بعد حیدرآباد کا روایتی مزاح پھر سے لوٹنے لگا۔ چند نئے لکھنے والوں نے بھی اس رجحان کو فروغ دیا۔ حیدرآبادی معاشرے میں اعلیٰ تعلیم کے تئیں شعور بیدار ہونے لگا۔ قاری کے شعور میں پختگی آنے لگی اور حالات کا یہ تقاضہ ہونے لگا کہ طنز ومزاح میں سماجی و اخلاقی قدروں کی آمیزش ہو اور یہ حقیقی انسانی تجربات سے اخذ کیا گیا ہو۔ جب معاشرے کی فکر میں تبدیلی واقع ہوتی ہے تو ظرافت نگار کو نہ صرف موضوع ہاتھ آتا ہے بلکہ وہ اس میں ایک نئی جان اور نُدرت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اس دور کے مزاح نگار حقیقی زندگی کو موضوع بنا کر زندہ تہذیب و اقدار سے مواد حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے تاکہ قاری پر خوشگوار تاثر قائم ہو اور اس کا اثر دیرپا ثابت ہو۔

اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے فروغ میں طنز ومزاح نگاروں کی خدمات بھی قابل تحسین ہیں۔ حیدرآباد کے ایسے مزاح نگار جو یوروپی و خلیجی ممالک میں رہ رہے برادران وطن کی جانب سے قائم کردہ زندہ دلان کے ادبی اجلاسوں میں اپنی تخلیقات پیش کیں۔ ان مزاحیہ قلمکاروں نے دوسروں کو بھی طنز ومزاح لکھنے کی طرف مائل کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ طنز ومزاح کے لئے خواہ وہ نثر ہو یا نظم، موضوعات اور مواد کی کمی نہیں ہے۔ سماج میں جو ناہمواریاں ہیں، ذات پات، مذہب و مسلک کے جو مسائل ہیں، سیاسی انارکی، بدعنوانی، اقربا پروری، حکمرانوں کی نااہلی، ذہنی افلاس، اخلاقی گراوٹ، کثرت آبادی، مفلسی، بیروزگاری، بیماری، ادب کی تجارت زدگی، اردو کی زبوں حالی، خودغرضی اور خود پرستی غرض طنز ومزاح کے لئے خام مال کی بہتات ہے لیکن اس کچے مال سے سونا بنانے کا ہنر جاننے والے کمیاب ہیں۔

یہ بھی ایک حقیت ہے کہ اردو ادب میں طنز ومزاح کا جو معیار و مقدار ہے، وہ ہندو پاک کی کسی دیگر زبان میں یقیناً نہیں ہے اردو کا طنز ومزاح برصغیر کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مزاح ہے۔ حیدرآباد میں طنز ومزاح کی ایک صدی اپنے مضامین، تاریخیت، سماجی حقیقت نگاری میں بے مثال ادب کی امین ہے۔

بنیادی کتب

شمار سلسلہ	مصنف	کتاب	سنہ اشاعت
-1	ایم اے حنان	''گستاخی معاف''	1999ء
-2	آصف جہاں بیگم بلگرامی	''گل خنداں''	1941ء
-3	برق آشیانوی	''یہ ایک تبسم''	......
-4	بھارت چند کھنہ	''مسکراتے آنسو''	1944ء
-5	بھارت چند کھنہ	''مصیبتیں''	1946ء
-6	بھارت چند کھنہ	''ٹھنڈی بجلیاں''	1961ء
-7	بھارت چند کھنہ	''تیر نیم کش''	1972ء
-8	پرویز یداللہ مہدی	''چھیڑ چھاڑ''	1974ء
-9	پرویز یداللہ مہدی	''چوڑی کے غلام''	1977ء
-10	پرویز یداللہ مہدی	''ٹائیں ٹائیں فش''	1983ء
-11	پرویز یداللہ مہدی	''کچوکے''	1993ء
-12	پرویز یداللہ مہدی	''ترکی بہ ترکی''	2001ء
-13	تمکین کاظمی	''غنچۂ و تبسم''	1930ء
-14	حبیب ضیاءؔ ڈاکٹر	''انیس بیس''	1987ء
-15	حبیب ضیاءؔ ڈاکٹر	''گویم شکل''	1981ء
-16	حبیب ضیاءؔ ڈاکٹر	''جو مژگاں اٹھائیے''	2001ء
-17	حمایت اللہ	''دھنمڑی''	2001ء
-18	خواجہ عبدالغفور	''قہقہہ زار''	......
-19	رحمٰن جامی	''کیف''	2008ء
-20	رحیم الدین توفیق	''کہیں دیکھا ہے''	1999ء
-21	رشید موسوی	''کاغذی ہے پیراہن''	1986ء

-22	رؤف رحیم	''تبسم برطرف''	2003ء
-23	زینت ساجدہ	''اسلوب بیاں اور''	2009ء
-24	سلیمان خطیب	''کیوڑے کا بن''	1979ء
-25	سید عباس متقی ڈاکٹر	''ڈرتا ہوں آئینے سے''	2003ء
-26	سید عباس متقی' ڈاکٹر	''لگے ہاتھوں''	2007ء
-27	شاہد صدیقی	''شیشہ وتیشہ'' مرتبہ: مجتبیٰ حسین	1994ء
-28	شکور بیگ' مرزا	''منتخب مضامین''	1986ء
-29	شکور بیگ' مرزا	''ترانے''	1985ء
-30	شکور بیگ' مرزا	''مزاحیہ تقاریر ومضامین''	1989ء
-31	شکور بیگ' مرزا	''سدابہار''	1989ء
-32	شمیم علیم' پروفیسر	''عکسِ کائنات''	2004ء
-33	شمیم علیم' پروفیسر	''سوندھی مٹی کا عطر''	2006ء
-34	طالب خوندمیری	''سخن کے پردے میں''	1994ء
-35	طالب خوندمیری	''کانٹوں پہ زباں رکھ دی''	2001ء
-36	عابد معز	''واہ حیدرآباد''	1994ء
-37	عابد معز	''سگ گزیدہ''	1995ء
-38	عابدہ محبوب	''دھجیاں''	1988ء
-39	عاتق شاہ	''انڈین کاجو''	......
-40	عصمت اللہ بیگ' مرزا	''متاع ظرافت''	1985ء
-41	علی صائب میاں	''گھوکرو کے کانٹے''	1968ء
-42	غوث خواہ مخواہ	''کاغذ کے تیشے''	2004ء
-43	فاطمہ تاج	''دلاسا''	1993ء
-44	فاطمہ تاج	''من مانی''	2005ء
-45	فرحت اللہ بیگ' مرزا	''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی''	2004ء
-46	فرحت اللہ بیگ' مرزا	''مضامین فرحت''	1993ء

-47	فرید انجم	’’چغلیات‘‘	2004ء
-48	لئیق صلاح، ڈاکٹر	’’سنی سنائی‘‘	1981ء
-49	لئیق صلاح، ڈاکٹر	’’عکس در عکس‘‘	1998ء
-50	مجتبیٰ حسین	’’تکلف برطرف‘‘	1968ء
-51	مجتبیٰ حسین	’’قطع کلام‘‘	1970ء
-52	مجتبیٰ حسین	’’قصہ مختصر‘‘	1972ء
-53	مجتبیٰ حسین	’’بہرحال‘‘	1974ء
-54	مجتبیٰ حسین	’’آدمی نامہ‘‘	1981ء
-55	مسیح انجم	’’در پردہ‘‘	1976ء
-56	مسیح انجم	’’سائیڈ سے چلئے‘‘	1972ء
-57	ممتاز مہدی	’’شامت اعمال‘‘	1994ء
-58	نریندر لوتھر	’’بند کواڑ‘‘	1962ء
-59	نریندر لوتھر	’’مزاج پرسی‘‘	1973ء
-60	نریندر لوتھر	’’الف تحاشہ‘‘	1985ء
-61	یوسف ناظم	’’سائے ہم سائے‘‘	1975ء
-62	یوسف ناظم	’’کیف کم‘‘	1963ء
-63	یوسف ناظم	’’ایک اور چکمہ‘‘	2008ء
-64	یوسف ناظم	’’البتہ‘‘	1981ء
-65	یوسف ناظم	’’زیر غور‘‘	1973ء
-66	یوسف ناظم	’’لہٰذا‘‘	2003ء

امدادی کتب غیر مطبوعہ

67- آمنہ نصرت　　''دکنی طنز ومزاح کے فروغ میں سرور ڈنڈا کا حصہ'' مقالہ برائے ایم فل' مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو' سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد' 2005ء

68- بشیر النساء بیگم　　''معزالدین ملتانی، شخصیت اور فن''　　ایضاً　　1990ء

69- جمیل فاطمہ　　''ڈاکٹر حبیب ضیاء فن اور شخصیت''　　ایضاً　　1997ء

70- رفعت النساء　　''دکنی میں طنز ومزاح' حمایت اللہ کے حوالے سے''　　ایضاً　　2002ء

71- شائستہ رفعت　　''دکنی شاعری کے فروغ میں علی صائب میاں کا حصہ''　　ایضاً　　1998ء

72- طیب علی' محمد　　''آزادی کے بعد جنوبی ہند میں اردو طنز ومزاح کا ارتقاء'' مقالہ برائے پی ایچ ڈی' مخزونہ کتب خانہ شعبہ اردو' سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد 2007ء

73- عزیز ابرار　　''شگوفہ کی ادبی خدمات'' مقالہ برائے ایم فل'　　ایضاً　　1989ء

74- ممتاز سلطانہ　　''جیلانی بانو' حیات اور ادبی خدمات''　　ایضاً　　1983ء

75- وسیم بیگم　　''گلی نلگنڈوی بحیثیت طنز ومزاح نگار''　　ایضاً　　2009ء

76- وہاب النساء' سیدہ　　''شاہد صدیقی، حیات اور کارنامے''　　ایضاً　　1983ء

امدادی کتب

شمار سلسلہ	مصنف	کتاب	سنہ اشاعت
77-	احتشام حسین' سید	''تنقید اور عملی تنقید''	2005ء
78-	انیسہ سلطانہ	''حیدرآباد میں طنز ومزاح کی نشو نما''	1986ء
79-	ایس جے صادق' ڈاکٹر	''اردو ادب میں طنز ومزاح آزادی کے بعد''	1994ء
80-	ایس جے صادق' ڈاکٹر	''کنہیا لعل کپور حیات اور کارنامے''	1975ء
81-	حبیب ضیاء' ڈاکٹر	''حیدرآباد کی طنز ومزاح نگار خواتین''	2005ء

-82	حبیب نثار ڈاکٹر	''مطالعہ''	1997ء
-83	حبیب نثار ڈاکٹر	مضمون: غیر مطبوعہ	
-84	حبیب نثار ڈاکٹر	''دکنی کی شعری اصناف''	1990ء
-85	خواجہ عبدالغفور	''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ''	1983ء
-86	رشید شکیب	''دکنی ادب کے چار مینار''	1994ء
-87	زینت ساجدہ ڈاکٹر	''حیدرآباد کے ادیب''	1958ء
-88	سلیمان اطہر جاوید پروفیسر	''تنقید شعر''	1971ء
-89	سلیمان اطہر جاوید پروفیسر	''تنقیدی افکار''	1977ء
-90	سلیمان اطہر جاوید پروفیسر	''تنقید اور احتساب''	1993ء
-91	سلیمان اریب	''حیدرآباد کے شاعر''	......
-92	سید بشیر احمد ڈاکٹر	''مزاح نگارانِ حیدرآباد''	2007ء
-93	سید داؤد اشرف	''نقوش تاباں''	1994ء
-94	سیدہ جعفر	''طنز و مزاح تاریخ و تنقید''	1986ء
-95	شاہد صدیقی	''چراغ منزل''	1960ء
-96	طارق سعید	''اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب''	1996ء
-97	محمد طیب انصاری ڈاکٹر	''عہد آصفیہ اور اردو نثر کا ارتقاء''	1999ء
-98	ظفر الحسن مرزا	''ذکر یار چلے''	1979ء
-99	عبدالرؤف عروج	''اقبال اور بزم اقبال''	1978ء
-100	عزیز احمد	''یادگار فرحت''	......
-101	عظیم الدین محبتؔ	''مملکت آصفیہ''	......
-102	غلام احمد فرقت کاکوروی	''اردو ادب میں طنز و مزاح''	1957ء
-103	فرمان فتح پوری	''اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے''	2004ء
-104	قمر رئیس پروفیسر	''تنقیدی تناظر''	1978ء
-105	قمر رئیس پروفیسر	''تعبیر و تحلیل''	1996ء
-106	مالک رام	''تذکرۂ ماہ و سال''	1991ء

107-	ماہرالقادری	''یادرفتگان''	1994ء
108-	مجیب الاسلام' ڈاکٹر	''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی علمی وادبی خدمات''	......
109-	محمد انورالدین' ڈاکٹر	''حیدرآباد دکن کے علمی وادبی رسائل''	1997ء
110-	محمد نورالدین خان	''یادداشت''	2003ء
111-	محمد یونس فہمی	''اردو شاعری میں طنز و مزاح' آزادی ہند 1947 کے بعد''	1979ء
112-	مسلم ضیائی	''روسی ظرافت''	1944ء
113-	مشتاق احمد یوسفی	''پہلا پتھر' مشمولہ چراغ تلے''	......
114-	نامی انصاری	''بیسویں صدی میں طنز و مزاح''	2002ء
115-	نامی انصاری	''آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح''	2003ء
116-	نصیرالدین ہاشمی	''دکن میں اردو''	2002ء
117-	نظر حیدرآبادی	''اقبال اور حیدرآباد''	1961ء
118-	وزیر آغا' ڈاکٹر	''اردو ادب میں طنز و مزاح''	1981ء
119-	وزیر آغا' ڈاکٹر	''اردو طنز و مزاح کا ارتقاء آزادی کے بعد''	......
120-	یوسف حسین خاں' ڈاکٹر	''یادوں کی دنیا''	1967ء

رسائل واخبارات

شمار سلسلہ	اخبار/رسالہ	روزنامہ/ماہنامہ	تاریخ	سنہ اشاعت
121-	ادب لطیف (سالنامہ)	ماہنامہ	جنوری	1961ء
122-	آج کل' نئی دہلی	ماہنامہ	جون	1968
123-	آج کل، نئی دہلی	ماہنامہ	اگست	1972ء
124-	آج کل' طنز و مزاح نمبر نئی'' دہلی	ماہنامہ	ستمبر	1982ء
125-	پروازِ ادب' طنز و مزاح نمبر'' (حصہ دوم)	ماہنامہ	مارچ اپریل	2005ء
126-	تحریر نو' ممبئی	ماہنامہ	ستمبر	2009ء
127-	سووینیئر ''زندہ دلان حیدرآباد (دوسرا کل ہند مزاحیہ مشاعرہ)		مئی	1967ء

128- پونم خصوصی اشاعت ''طنز ومزاح نمبر''	ماہنامہ	اپریل	1968ء
129- پونم ''جشن زینت نمبر''	ماہنامہ	جون جولائی	1983ء
130- ساقی' طنز وظرافت نمبر''	ماہنامہ	اپریل	1946ء
131- سب رس' کراچی	ماہنامہ	اگست	1993ء
132- شاعر' ممبئی	ماہنامہ	جنوری	1976ء
133- شاعر' ممبئی	ماہنامہ	مارچ	1977ء
134- شاعر' ممبئی	ماہنامہ	نومبر	1978
135- شگوفہ' حیدرآباد	دوماہی	اکٹوبر' نمبر	1971ء
136- شگوفہ' حیدرآباد	دوماہی	مارچ' اپریل	1973ء
137- شگوفہ' حیدرآباد	ماہنامہ	جون	1973ء
138- شگوفہ' حیدرآباد	ماہنامہ	جون	1974ء
139- شگوفہ' حیدرآباد	ماہنامہ	جولائی	1975ء
140- شگوفہ' حیدرآباد	ماہنامہ	اپریل	1977ء
141- شگوفہ' حیدرآباد	ماہنامہ	نومبر	1978ء
142- شگوفہ' حیدرآباد	ماہنامہ	ڈسمبر	1980ء
143- شگوفہ' حیدرآباد	ماہنامہ	ستمبر	1981ء
144- شگوفہ' حیدرآباد	ماہنامہ	ستمبر	1982ء
145- شگوفہ' حیدرآباد	ماہنامہ	جنوری	1983ء
146- شگوفہ' حیدرآباد	ماہنامہ	ستمبر	1984ء
147- شگوفہ ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)	ماہنامہ	جون	1985ء
148- شگوفہ (سالنامہ)	ماہنامہ	جنوری	1986ء
149- شگوفہ (اقبال نمبر)	ماہنامہ	اپریل	1986ء
150- شگوفہ'' حیدرآباد	ماہنامہ	نومبر	1986ء
151- شگوفہ' حیدرآباد	ماہنامہ	جنوری	1987ء
152- شگوفہ'' حیدرآباد	ماہنامہ	اگست	1987ء

153- شگوفہ (مجتبیٰ حسین نمبر)	ماہنامہ	نومبر	1987ء
154- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	جنوری	1988ء
155- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	ستمبر	1988ء
156- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	جنوری	1989ء
157- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	اگست	1990ء
158- شگوفہ (سالنامہ)	دوماہی	جنوری، فروری	1991ء
159- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	جولائی	1991ء
160- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	جون	1992ء
161- شگوفہ (25 سالہ شعری انتخاب)	ماہنامہ	اپریل	1994ء
162- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	اکتوبر	1994ء
163- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	اکتوبر	1996ء
164- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	جون	1997ء
165- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	ستمبر	2000ء
166- شگوفہ (ڈیڑھ سالہ نمبر)	ماہنامہ	جون	2001ء
167- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	مئی	2002ء
168- شگوفہ (یوسف ناظم نمبر)	ماہنامہ	جون	2004ء
169- شگوفہ (خلیج نمبر)	ماہنامہ	جون	2004ء
170- شگوفہ (37 ویں سالگرہ نمبر)	ماہنامہ	جولائی	2005ء
171- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	جون	2006ء
172- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	مارچ	2007ء
173- شگوفہ (پرویز یداللہ مہدی نمبر)	ماہنامہ	مارچ	2009ء
174- شگوفہ (بہ یاد یوسف ناظم)	ماہنامہ	اگست	2009ء
175- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	اپریل	2009ء
176- شگوفہ، حیدرآباد	ماہنامہ	جولائی	2010ء
177- قومی زبان، حیدرآباد	ماہنامہ	اپریل	1992ء

178- قومی زبان، حیدرآباد	ماہنامہ	اکٹوبر	2006ء
179- صبا (مخدوم نمبر)	ماہنامہ	......	1966ء
180- عصری ادب	ماہنامہ	مارچ	1971ء
181- مجلّہ عثمانیہ پلاٹینم جوبلی نمبر		اگست	1978ء
182- غزلوں کی رات	ماہنامہ	مارچ	1978ء
183- کتاب نما، نئی دہلی	ماہنامہ	جون	2008ء
184- ''نقوش'' (طنز و ظرافت نمبر)	ماہنامہ	جنوری، فبروری	1959ء
185- اعتماد، حیدرآباد	روزنامہ	3 اگست	2009 ء
186- اعتماد، حیدرآباد	روزنامہ	4 جنوری	2010ء
187- انقلاب، ممبئی	روزنامہ	27 اپریل	1997 ء
188- جسارت	روزنامہ	30 اکٹوبر	1979ء
189- جنگ، کراچی	روزنامہ	16 نومبر	1995ء
190- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	26 جولائی	1959ء
191- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	12 مارچ	1961ء
192- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	12 نومبر	1961ء
193- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	22 اگست	1962ء
194- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	یکم جون	1964ء
195- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	6 ڈسمبر	1964ء
196- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	26 جنوری	1969ء
197- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	19 اگست	1973ء
198- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	5 جنوری	1975ء
199- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	16 ڈسمبر	1977ء
200- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	26 جولائی	1980ء
201- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	2 ڈسمبر	1980ء
202- سیاست، حیدرآباد	روزنامہ	15 مارچ	1981ء

203- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	19 جولائی	1981ء
204- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	9 اگست	1981ء
205- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	30 ستمبر	1981ء
206- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	16فبروری	1983ء
207- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	22جون	1992ء
208- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	17اگست	1992ء
209- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	15اکتوبر	1995ء
210- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	12اگست	2006ء
211- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	6اگست	2007ء
212- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	13ڈسمبر	2008ء
213- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	27جون	2009ء
214- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	13اکتوبر	2009 ء
215- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	19ڈسمبر	2009ء
216- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	9جنوری	2010ء
217- سیاست' حیدرآباد	روزنامہ	27جون	2010ء
218- سیاست'' حیدرآباد	روزنامہ	31جولائی	2010ء
219- رعیت'' حیدرآباد	روزنامہ	12نومبر	1938ء
220- منصف' حیدرآباد	روزنامہ	25اپریل	1998ء
221- منصف' حیدرآباد	روزنامہ	17ستمبر	2000ء
222- منصف' حیدرآباد	روزنامہ	17 ستمبر	2000ء
223- منصف' حیدرآباد	روزنامہ	18ڈسمبر	2005ء
224- منصف' حیدرآباد	روزنامہ	24اگست	2006 ء
225- منصف' حیدرآباد	روزنامہ	8اکتوبر	2009ء
226- منصف' حیدرآباد	روزنامہ	28جنوری	2010ء
227- منصف' حیدرآباد	روزنامہ	25مارچ	2010ء

انگریزی کتب

228- Inside out look by Arthor Coisler

229- The Oxford English Urdu Dictionary (2004)

230- Urdu English Dictionary, NCPUL (1995)

ویب سائٹ

231- www.alqalm.org

232- www.awazsayeed.com

233- www.urduenglishdictionary.org

234- www.urdupoint.com

شخصی انٹرویو

235- مظفرالدین سعید　بتاریخ 15 اپریل 2004ء　بمقام ترپ بازار، حیدرآباد

236- ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال　بتاریخ 10 مئی 2006ء　بمقام دفتر ''شگوفہ'' معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

237- مجتبیٰ حسین　بتاریخ 16 ڈسمبر 2008　بمقام مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

238- وحید پاشاہ قادری　بتاریخ 24 فروری 2010　بمقام مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی